بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ ڈی

ماہر القادری

حیات اور ادبی کارنامے

۱۹۹۰ء

مقالہ نگار
عبدالغنی فاروق
استاد شعبہ اردو
گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور

نگران
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
استاد شعبہ اردو
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۳۱-۱۲-۹۱

انتساب

بہت عزیز اور محترم دوست،

محمّد ریاض ناز (مقیم جدّہ)

کے نام۔

فہرست

پیش لفظ

ماہر القادری جامع الصفات شاعر اور ادیب تھے ، وہ نعت میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے - بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری " ان کی غزل قاری اور سامع کو چونکائے بغیر نہیں رہتی " اور یہ کہ " وہ اپنے ہم عصر غزل گو شعراء میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں "۔[1] انہوں نے رومانی ، سیاسی، مزہبی اور معاشرتی موضوعات پر مختلف اصنافِ سخن میں بےشمار نظمیں بھی لکھیں جو ان کی قادر الکلامی پر شاہدِ عادل ہیں - نثر میں موصوف نے چار ناول یادگار چھوڑے ، مختلف وقتوں میں چھ مجموعے افسانوں کے طبع کرائے ، مختلف شخصیات پر ۱۹۰ خاکے لکھے، باقاعدہ کتابی صورت میں ایک سفرنامہ حج کے علاوہ مختلف اسفار کے تفصیلی تاثرات پر مبنی ماہر کے متعدد سفرنامے " فاران " میں شائع ہوئے - تبصرہ نگاری میں وہ واقعتہً انفرادیت اور خاص امتیاز کے حامل ہیں اور دو ہزار سے زائد کتابوں پر انہوں نے جامع اور بھرپور تبصرے قلم بند کیئے - تنقید ، لُغت اور اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات بڑی وقیع ہیں - اس کے علاوہ مذہبی ، سیاسی اور علمی موضوعات پر ان کی لاتعداد تحریریں اپنی ثقاہت، سند اور وقعت کے اعتبار سے بڑی اہم ہیں - ایک ماہانہ رسالہ کے مدیر کی حیثیت سے بھی ماہر کا اپنا ایک مقام ہے۔اس طرح موصوف

۱- ماہنامہ " فاران " کراچی ، اگست ۱۹۸۶ء (ماہر نمبر) ص ۲۵

نے اردو زبان و ادب ، دینِ اسلام اور وطنِ عزیز پاکستان کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور ان کا یہ اعزاز وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتا اور نمایاں ہوتا چلا جائے گا ۔

مگر یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ متذکرہ ساری صفات اور خدمات کے باوجود ماہرالقادری ایک مظلوم شاعر اور ادیب ہیں ۔ نقاد حضرات کی غالب اکثریت نے انہیں یکسر نظر انداز کیا ہے اور (نعت کے سوا) کسی بھی صنفِ ادب کے حوالے سے تجزیاتی مقالات میں ان کا نام ڈھونڈے سے نظر نہیں آتا ۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ مختلف ادبی رسائل پر ترقی پسند حضرات قابض تھے ، نقد و نظر کی دنیا میں بھی یہی لوگ چھائے ہوئے تھے اور چونکہ ماہر نے حیدر آباد دکن ہی سے ترقی پسند تحریک کے خلاف محاذ کھول دیا تھا جو تادمِ مرگ جاری رہا اور جس نے بمبئی میں باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی ؛ اس لیے اس طبقے نے اُن سے اِس طرح انتقام لیا کہ اُنہیں مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا اور ادبی محفلوں میں ان کے بارے میں طنز و استخفاف کا لہجہ اختیار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر شعوری طور پر غیر جانبدار نقاد حضرات بھی متاثر ہوئے اور ماہر کو ادبی دنیا میں ایک ناپسندیدہ فرد کی حیثیت دے دی گئی ۔

مَیں اِسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ استادِ گرامی ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے مجھے ماہر القادری پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی ترغیب دی اور اللہ تبارک و تعالٰی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اسے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں ۔ میں اس امر کا

اعتراف کرتا ہوں کہ حُسنِ اتفاق سے مَیں ماہر کے متنوع نظریات و عقاید سے کامل

اتفاق رکھتا ہوں ، مگر میں نے اس مقالہ کو " مدلّل مدّاحی " نہیں بننے دیا اور

ان کی نظم و نثر کی خوبیاں اجاگر کرنے کےساتھ ساتھ جہاں بھی مجھے کوئی خامی یا

کمزوری نظر آئی ہے ، میں نےاس کی بھی نشاندھی کی ہے ۔ ماہر اعتدال اور توازن

کے علمبردار تھے اور یہی روّیہ میں نے ان کے بارے میں اختیار کرنے کی کوشش کی ہے ۔ میں

اس کوشش میںکہاں تک کامیاب ہوا ہوں ، اس کا فیصلہ ممتحن حضرات اور قارئین ہی

کر سکتے ہیں ۔

اس مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں مَیں سب سے پہلے استادانِ گرامی ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا تہِ دل سے شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے مختلف مواقع پر میری خاص حوصلہ افزائی فرمائی ۔ سیالکوٹ کے ریٹائرڈ بریگیڈیر نثار احمد قریشی صاحب نے " فاران " کے بیس سال کے مجلد فائیل کا انتظام کر دیا اور اپنے حُسنِ عمل سے میرے راستے کی بعض ایسی دقتوں کو دور کیا کہ میرے لیے کام کرنا آسان ہو گیا ۔ ریٹائرڈ جنرل محمد اکرم مرحوم نے یہ فائل پہلے عاریتہً بھجوائے ، مگر بعد میں مستقلاً عنایت فرما دیئے ۔ معروف مورّخ اور مصنف جناب طالب ہاشمی نے مجھے ماہر کی متعدد نادر تحریریں مہیا فرمائیں اور نہایت خلوص و محبت سے میری حوصلہ افزائی کرتے رہے ۔ کراچی کے اسمٰعیل مینائی صاحب نے ماہر کی وفات کے بعد

جو " فاران " کو زندہ رکھا ، اس کا شاید سب سے زیادہ فائدہ مجھے پہنچا اور میں نے

مختلف وقتوں میں ماہر کے بارے میں چھپنے والے مضامین سے بھرپور استفادہ کیا ۔

مینائی صاحب نے براہ راست بھی میری مدد فرمائی اور ماہر کی بعض نایاب کتب مرحمت

کیں ۔ میں ان چاروں محترم حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں ۔ مجھے معروف بزرگ شاعر
جناب انوار ظہوری کے ایک غیر مطبوعہ مضمون سے بھی استفادہ کا موقع ملا جس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں ۔
اسکے علاوہ اس مقالے کے سلسلے میں جناب مشفق خواجہ ، جناب عبدالجبار شاکر ،

پروفیسر اختر راہی ، جناب حفیظ الرحمٰن احسن ، پروفیسر اسرار احمد سہاوری اور محمد یوسف خاں نے

مجھے ماہر القادری کی نادر کتب اور متعلقہ مضامین عطا کئے ۔ ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ

کی لائبریری ، پنجاب پبلک لائبریری ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری

کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی ، دیال سنگھ کالج لائبریری اور اورینٹل کالج لائبریری

کے مہتمم حضرات نے میری خاص معاونت کی ۔ میں فردا" فردا" ان سب حضرات کے خلوص

اور محبت کا سپاس گزار ہوں ۔ میں اپنے لائق اور عزیز شاگرد (سکواڈرن لیڈر)

محمد ازہر رانا کا بھی شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے مطلوبہ انگریزی حوالے تلاش کرنے

میں میری مدد کی ۔ اور اپنے نگران ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا بھی تہہِ دل سے

ممنون ہوں کہ انہوں نے میری مناسب رہنمائی فرمائی اور اپنے ذاتی کتب خانہ سے بھی

مستفید ہونے کا بھرپور موقع عطا کیا ۔ جزا ہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء ۔

عبدالغنی فاروق
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ،
گورنمنٹ دیال سنگھ کالج ، لاہور ۔

باب - ۱

مراحلِ حیات —— پیدائش سے وفات تک

پیدائش ، والدین اور خاندان

منظور حسین نام ، ماہر تخلص ، سلسلہ قادریہ سے نسبت کے سبب القادری تخلص کا جزو بن گیا - [1]

ماہر القادری ۸ جمادی الثانی ۱۳۲۴ھ (مطابق ۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء) کو ضلع بلند شہر (یو - پی ، بھارت) کے ایک قصبہ کیسرکلاں [2] میں پیدا ہوئے۔ منظور حسین تاریخی نام ہے جو ۱۳۲۴ھ کے اعداد سے ان کے والد محمد معشوق علی (ولد شیخ علی بخش [3]) نے نکالا تھا [4] ، ماہر کا گھرانا نسب کے اعتبار سے قریشی ہے - [5]

۱- ماہنامہ " فاران " کراچی دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۵۲ (نامکمل خود نوشت ماہر القادری)

۲- کسیر کلاں علی گڑھ سے تیس میل کے فاصلے پر واقع ڈبائی ریلوے سٹیشن سے تین میل دور ہے (فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۵۲) ماہر کے چھوٹے بھائی مسرور حسین نے بتایا (ملاقات ناظم آباد کراچی ۸ اگست ۱۹۸۶ء) کہ تقسیم کے وقت اس قصبے کی آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی جس میں نصف تعداد مسلمانوں کی تھی - کسیرکلاں کے گردو نواح میں بعض نامور مسلمانوں کی جاگیریں تھیں جن میں نواب چھتاری ، نواب اسمٰعیل خان صدر مسلم لیگ اور نواب جہانگیر آباد نے سیاسی شہرت پائی -

۳- پروفیسر محمد ایوب قادری " کاروان رفتہ " مکتبہ اسلوب ، کراچی ۱۹۸۲ء ص ۲۲۲

۴- فاران ، ایضاً ، ص ۱۵۳

۵- ماہر القادری فاران ، اگست ۱۹۶۹ء ، ص ۵۲

ماہر القادری کے چھوٹے بھائی مسرور حسین نے بتایا کہ ماہر اور ان کی ایک بہن رحمت النساء ، محمد معشوق علی کی پہلی بیوی ممتاز بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ رحمت النساء بڑی تھیں ، اور ماہر چھوٹے ـــ مگر ممتاز بیگم اس وقت وفات پا گئیں جب ماہر کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی -[۱]

محمد معشوق علی نے پہلی بیوی کی وفات کے کئی برس بعد دوسری شادی ایک خاتون معشوق النساء سے کی - مسرور حسین کے بقول یہ خاتون بڑی ہی نیک ، دیندار اور خلیق و حلیم تھیں - تعلیم صرف ناظرہ قرآن تک محدود تھی - انہوں نے ماہر کو سگی ماں کا پیار دیا - ماہر کے چھوٹے بھائی مسرور حسین اُنہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔[۲]

۱- سید احسان علی دہلوی کے نام ماہر صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں " میری عمر آٹھ سال کی تھی جب مجھے والدہ کی رحلت کا غم اٹھانا پڑا - اس زمانے میں جتنا بھی ہوش تھا ، اُس اعتبار سے احساسِ غم بھی تھا (فاران ، مئی ۱۹۸۱ء ، ص ۴۲)

۲- مسرور حسین صاحب نے بتایا کہ معشوق النساء بڑی ہمدرد اور ایثار پیشہ خاتون تھیں۔ جب ماہر نے میٹرک کر لیا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں پریشان تھے ، تو سوتیلی والدہ نے اپنا سارا زیور نکالا اور ماہر کے حوالے کرتے ہوئے کہا " منظور ، یہ لو - اسے لے جاؤ اور جس طرح مرضی ہو ، اس سے فائدہ اٹھاؤ تم پریشان اور فکرمند کیوں ہو ـــ معشوق النساء نے ۱۹۳۶ء ، میں اُس وقت وفات پائی جب مسرور حسین کی عمر پندرہ سال سے زاید نہ تھی -

ماہر صاحب لکھتے ہین کہ ان کے والد گاؤں کے پہلے شاعر ، شرنگار ، اور انگریزی دان تھے ۔ تخلص ظریف تھا ، مگر وہ مزاحیہ اور ظریفانہ شاعری نہین کرتے تھے ۔ عربی مین ظریف HUMOROUS کو نہین ، بلکہ زیرک و دانا کو کہتے ہین۔[1]

سرور حسین صاحب نے بتایا کہ ان کے والد آبائی طور پر زراعت پیشہ تھے ۔ گاؤں کے نواح مین ایک سو بیگھ زمین کے مالک تھے ـــــ خود کاشت کراتے تھے ، مگر پانی کی کمی کی وجہ سے پیداوار خاطر خواہ نہ ہوتی تھی اور خوشحالی میسر نہ تھی ۔

یہ معلوم نہین ہو سکا کہ ماہر کے والد کی تعلیم کیا تھی ، تاہم وہ اردو ، اور فارسی سے خوب شناسا تھے ۔ انگریزی لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے ۔[2]

سرور حسین صاحب نے بتایا کہ کاشت کاری کے ساتھ ساتھ محمد معشوق علی کسیر کلان مین برانچ پوسٹ ماسٹر کی ذمہ داری بھی نبھاتے تھے ۔ ایسا شاید اس لئے تھا کہ قصبے مین صرف وہی مناسب تعلیم کے حامل تھے ۔

محمد معشوق علی ادب و شعر کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے ۔[3] ماہر لکھتے ہین کہ ابتدا مین وہ غزل کے شاعر تھے ، مگر اخیر مین صرف حمد و نعت کہتے تھے ۔ ماہر نے ان کی نعتیہ غزل کا ایک مقطع بھی نقل کیا ہے ۔

الٰہی وہ دن کونسا ہے کہین سب
مدینہ ظریف ان دنون جا رہا ہے[4]

۱۔ فاران دسمبر ، ۱۹۷۸ء ، ص ۵۲
۲۔ ماہر القادری فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۵۲
۳۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے"کہ خط کی عبارت پڑھنے سے پہلے لکھنے والے کی خوشخطی دیکھ کر ہی ذہن اچھا اثر قبول کرتا ہے" ۔ ماہر القادری مقدمہ " تیس پروانے شمع رسالت کے از طالب ہاشمی ، مکتبہ چراغ اسلام لاہور ۱۹۷۸ء ، ص ۵
۴۔ فاران ستمبر ۱۹۶۹ء ، ص ۱۸

ماہر صاحب لکھتے ہیں کہ وہ بچپن میں مختلف مذہبی تقریبات میں مولود پڑھا کرتے تھے " والد مرحوم نے میری خاطر پورا میلاد مرتب کیا جو "مولودِ شہیدی" وغیرہ کتابوں سے مستفاد و ماخوذ تھا ۔ نعتیہ نظمیں اور غزلیں سب انہی کی تھیں ۔

والد مرحوم گاؤں کی مروجہ رسموں ۔۔ میلاد کے قیام ، فاتحہ ، سوم و چہلم میں حصہ لیتے تھے ، مگر دوسرے مسلمانوں کی طرح علمائے دیو بند سے بدظن نہ تھے بلکہ ان کا احترام کرتے تھے ۔ پوری بستی میں صرف ہمارے گھر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا "بہشتی زیور" تھا ۔ اسی نسبت اور ربط و تعلق کے سبب گاؤں کے مسلمانوں کی زبان سے ان پر " دیو بندیت " کی طنز سنتے میں آتی تھی "۔[1]

اپنے والد کے دینی مزاج اور طریقِ تربیت کے بارے میں ماہر لکھتے ہیں :۔

" ہم نے اس ماحول میں پرورش پائی ہے کہ والد مرحوم کھانا کھاتے میں نہ معلوم کتنی بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے ۔ میں ان کے ساتھ کھانا کھاتا ہوتا ، تو روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے کہتے جاتے " منظور ، یہ گیہوں کی روٹی ، یہ سالن ، یہ ٹھنڈی چھاؤں ، ہر کسی کو میسر نہیں آتی ۔ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے ۔ کھانا کھاکر پھر دعا پڑھتے "۔[2]

ان کے والد کی تربیت کا ایک انداز یہ بھی تھا :۔

۱۔ فاران اپریل ، ۱۹۶۷ء ، ص ۳۱

۲۔ کاروانِ حجاز مکتبہ فاران کراچی ، ۱۹۵۶ء ، ص ۱۲۸

" والد مرحوم [1] بچپن میں میرے سر کے تمام بال منڈوا دیا کرتے تھے چودہ پندرہ سال کی عمر تک یہی صورت رہی کہ مہینے میں ایک بار مجھے سر گھٹانا پڑتا - پھر میں نے ہائی اسکول میں دوسرے طلبہ کی دیکھا دیکھی انگریزی بال رکھ لئے اور وہ اس تدریج کے ساتھ کہ سب سے پہلے میں نے کنپٹیوں سے کچھ اوپر تک انگریزی انداز میں بال ترشوائے - میں نے دیکھا کہ والد مرحوم نے مجھے نہیں ٹوکا [2] تو پھر میں نے پورے سر کے بالوں کو فرنگی بنا دیا - تقریباً تیس سال کے بعد حج کی بدولت اس " افرنگیت " سے ، جسے میں اپنے سر پر لئے پھرتا تھا ، نجات ملی "- [3]

تعلیم اور مطالعے کا آغاز

ماہر نے قرآن حکیم اور اُردو کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب سے حاصل کی- [4] اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد سے فارسی کی کتابیں بھی پڑھتے رہے اور ۱۹۱۵ء میں یعنی نو سال کی عمر میں جب انہوں نے کبیر مڈل اسکول ڈبائی میں داخلہ لیا ، تو

۱- ماہر صاحب لکھتے ہیں :- " جس سال (۱۹۲۲ء میں) ان کی وفات ہوئی ہے ، ہمارے گاؤں کے کئی مسلمانوں کو حج و زیارت کی توفیق نصیب ہوئی - میاں نے کورے خاصے کا پاجامہ اور کچی ململ کا کُرتہ سلوا کر یہ جوڑا سینت کر رکھا تھا کہ جس دن حاجی ریلوے سٹیشن پر پہنچیں گے تو وہ نیا جوڑا پہن کر ان کا استقبال کریں گے ، مگر یہ خوشی دیکھنی ان کے نصیب میں نہیں لکھی گئی - حاجیوں کی واپسی سے پہلے ہی وہ دنیا سے چل بسے" (فاران ستمبر ۱۹۶۹ء ص ۱۸)

۲- جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تربیت کے معاملے میں متشدد نہ تھے بلکہ نو عمری کی نفسیات سے آگاہ تھے -

۳- کاروانِ حجاز ، ص ۲۱

۴ - فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۲۵

وہ گلستان ختم کر چکے تھے[1] -

ایک طالب علم کی حیثیت سے ماہر کو تاریخ ، اردو ، فارسی مین تو امتیازی حیثیت حاصل رہی ، مگر ریاضی مین وہ کمزور تھے ، اس لئے ۱۹۲۴ء مین جب الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا ، تو فیل ہو گئے[2] -

امتحان مین ناکامی کے چند ماہ بعد ماہر کے والد وفات پا گئے[3] - وہ بڑے ہی شفیق اور محبت کرنے والے باپ تھے - چنانچہ قدرتی طور پر نوجوان ماہر نے شدید صدمہ محسوس کیا ، امتحان کی ناکامی اس پر ستزاد تھی ، چنانچہ سال سوا سال کی مدت سخت اضطراب اور بے کیفی مین گزری ، تاآنکہ ان کی سوتیلی والدہ نے ان کی پریشانی کا یون مداوا کیا کہ اواخر دسمبر ۱۹۲۵ء مین ان کی شادی کر دی[4] - اس وقت ان

۱- ماہر کی دو تحریرین : (۱) ۱۹۱۸ء کا قصہ ہے ، مین ان دنون کبیر مڈل اسکول ڈبائی مین انگریزی کی فورتھ کلاس کا طالب علم تھا (فاران اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۴۸) (۲) ۱۹۲۳ء کی بات ہے مین کبیر ہائی اسکول قصبہ ڈبائی مین نوین کلاس مین پڑھتا تھا (فاران فروری ۱۹۶۷ء ص ۳۸ ، ۳۹) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہر نے ۱۹۱۵ء مین پہلی جماعت مین داخلہ لیا تھا اور سنِ پیدائش ان کا چونکہ ۱۹۰۷ء ہے ، اس لئے داخلے کے وقت انکی عمر نو برس بنتی ہے - تاخیر کا سبب مدرسے اور گھر کی تعلیم کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیہات مین کسان گھرانے بچون کو بہت چھوٹی عمر مین اسکول نہین بھیجتے تھے -

۲- ماہر القادری فاران اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۳۳ -

۳- ایضاً ،

۴- ماہر کی شادی ضلع بلند شہر ہی کے ایک گاؤن مین ہوئی اہلیہ کا نام بلقیس جہان بیگم تھا جو واجبی سی گھریلو دینی تعلیم کی حامل تھین - مسرور حسین صاحب کے بقول بڑی خوش اخلاق ، دیندار اور تہجد گزار خاتون تھین میان بیوی مین ہمیشہ مثالی تعلق رہا- اولاد سے محروم رہین ، مگر صبر و شکر سے خوش و خرم زندگی گزاری- جماعت اسلامی کی رکن تھین - ۱۹۶۶ء مین وفات پائی اور اپنا سارا اثاثہ جماعت کو دے گئین -

کی عمر ۱۹ سال تھی -

ماہر کو کھیتی باڑی سے چنداں دلچسپی نہ تھی - وہ چاہتے تھے کہ کوئی ملازمت مل جائے -[1] مگر سرکاری ملازمت کے لئے کم از کم میٹرک کی سند ہونا ضروری تھا چنانچہ انہوں نے میٹرک کی از سر نو تیاری شروع کر دی اور سخت محنت کے بعد ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا -[2]

ادبی اور ملی شعور کی پرورش
=====================

نو دس سال کی عمر ہی سے ماہر کو اخبار اور رسائل پڑھنے کا شوق ہو گیا - ان رسائل میں خواجہ حسن نظامی کا رسالہ " نظام المشائخ " بھی تھا جو دلی سے چھپتا تھا - ماہر خواجہ صاحب کی تحریروں کی سلاست ، سادگی اور حسنِ ادا سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے لگے -[3]

ماہر کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی جب ہندوستان میں " تحریکِ خلافت "

۱- روایت سرور حسین (ملاقات کراچی ۸ اگست ۱۹۸۶ء)

۲- ماہر القادری فاران اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۳۳ یہ امر دلچسپ ہے کہ جب کوئی پوچھتا کہ ماہر صاحب آپ کی تعلیم کیا ہے تو فرماتے MAB PIAT PIX پھر خود ہی وضاحت کرتے Matric Appeared but plucked in Allahabad then Passed in Aligarh.
اس سے ماہر کی شگفتہ مزاجی اور خود اعتمادی کا بھی اندازہ ہوتا ہے -
(ماہنامہ سیارہ لاہور دسمبر ۱۹۶۳ء ، ص ۲۳)

۳- ماہر القادری فاران ستمبر ۱۹۵۵ء ، ص ۳۱

آندھی اور طوفان کی طرح سارے ملک کی سیاسی اور تہذیبی فضا پر چھا گئی[۱] - قریہ قریہ، گاؤں گاؤں خلافت کمیٹیاں قائم ہوئیں - کسیر کلاں میں جو خلافت کمیٹی قائم ہوئی وہ ضلع بھر میں فعّال ترین تھی اور ماھر اس کے سب سے کمسن رکن تھے[۲] - تحریکِ خلافت کے دوران عوام کے مذھبی جوش و خروش اور ملی غیرت نے نو عمر ماھر کو بہت متاثر کیا[۳] -

عمومی مطالعہ کے حوالے سے نظام المشائخ کے علاوہ جو رسائل و جرائد ماھر کے زیرِ مطالعہ رہے ، ان میں ماھنامہ " زمانہ " کانپور ، ماھنامہ " عالمگیر " لاھور ماھنامہ " نقیب " اور " نقاش " اور رسالہ " ادیب " الہ آباد بھی شامل تھے - تیرہ چودہ برس کی عمر میں وہ نیاز فتح پوری کے " نگار " سے متعارف ہوئے اور موصوف کے شاعرانہ رومانی اسلوبِ تحریر سے بہت متاثر ہوئے[۴] -

پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ماھر " زمیندار " اخبار کا پابندی سے مطالعہ کرنے لگے اور اس حوالے سے مولانا ظفر علی خان کی تحریروں سے آشنا ہوئے " یوں سمجھئے کہ میرے شعور کا آغاز بھی پورے طور پر نہ ہوا تھا کہ زمیندار اور ظفر علی خان کے نام سے کان آشنا ہو چکے تھے "[۵] -

---

۱- پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر انگریزوں نے خلافتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے اور ترکوں کو مکمل تباھی سے ھمکنار کرنے کی جو سازش کی ، اس کے خلاف ھندوستان کے مسلمانوں نے جس تحریک کی بنیاد رکھی (مئی ۱۹۲۰ء) وہ تحریک خلافت کہلاتی ھے - تفصیلات کے لئے دیکھئے " تحریک آزادی " از پروفیسر فاروق اختر نجیب علمی کتابخانہ لاھور ۱۹۷۵ء ، ص ۱۲۲

۲- ماھر القادری فاران فروری ۱۹۶۰ء ، ص ۳۰

۳- ایضاً ،

۴- ایضاً ، جولائی ۱۹۶۶ء ، ص ۳۳

۵- ایضاً ، جنوری ۱۹۵۷ء ، ص ۳۰

ماہر میٹرک کے طالب علم تھے جب انہوں نے پہلی مرتبہ علی گڑھ میگزین کا ضخیم سلور جوبلی نمبر دیکھا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین سے غیر معمولی اثر پذیر ہوئے ۔ خود لکھتے ہیں " ملا رموزی بھوپالی کی " گلابی اردو " کا ان دنوں بڑا شہرہ تھا مگر رشید احمد صدیقی کی سنجیدہ لطف انگیز طنز کے آگے " گلابی اردو " نقشِ بے رنگ ہی نظر آئی ! قاضی عبدالغفار مراد آبادی کے " لیلیٰ کے خطوط " کی دھوم مچی ہوئی تھی ، کوئی شک نہیں یہ خطوط طنز و ادب کا شاہکار ہیں مگر اسی زمانے میں رشید احمد صدیقی کے مضامین رسالوں میں نظر سے گزرے تو میرا ذوق و وجدان محسوس کرتا کہ ---- این جہانے دیگر است ! ان کی ادبی شخصیت طلوعِ صبح کی طرح میرے ذہن و فکر کے افق پر ابھرتی جا رہی تھی ۔"[1]

کسیر کلاں سے تقریباً دس میل دور ضلع بدایوں میں ایک قصبہ گنور ہے[2] ۔ وہاں بدایوں کی مشہور و معروف قادریہ خانقاہ کے سجادہ نشین مولانا عبدالقدیر بدایونی رہتے تھے ۔ کسیر کلاں کے بہت سے لوگ مولانا کی ظاہری وجاہت ، بزرگی اور تقریر کے دلکش انداز سے متاثر ہو کر ان کے مرید ہو گئے تھے ۔ چنانچہ عام فضا کے پیش نظر ماہر ابھی چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے کہ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے باقاعدہ مرید ہو گئے ۔[3] اور ارادت کا سلسلہ گہرا ہوتا چلا گیا ۔ ماہر لکھتے ہیں کہ " اس کے بعد میرا بدایوں آنا جانا رہا اور بعض دفعہ مولانا بدایونی کے یہاں مدرسۂ قادریہ میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو مہینہ قیام کی نوبت آ جاتی ۔ مولانا مرحوم تو سراپا لطف و کرم تھے ہی ، ان کے اعزا و متوسلین بھی بڑے احترام و محبت سے پیش آتے ۔"[4] اس کا اصل سبب ماہر کی

۱۔ ماہر القادری فاران ، مئی ۱۹۷۷ء ، ص ۲۷

۲۔ ضلع بلند شہر اور ضلع بدایوں کے درمیان گنگا ندی حدِّ فاصل ہے فاران اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۰

۳۔ فاران اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۲۹

۴۔ ایضاً ، ص ۳۵

شاعرانہ صلاحیتیں تھیں جن سے ساری خانقاہ متاثر تھی ۔[1]

ملازمت کے لئے تگ و دو
================

ماہر کا تعلق ایک متوسط سفید پوش خاندان سے تھا وہ لکھتے ہیں " ہمارے خاندان کی تاریخ امارت اور دولت کسی روایت سے خالی ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں امیر گھرانے میں پیدا نہیں ہوا " ۔[2] چنانچہ والد کی وفات کے بعد ماہر کی ناتجربہ کاری اور طبعی طور پر زراعت سے عدم دلچسپی کی وجہ سے مالی حالات اور بھی دگرگوں ہو گئے اور وہ اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ کہیں ملازمت مل جائے ۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے اپنے مرشد مولانا عبدالقدیر بدایونی سے سفارش کی درخواست کی[3] اور موصوف نے ماہر کو دلی میں سہ روزہ " الجمعیت " کے ایڈیٹر اور اپنے نہالی عزیز[4] سید ابو الاعلٰی مودودی سے ملوایا اور ملازمت کی سفارش کی ۔ سید مودودی " الجمعیت " کی ادارت سے سبکدوش ہو کر حیدر آباد دکن جانے کی تیاری کر رہے تھے ۔[5] ابو الاعلٰی مودودی ماہر کو اخبار کے ناظمِ اعلٰی مولانا احمد سعید دہلوی (صدر جمعیت العلمائے ہند) کے پاس لے گئے اور ان کے تعارف اور سفارش پر اور مضمون نویسی کا مختصر سا امتحان لینے کے بعد ماہر کو " الجمعیت " میں رپورٹر اور مضمون نگار کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا ، مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر یہ ملازمت ایک ماہ سے زیادہ نہ چل

۱۔ فاران اپریل ۶۷ء ص ۳۶

۲۔ ایضاً ، مئی ۱۹۸۳ء ، ص ۵۲

۳۔ ماہر القادری فاران اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۳۲

۴۔ ایضاً ، ص ۳۸

۵۔ مولانا مودودی ۱۵ مئی ۱۹۲۸ء کو اس منصب سے سبکدوش ہوئے ۔" تحریک اسلامی منزل بہ منزل " از لعل دین سلیم مطبوعہ فیروز آباد ، سن ن ص ۱۵

سکی اور وہ دلی سے واپس وطن آ گئے - [۱]

مولانا عبدالقدیر بدایونی کے تعلقات نظامِ دکن سے بہت خوشگوار تھے اور حکومتِ دکن کی طرف سے اُنہوں بھاری وظیفہ بھی ملتا تھا - چنانچہ مولانا موصوف کی سفارش سے ماہر کو ۱۹۲۹ء میں [۲] حیدر آباد کے محکمہ ڈاک خانہ جات میں کلرک کی ملازمت مل گئی اور جب کچھ ہی عرصہ کے بعد خود مفتی صاحب بھی دکن کی عدالتِ عالیہ میں مفتی بن کر آ گئے ، تو انہوں نے ماہر کی تقرری عدالت کے صیغۂ انتظامی میں کرا لی- [۳] انہوں نے اپنی رہائش بھی ملک پیٹ کے بجائے آرائشِ بلدہ کے ایک خوبصورت کوارٹر میں منتقل کر لی - یہیں ان کا تعارف اسمٰعیل احمد مینائی سے ہوا - جو امیر مینائی کے پوتے اور اسی محکمہ میں ملازم تھے - یہ تعارف گہری دوستی میں‌تبدیل ہو گیا اور اخیرعمر تک برقرار رہا - [۴]

اُس زمانے کا حیدر آباد

ماہر حیدر آباد دکن میں کم و بیش پندرہ برس تک مقیم رہے اور وہاں کی تمدّنی ، علمی اور ادبی فضا سے انہوں نے گہرا اثر قبول کیا ، اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس زمانے کے حیدر آباد پر ایک نظر ڈالتے چلیں -

حیدر آباد دکن کہنے کو جنوبی ہند کی ایک ریاست تھی جو دیگر بےشمار ہندوستانی ریاستوں کی طرح برطانیہ کی باجگزار اور مطیع و فرمانبردار تھی ، مگر دراصل یہ ریاست برطانوی استعمار کی غلام ہوتے ہوئے بھی اپنی مخصوص حیثیت اور امتیازی خصوصیات

۱- فاران فروری ۱۹۷۰ء ، ص ۳۱

۲- ایضاً ، مئی ۱۹۷۸ء ، ص ۲۳

۳- ایضاً ، اکتوبر ۱۹۷۶ء ، ص ۳۰

۴- ایضاً ، مئی ۱۹۸۳ء ، ص ۲۱

کی بِنا پر خاص انفرادیت کی حامل تھی - ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ نفوس پر مشتمل یہ ریاست چھیاسی ہزار مربع میل رقبے پر محیط تھی - یعنی انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبہ سے بھی زیادہ -[1] اس کا الگ سکہ ، الگ پرچم ، ڈاک خانہ اور ریلوے کا الگ نظام تھا اوردوسری ریاستوں کے مقابلے میں داخلی طور پر خاصی خود مختاری کی حامل تھی - یہی سبب ہے کہ ہر مکتبِ فکر کے مصنف اور دانشور حیدر آباد دکن کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں چنانچہ نواب مشتاق احمد خان[2] ہوں یا سیّد سبط حسن[3] ، بابائے اردو مولوی عبدالحق[4] ہوں یا پروفیسر حمید احمد خان[5] یا بدر شکیب[6] ہر ایک نے حیدر آباد دکن کی مرفہ الحالی ، معاشرتی امن و امان ، تمدنی یکرنگی ، انتظامی خوبیوں اور علمی و ادبی ترقیوں کی جی بھر کر تعریف کی ہے - وہاں کے پورے ماحول پر جس طرح مشرقیت بلکہ اسلامیت چھائی ہوئی تھی ، اردو کی جس طرح ہر شعبے میں سرپرستی اور قدر افزائی ہوئی ، جامعہ عثمانیہ کا جو عظیم کارنامہ معرضِ عمل میں آیا اور عوام کی ہمہ جہت ترقی کے ساتھ ساتھ اس ریاست نے ملک بھر کے دینی ، علمی اور رفاہی اداروں کی جس طرح بھر پور مدد کی اس کا ہلکا سا اندازہ ماہر کی اس تحریر سے کیا جا سکتا ہے -

" حیدر آباد کی سلطنتِ آصفیہ نے علوم و معارف کی سرپرستی اور آبیاری اور اہلِ کمال کی قدر شناسی میں قرطبہ اور غرناطہ کی یاد تازہ کر دی - جامعہ عثمانیہ بغداد کی شہرہ آفاق درسگاہ نظامیہ

۱- نواب مشتاق احمد خان ، " زوالِ حیدر آباد کی ان کہی داستان " فخر منزل ماڈل ٹاون ، لاہور جون ۱۹۸۶ء ، ص ۷

۲- ایضاً ، ص ۳۴ ، ۳۵

۳- " شہرِ نگاراں " از سبطِ حسن مکتبہ دانیال کراچی طبع دوم ۱۹۸۵ء ، ص ۳۹-۵۰

۴- سرگزشتِ جامعہ عثمانیہ مرتبہ بدر شکیب مطبوعہ کراچی سن - ن ، ص ۶۷ -۶۸

۵- " تعلیم و تہذیب " از حمید احمد خان - مجلسِ ترقی ادب ، لاہور ۱۹۷۵ء ، ص ۷ مضمون جامعہ عثمانیہ -

۶- حیدر آباد کا عروج و زوال از بدر شکیب مطبوعہ عثمانیہ اکیڈمی ، کراچی ۱۹۷۶ء ، ص ۱۷

کا نقشِ بدیع تھی ۔ آج کی طرح دل بُجھے ہوئے اور سہمے ہوئے
نہ تھے ۔ وہ بادشاہت یورپ کی نام نہاد جمہوریت اور عوامی (پرولتاری)
حکومت کے مقابلے مین رحمت تھی"۔ [۱]

حیدر آباد دکن مین علم و ادب کے شعبے مین جو بےمثال ترقی ہوئی اور جس کے نتیجے مین ہندوستان بھر کے اہلِ کمال وہان جمع ہو گئے ، اس کی تفصیلات مختلف کتابون مین نظر آتی ہین ۔ اس ضمن مین ریاست کے فاضل وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کے ہمہ پہلو کمالات اور علمی و شعری ذوق کے ساتھ ساتھ ذاتی محاسن کا ایک زمانہ معترف ہے ۔ [۲]

اس غیر معمولی علمی و ادبی فضا کا نتیجہ تھا کہ حیدر آباد کے معاشرے مین اعلیٰ اخلاقی و تہذیبی قدرون کو خصوصی فروغ حاصل ہوا ، چنانچہ ماہر صاحب بڑی وارفتگی اور محبت کے ساتھ جابجا حیدر آباد کو یاد کرتے ہین ۔

اس علمی ، ادبی اور معاشرتی فضا مین ماہر نے عملی اور علمی زندگی کا آغاز کیا ۔ مفتی عبدالقدیر بدایونی ہی کی وساطت سے ان کا تعارف مہاراجہ سرکشن پرشاد سے ہوا۔ [۳] اور مہاراجہ نے ان کی خصوصی قدر افزائی کرتے ہوئے انہین اپنے دربار سے وابستہ کر لیا اور ایک فرمان شاہی کے ذریعے انہین قید ملکی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ [۴]

۱- فاران مارچ ۱۹۷۳ء ، ص ۳۰

۲- ایضاً ،

۳- فاران اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۳۹

۴- ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ حیدر آباد مین "ملکی تحریک" نے زور پکڑا یعنی حیدر آباد دکن مین ملازمت کرنے کا حق صرف مقامی باشندون کو ہے ۔ یہ فتنہ اس شدت سے اٹھا کہ آغاز مین کچھ عرصے کے لئے نواب بہادر یار جنگ بھی اس کے نقیب بن گئے (ماہر القادری فاران اکتوبر ۱۹۶۱ء ، ص ۳۳)

ملازمت کے ساتھ ساتھ ماہر نے مطالعہ اور محنت کا سلسلہ جاری رکھا ۔ حیدر آباد میں آصفیہ لائبریری کے علاوہ متعدد دارالمطالعے بھی تھے اور گشتی کتب خانے بھی ۔ چنانچہ ان کے " مطالعہ کی کوئی حد و نہایت نہ رہی ۔ جو کتاب بھی مل گئی ، اسے پڑھ ڈالا "۔[1] اس طرح انہیں شاعری اور نثرنگاری کی مشق کے لئے خاطر خواہ فرصت میسر آئی " طبیعت شعر گوئی اور مضمون نگاری کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتی ۔ آورد اور انقباض کی شاذو نادر ہی نوبت آتی ۔ کسی رسالہ کے ایڈیٹر کا مضمون کے لئے خط آتا ، تو میں دوسرے ہی دن کوئی مضمون یا افسانہ لکھ کر بھیج دیتا "۔[2]

چنانچہ ماہر دکن کے علمی و شعری حلقوں میں بڑی تیزی سے ترقی اور مقبولیت کی منزلیں طے کرتے رہے اور یہی مقبولیت انہیں نواب بہادر یار جنگ کے قریب لے آئی ۔ اسمٰعیل مینائی کی روایت کے مطابق دونوں کی ملاقات مہاراجہ کشن پرشاد کے دولت کدے پر ہوئی[3] ، مگر مسعود جاوید کا خیال ہے کہ ماہر اتحاد المسلمین کے معتمدِ عمومی ابوالبیان خواجہ بہاء الدین کی وساطت سے نواب صاحب کے قریب آئے ۔ ماہر فارغ اوقات میں خواجہ صاحب کی کتابوں کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے جو حیدر آباد کے بازار پتھر گٹی میں واقع تھی۔[4] وقت کے ساتھ ساتھ یہ تعلق گہرا ہو تا چلا گیا ۔

انوار ظہوری کے بقول خداداد صلاحیتوں کی بنا پر نوجوانی کے باوجود ماہر کو بہت جلد صفِ اول کے شعرا میں شمار کیا جانے لگا چنانچہ سہ شبی مشاعروں میں وہ تیسری شب کے پڑھنے والوں میں ہوتے تھے ۔ ان مشاعروں میں پہلی رات مقامی و مبتدی شعراء کے لئے مخصوص ہوتی ۔ شبِ دیگر مقامی اساتذہ اور معروف شعرا کے لئے مختص ہوتی اور

۱۔ فاران جولائی ۱۹۷۶ء ، ص ۳۳
۲۔ فاران نومبر ۱۹۷۶ء ، ص ۲۹
۳۔ فاران مئی ۱۹۸۰ء ، ص ۵۵
۴۔ ماہنامہ سب رس کراچی اکتوبر ۱۹۸۸ء ، ص ۷

شبِ آخر میں برصغیر کے مہمان شعرا اور اساتذۂ ہند اپنا کلام سناتے تھے یہ اعزاز علم و ادب کی اس غیر معمولی فضا میں معمولی بات نہ تھی ۔ ماہر القادری کی طرح نوجوانی میں شاید ہی کسی اورشاعر کو دکن میں اتنی پذیرائی حاصل ہوئی ۔[1]

انوار ظہوری لکھتے ہیں کہ جلسہ گاہوں میں کاروائی کے آغاز میں تلاوت کے ساتھ ساتھ ماہر کی نظم مستقل روایت کی صورت اختیار کر گئی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ماہر لہجے میں رچاؤ ، فکر میں تازگی و شگفتگی ، فن میں ندرت اور آواز میں جادو اثر ترنّم رکھتے تھے ، وہ ڈوب کر پڑھتے ، آنکھیں بند کئے ، سامعین سے بےنیاز جیسے کسی گنبدِ بےدر میں ترنّم کے دائرے بُن رہے ہوں چنانچہ جتنی داد و تحسین وہ سمیٹتے وہ خال خال کسی کے حصے میں آتی تھی ۔[2]

روز نامہ " مدینہ " اور پندرہ روزہ " غنچہ " بجنور سے وابستگی
==

۱۹۳۳ء میں ماہر القادری حیدر آباد کی ملازمت ترک کرکے اچانک بجنور چلے گئے اور وہاں روز نامہ " مدینہ " کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے ۔ بچوں کے پندرہ روزہ رسالہ " غنچہ " کی ادارت بھی انہی کے حوالے کی گئی ۔ " حیدرآباد میں ماہر کو ہر طرح کی سہولت اور عزت حاصل تھی اور علمی و ادبی ماحول بھی میسر تھا ، مگر " ادب و صحافت سے وابستگی اور کام کرنے کا شوق ان تمام سہولتوں پرغالب آیا اور مجھے کشاں کشاں دکن سے بجنور لے گیا " ۔[3]

بجنور سے سہ روزہ " مدینہ " شائع ہوتا تھا ۔ جس کے مدیر مولانا نصراللہ خان عزیز

---

۱ ۔ ماخوذ انوار ظہوری کا غیر مطبوعہ طویل مضمون

۲ ۔ ایضاً

۳ ۔ ماہر القادری فاران ستمبر ۱۹۷۶ء ، ص ۳۵

اور مالک مولوی مجید حسن تھے - ۱۹۳۳ء میں " مدینہ " کو روزانہ اخبار کے طور پر شائع کرنے کا پروگرام بنا اور اس کے لئے نئے اسسٹنٹ ایڈیٹر منتخب کئے گئے جن میں ماہر بھی شامل تھے - تنخواہ پچاس روپے مقرر ہوئی - رہائش بلا معاوضہ فراہم کی گئی -

خبروں کے ترجمہ کے علاوہ مراسلات اور ادبی صفحہ ماہر سے متعلق کیا گیا - ماہر نے خوب محنت کی۔دس دس گھنٹے مسلسل کام کیا[۱] - مولانا نصراللہ خان عزیز نے بڑی شفقت اور محبت سے حوصلہ افزائی کی ، لیکن چونکہ بجنور چھوٹی لائن پر واقع تھا اور دلی سے خبریں کئی گھنٹوں کی تاخیر سے پہنچتی تھیں جو باسی ہو کر چھپتی تھیں ، اس لئے اخبار قارئین میں مقبول نہ ہو سکا اور چھ ہی ماہ بعد بند ہو گیا۔[۲] ماہر ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس دکن آ گئے - وہ " غنچہ " کے بھی ایڈیٹر تھے[۳] - " لیکن اصل پوسٹ ہی نہ رہی تو یہ ضمنی خدمت کس طرح برقرار رہ سکتی تھی"[۴] -

سفرِ عراق

" مدینہ " کی ملازمت سے فارغ ہو کر ماہر القادری بدایوں پہنچے - مفتی عبدالقدیر بدایونی وہیں تھے اور سفرِ عراق کی تیاری کر رہے تھے ، موصوف ہر سال ربیع الثانی میں بغداد جایا کرتے اور بڑی گیارھویں شریف کی تقریب وہیں کیا کرتے[۵] - اس مرتبہ انہوں نے ماہر کو بھی اپنے مصارف پر ساتھ لے لیا اور جناب طالب ہاشمی کی تحقیق کے مطابق[۶] اگست ۱۹۳۳ء میں یہ قافلہ بحری جہاز سے بمبئی سے کراچی اور وہاں سے بصرہ پہنچ گیا۔

۱- ماہر القادری فاران نومبر ۱۹۶۰ء ، ص ۲۸
۲- ایضاً فاران ستمبر ۱۹۷۶ء ، ص ۳۵ ، ۳۶ ، ۳۷
۳- شرف الدین احمد عظیم آبادی لکھتے ہیں " غنچہ کو غنچہ محض بچوں کا ایک معمولی رسالہ تھا ، مگر اس نے ان کی ذہنی نشو و نما میں جو کردار ادا کیا ، اس کی مثال پھر کبھی (ماہر القادری) نہ مل سکی (فاران مئی ۱۹۸۰ء ، ص ۳۷)-
۴- فاران جنوری ۱۹۶۷ ء ، ص ۵۵
۵- ایضاً ، اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۳۹
۶- سیاحت نامہ ماہر القادری مرتبہ طالب ہاشمی حسنات اکیڈمی لاہور ۱۹۸۷ء ، ص ۲۷۱

بمبئی مین فلسطین کے مفتیٔ اعظم سید امین الحسینی مقیم تھے اور وہ مفتی عبدالقدیر بدایونی سے ملنے آتے تھے ، اس طرح ماہر کو بھی اس مجاہدِ عظیم سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔

اس زمانے مین بغداد مین کشتیون کے پُل بنے ہوئے تھے ۔ مسلمان عورتین برقع پہنتی تھین ۔ مفتی صاحب کی معیت مین ماہر کو عراق کے فرمانروا شاہ غازی الاول سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور بغداد کے علاوہ انہون نے کربلا ، نجف ، کوفہ ، مسیب ، کاظمین اور ذوالکفل کی بھی زیارت کی ۔ مدائن مین طاقِ کسریٰ کو بھی دیکھا اور بابل کے آثار کی بھی سیاحت کی ۔[1]

دوبارہ دکن مین
=============

سفرِ عراق سے واپسی پر ماہر دوبارہ حیدر آباد دکن آ گئے اورعدالتِ عالیہ کے صیغہ انتظامی ہی سے وابستہ ہو گئے ۔ حسبِ سابق ان کی علمی و ادبی و شعری مصروفیات کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ ماہر مطالعہ و تحقیق کے رسیا تھے اور فارغ اوقات مین مختلف علماء اورمحققین سے استفادہ کرتے تھے ۔ اس سلسلے مین وہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی (متوفی ۱۹۸۹ء) اور مولانا محمود حسن ٹونکی صاحب معجم المصنفین کے ہان تقریباً روزانہ جاتے اور لُغت و معانی اور مختلف دینی مسائل کے سلسلے مین ان سے استفادہ کرتے۔[2] گاہے مفتی عبدالقدیر بدایونی کے مکان پر بھی محفلین جمتین جن مین متعدد شُعرا و ادباء شریک ہوتے ۔ ماہر شعر خوانی کے اعتبار سے سب مین ممتاز تھے ۔[3] ان کی مقبولیت کا

۱۔ ماہر القادری فاران نومبر ۱۹۷۶ء ، ص ۲۰

۲۔ ماہنامہ ساقی دہلی فروری ۱۹۳۲ء ،عراق کے دلچسپ حالات " از ماہر القادری ص ۲۰ تا ۳۰

۳۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی ، فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۵۸

۴۔ اسمٰعیل احمد مینائی فاران مئی ۱۹۸۲ء ، ص ۴۳ ، ۴۴

اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ھے کہ ریٹائرڈ سیشن جج مہدی علی صدیقی کے مطابق حیدر آباد دکن ھی نہیں بلکہ پورے جنوبی ھند میں شاید ھی کوئی ضلع اور شہر ھو گا جہاں مشاعروں میں ماھر کو نہ بلایا جاتا ھو۔[١]

اس شہرت کے باوصف وہ راست فکر اور صحیح العقیدہ مسلمان تھے اور نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ اُن سیاسی ، مِلّی اور دینی جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ھوتے جو حیدر آباد اور ھندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد ھوتے تھے[٢] ۔ یہ امر قابل ذکر ھے کہ اُسی زمانے میں مشہور کمونسٹ شاعر اور رہنما مخدوم محی الدین بھی حید آباد میں رھتے تھے اور اپنے محاذ پر خوب سرگرمِ عمل تھے ۔ انوار ظہوری کی روایت کے مطابق جب کبھی یہ دونوں حضرات کسی ایک مشاعرے میں یکجا ھو جاتے تو ماھر کی دینی غیرت خاموش نہ رھتی اور وہ مخدوم کی اور کمونزم کی خوب خبر لیتے ۔ بعض اوقات ناخوشگوار صورت حال بھی پیدا ھو جاتی[٣] ۔

اسمٰعیل احمد مینائی نے لکھا ھے کہ ماھر کو اہلِ علم اور خصوصاً دینی رہنماوں سے خاص تعلقِ خاطر تھا ۔ غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں اور وسیع مطالعے نے ان میں بےپناہ اعتماد پیدا کر دیا تھا ۔ اسی لئے دکن میں مہاراجہ سرکشن پرشاد کے علاوہ ماھر کے تعلقات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، مولانا مناظر احسن گیلانی ، مولوی عنایت اللہ ، جوش ملیح آبادی ، ھوش بلگرامی ، نظم طبا طبائی ، مرزا ھادی رسوا ، فانی بدایونی ، نواب بہادر یار جنگ ، نواب دوست محمد خان اور نواب فخار یار جنگ سے نہایت گہرے تھے۔ خصوصاً آخری دو حضرات کو چونکہ عمدہ کھانے کا بڑا شوق تھا اور عمدہ کھانا ماھر کی کمزوری تھی اس لئے ان سے موصوف کی گاڑھی چھنتی تھی ۔

١۔ فاران دسمبر ١٩٧٨ء ، ص ٢٣ ، ٢٤

٢۔ ایضاً ، ص ٢٧

٣۔ انوار ظہوری غیر مطبوعہ مضمون ۔

ماہر زیرِ عتاب

١٩٣٧ء میں ماہر کی ایک نظم " سلطانِ کائنات سے خطاب " روزنامہ "صبحِ دکن " میں شائع ہوئی جس کے نتیجے میں عتابِ شاہی ان پر نازل ہوا اور انہیں جلد از جلد دکن سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا ۔ مگر خوش قسمتی سے مہاراجہ سرکشن پرشاد ، نواب بہادر یار جنگ ، ہوش بلگرامی اور نواب نثار یار جنگ کی سفارش اور کوشش سے آزمائش کا یہ مرحلہ تین چار دن کے اندر اندر ختم ہو گیا ۔ نظامِ دکن عثمان علی خان نے انہیں طلب فرمایا ، ہلکی سی فہمائش کی پھر کوتوال بلدہ کے ہاں ان کی حاضری ہوئی اور ایک معذرت نامہ لکھنے کے بعد سرکار نظام کی طرف سے ان کے حق میں معافی نامہ جاری کر دیا گیا ۔ نظم میں بظاہر کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آتی ، مگر شخصی حکومتوں میں بےضرر باتوں پر سزا و تعزیر کوئی عجیب بات نہیں۔[1]

ماہر اور شہزادہ معظم جاہ کا دربار

ماہر حیدر آباد جاتے ہی مہاراجہ سرکشن پرشاد سے متعارف ہو گئے تھے اور مہاراجہ ان کی خصوصی قدر افزائی فرماتے تھے ۔ مگر ١٩٤٠ء کے لگ بھگ جب ماہر کو ملک گیر شہرت حاصل ہو گئی تھی ، نظام کے چھوٹے صاحبزادے شہزادہ معظم جاہ نے انہیں طلب کیا اور اپنے دربار سے منسلک ہونے کی خواہش ظاہر کی ۔ ماہر صاحب لکھتے ہیں کہ نواب معظم جاہ کے یہاں بلانے کے لئے پہلے دن شاہد صدیقی[2] آئے تھے اور ان کے ہمراہ آفتاب علی تھے جو معظم جاہ کے دربار کے خاص آدمی تھے[3] ۔ اس زمانے میں شہزادہ

---

١ - تفصیلات کے لئے دیکھئے فاران اپریل ١٩٦٧ء ، ص ٣١ ، ٣٢ ، ٣٣ اور " یاد رفتگان جلد دوم مرتبہ طالب ہاشمی البدر پبلیکیشنز لاہور ١٩٨٦ء، ص ١٠٢ ، ١٠٨ ۔

٢ - عبدالمتین شاہد صدیقی اکبر آبادی ، (١٩١١-٦٢ء) حیدر آباد کے نامور شاعر ۔

٣ - فاران ، اکتوبر ١٩٦٢ء ، ص ٣٣

معظم جاہ کے دربار سے فانی بدایونی اور صدق جائسی بھی منسلک تھے -[1] ظاہر ہے ایک بااختیار شہزادے کی خواہش کو ٹالا نہین جا سکتا تھا ، چنانچہ ماہر صاحب دربار سے منسلک ہو گئے ، مگر یہ تعلق تقریباً چھ ماہ تک ہی قائم رہ سکا -[2] اس انقطاع کا سبب کیا ہوا ؟ اس جانب ماہر نے کوئی اشارہ نہین کیا ، مگر جیسا کہ نواب مشتاق احمد[3] خان نے لکھا ہے کہ اگرچہ ماہر صاحب کو حیدر آباد دکن سے غائت درجے کی محبت تھی اور وہ وہان چودہ پندرہ سال مقیم رہے ، مگر وہان کے معاشرے کے چند پہلوؤن کو وہ پسند نہین کرتے تھے -[4] اور ان چند ناپسندیدہ پہلوؤن مین قرائن کہتے ہین ، کہ شہزادون کی دربار داری بھی تھی جس کی دلچسپ مگر عبرت ناک تفصیلات صدق جائسی[5] کی کتاب " دربار دربار[6] " مین نظر آتی ہین - یہ کتاب نواب معظم جاہ کے ایک درباری نے قلم بند کی ہے اور اپنے حافظے ، جزئیات نگاری اور حسنِ بیان سے اس ماحول کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے -

کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہزادہ پرلے درجے کا عیاش اور مُسرف مگر بخیل تھا - اسے پچیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی ، جسے وہ انواع و اقسام کے کھانون ، لباسون اور اربابِ نشاط پر اڑا دیتا تھا[7] ، مگر فانی بدایونی جیسا شاعر جو اس کا مصاحب تھا ، شدید مالی پریشانیون مین مبتلا رہا اور شہزادے نے اس کی کوئی مدد نہ کی -[8]

۱- دربارِ دُربار صدق جائسی ص ۳۱
۲- ماہنامہ فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۵۴
۳- دکن ریلوے کے آفیسر ، پاکستان مین آزاد دکن کے پہلے سفیر (پیدائش ۱۹۱۱) پاکستان مین مقیم ہین -
۴- فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۵۷
۵- نواب معظم جاہ کے ایک درباری شاعر -
۶- مطبوعہ حسامی بک ڈپو ، مچھلی کمان ، حیدر آباد دکن - ۱۹۶۱ء
۷- دربار دربار ، ص ۶۹ ، ۷۰
۸- ایضاً ، ص ۲۰۱

دربار مین خوشامد اور توہم پرستی کا چلن عام تھا ۔ پرنس کے دربار مین جس قماش کے لوگ جمع تھے ، اس کا اندازہ فانی کی اس رائے سے ھوتا ھے جس کا اظہار مشورے کرانداز مین انہون نے مصنف کے سامنے کیا تھا کہ اس دربار کے کسی آدمی کو کبھی بھولے سے اپنا دوست نہ سمجھنا ۔ یہ سب کے سب ناقابل اعتبار اور منافق ھین ۔ بہ ظاھر سب سے خلوص و محبت سے پیش آنا ، مگر دل مین سب سے ڈرنا[١] ۔

شاھی خاندان مین ایک آنکھ کے کھجانے یا مَلنے کو منحوس خیال کیا جاتا تھا ۔ اس لئے حُکمِ عام تھا کہ ایک آنکھ مین کھجلی ھو تو بیک وقت دونون آنکھین مَلی جائین ۔ ایک روز بد قسمتی سے ماھر القادری نے بھولے سے ایک آنکھ ملی تو شہزادہ نے بھرے دربار مین انہین ڈانٹ دیا[٢] ۔

چنانچہ صاف سمجھ مین آتا ھے کہ ماھر القادری کیون زیادہ دیر تک اس دربار سے منسلک نہ رہ سکے اور تھوڑے عرصے کے بعد ھی وھان سے بھاگ کھڑے ھوئے۔

ماھر القادری اور قائداعظم

گزشتہ صفحات مین یہ ذکر آ چکا ھے کہ مجلسِ اتحادُ المسلمین کے جلسون مین نواب بہادر یار جنگ کی تقریر سے پہلے ماھر کی نظم یا نعت لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور مسلم لیگ کے جلسون مین بھی یہی صورت ھوتی تھی ۔ پروفیسر محمد ایوب قادری کی روایت ھے کہ نواب صاحب نے ایک موقع پر قائداعظم سے کہا تھا کہ اس علاقے مین مسلم لیگ کی مقبولیت مین ماھر القادری کی نظم خوانی نے خاص کردار ادا کیا ھے[٣] ۔

١۔ دربار دربار ، ص ٥٣

٢۔ ایضاً ، ص ٢٠٧

٣۔ کاروانِ رفتہ ص ٢٢٣

چنانچہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ ایک تقریب مین جو نواب صاحب کے بنگلے پر منعقد ہوئی اور جس مین قائداعظم سمیت حیدر آباد کے تمام معروف اصحاب موجود تھے ، ماہر القادری نے " قائداعظم کا پیغام ملت کے نام " پڑھ کر سنائی - قائداعظم نظم ختم ہونے ہونے تک ماہر کے قریب کھڑے رہے -[1]

ماہر بمبئی مین
=============

علامہ انوار ظہوری نے لکھا ہے[2] کہ ماہر القادری نے دکن مین اپنی زندگی کے نہایت سنہرے دن گزارے اور اُن ایام کی یادین حرزِ جان بنائے رہے - چنانچہ قیامِ دکن کے تقریباً تمام عرصے مین شاید ہی کوئی قابلِ ذکر مشاعرہ ہو گا جس مین ماہر کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے ہون - مہاراجہ سرکشن پرشاد اور پرنس معظم جاہ کی مجلسی وابستگی کے باوجود وہ سارے حیدر آباد دکن اور جنوبی ہند کی ادبی و شعری محفلون کی جان بنے رہے اور جیساکہ ماہر نے خود لکھا ہے یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدر آباد دکن مین سیاسی اور مذہبی جلسون کا بڑا زور شور تھا - بہت کم جلسے ایسے ہوتے تھے جن کے پروگرام مین ان کی نظم شامل نہ ہوتی ہو - خصوصاً نواب بہادر یار جنگ کی تقریر سے قبل ان کی نظم یا نعت جُزوِ لازم بن گئی تھی - ماہر لکھتے ہین کہ "اِنہی جلسون کی بدولت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سے تعارف ہوا جو بعد مین باقاعدہ ربط و اخلاص مین تبدیل ہو گیا "-[3] چنانچہ انوار ظہوری لکھتے ہین کہ مسز سروجنی نائیڈو کی جانتاب

۱- فاران دسمبر ۱۹۶۷ء ، ص ۵۰

۲- غیر مطبوعہ مضمون ،

۳- فاران جولائی ، ۱۹۵۶ء ، ص ۳۱

12517

محفلین هون ، بہادر یار جنگ کی مجلسین ہون یا علمائے دین کی تقاریب ، ماہر ان مین ملاحِ روان کی حیثیت رکھتے تھے ۔

مگر اس ہر دلعزیزی ، شہرت اور عزت کے باوجود ماہر کا دل دکن سے اچاٹ ہو گیا ، اس کا سبب جہان ملوکیت کے جبر اور شہزادون اور جاگیردارون کی رعونت اور عیاشی مین تلاش کیا جا سکتا ہے ، وہان نواب بہادر یار جنگ کی ناگہانی وفات یا صحیح تر الفاظ مین ان کا قتل[1] ماہر کے لئے مہمیز بن گیا اور انہون نے دکن کو چھوڑنے کا مصمّم ارادہ کر لیا ۔ خود لکھتے ہین کہ نواب صاحب کی مرگِ بے ہنگام " کے بعد دِل اچاٹ سا ہو گیا "۔[2] اور وہ ۱۹۴۴ء مین دکن کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے ۔

اس انتقالِ مکانی کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ اسمٰعیل احمد میناٸی کے بقول " ماہر کے بیحد عزیز دوست نواب نثار یار جنگ بمبئی جاتے رہتے تھے ۔ وہ دو ایک بار ماہر کو بھی ساتھ لے گئے اور اپنے احباب سے تعارف کرایا جن مین صحافی ، شاعر اور روساء بھی تھے ۔ انہی مین جُدن[3] بائی کا نام بھی شامل ہے "۔[4]

اور اسی تعارت کے حوالے سے ۱۹۴۱ء مین پہلی بار " یومِ اکبر اعظم " پر جو وہان کے ہندو ، مسلمان ، عیسائی اور پارسی مل کر منعقد کرتے تھے ، ایک مشاعرے مین ماہر کو مدعو کیا گیا ۔[5] بمبئی مین انجمن مسلمانانِ پنجاب بھی ہر سال اہتمام سے " یومِ اقبال "

---

۱ ۔ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو صرف ۳۹ سال کی عمر مین ایک سازش کے تحت اس عظیم قائد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ (دیکھیئے حیات بہادر یار جنگ از غلام محمد بہادر یار اکادمی کراچی)۔

۲ ۔ فاران جولائی ۱۹۵۱ء ، ص ۳۴

۳ ۔ بمبئی کی مشہور مغنیہ ، معروف فلمی اداکارہ نرگس کی ماں ۔

۴ ۔ فاران ، جولائی ۱۹۸۱ء ، ص ۳۲ ، ۳۳

۵ ۔ ایضاً جولائی ۱۹۵۱ء ، ص ۳۸ ، ۳۹

مناتی تھی ، ماہر کو اس میں بھی باقاعدگی سے مدعو کیا جانے لگا ۔[1]

ان مشاعروں اور تقریبات کے حوالے سے بمبئی میں ماہر کا حلقۂ تعارف پھیلتا چلا گیا جس میں فلمی دنیا سے وابستہ مشہور شاعر نخشب جارچوی اور مجروح سلطان پوری بھی شامل تھے ۔ اسمٰعیل مینائی کا خیال ہے کہ انہی حضرات کے ایماء پر اور فلمی دنیا کی چکاچوند سے متاثر ہو کر ماہر فلموں کے لئے گانے لکھنے پر آمادہ ہوئے[2] اور سب سے پہلے انہوں نے مشہور فلم ڈائریکٹر محبوب کی فلم " تقدیر " کے لئے گانے قلم بند کئے جس کا غالباً انہیں اچھا خاصا مشاہرہ ملا۔

ماہر کے دوستوں نے انہیں مستقل طور پر بمبئی منتقل ہونے پر آمادہ کر لیا اور چونکہ بقول نواب مشتاق احمد خان وہ حیدر آباد دکن کے معاشرے کے چند پہلوؤں کو پسند نہیں کرتے تھے[3] اور نواب بہادر یار جنگ کی شہادت کے بعد وہاں کے ماحول سے بددل ہو چلے تھے ، اور بمبئی میں انہیں مالی یافت کے امکانات روشن نظر آ رہے تھے ، اس لئے انہوں نے ایک روز بوریا بستر باندھا اور کسی دوست کو بتائے بغیر چپکے سے بمبئی چلے گئے ۔ یہ واقعہ ۱۹۴۴ء کے اواخر کا ہے ۔

بمبئی میں ان دنوں ہندوستان بھر کے نامور شعراء و ادباء جمع تھے ۔ جن میں ساغر نظامی ، خمار بارہ بنکوی ، شکیل بدایونی ، علی سردار جعفری ، کیفی اعظمی ، ساحر لدھیانوی ، مجروح سلطان پوری ، ذوالفقار بخاری اور محشر اصر وھوی وغیرہ شامل تھے ۔ ماہر نے سب سے ربط ضبط پیدا کیا ، لیکن چونکہ متذکرہ شعراء کی اکثریت

۱۔ فاران جولائی ۱۹۶۹ء ، ص ۵۷

۲۔ فاران مئی ، ۱۹۸۴ء ، ص ۳۵

۳۔ ایضاً دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۵۷

کمونسٹوں پر مشتمل تھی اور یہ لوگ مذہب اور اخلاق کے خلاف باقاعدہ سرگرمِ عمل تھے ، اس لئے ماہر کی ان سے بن نہ سکی اور انہیں لنگر لنگوٹ کس کر ان کے مقابلے مین صف آرا ہونا پڑا ۔ اس کی تفصیل آگے چل کر ایک الگ باب مین آئے گی ۔

بمبئی مین ماہر نے بھرپور زندگی گزاری ۔ کئی فلمون کے لئے کہانیان اور گیت لکھے جن مین فلم " جیون " اور " زینت " کے گانون نے بڑی مقبولیت حاصل کی ۔[۱] اس شعبے مین ان کی کامیابی کا اس امر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ماہوار آمدنی تقریباً تین ہزار روپے تھی ۔[۲] مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ عطیہ فیضی جیسی خاتون ان کے اعزاز مین تقریبات منعقد کرتی تھین جس مین بمبئی کے اونچے طبقے کے معروف لوگ شامل ہوتے تھے ۔[۳]

جیساکہ اوپر ذکر آ چکا ہے ماہر کا تعارف بمبئی کی مشہور مُغنیہ جُدن بائی سے بھی ہو چکا تھا ، نرگس جُدن بائی کی نو عمر بیٹی تھی جس نے آگے جا کر فلمی دنیا مین خاصا نام پیدا کیا ۔ جدن بائی ماہر کی شعری صلاحیتون ، ذاتی خوبیون اور شخصی وجاہت[۴] سے بڑی متاثر تھی ۔ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی " اُس بازار " کی آلائشون سے بچ کر پاکیزہ زندگی گزارے اور ماہر سے اس کی شادی ہو جائے ۔[۵] چنانچہ جُدن بائی کی غیر معمولی توجہ اور خود نرگس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی سے ماہر گھبرا گئے ۔ وہ صاحبِ علم اور بیدار مغز انسان تھے اور دینی تقاضون سے آگاہ تھے ۔ ان کے کردار کا یہ عالم تھا کہ جُدن بائی کی محفلون

۱۔ ماہر القادری انٹرویو ، ماہنامہ " سیارہ " لاہور نومبر ۱۹۶۳ء ، ص ۲۴

۲۔ ایضاً ۔

۳۔ فاران مارچ ۱۹۶۷ء ، ص ۴۷

۴۔ فانی بدایونی انہین ماہ رُو کہا کرتے تھے (فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۲۶) باقی احمد پوری لکھتے ہین کہ ماہر جوانی مین بہت خوبرو تھے (فاران مئی ۱۹۸۲ء ، ص ۹۰)

۵۔ اسمٰعیل مینائی/ فاران ستمبر ۱۹۸۱ء ، ص ۲۷

مین بقول انوار ظہوری اکیلے وہ شاعر تھے جو شراب کے قریب تک نہ پھٹکتے تھے ورنہ اکثر شعرا وہاں صرف پینے کے لئے جاتے تھے - ان کی طبیعت فلمی ماحول سے بھی بیزار ہو چلی تھی اور وہ اسے ترک کرنے کے لئے پر تول رہے تھے[1] - چنانچہ جب نرگس کے حوالے سے اِدھر اُدھر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں ، تو ماہر نے ساری شہرت اور غیر معمولی مالی فوائد پر لات مار کر بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا - اس سلسلے مین اسمٰعیل میناٸی اور نواب نثار یار جنگ سے بھی مشورے ہوئے اور ماہر نے مولانا سید ابو الاعلٰی مودودی سے بھی مراسلت کی[2] - اور آخرکار یکسو ہو کر انہون نے بمبئی کی بہارون اور رنگینیون سے کنارہ کشی اختیار کر لی - حیدر آباد گئے اور وہان ایک روز ٹھہر کر کمیر کلان ہوتے ہوئے دہلی چلے گئے - جہان سے وہ ایک ماہانہ علمی و ادبی رسالہ کا اجرا کرنا چاہتے تھے - بمبئی مین ان کا قیام ایک ڈیڑھ سال پر محیط تھا - ۱۹۳٦ء ، کے تقریباً وسط مین وہ دہلی مین تھے -

---

۱- ماہر ایک جگہ لکھتے ہین " اس لائن مین کوئی شک نہین حُسن برستا ہے - روپیہ پیسہ کی بڑی ریل پیل رہتی ہے اور ہر طرح کا لطف اور عیش میسر آتا ہے ، لیکن اخلاقی اعتبار سے آدمی گھاٹے مین رہتا ہے اور شاعر کی شعریت اور ادیب کی ادبیت کو بڑا نقصان پہنچتا ہے (فاران نومبر ۱۹٦۲ء ، ص ۳۲) ماہر نے ایک مرتبہ علامہ سیماب اکبر آبادی کو مشورہ دیتے ہوئے بھی کہا تھا کہ " فلمی لائن سے تعلق آپ کو زیب نہین - مین خود اس لغویت مین مبتلا رہ چکا ہون اور اس حماقت پر آج تک متاسف ہون " (فاران اپریل ۱۹۵۱ء ، ص ۲۳)

۲- نعیم صدیقی لکھتے ہین کہ اس زمانے مین ماہر نے مشورے کے لئے مولانا مودودی کو ایک خط (پٹھان کوٹ) لکھا تھا جس مین اس شعبے سے بیزاری کا اظہار کیا تھا اور یہ کہ ان کی آمدنی کم از کم دو ہزار روپے ماہانہ ہے (نعیم صدیقی دسمبر ۱۹٧۸ء ، ص ۳۰۵)

قیام دھلی اور ھجرت

جیساکہ اسمٰعیل احمد مینائی کی روایت ھے ، ماھر صاحب کے بےحد عزیز دوست نواب نثار یار جنگ کا اصرار تھا کہ ماھر بمبئی سے واپس حیدر آباد آ جائیں ، مگر ماھر اب اعلٰی معیار کا علمی و ادبی رسالہ نکالنا چاھتے تھے ۔ دکن کی حکومتِ آصفیہ سے ڈیکلریشن کی توقع بھی نہین تھی اور اُس بے باکی اور آزادیٔ اظہار کی بھی وھان گنجائش نہ تھی ، جس کا تقاضا ایک علمی رسالہ کرتا ھے ۔ مینائی صاحب ماھر کے ھم خیال تھے کہ حیدر آباد مین لاکھ آسانیاں سہی ، مگر پھر بھی ریاستی فضا ایسی تھی کہ وھان ایک آزاد رسالہ نہین پنپ سکتا تھا ۔ اس مقصد کے لئے ماھر دھلی کی فضا کو مناسب سمجھتے تھے ، چنانچہ ماھر بمبئی سے حیدر آباد آئے ، مگر احباب سے بحث و تکرار کی الجھن سے بچنے کے لئے وہ یہان ایک رات قیام کرکے کسیر کلان چلے گئے اور وھان سے دھلی منتقل ھو گئے ۔

ماھنامے کے سلسلے مین اُس وقت اُن کے ذھن مین دو نام تھے " منزل " اور " فاران " ۔ وہ خود " منزل " پسند کرتے تھے ، جبکہ نواب نثار یار جنگ " فاران " کو ترجیح دیتے تھے ۔ چنانچہ ماھر نے نواب صاحب کی رضاجوئی اور خوشی کی خاطر رسالے کے لئے یہی نام منتخب کر لیا اور ڈیکلریشن حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی ۔ مگر ابھی اس کی مبادیات کی تکمیل بھی نہ ھونے پائی تھی کہ پاکستان کی جدوجہد فیصلہ کن مرحلے مین داخل ھو گئی اور اُنہین دھلی کوخیر باد کہنا پڑا ۔[۱]

دلی کی سبزی منڈی کا علاقہ بہت وسیع ھے ۔ اسکے ایک محلہ کا نام شورہ کوٹھی ھے ۔ ماھر صاحب نے اسی محلے مین اپنے ھم زلف کے ساتھ " ایک معمولی درجہ کے چھوٹے

---

۱ ۔ فاران ستمبر ۱۹۸۱ء ، ص ۲۷ ، ۲۸

سے مکان * مین رہائش اختیار کی [1] - جبکہ مستقل رہائش کے لئے شورہ کوٹھی سے آدھ میل کے فاصلے پر ہر لاہل کے قریب انہون نے ایک ادھ بنا مکان خرید لیا [2] اور اسے مکمل کرنے مین قلم اور مشاعرون کی آمدنی کسی ساری جمع پونجی لگا دی - مگر مکان بن کر تیار ہو رہا تھا کہ تقسیمِ ھند نے قیامت برپا کردی اور اس مکان مین رھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا نصیب نہ ہو سکا - بلوائیون نے اسے جلا کر راکھ کر دیا [3] -

دلی مین ماہر ۱۹۳۶ء کے تقریباً وسط مین آئے اور یہان ان کا ایک برس کا قیام مکان بنوانے ، رسالے کے اجراء کی تیاری کرنے اور مشاعرے پڑھنے مین صرف ہوا - ان کے نہایت عزیز دوست نخشب جارچوی بھی بمبئی سے دلی آ گئے تھے اور صابر دہلوی سے بھی ان کا تعلق گہرا ہو گیا تھا ، چنانچہ ماہر کا بیشتر وقت ان حضرات کے ساتھ گزرتا تھا [4] - خصوصاً شام جامع مسجد کی سیڑھیون پر ، اردو بازار اور ایڈورڈ پارک مین گزرتی تھی - جامع مسجد کے سامنے اردو بازار مین معروف عالمِ دین مفتی کفایت اللہ مرحوم کے داماد مولوی سمیع اللہ کی کتابون کی دکان تھی جو " کتب خانہ عزیزیہ " کے نام سے مشہور تھی - یہان اہلِ علم ، اربابِ قلم اور شاعرون کی بیٹھک رہتی تھی - دن مین ماہر کا بیشتر وقت یہین گزرتا تھا [5] -

فسادات ، ھجرت

===========

تقسیمِ ھند کے بعد ماہر القادری کن حالات سے دوچار ہوئے - اس کی روداد

۱- فاران اکتوبر ۱۹۶۷ء ، ص ۳۵

۲- ایضاً جون ۱۹۶۷ء ، ص ۳۵

۳- ایضاً اکتوبر ۱۹۶۷ء ، ص ۳۵

۴- ایضاً ، دسمبر ۱۹۶۸ء ، ص ۲۸

۵- ایضاً ، نومبر ۱۹۶۹ء ، ص ۵۳

انہون نے خود قلم بند کی ہے - اِس کے مطابق دلی مین خون ریز ہنگامون کے آغاز سے بارہ دن پہلے ٢٦ اگست کو وہ ایک خانگی ضرورت سے کمیرکلان چلے گئے جہان مسلمان آبادی مین سخت خوف و ہراس تھا - ایک قریبی ریلوے سٹیشن خورجہ پر مسلمان مسافر ٹرین مین قتل کئے جا چکے تھےاور خبرین گرم تھین کہ ہندو اور سکھ ١٢ ستمبر کو کمیر کلان پر حملہ آور ہون گے -

گاوٴن مین عورتون ، بچون اور بڑے بوڑھون سمیت مسلمانون کی آبادی تقریباً بارہ سو نفوس پر مشتمل تھی جن مین جوان اور ادھیڑ عمر افراد کی تعداد پانچ سو سے زائد نہ تھی ماہر نے اُنہین منظم کیا ، مدافعت کے لئے دیسی ساخت کی بندوقین اور چھوٹی توپین بنائی گئین اور پہرہ بندی کا انتظام کیا گیا - ١٢ ستمبر کو تقریباً ٣٠ ہزار ہندوون اور سکھون نے کمیرکلان پر حملہ کر دیا - گاوٴن کے مسلمانون نے مدافعت کے لئے پانچ مقامات پر محاذ قائم کئے اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جس کے نتیجے مین بےشمار حملہ آور مارے گئے جبکہ صرف پانچ مسلمان شہید ہوئے - دشمن ٹھٹک گیا اور اسے گاوٴن کے قریب آنے کی جرات نہ ہوئی تاہم گاوٴن کا محاصرہ تین ہفتے تک جاری رہا[1] - اس دوران مین ماہر نے سارے محاذون کی نگرانی کی ، پہریدارون کی ڈیوٹیان لگاتے رہے اور تقریرون اور گفتگوون کے ذریعے لوگون کی ہمتین بڑھاتے رہے[2] -

تین ہفتے کے بعد گاوٴن مین ملٹری آ گئی۔ منظم قتل و غارت کا خطرہ ٹل گیا اور مسلمان ایک اسپیشل ٹرین کےذریعے پاکستان آ گئے - ماہر بھی اسی ٹرین مین تھے[3] - وہ

١- اخراج اسلام از ہند مرتبہ مرتضٰے احمد خان ، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور ١٩٤٨ء ، ص ٥٨٣ تا ٦٠٠ -

٢- فاران دسمبر ١٩٧٨ء ، ص ٥٤

٣- فسادات کے حوالے سے ایک مرتبہ ماہر کے ہلاک ہونے کی افواہ اڑ گئی تھی اور اخبارات مین شائع بھی ہو گئی (فاران اکتوبر ١٩٧٧ء ، ص ٣٠)

پہلے لاہور پہنچے - یہاں چند روز ٹھہرے - پھر تھوڑا عرصہ ملتان میں قیام کیا [1]
اور وہاں سے کراچی چلے گئے - اُن دنوں میاں محمد شفیع [2] ملتان میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ
مجسٹریٹ تھے ان کی توجہ اور کوشش سے ایک متروکہ فلور مل صابر دہلوی، ماہر القادری
اور خواجہ محمد شفیع کو مشترکہ طور پر الاٹ کر دی گئی چنانچہ ماہر کراچی سے ملتان منتقل ہو گئے مگر یہاں ان کا جی نہ لگا / اور وہ چند ہی
ماہ بعد واپس کراچی چلے گئے - [3] جہاں انہوں نے عمر عزیز کے بقیہ تیس برس گزار
دیئے -

ماہر کراچی میں
===============

کراچی آنے کے فوراً بعد ماہر القادری نے کچھ عرصہ تک جیکب لائن بیرکس میں
اقامت اختیار کی - [4] پھر بنک آف انڈیا کے قریب کیمبل اسٹریٹ میں ایک دو منزلہ فلیٹ
انہیں الاٹ ہو گیا - [5] اور وہ فاران کے اجراء یعنی ۱۹۴۹ء کے آغاز تک وہیں مقیم رہے
جب اس فلیٹ کو انہوں نے " فاران " کے دفتر میں تبدیل کر لیا تو وہ پلازہ کوارٹرز میں،
سعید منزل سے ذرا آگے، رحمت مینشن کی چوتھی منزل کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے -
اس فلیٹ کی اسّی ۸۰ سے کم کیا سیڑھیاں ہوں گی - [6]
جیساکہ رئیس امروہوی نے لکھا ہے " کراچی ہند کے پانچ سو شہروں کا بدل
ہے " [7] تقسیم کے بعد یہاں برصغیر کے کونے کونے سے ہر شعبۂ فن کے بےشمار اہل کمال

۱- وہاں ان کے دوست صابر دہلوی مقیم ہو گئے تھے - (فاران فروری ۱۹۶۷ء ، ص ۳۰)
۲- ایک نیک نام، دیندار افسر، محقق اور مصنف، بعد میں کمشنر کے عہدے تک پہنچے -
۳- فاران فروری ۱۹۶۷ء، ص ۳۰
۴- ڈاکٹر وفا راشدی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۷۷
۵- سید عبدالرشید فاضل فاران مئی ۱۹۸۲ء ، ص ۱۸
۶- اقبال احمد صدیقی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۹
۷- رئیس امروہی ایضاً ، ص ۲۹۸

کھنچ کر آ گئے اور ادب و شعر کے حوالے سے کراچی واقعتاً صد رنگ پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ بن گیا جس نے علمی دنیا کو ایک نئی بہار سے روشناس کیا ۔ ماہر کو تو گویا یہاں ایک نیا حیدر آباد مل گیا ۔ مزید خوش قسمتی یہ ہوئی کہ موصوف کا تعارف جلد ہی مولانا ظفر احمد انصاری سے ہو گیا اور مولانا انصاری ہی کی وساطت سے ماہر کراچی اور پاکستان کے تمام مشہور و معروف علماء ، فقہا ، اور قائدین سے متعارف ہوئے ۔ مولانا مفتی محمد شفیع ، مولانا محمد یوسف بنوری ، مولانا ظفر احمد عثمانی ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی ، مولانا عبدالرشید نعمانی ، مولانا منتخب الحق برکاتی ، مفتی ولی حسن ٹونکی ، مولانا طحہ اور مولانا طاسین جیسے اہلِ علم و اہلِ دل حضرات کے ساتھ میل ملاقات اور نشست و برخاست نے ماہر کے مطالعۂ علومِ جدید و قدیم اور ذوق و شوقِ کتبِ تاریخ و حدیث اور فقہِ اسلامی کو جلا بخشی اور جلد ہی اپنی محنت اور لگن، اپنے ذوقِ تحقیق و تجسس اور اپنی کوشش و کاوش کی بدولت وہ پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں مولانا ماہر القادری کے نام سے یاد اور مخاطب کئے جانے لگے ۔[1] یہ امر خاصا دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ جب ماہر کراچی منتقل ہوئے ہیں ، تو ان کی عمر ۴۲ سال تھی ، مگر طلبِ علم کا اب بھی ذوقِ فراوان رکھتے تھے چنانچہ خود لکھتے ہیں :

" مولانا ظفر احمد انصاری کا مکان مختلف ملاقاتوں کا سنگم تھا علامہ خلیل عرب[2] مرحوم سے عربی تعلیم کا سلسلہ بھی انصاری صاحب کے یہاں شروع ہوا ۔ اسمٰعیل احمد مینائی صاحب اس درس میں اپنی مصروفیتوں کے سبب دو ڈھائی مہینے سے زیادہ ساتھ نہ دے سکے ۔ حسن ریاض مرحوم چھ ماہ تک پابندی کے ساتھ درس میں

۱- اسمٰعیل احمد مینائی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۰۲

۲- عربی ادب کے ایک مستند عالم متوفی ۱۹۷۷ء

شریک ہوتے رہے ، پھر ناغہ ہونے لگا - یہاں تک کہ پھر جناب انصاری اور راقم الحروف ہی ہم سبق رہ گئے"۔[1]

فاران کا اجراء

کراچی میں آنے کے فوراً بعد ماہر صاحب اس دیرینہ آرزو کی تکمیل میں مصروف ہو گئے جس کے لئے انہوں نے دلی کو مسکن بنایا تھا - یعنی وہ معیاری علمی ، ادبی اور دینی رسالہ کا اجراء کرنا چاہتے تھے - جیساکہ پہلے وضاحت ہوچکی ہے ، اس کا نام تک وہ متعین کر چکے تھے - چنانچہ انہوں نے " فاران " کے اجرا کی کوششیں شروع کر دیں اور اپریل ۱۹۴۹ء میں اس کا پہلا شمارہ منصۂ شہود پر آگیا - دفتر اس کا کراچی کے معروف کاروباری مرکز کیمبل اسٹریٹ میں بنایا گیا -

ماہر القادری فاران کے مالک ، مدیر اور منتظم یعنی سب کچھ خود ہی تھے - کوئی کلرک یا معمولی ملازم تک نہیں رکھا گیا تھا - شاید آغاز میں وہ اس کی استطاعت بھی نہیں رکھتے تھے - چنانچہ مہدی علی صدیقی لکھتے ہیں کہ " فاران کے اجراء کے آغاز میں مولانا ماہر خود ہی فاران کا بنڈل لے کر سٹی پوسٹ آفس لے جایا کرتے تھے -[2] تاہم ان کے چھوٹے بھائی مسرور حسین نے بہت جلد انتظامی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور بڑی تندہی اور جانفشانی سے ماہر کے ساتھ تعاون کیا - ماہر نے بھائی کے اس ایثار اور معاونت کا بار بار احساسِ تشکّر کے ساتھ ذکر کیا ہے -

ماہر صاحب ایک کامیاب مدیر ثابت ہوئے - ان کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت

۱- ماہر القادری فاران دسمبر ۱۹۷۲ء ، ص ۴۷

۲- مہدی علی صدیقی فاران ، دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۵

اور کیا ہو سکتا ہے کہ انتیس[29] سال تک " فاران " نہایت پابندی اور باقاعدگی سے چھپتا رہا اور اس طویل مدت میں ایک شمارہ کا بھی ناغہ نہیں ہوا[1] ۔ اور اجراء کے بعد بہت تھوڑے عرصے میں " فاران " اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا ۔ اسے معقول اشتہارات ملنے لگے اور ماہر کی نظم و نثر پر مشتمل سیاسی ، مذہبی اور معاشرتی تحریروں قارئین کا حلقہ بڑھاتی چلی گئیں ۔ اپنے دو ٹوک ، واضح اور جرات مندانہ موقف کی بنا پر انہوں نے ملک کے علمی اور نظریاتی جرائد میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا چنانچہ اپنی اسی مقبولیت کی بنا پر" فاران" عام علمی رسالوں کے برعکس خسارے کا کاروبار نہ رہا اور اپنی اور اپنے مالک کی بخوبی کفالت کرنے لگا[2] ۔

حلقہ ادب اسلامی کا قیام

پاکستان بنتے ہی کمیونسٹوں نےعالمی اشتراکی تحریک کی ہدایات کے مطابق اس نوزائیدہ مسلمان ملک میں اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں ۔ سیاست ، تعلیم اور محنت کے محاذ پر انہوں نے بھرپور انداز میں اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا اور آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے سکہ بند ارکان اور قائدین مثلاً ڈاکٹر اشرف ، سجاد ظہیر ، مرزا ابراہیم ، ایرک سپرین ، سی ۔ آر۔اسلم ، طفیل عباس ، اور ان کے بےشمار ہم مسلک لوگ میدانِ عمل میں کود پڑے تھے ۔ خصوصاً انجمن ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے شعرا و ادباء اور صحافیوں کی پوری ایک کھیپ اشتراکی نظریات کے فروغ اور اشاعت کے لئے سرگرمِ عمل ہو گئی۔

ماہر القادری اس طبقے کے عزائم سے بخوبی آگاہ تھے وہ حیدر آباد دکن سے ان

۱۔ وارث سرہندی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۵۷ ، فاران کی باقاعدگی کا ماہر صاحب کو اتنا خیال رہتا کہ اگر کہیں لمبے سفر پر جانا پڑتا ، تو فاران کے ایک دو شمارے پیشگی مرتب کرکے دے جاتے تاکہ ان کی غیر حاضری میں پرچہ وقت پر چھپ سکے ۔

۲۔ ایضاً

لوگون کا تعاقب کر رہے تھے اور بمبئی کے قیام کے دوران مین یہ تصادم تیز تر ہو گیا تھا ۔ بدقسمتی سے جفاوری کمیونسٹ ادیبون اور شاعرون کی بہت بڑی تعداد پاکستان منتقل ہو گئی اور ملک کے متنوع مسائل اور سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی روایت اور طریقِ کار کے مطابق شعر و افسانہ اور ادب و صحافت کے حوالے سے اپنے نظریات کی اشاعت کرنے لگے ۔۔ ماہر القادری نے اس صورت حال کو تشویش کی نظرون سے دیکھا اور جہان " فاران " کو کمیونسٹون کے عزائم کے توڑ کے لئے وقف کیا وہان کراچی منتقل ہونے کرجلد بعد ہی انہون نے اپنے ہم خیال احبابکے تعاون سے "حلقۂ ادبِ اسلامی " کا اجرا کر دیا [1] جس کا مقصد ادب و شعر کے حوالے سے اسلامی اقدار کی ترویج و اشاعت اور دینی قدرون کا احیا تھا ۔ چنانچہ یعقوب خان روڈ پر / راجہ مینشن کے بالمقابل ایک فلیٹ کے ایک کمرے مین " حلقۂ ادبِ اسلامی " کا دفتر بنایا گیا اور یہین ہفتہ وار اجتماعات شروع ہوئے ۔ جوہر اتوار کو تین بجے دوپہر سے نمازِ مغرب تک منعقد ہوتے تھے ۔ اِسی فلیٹ مین سید اسعد گیلانی کے ماہنامہ " جہانِ نو " کا دفتر تھا ۔

ان اجلاسون مین جو لوگ پابندی سے شریک ہوتے تھے ان مین ماہر صاحب کے علاوہ محمود فاروقی، سید اسعد گیلانی، حمید اللہ صدیقی ، حسّان کلیمی ، مسعود جاوید ، ابو الخطیب ، صبر دہلوی ، قیصر قمری ، عبدالکریم عابد ، ضیاء الاسلام انصاری، احمد اسحاق ، حسن محمود عروج ، شمیم جاوید ، زاہد حسین صدیقی ، شہزاد نبی خان، رشید احمد گیلانی ، انعام الحق اخوان ، عماد الحق صدیقی ، اعظم ادیب ، منظر حسین اور نور العین کے نام قابل ذکر ہین ۔ اجلاس کی صدارت عموماً ماہر صاحب کرتے ۔ شاعر یا ادیب غزل ، نظم یا نثر پارہ پڑھتا، شرکاء حضرات اس پر تنقید کرتے اور بحث مین حصہ

۱۔ اسعد گیلانی فاران ، دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۶

لیتے ـ صدرِ مجلس کی حیثیت سے ماہر صاحب ہر ادب پارے پر بعد میں اظہارِ خیال کرتے، وہ زبان کی صحت پر خصوصی زور دیتے ـ زاہد حسین صدیقی[1] نے بتایا کہ وہ کلاسیکل ادب کے بڑے مداح تھے ـ کوئی انگریزی کی رومانوی تحریک کے حوالے سے بات کرتا، تو ماہر صاحب اسے پسند نہ کرتے اور کہا کرتے کہ اردو میں بھی اس نوعیت کی مثالیں موجود ہیں اور نسبتاً زیادہ صحت مند ہیں ـ

حلقۂ ادبِ اسلامی کی شاخیں پاکستان بھر میں قائم کی گئیں ـ اور اس ادارے نے ملک بھر کے اسلامی فکر و نظر کے حامل ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونے کا موقع فراہم کیا ـ بےشمار نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان کی تحریروں میں مثبت نوعیت کی مقصدیت اور پاکیزگی پیدا ہوئی ـ حقیقت یہ ہے کہ حلقۂ ادبِ اسلامی نے ترقی پسندوں کی زہرناکیوں کے تدارک میں اہم رول ادا کیا ـ

۱۹۵۶ء میں آل پاکستان حلقۂ ادبِ اسلامی کا انتخاب ہوا ـ ماہر القادری صدر اور عماد الحق سیکرٹری منتخب ہوئے ـ

ایوب خان کے مارشل لاء تک یہ حلقہ کامیابی سے اپنے عزائم کی طرف بڑھتا رہا، مگر اشتراکیت نواز بیورو کریسی نے ایسی رکاوٹیں کھڑی کیں کہ اس کی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں ـ

دیگر مصروفیات
===============

" فاران " کی ادارت کے ساتھ ساتھ ماہر صاحب نے مشاعروں میں غزل خوانی کا پرانا شغل جاری رکھا اور ملک بھر میں جہاں سے بھی انہیں دعوت نامہ آتا، وہ مشاعرے میں شرکت کرتے اور چونکہ وہ پیشگی معاوضہ لے کر مشاعروں میں جاتے تھے، اس لئے یہ مشاعرے

۱ـ ملاقات ناظم آباد، کراچی، ۱۰ اگست ۱۹۸۶ء

سیرو سیاحت کے علاوہ ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھے ۔ چنانچہ قیام پاکستان کی تلخیاں کم ہوئیں اور مشاعروں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا ، تو ماہر صاحب ۱۹۵۰ء میں لاھور اور ڈھاکہ کے ملک گیر مشاعروں میں شامل ہوئے جبکہ ۱۹۵۲ء میں حیدر آباد کے عظیم الشان مشاعرے میں بھی شرکت کی ۔ دیگر چھوٹے بڑے مقامات اس کے علاوہ تھے ۔

پہلا سفرِ حج
============

دینِ اسلام سے گہری محبت ماہر القادری کی گھٹی میں پڑی تھی جسے ان کی سلامتِ طبع اور کثرتِ مطالعہ نے بڑا ہی مثبت رنگ عطا کر دیا تھا ۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں :-

" خدا شاہد ہے اور میری آشفتہ مزاجیاں اس کی گواہ ہیں ۔ کہ زندگی ہر طرح کے مرحلوں سے گزری ، مگر کسی عالم میں بھی دل مکہ اور مدینہ کی یاد سے خالی نہیں رہا ۔"[1]

اور اِسی اشتیاق اور تڑپ نے ماہر کو ۱۹۵۴ء میں سفرِ حج پر ابھارا اور وہ اپنی اہلیہ اور ان کی بڑی بہن کی معیّت میں ۱۳ ر جولائی ۱۹۵۴ء کو " سفینۂ عرب " سے عازمِ حجاز ہو گئے ۔ ٹکٹ عرشے کا لیا تھا ، مگر روانگی سے قبل ہی پان اسلامک کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر عبدالحمید اسمٰعیل نے انہیں دیکھ لیا اور اصرار کے ساتھ فرسٹ کلاس میں ایک کیبن ان کی تحویل میں دے دیا جس کے نتیجے میں ان کا سفر سہولت اور آرام کے ساتھ گزرا ۔ ۲۲ ر جولائی کو انہوں نے جدہ یعنی سرزمینِ حجاز پر قدم رکھا جہاں سے وہ ۲۳ ر جولائی کو مکہ مکرّمہ پہنچے اور زیارات و حج سے فارغ ہو کر مدینہ کی راہ لی اور روضۂ رسول ؐ اور مسجدِ نبویؐ کی فضاؤں سے خوب خوب فیض یاب ہوئے اور واپسی

۱۔ کاروانِ حجاز ، ص ۲

پر عمرہ کرتے ہوئے ۳۔ اکتوبر کو جدہ پہنچے جہاں سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو یعنی تین ماہ کے بعد وطن آ گئے ۔ اس روح پرور سفر کی روداد انہوں نے کاروانِ حجاز کے نام سے رقم کی جو اپنی نوعیت کا انوکھا سفر نامہ ھے اور اپنے موضوع کے حوالے سے متنوع معلومات اور ایمان پرور تاثرات کا حامل ھے ۔[1]

اس مقدّس سفر نے ماہر القادری مین دو تبدیلیاں پیدا کین ۔ اس سے قبل وہ شیو (SHAVE) بناتے ان سر کے بالون کو انگریزی طرز پر سجاتے تھے۔ مگر ۱۹ جولائی کو یعنی جہاز پر ھی شیو کرانے کی بجائے خط بنوایا[2] اور داڑھی بڑھائی اور حج کے دوران سعی سے فارغ ہو کر سر گھٹوا لیا اور یون انہون نے " اپنے سراپا پر سے فرنگیت کے آخری نشان کا بھی صفایا کرا دیا "۔[3]

کراچی مین ماہر القادری کے شب و روز

" فاران " کی ذمہ داریون اور مشاعرون مین شمولیت کے ساتھ ساتھ ماہر القادری اب تبلیغی و دعوتی نوعیت کی تقریبات مین بھی شامل ہونے لگے تھے ۔ سیرت النبیؐ کی محافل مین خصوصاً شریک ہوتے اور نعت سنانے کے علاوہ تقریر بھی کرتے تھے ۔ انہون نے جماعتِ اسلامی کی رکنیت تو اختیار نہین کی تھی ، مگر جماعت سے ان کا نظریاتی تعلق بہت گہرا ہو گیا تھا اور اس حوالے سے اُنہین ملک کے طول و عرض سے دینی و تبلیغی تقریبات مین شرکت کی دعوت دی جاتی جسے وہ رد نہ کرتے ۔ تبلیغی اجتماعات سے وہ کوئی معاوضہ طلب نہ کرتے ۔ اِن اجتماعات مین اُن کے پسندیدہ موضوعات بالعموم اثباتِ توحید اور اسلامی نظام کی برکات و جامعیّت پر مبنی ہوتے تھے ۔

۱۔ کاروانِ حجاز اور ماہر کے دیگر اسفار کا مطالعہ الگ باب مین آئے گا ۔

۲۔ کاروان حجاز ، ص ۲۲

۳۔ ایضاً ، ص ۲۱

کراچی میں ماہر کے حلقۂ احباب میں مولانا ظفر احمد انصاری اور اسمٰعیل احمد مینائی کے علاوہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی ، مولانا ناظم ندوی ، مولانا جمال میاں فرنگی محلی ، شفیق بریلوی ، محمد صلاح الدین ، فضل احمد کریم فضلی ، سید ہاشم رضا ، پیر حسام الدین راشدی ، ڈاکٹر آفتاب حسن ، اقبال احمد صدیقی ، اقبال صفی پوری ، پروفیسر اقبال عظیم ، تابش دہلوی ، پروفیسر محمد ایوب قادری ، فاروق محشر بدایونی ، مہدی علی صدیقی اور بہت سے دیگر حضرات بھی شامل تھے اور مختلف دنوں میں مختلف مقامات پر شعرو سخن کی محفلیں برپا ہوتی تھیں - ماہر خوش خوراک تھے اور مہمان نواز بھی ، اس لئے جہاں احباب کے گھروں پر مشاعرے ہوتے اور خورد و نوش کی محفلیں جمتیں ، وہاں خود ماہر بھی وقتاً فوقتاً اپنے گھر پر دوستوں کو بلاتے اور انواع و اقسام کے کھانوں سے ان کی تواضع کرتے -

کراچی میں بعض ہفتہ وار محفلیں پابندی سے جمتی تھیں - مہدی علی صدیقی لکھتے ہیں کہ ابتداء میں ہر جمعہ کو ان کے گھر پر محفل شعرو سخن برپا ہوتی جو بعد میں مرزا سلیم بیگ کے مکان پر منتقل ہو گئی[1] - اسی طرح کئی سال تک فضل احمد کریم فضلی کے مکان پر ماہانہ محفلیں جمتی رہیں --- مگر جب فضلی صاحب طویل علالت سے دو چار ہوئے تو اسمٰعیل احمد مینائی کے بقول[2] ۱۹۶۵ء میں میاں غلام محمد صالح کے مکان واقع بلاک نمبر ۳ ناظم آباد میں ہفتہ وار محفل کا انعقاد شروع ہوا جو ماہر صاحب کی وفات تک پابندی سے جاری رہا - یہ محفل "بزمِ صالح" کہلاتی تھی اور اس میں اتوار کی شام کو کراچی کے منتخب شعراء ، ادباء اور دانشور جمع ہوتے تھے اور شعرو ادب

۱- فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۵

۲- ایضاً ، اکتوبر ۱۹۸۶ء ، ص ۶۳

کے علاوہ اس مین مختلف موضوعات پر گفتگو ئین ہوتی تھین ۔ محفل کے میزبان پرانی قدرون کے حامل وضع دار اور مخلص انسان تھے جو اہلِ علم کے قدردان اور مخیّر آدمی تھے ۔[1]

افریقہ ، یورپ اور مشرقِ وسطٰی کے سفر[2]

ماہر القادری ۲۸ مارچ ۱۹۶۹ء کو چار ماہ کے سفر پر نکلے اور جنوبی و مشرقی افریقہ ، یورپ ، ترکی ، شام٬ بیروت اور مکہ و مدینہ کی سیاحت کرتے ہوئے ۲۷ جولائی کو واپس آئے ۔ اس سفر کا ظاہری سبب وہ خصوصی دعوت نامہ تھا جو جشنِ نزولِ قرآن کونسل ڈربن (جنوبی افریقہ) کی طرف سے موصوف کو ملا تھا ۔[3]

اگست ۱۹۷۶ء مین ماہر دوسری مرتبہ دنیا کی سیاحت کو نکلے پہلے انگلستان گئے اور برمنگھم اور لندن کی تقریبات مین شمولیت کی ۔ انگلستان سے ماہر مصر آئے اور وہان سے ۹؍ ستمبر کو جدہ اور وہان سے مکہ اور مدینہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے ۔ حجاز مین انھون نے ۲۸؍ ستمبر تک قیام کیا ۔ ۲۹؍ کو واپس کراچی پہنچے ۔[4]

ماہر نے مختلف وقتون مین چار مرتبہ حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا[5] ۔ مکہ و مدینہ سے انہین گویا عشق تھا خود لکھتے ہین ۔

" خدا شاہد ہے اور میری آشفتہ مزاجیان اس کی گواہ ہین کہ زندگی ہر طرح کے مرحلون سے گزری ، مگر کسی عالم مین بھی دل مکہ و مدینہ کی یاد سے خالی نہین رہا ۔"[6]

۱۔ احمد اشرف (ڈپٹی ڈائریکٹر سٹیٹ بنک)، فاران اگست ۱۹۶۳ء ، ص ۳۴ ، ۳۵

۲۔ ماہر کے تمام سفرون کا تنقیدی مطالعہ الگ باب مین پیش کیا جا رہا ہے ۔

۳۔ اس سفر کی ضروری تفصیلات خطوط کی صورت مین فاران مین چھپتی رہین ۔ دیکھئے فاران جولائی٬ اگست٬ ستمبر ۱۹۶۹ء ،

۴۔ اس سفر کی روداد فاران جنوری ۱۹۷۷ء ، مین شائع ہوئی ۔

۵۔ سفر حج ۱۹۵۳ء جولائی ۱۹۶۹ء ، ستمبر ۱۹۷۶ء ، آخری سفر مئی ۱۹۷۸ء

۶۔ کاروانِ حجاز مطبوعہ مکتبہ فاران س۔ ن ۔ ص ۲

ماہر اور مشاعرے

=============

بقول ماہر " شاعری میرا اوڑھنا بچھونا ہے "[۱]۔ چنانچہ تیرہ چودہ برس کی عمر مین وہ شعر کہنے لگے[۲]۔ اور اپنی ذہانت ، محنت اور مسلسل مشق سے وہ بہت جلد ایک مقبول و ہر دلعزیز شاعر کی حیثیت سے معروف ہو گئے اور ہندوستان کے طول و عرض مین ہر مشاعرے مین مدعو کئے جانے لگے۔ وہ وجیہہ آدمی تھے ، قدرت کی طرف سے انہین لحنِ داودی عطا ہوا تھا ، اور شاعری کی مختلف اصناف پر انہین استادانہ کمال حاصل تھا ، اس لئے وہ اپنی شخصیت ، آواز او شعری محاسن کے بل پر مشاعرون پر چھا جاتے تھے ۔

ہندوستان مین مشاعرون کا زیادہ رواج جنگ عظیم دوم کے زمانہ مین ہوا ۔ سرکاری و نیم سرکاری طور پر " وارفنڈ " کے مشاعرے ہوتے تھے ۔ ترنّم کا رواج عام ہو گیا اور تحت اللفظ پڑھنے والے کا رنگ نہ جمتا تھا ۔ نتیجۃ " سستی شہرت کے اس چٹخارے نے بہت سے ایسے لوگ پیدا کر دیئے جو شاعر کم اور گویے زیادہ تھے "[۳]۔

چنانچہ ماہر بڑی حقیقت پسندی سے اعتراف کرتے ہین کہ " مشاعرون مین عام طور پر " گلے باز " شاعرون کو بلایا جاتا تھا ۔ مَین ترنّم سے شعر پڑھنا نہ جانتا تو شاید خود میری پوچھ بھی نہ ہوتی "۔

ماہر مشاعرون مین معاوضہ طے کرکے بلکہ وصول کرکے جاتے اور اس اصول پر سختی سے کاربند رہے اور کسی کی ناراضگی کی پروانہ کرتے[۴]۔ ان مشاعرون کا انہین گونہ

۱۔ فاران جولائی ۱۹۷۳ء ، ص ۳۳

۲۔ ایضاً ، دسمبر ۱۹۶۲ ، ص ۲۷ و ایضاً دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۵۳

۳۔ ماہنامہ " چراغ راہ " خاص نمبر "مضمون پاکستان کے مشاعرے " از ماہر القادری ص ۷۶

۴۔ فاران فروری ۱۹۵۲ء ، ص ۳۳ و ایضاً دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۶۳

فائدہ ہوا یعنی اوّلاً یہ مالی منفعت کا ذریعہ بن گئے - دوم ، سیر و تفریح اور سیاحت کے ذوق کی تسکین ہوئی اور انہوں نے برصغیر کے ہر بڑے شہر ، تاریخی مقامات اور خوش منظر جگہوں کی جی بھر کر سیر کی - ان کے ذاتی تعارف ، تعلقات اور معلومات میں اضافہ ہوا - قیامِ پاکستان کے بعد وہ مشاعروں میں جاتے ، تو اسی شہر میں کوئی نہ کوئی دینی یا تبلیغی ادارہ ، ان کی تقریر کا انتظام کر دیتا جہاں وہ نعت سناتے اور قرآن و سنت خصوصاً توحید کے کسی عنوان پر تقریر کرتے -- اس طرح یہ مشاعرے اور سفر ان کے لئے اجرو ثواب کا ذریعہ بھی بن جاتے -

ماہر کے مذہبی معتقدات و نظریات
==============================

ماہر نے مختلف مقامات پر اپنے آبائی عقائد اور ان میں تبدیلی کی تفصیل قلم بند کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسیر کلاں کی فضا میں بریلی اور بدایوں کے عقاید کا غلبہ تھا - یعنی اموات پر تیجا اور چالیسواں فرض واجب کی طرح کیا جاتا ، " محفل میلاد میں قیام عشقِ رسول کا سب سے بڑا مظہر سمجھا جاتا " علمائے دیو بند اور علمائے اہلحدیث کو کافر قرار دیا جاتا اور اولیاء اللہ کو خدا کا ہم پلہ تصور کیا جاتا تھا خصوصاً شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے اِستمداد اور گیارھویں شریف کو گویا اِیمان کا حصہ سمجھا جاتا تھا اور انہیں خدا ہی کی طرح حاضر و ناظر خیال کیا جاتا تھا - ہر مذہبی جلسے میں علمائے دیوبند کو طنز و تعریض اور سب و شتم کا نشانہ بنایا جاتا - ایک مرتبہ گنور سے ایک بارات کسیر کلاں آئی - چند براتی اہلحدیث بھی تھے انہوں نے نماز باجماعت میں آمین بلند آواز سے کہدی ، تو لوگوں نے ہت توڑ کر ان براتیوں کو مسجد سے

۱- ماہر القادری فاران اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۲۷

نکال دیا اور وضو کے لوٹے توڑ دیئے کہ اہلحدیثوں کے چھونے سے وہ پلید ہو گئے تھے۔ چنانچہ نفرت کا یہ عالم تھا کہ بچپن میں ماہر کہیں علمائے دیوبند کے ساتھ تعظیمی القاب لکھا ہوا دیکھتے تو ان الفاظ کو کاٹ کر اپنے قلم سے گالیاں لکھ دیتے[۱] ۔

لیکن بعد میں ماہر کے ان عقاید و نظریات میں زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی۔ میٹرک کے بعد وہ روز گار حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کے مدرسہ قادریہ بدایوں میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ مولانا موصوف حیدر آباد دکن جا رہے تھے ۔ انہوں نے ساتھ چلنے کو کہا ، مگر مشورہ دیا کہ " نظام الملک " نام کا ایک رسالہ چھپوالو ۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ رسالہ میں ایک باب فقہ کا بھی ہونا چاہیئے اور وہ مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود اردو فارسی کتب کی مدد سے تیار کیا جا سکتا ہے ۔

چنانچہ ماہر نے جب ان کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو انہیں دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان کتابوں میں " عرس ، نذر و نیاز ، میلاد ، قیام ، سوم ، چہلم وغیرہ " کا کہیں بھی ذکر نہیں حالانکہ بچپن سے یہ بات ان کے دل میں بٹھائی گئی تھی کہ " جو کوئی ان مستحب امور کو بدعت سمجھتا ہے وہ اہلِ سنت و الجماعت کے دائرے سے خارج ہے "[۲] " پھر کتاب و سنت ، سیرتِ رسول ؐ، آثارِ صحابہ ؓ اور دوسری دینی کتابوں کا جس قدر مطالعہ کا موقع ملتا گیا ، اہلِ بدعت کا ایک ایک عقیدہ کی آپ ہی آپ نفی ہوتی گئی "[۳] ۔

ماہر دکن پہنچے تو وہاں اُنہیں علامہ شبیر احمد عثمانی ، مولانا مناظراحسن گیلانی ،

۱۔ ماہر القادری فاران اپریل جولائی ۱۹۷۶ء ، ص ۳۰

۲۔ فاران جولائی ۱۹۷۶ ء ، ص ۳۰

۳۔ ایضاً ، اپریل ۱۹۶۷ء ، ص ۳۸

قاری محمد طیب اور دوسرے دیوبندی علماء کی تقریرین سننے کا اتفاق ہوا۔ " ان مین نہ تو بریلویون پر طنز کی جاتی اور نہ ان کے عقائد کا شدومد کے ساتھ رد کیا جاتا ۔ اللہ تعالی کی ربوبیت ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ ، صحابہ کرام کے حالات یا اولیاء اللہ کے اقوال و احوال بیان کئے جاتے ، علمِ غیب ، استمداد بغیرِ اللہ وغیرہ مسائل کا کبھی کبھار ذکر آ بھی جاتاتو نہایت سادہ انداز مین اپنی بات فرما دیتے اور ان کی زبان سے یہ کبھی نہ سنا گیا کہ جن کے ہمارے جیسے عقائد نہین ہین وہ کافر ہین بریلی کا تو نام ہی ان کی تقریرون مین نہین آتا تھا۔"[1]

اس صورتِ حال سے دونون مکاتبِ فکر کا فرق ماہر پر واضح ہوتا چلا گیا اور پھر وہ زبان اور قلم کے محاذ پر توحید کے بہت بڑے علمبردار بن گئے ۔

قیامِ دکن کے اوائل ہی مین ماہر صاحب کی ملاقات مولانا سیدابوالاعلی مودودی سے ہو گئی جو اس وقت حیدر آباد سے " ترجمان القرآن " کے نام سے ایک رسالہ شائع کرتے تھے ۔ اس ملاقات کا ذریعہ بھی مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی ہی تھے کہ مولانا مودودی ان کے ننھیالی عزیز تھے ۔ مولانا مودودی اکثر مفتی صاحب کے ہان جایا کرتے تھے ۔ وہین ماہرالقادری کا ان سے تعارف ہوا ۔ ملاقاتون کے بعد بےتکلفی ہوئی۔ماہر صاحب کو مولانا کی شخصیت نے بیحد متاثر کیا[2] اور یہی تاثر بعد مین گہرے تعلقات مین بدل گیا ۔ ماہر صاحب خود لکھتےہین ۔ " مین ایک زمانہ مین ان بدعات مین مبتلا رہا ہون ، مگر اللہ تعالی نے اپنا فضل فرمایا کہ اس چکر سے مجھے نکال دیا ۔ عقیدۂ توحید کے نکھارنے مین قرآن و سنت اور سیرت و آثار کے بعد سب سے زیادہ کام مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی کتابون نے کیا "۔[3]

۱۔ فاران جولائی ، ۱۹۷۶ء ، ص ۳۲ ، ۳۳

۲۔ شفیق بریلوی ایضاً ، ص ۱۵۳ ، ۱۵۴

۳۔ کاروان حجاز از ماہر القادری ، ص ۲۰

چنانچہ توحید میں ماہر جس قدر راسخ اور اشاعتِ توحید میں جس قدر مشہور ہوئے ، وہ ان کے دوست دشمن سب جانتے ہیں ۔ محمد صلاح الدین کے بقول مرحوم کہا کرتے تھے کہ توحید اسلام کی اساس ہے ، توحید نہ رہی تو اسلام اور ایمان کا دعویٰ ہی باطل ہے ۔[۱]

ماہر القادری کے عقاید و نظریات کے ضمن میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن[۲] لکھتے ہیں :

" اس وقت ان کی طلاقتِ لسانی زیادہ بروئے کار آتی جب وہ اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے ۔ تصوف،وحدت الوجود ، بدعت، تبلیغی جماعت ، جماعت اسلامی، بریلوی علماء، زبان وادب ، تذکیر و تانیث ان کا خاص موضوع ہوتا ۔ تصوّف کے مخالف اور وحدت الوجود کے منکر تھے "۔[۳]

....

ماہر القادری کی صحت اور گھریلو زندگی
===============================

ماہر القادری نے بڑی مصروف زندگی گزاری ۔ ایک ماہانہ پرچے کی ادارت اور انتظام کا بیشتر بوجھ انہیں کے کندھوں پر تھا ۔ ان کے بےتکلف اور قریبی دوست لالحہ صحرائی[۴] کی روایت ہے کہ " انہیں شاید کسی کلرک کی معاونت بھی حاصل نہ تھی"۔[۵]

۱۔ سید محمد صلاح الدین   فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۸

۲۔ متوفی ۱۹۸۸ء ، " معارف " اعظم گڑھ کے مدیر ، معروف مصنف اور مورخ ۔

۳۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۷۸ء ، ص ۴۵۶

۴۔ چودھری محمّد صادق آف جہانیاں ضلع خانیوال ۔

۵۔ فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۷۱

مشاعروں اور دیگر تقریبات کے لئے آئے روز کے سفر اس کے علاوہ تھے - مگر موصوف نے ان غیر معمولی مصروفیات کے باوجود مطمئن و مسرور زندگی گزاری -

ماہر کی کوئی اولاد نہ تھی ، لیکن انہیں اپنے چھوٹے بھائی سرور حسین اور ان کے بچوں سے بڑی محبت تھی اور عام انسانوں سے ان کا سلوک اتنی خندہ روئی اور خوش مزاجی پر مشتمل ہوتا تھا کہ انہیں اولاد کی محرومی پر کبھی ملول و افسردہ نہ دیکھا گیا - ان کی خدمت گزار ، وفاشعار اور دیندار اہلیہ ۱۹۶۶ء میں وفات پا گئیں جس کا انہوں نے خاصا صدمہ بھی محسوس کیا -[1] مگر چونکہ عملی طور پر وہ دینی تعلیمات پر سختی سے کاربند تھے اور ایک سچے مسلمان تھے[2]، اس لئے صبر و رضا کا پیکر بنے رہے -

مجموعی اعتبار سے ماہر کی صحت ہمیشہ اچھی رہی - وہ اس حد تک خوش خوراک تھے کہ حلقہ احباب میں گویا ضرب المثل تھے - اچھے کھانوں کا وہ جگہ جگہ ذکر کرتے ہیں - عمر بھر دیسی گھی استعمال کیا - بناسپتی کے قریب تک نہ پھٹکتے - چنانچہ ۱۹۷۷ء میں جب کہ ان کی عمر ۷۱ برس تھی ، وہ لکھتے ہیں :-

> "اللہ تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس عمر میں راقم الحروف کی صحت بہت اچھی ہے کل کی خبر نہیں کیا ہو جائے، مگر اس وقت تو میں مسلسل بارہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہوں ، مگر تکان محسوس نہیں ہوتی - ہاں چار پانچ برس سے یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ زور سے چلانے ، اچانک کسی واقعہ اور غیر معمولی حرکت سے اور دو تین فرلانگ پیدل چلنے سے دل میں گھٹن سی ہونے لگتی ہے - ڈاکٹروں کا کہنا یہ ہے کہ ایک خاص عمر میں جاکر دل کی رگیں

۱- سرور حسین ، ملاقات کراچی ۸ اگست ۱۹۸۶ء ،

۲- شفیق بریلوی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۵۴

سکڑنے لگتی ھین ۔ GLYCERYL TRINITRATE کی گولیون کی شیشی میری جیب مین رھتی ھے ۔ ایک گولی زبان کے نیچے رکھنے اور کچھ دیر بیٹھنے رھنے سے یہ گھٹن جاتی رھتی ھے اور طبیعت چاق چوبند ھو جاتی ھے ۔ جیسے کچھ ھوا ھی نہین تھا "۔[1]

ماھر کا سفرِ آخرت

یہی صورت حال تھی جب مارچ ۱۹۷۸ء مین ماھر کو برمنگھم (انگلستان) کی سیرت کانفرنس (۲۷ تا ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء) کے لئے دعوت نامہ ملا ۔[2] وہ اس کی تیاریان کر رھے تھے کہ انہین جدہ سے مشاعرہ کی دعوت ملی جو ۱۱ ، ۱۲ مئی کی درمیانی شب کو پاکستانی سفارت خانے مین منعقد ھو رھا تھا ۔ چنانچہ ان کا ارادہ تھا کہ وہ جدہ جائین گے ، عمرہ ادا کرین گے ، چند روز مدینہ منورہ مین گزارین گے اور پھر انگلستان جائین گے ۔[2] اس کے لئے انہون نے " فاران " کے دو مزید پرچون کے لئے اداریے اور مضامین وغیرہ پیشگی تیار کئے ۔[3] اور رختِ سفر باندھ کر ۹ مئی ۱۹۷۸ء کی شام کو بعد نمازِ مغرب کراچی سے روانہ ھوئے ۔ ماھر کے دوستِ دیرینہ جناب اسمٰعیل احمد مینائی لکھتے ھین کہ " اسی روز دن میـن انہون نے ایوب گونڈوی سے جو ان کے دن رات کے رفیق تھے ، یہ بیان کیا کہ " رات مین نے حضرت رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب مین زیارت کی ۔ حضورؐ مجھ کوبلا رھے ھین اور فرمایا ھے کہ مین تمہارا منتظر ھون "۔ چنانچہ

۱- فاران مارچ ۱۹۷۷ء ، ص ۱۰ ، ۱۱

۲- ایضاً " دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۰۲

۳- ایضاً ص ۱۹۷

وقتِ رخصت اپنے چھوٹے بھائی سرور حسین کو ہدایت کی کہ سرزمینِ حجاز میں موت آ جائے تو وہیں مکہ میں دفن کر دینا - یہاں میت کو مت منگانا "[1]

جہاز کچھ لیٹ تھا ، آدھی رات کے قریب جدہ پہنچا ، قیام گاہ پر پہنچ کر آرام کیا اور صبح دس بجے عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ چلے گئے - وہاں عمرہ کے دوران ہی طبیعت بہت بگڑ گئی - بمشکل مدرسہ صولتیہ میں مولانا شمیم صاحب کے ہاں پہنچائے گئے اور دوا و علاج سے طبیعت سنبھل گئی۔دن بھر مولانا شمیم کے ہاں آرام کیا --- شام کو جدہ آ گئے -

مشاعرہ کا اہتمام جدہ میں مقیم پاکستانیوں نے کیا تھا اور اس میں پاکستان کے تقریباً تمام معروف شاعروں کو دعوت دی گئی تھی -

مشاعرہ ۱۲ مئی کو رات ساڑھے دس بجے شروع ہوا - ماہر صاحب ڈائس پر سفیرِ پاکستان اور صدرِ جلسہ جنرل قونصل مقیم کے ساتھ بیٹھے تھے - جناب اسمٰعیل احمد مینائی کا بیان ہے کہ موصوف اگرچہ چاق چوبند تھے ، مگر آواز میں نقاہت اور چہرے پر ہلکی سی زردی تھی - انہوں نے مینائی صاحب کو بتایا کہ جس قدر آج میری طبیعت خراب ہوئی،کبھی نہ ہوئی تھی - سینے میں ہلکا ہلکا درد ابھی تک موجود ہے - اِس پر مینائی صاحب اور جنرل قونصل مقیم دونوں نے مشورہ دیا کہ وہ جاکر سفیر کے چیمبر میں آرام کریں- ان کی باری پر انہیں بلالیا جائے گا ،۔مگر وہ نہ مانے۔ جنرل صاحب نے اصرار کیا ، تو جواب دیا " جنرل صاحب زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ یہیں مر جاؤں گا تو آپ لوگ مجھے مکہ معظمہ میں دفن کر دیجیئے گا"[2]

۱- فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ،ماہر نمبر ، ص ۱۹۷

۲- ایضاً ، ص ۱۹۸

۳- اسمٰعیل مینائی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۹۹

محترمہ واجدہ تبسم ، رحمان کیانی اور اقبال عظیم کے بعد ماہر القادری مائیک پر آئے - لوگوں نے چند مخصوص نظموں (جمنا کا کنارہ وغیرہ) کی فرمائش کی ،مگر وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ اب اس کا موقع نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے نہایت اطمینان سے تحت اللفظ میں یہ شعر پڑھا -

شیرازۂ حیات پریشان ہو گیا　　　یہ مرحلہ بھی خیر سے آسان ہو گیا [1]

ماہر نے یکے بعد دیگرے کئی غزلیں سنائیں جس پر انہیں خوب داد ملی یہ شعر بھی معنی خیز تھا -

اے حسن تجلی کی یہ تکرار کہاں تک!
آئینوں میں اب طاقتِ حیرت بھی نہیں ہے

ماہر کے بعد احسان دانش اور ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنا کلام سنایا اور مشاعرے کا پہلا دور اختتام کو پہنچا -

دوسرے دور میں ماہر نے نعت پڑھنا چاہی تو انہیں یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ مشاعرے کا آخری اور تیسرا دور نعت گوئی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے - اس لئے وہ فی الحال غزل یا نظم سنائیں - چنانچہ متفرق منظومات سنانے کے بعد وہ بیٹھ گئے اور احسان دانش مائیک پر آئے اور کلام سنایا جس میں ایک شعر بڑا ہی معنی خیز تھا اس کی درد ناک تعبیر جلد ہی سامنے آ گئی -

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں انہیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے [2]

۱- اسمٰعیل مینائی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۳۳

۲- ایضاً ، ص ۳۷۹ ، ۳۸

اخیر مین حفیظ جالندھری آئے اور ماھر کی طرف اشارہ کرکے یہ شعر پڑھا۔

بہشت مین بھی صلا ھے مجھے عذابِ شدید

یہان بھی مولوی صاحب ھین میرے ھمسائے

اس پر ماھر القادری تیزی سے اٹھے اور مائیک پر آکر کہا " یہ غلط جگہ پر پہنچ گئے تھے " پھر حفیظ صاحب سے کہا " مین تو پیار کرتا ھون اور پیار کا خواھان ھون" اس کے جواب مین حفیظ نے کہا " دیکھئے یہ مولویت کا جواب دے رھے ھین"۔

ماھر اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئے تو حفیظ جالندھری نے مڑ کر دوبارہ ماھر صاحب کی طرف اشارہ کیا اور دوسری بار پھر یہی شعر پڑھا[١] ۔ مگر پہلا مصرع ختم ھوا تھا کہ ماھر صاحب پر دل کا شدید دورہ پڑا وہ اس طرح گرے جیسے کوئی تھک کر گرتا ھے۔ قریب کے لوگون نے انھین گود مین لے لیا ، محفل مین کئی ڈاکٹر بھی تھے ۔ وہ سب ڈائس پر چڑھ گئے ۔ فوری طبی امداد کی مختلف تدبیرین کی گئین ، مگر موصوف کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ یہ سعودی عرب کے مطابق صبح ساڑھے تین بجے کا عمل تھا اور مئی کی تیرہ تاریخ تھی[٢] ۔

ماھر صاحب کو عجلت مین ھسپتال لے جایا گیا جہان ان کی موت کی تصدیق ھو

١۔ حفیظ جالندھری کے اس طرزِ عمل کا سبب اغلباً ماھر کی وہ تنقید ھے جو انھون نے ماھنامہ " افکار کراچی " کے حفیظ نمبر پر کی تھی ۔ اور جس مین اپنے مخصوص بےلاگ انداز مین حفیظ کی شاعری کی خوبیون کے ساتھ ساتھ اس کی خامیان اور کمزوریان بھی بیان کی تھین اور سرکار دربار سے ان کی دائمی وابستگی کی طرف اشارے کئے تھے دیکھئے فاران جنوری ٧۵ء ص ٩٤ ۔

٢۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی فاران دسمبر ١٩٧٨ء ، ص ٣٧٩ تا ٣٨١

گئی - لاش سرد خانے مین رکھ دی گئی اور راؤ اختر جو ماہر صاحب کے میزبان تھے اور مقامی قوانین سے واقف تھے ، انتظامات مین لگ گئے - کراچی مرحوم کے بخانی سے رابطہ قائم کیا گیا جنھون نے مکہ مین لاش کی تدفین کی اجازت دے دی - لاش مکہ لائی گئی مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا شمیم (مسعود سلیم) نے اپنی خاندانی روایات اور اپنے والد بزرگ مولانا محمد سلیم سے مرحوم کے دیرینہ تعلقات خوب نبھائے اور بڑی محبت اور خلوص سے میّت کو غسل کفن دیااور اس سلسلے کے اخراجات خود برداشت کئے۔

نماز مغرب سے قبل جنازہ حرم کعبہ مین لایاگیا - مدرسہ کے طلبہ ، اساتذہ جدہ سے آئے ہوئے احباب ، سفیر پاکستان اور حفیظ جالندھری نے مرحوم ماہر القادری کی طرف سے طواف کیا - نماز کے بعد حسب معمول اعلان ہوا " الصلوۃ علی المیت الحاضر" جمعہ کاروز تھا ، اس لئے ہزارون افراد روز کے آنے والون کے علاوہ موجود تھے - مجمع اگر پچیس ہزار کا کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا - نمازِ جنازہ کے بعد میت کو حرم کعبہ کے قریب جنت المعلٰی کے قبرستان مین لےجایا گیا جہان ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض کے بالکل پائنتی اس مقام پر دفن کیا گیا جہان حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا محمد سلیم بانی مدرسہ صولتیہ کے مزار ہین۔جہان سے کعبہ دائماً پیش نظر رہتا ہے اور دن رات مین پانچ بار موذنِ کعبہ کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔[1]

وفات کے وقت ماہر صاحب کی عمر شمسی اعتبار سے تقریباً بہتر برس جبکہ ہجری لحاظ سے پچھتر سال تھی -

---

۱- فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۹۹

سیرت و کردار

ماہر القادری ایک باوقار اور دلاویز شخصیت کے حامل تھے ۔ کھلتا ہوا سیدھا قد ، کھلتی ہوئی گندمی رنگت ، دوہرا بدن ، کتابی چہرہ ، چھوٹی خشخشی داڑھی ، کشادہ پیشانی ، سرمگین روشن آنکھیں ، سر پر دوپلی ٹوپی ، شیروانی اور پاجامے میں ملبوس تیز رفتار ، گرم گفتار۔[1] وارث سرھندی کے مطابق وفات کے وقت ماہر کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی ، مگر ان کی جسمانی صحت اتنی شاندار تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کہولت کی منزل میں ہیں ۔ قد میں جھکنے کی کوئی علامت نہ تھی ۔[2]

یہ تھے ماہر القادری جن کی ذات اور کردار کے حوالے سے بےشمار لوگ ان کے مداح ہیں اور جو ایسی خوبیوں کے حامل تھے جو کم لوگوں میں نظر آتی ہیں ۔ چنانچہ سید محمد صلاح الدین[3] ماہر کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" ماہر صاحب برصغیر کے ممتاز شاعر بھی تھے اور نامور ادیب بھی ۔ وہ اپنے عہد کے ایک عظیم ماہر لسانیات بھی تھے اور معروف مورخ و سیرت نگار بھی۔ وہ شعروادب کے علاوہ فقہ ، حدیث ، تفسیر پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ، لیکن میرے نزدیک ان کی شہرت و عظمت اور محبوبیت کا اصل سبب ان کی شخصیت کے وہ نمایاں اوصاف تھے جو کسی ایک ذات میں بہت کم جلوہ گر ہوتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم کی دولت بخشنے کے ساتھ ہی عمل کی توفیق بھی عطا کی تھی ..... ماہر صاحب کا سب سے

۱۔ ماھنامہ فکار حیدر آباد دکن (گوشہ ماھر) مئی جون ۱۹۸۷ء ، ص ۹۳

۲۔ فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۳۹

۳۔ مدیر ہفت روزہ " تکبیر " کراچی ، مصنف ، مفکر اور صحافی ۔

بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو نفاق کی بیماری سے پاک رکھا ۔ وہ محض معلمِ اخلاق ہی نہ تھے، مجسم اخلاص بھی تھے ۔ انہوں نے اپنی جوانی کی عمر کا بڑا حصہ شراب و شباب کی محفلوں میں گزارا اور بمبئی کی فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے ، لیکن اس اخلاص سوز اور ایمان شکن ماحول میں بھی ان کا دامنِ کردار داغدار نہ ہوا۔

عقیدۂ توحید ان کے کردار کا اصلِ جوہر تھا ۔ وہ شرک و بدعت کے کُھلے دشمن اور توحید کے پُرجوش علمبردار تھے ۔ اس معاملہ میں کسی لگی لپٹی کے قائل نہ تھے ۔ پروفیسر غفور احمد[1] سے گہری دوستی اور محبت تھی لیکن جب خبر پڑھی کہ انہوں نے کسی مزار پر چادر چڑھائی ہے ، تو ان کی خبر لینے میں ذرا تکلف سے کام نہ لیا ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ توحید اسلام کی اساس ہے ۔ توحید نہ رہی تو اسلام اور ایمان کا دعویٰ ہی باطل ہے ۔ عقیدۂ توحید نے ان کے کردار کو ہرنوع کی ذلت و پستی سے محفوظ کر دیا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی حکمران کا قصیدہ نہیں لکھا ۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا ۔ قناعت کی درویشانہ زندگی شاہانہ آن بان سے گزاری ۔

ماہر صاحب کے فکر و عمل کا ایک اور نمایاں وصف حب رسولؐ تھا ۔ سیرت پر ان کی کتاب "دُرِّ یتیمؐ" اور ان کے سفر نامہ حج "کاروان حجاز" سے حضور اکرمؐ سے ان کی عقیدت و محبت اور حرمین کے چپے چپے سے ان کے قلب و ذہن کی وابستگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی نعتوں میں بھی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے توحید و رسالت کو اپنے اپنے مقام پر رکھا ہے اور "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کی نازک حد کو کبھی غلو کی نذر نہیں ہونے دیا ۔

ماہر صاحب مکہ مکرمہ یامدینہ منورہ میں ہوتے ، تو پابندی سے پانچوں وقت

۱۔ معروف سیاست دان اور جماعت اسلامی کے قاید ۔موصوف کچھ عرصہ صدر جنرل ضیاءالحق کی کابینہ میں وزیر بھی رہے ۔

کی نماز حرم میں ادا کرتے ۔ دعوتوں کا شوق یہاں اگر ماند پڑ جاتا ۔ رات کے کھانے کی دعوت ہوتی ، تو واضح کر دیتے کہ نماز عشاء کے بعد آؤں گا ۔ کسی مقام کا فاصلہ حرم سے بہت دور ہوتا اور وہاں کی دعوت میں ایک وقت کی نماز جانے کا اندیشہ ہوتا ، تو معذرت کر لیتے ۔ وہ کسی قیمت پر ایک لاکھ اور پچاس ہزار نمازوں کا ثواب چھوڑ دینا گوارا نہ کرتے ۔

ماہر صاحب کو کسی سے اختلاف ہوتا تو کھل کر اور بڑے پرجوش انداز میں اس کا اظہار کرتے ، مگر اس احتیاط اور شائستگی کے ساتھ کہ جس سے اختلاف ہے ، اس کی ذات کو نشانۂ طنز و تضحیک نہ بنایا جائے ۔ وہ نہ مدح سرائی کے قائل تھے نہ ہجوگوئی کے ۔ غیبت سے حد درجہ اجتناب کرتے ۔ البتہ کسی سے مراسم قائم کرتے وقت اس امر کی کھوج کرید ضرور کر لیتے تھے کہ اس کا ذاتی کردار کیسا ہے اور اس کی آمدنی کے ذرائع پاک ہیں یا نہیں ؟ نباہ سب سے کرتے تھے ۔ بڑے سیر چشم اور وسیع القلب تھے ، لیکن طبیعت انہی سے میل کھاتی تھی جو کردار میں کھرے ہوں گے[1]

سید مصطفٰے علی بریلوی (سیکرٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس و مدیر العلم) رقمطراز ہیں :۔

"ماہر صاحب ہمہ صفت موصوف انسان تھے ۔ طنز گو ، شاعر ، خوش بیان مقرر ، بلند پایہ ادیب و انشا پرداز اور باریک بین نقاد تھے ۔ زبان اور بیان کے مسائل اور رموز و نکات پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ مطالعہ بہت وسیع تھا مذہبی اور تاریخی معلومات بھی بہت تھیں ۔ حق گوئی اور بیباکی ان کا مسلک تھا ۔ تنقید و تبصرہ میں کوئی رعایت کے قائل نہیں ، جہاں خوبیوں کا

۱۔ فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹

کُھلے دل سے اعتراف کرتے وہاں خامیاں تلاش کرنے میں بھی ان کو
کمال حاصل ہے ۔ ماہر صاحب کی ایک نمایاں خوبی ان کی حقیقت
پسندی ہے اگر ان پر ان کی غلطی واضح ہو جاتی تو بیچون وچرا
تسلیم کر لیتے [1]

بہت سے لوگوں نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ ماہر کردار کی اعلیٰ خوبیوں سے متصف تھے اور اخلاص و خیر خواہی ، اصول پسندی ، سادگی و درویشی ، توازن و اعتدال ، ایثارومروت ، مہمان نوازی اور شگفتہ مزاجی ان کے عمومی رویے کے لازمی اجزا تھے۔ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی [2] نامور عالم دین اور محقق و مصنف تھے ان سے ماہر کے تعلقات حیدر آباد دکن میں استوار ہوئے اور بیالیس سال تک قائم رہے اور مولانا موصوف کے بقول ان میں روز بروز استواری پیدا ہوتی چلی گئی ۔ ماہر بڑے ہی دوست نواز اور پرخلوص طبیعت کے حامل تھے ۔ وہ اختلاف کو مخالفت میں کبھی تبدیل نہ ہونے دیتے۔[3]

اسی طرح اسمٰعیل [1] احمد مینائی سے بھی ماہر کے تعلقات دکن ہی سے قائم ہوئے اور اخیر دم تک قائم اور خوشگوار رہے [4] جو اس امر کی علامت ہے کہ ماہر کے عمومی رویے میں توازن اور اعتدال کار فرما تھا اور اپنے دوستوں سے سچی محبت رکھتے تھے۔

ماہر القادری کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی ۔ وہ کسی منفی احساس (complex) کا شکار نہ تھے ۔ اگرچہ وہ بڑے ہی خوش ذوق اور نفاست پسند تھے، مگر ہر طرح کے ماحول میں خوش رہتے تھے ۔ اس ضمن میں لالہ صحرائی نے اپنا ایک مشاہدہ

۱۔ ماہنامہ سب رس کراچی یاد رفتگان نمبر ، جنوری ۱۹۸۰ء ، ص ۲۷۷

۲۔ متوفی ۱۹۸۹ء ، اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق رکن ۔

۳۔ فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۵۸ ، ۲۵۹

۴۔ ایضاً ، ص ۲۰۷

بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ماہر ان کی دعوت پر جہانیاں تشریف لے گئے ۔ اس زمانے میں جہانیاں بجلی کی نعمت سے محروم تھا اور قصبہ میں دھقانیت کا خاصا غلبہ تھا، مگر ماہر بڑی ہی بےتکلفی سے ایک کھری چارپائی پر لیٹ گئے اور اپنی طبعی بشاشت اور خندہ روئی میں کوئی فرق نہ آنے دیا ۔ میزبان نے معذرت کی اور ندامت کا اظہار کیا ، تو جواب دیا ۔

" بھئی میں خود اصل میں ایک دیہاتی ہوں جو مزا مجھے کُھلی اور فطری ہوا اور سادہ ماحول میں ملتا ہے ، وہ شہروں کے تصنع اور وہاں کی گھٹن میں کہاں ۔۔آپ بالکل فکر مند نہ ہوں، میں تو خود کو گویا گھر میں محسوس کر رہا ہوں "۔[1]

اور خاص بات یہ ہے کہ اس دور دراز قصبے میں اگر انہوں نے جو مشاعرہ پڑھا ، اپنی روایت کے بالکل برعکس اس کا کوئی معاوضہ قبول نہ کیا ۔[2]

ماہر القادری بڑے شفیق انسان تھے ۔ ملنے والا پہلی ہی ملاقات میں ان کی گرمجوشی اور اپنائیت سے متاثر ہو جاتا ۔[3] وہ شعراء حضرات کے عمومی مزاج کے برعکس بڑے جرات مند اور باصول انسان تھے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب موصوف کراچی آئے ہیں ، تو ان کے مالی حالات بہت خراب تھے ۔ ان کے بےتکلف اور مخلص دوست نخشب چار چوی لاہور اگر فلمی لائن سے وابستہ تھے ۔ انہوں نے ماہر سے اصرار کیا کہ فلموں کے لئے گانے لکھیں ، بارہ ہزار روپے کی فوری پیش کش بھی کی ، مگر ماہر نے صاف انکار کر دیا کہ اب یہ کام مجھ سے نہیں ہو گا ۔[4]

۱۔ فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۶۴

۲۔ لالہ صحرائی ایضاً ، ص ۱۶۳

۳۔ ایضاً ، ص ۱۶۲

۴۔ ماہر القادری فاران اکتوبر ۱۹۶۷ء ، ص ۳۹

اسی طرح فاران کے لئے سودی کاروبار کا کوئی اشتہار ، فلمی اشتہار ، یا تصویروں والے اشتہارات کسی بھی معاوضہ پر قبول نہ کرتے ۔[1]

ماہر کی جرات مندی کا یہ عالم تھا کہ ایوب خان کے دور میں انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ایک زور دار اداریہ لکھ دیا، حکومت کی طرف سے ایک عتاب نامہ نوٹس کی صورت میں جاری ہوا ، سید ہاشم رضا (اس وقت سیکرٹری اطلاعات و نشریات) اور بریگیڈیر ایف - آر - خان (ڈائریکٹر قومی تعمیر نو) نے زور دیا کہ ماہر ایک معذورت نامہ لکھ دیں ، معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا ، مگر ماہر نے معذرت لکھنے سے انکار کردیا ۔ سید ہاشم رضا کی کوششوں سے معاملہ ختم ہوا ۔[2]

ماہر القادری کی دوستی اور دشمنی صرف اللہ کے لئے اور اردو کی خاطر تھی۔ کسی کی تحریر یا قول و فعل میں شرک و بدعت کا شائبہ بھی دیکھتے ، تو اس پر گرفت اپنا فرض سمجھتے تھے ، لیکن اندازِ گرفت ہمیشہ خیر خواہانہ ہوتا ۔ یہی صورت زبان کے معاملے میں تھی ۔ زبان کی غلطی ان کی برداشت سے باہر تھی ۔ اس معاملے میں انہوں نے اپنی انتہائی محبوب شخصیت مولانا ابو الاعلی مودودی کو بھی معاف نہیں کیا ۔[3]

ماہر تنقید میں بڑے بے رحم تھے مگر ملاقات یا عمومی رویے میں وہ بڑی شائستگی، مروّت اور وضع داری کا مظاہرہ کرتے اور کوئی اندازہ نہ کر سکتا کہ یہی وہ ماہر ہیں جن کی تیغِ نقد نے کاٹ میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی ۔ وہ ہر جوہرِ قابل کی حوصلہ افزائی کرتے اور جس کے اندر کجی ان پر فاش ہو جاتی تو پھر ذاتی مراسم ان کی راہ میں حائل نہ ہوتے ۔[4]

۱۔ اقبال احمد صدیقی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۱

۲۔ شفیق بریلوی ایضاً ، ص ۱۵۵

۳۔ سید محمد صلاح الدین ایضاً ، ص ۲۸ ، ۲۹

۴۔ چودھری غلام جیلانی ایضاً ، ص ۳۲۰
نیز دیکھئے " ماہر کی تنقید اور تبصرے ")

ماہر بڑے مہمان نواز تھے - بےتکلف دوستوں کی دعوتیں کرتے رہتے - متنوع اور مزیدار کھانے تیار کراتے اور بڑی محبت اور اصرار سے کھلاتے -[1] خود بھی خوش خوراک تھے، مگر یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ۱۹۵۴ء میں جب حج کے سلسلے میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، شاہ سعود کی جانب سے شاہی ضیافت کا دعوت نامہ ملا ، مگر ماہر اس میں اس لئے شریک نہ ہوئے کہ اس سے حرمِ کعبہ میں عشا کی باجماعت نماز سے محرومی کا خدشہ تھا - کہنے لگے " میں اگر دعوت میں شریک ہوتا تو ایک لاکھ نمازوں کے ثواب سے محروم ہو جاتا "-[2]

موصوف کی وضع داری ، دوست نوازی اور منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب کہ لالہ صحرائی ان کے ہاں مہمان تھے اور دونوں حضرات مسجد میں نماز کے لئے گئے ، تو ماہر نے موصوف کا جوتا اٹھا کر محفوظ جگہ پر رکھ دیا اور اس میں اپنی کوئی سبکی محسوس نہ کی -[3]

لیکن ساری دینداری اور علمیت کے باوجود زاہد خشک نہ تھے - بذلہ سنج ، خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے اور ان کے وجود سے محفل کشتِ زعفران بنی رہتی اور سفر ان کی معیت میں بےحد پر لطف ہو جاتا -[4] اس برصغیر کا کوئی سیاسی ، علمی ، ادبی اور معاشرتی لطیفہ ایسا نہ تھا جو ان کے ذہن میں محفوظ نہ ہو - اگر کوئی اچھے لطیفے کو صحیح طور پر بیان نہ کرتا ، تو بد حظ ہو کر اس کی اصلاح کرتے -[5] ان کے لطائف سے سنجیدہ سے سنجیدہ حضرات محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتے اور بےاختیار ہنسنے لگتے -[6]

۱- اقبال احمد صدیقی فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۲

۲- اعجاز رحمانی ایضاً ، ص ۲۱۵

۳- لالہ صحرائی ایضاً ، ص ۱۷۰

۴- مولانا عبدالقدوس ہاشمی ایضاً ، ص ۲۵۹

۵- سید صباح الدین عبدالرحمٰن " معارف " جون ۱۹۷۸ء ، ص ۲۵۸

۶- چودھری غلام جیلانی " فاران " دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۰۶

لیکن اس کا مطلب یہ نہین کہ ماہر القادری معصوم عن الخطا اور کمزوریوں سے پاک تھے - وہ بہرحال انسان تھے اور بشری خامیوں سے مبرا نہ تھے - مثال کے طور پر وہ اپنی تحریروں مین کھانوں کا ذکر جا و بےجا کرتے ہین اور اکل و شرب کے حوالے سے اپنی معلومات کا اِس قدر چرچا کرتے ہین کہ اس مین تکرار اور ہلکا پن محسوس ہونے لگتا ہے - ثانیاً وہ ہر محفل مین سو جاتے تھے یا مجمع کے مذاق و فضا کا لحاظ کئے بغیر الفاظ و حروف اور لُغت و زبان کے غیر دلچسپ مباحث چھیڑ دیتے تھے[1] - ثالثاً موصوف سریع الاحساس تھے اور مزاج مین کسی قدر تیزی بھی تھی -[2] آخری عمر مین تو وہ الجھنے اور جھنجلانے بھی لگے تھے -[3]

۱- اسمٰعیل احمد مینائی ایضاً ، ص ۲۰۷

۲- وارث سرہندی ایضاً ، ص ۳۵۰

۳- اسمٰعیل احمد مینائی ، ایضاً ، ص ۲۰۷

باب - ۲

ماہر القادری کی نعت گوئی

نعت اور اس کے لوازمات

اب اس امر میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ نعت عُرفِ عام میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی مدح و ستائش میں لکھی جانے والی تحریر کو کہتے ہیں - جو بالعموم منظوم ہوتی ہے اور نعت دراصل ہدیہ تشکر ہے نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے بےحد و حساب اور متنوع احسانات کا جو آپ کی وجہ سے یا آپ کی وساطت سے عالمِ انسانی کو فیض یاب کر رہے ہیں -

ڈاکٹر ممتاز حسن نے بالکل درست لکھا ہے کہ :

" خدا کے جتنے احسان اولادِ آدم پر ہیں ، ان میں سب سے بڑا احسان ظہورِ محمدؐی ہے اور اولادِ آدم ہی پر کیا ، یہ احسان ساری کائنات پر ہے - محمّد بن عبداللّٰہ محسنِ اعظم ہی نہیں ، خود احسان عظیم بھی ہیں - ذاتِ محمدؐی کا ظہور کون و مکان کی تخلیق کا نقطۂ عروج ہی نہیں ، بلکہ منتہائے مقصود بھی ہے - ذاتِ محمدؐی الطافِ ایزدی کی سب سے بڑی مظہر ہے - وہ بجائے خود ایک رحمت ہے ، سب سے بڑی رحمت جس کے بغیر زندگی اور کائنات کی کوئی صورت مکمل نہیں "[۱]

چنانچہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تاریخِ انسانی کی وہ واحد ہستی ہے جو شخصیت اور کردار کی تمام جزئیات سمیت تمام نوعِ انسانی کے لئے تقلید و رہنمائی کا کامل ترین نمونہ ہیں - بچپن سے رحلت تک ان

۱- " خیر البشر کے حضور میں " از ڈاکٹر ممتاز حسن ، ادارہ فروغ اردو ، لاہور جنوری ۱۹۷۵ء ص ۲۰- ۲۱

کی حیاتِ مقدسہ کا ایک ایک رخ تاریخ مین مستند حوالون کے ساتھ محفوظ ھے اور مختلف شعبہ ھائے حیات مین اور ھر زمانے مین اس سے رھنمائی حاصل کی جا سکتی ھے ۔ ان کی زندگی کا ھر پہلو اُسی اسوہ حسنہ کا کامل نمونہ ھے جس کا ذکر خود قرآن نے کیا ھے۔[۱] چنانچہ بقول ڈاکٹر ممتاز حسن " اگر حضور کی زندگی چند مافوق الفطرت واقعات کا مجموعہ ھو کر رہ گئی ھوتی اور اس مین عام انسانون کے رنج و راحت ، مسرت و غم ، مصیبت اور کامرانی یہ سب موجود نہ ھوتے ، تو ھم بحیثیتِ انسان اس زندگی سے کوئی سبق نہ سیکھ سکتے "۔[۲]

چنانچہ نعت اُسی انسانِ کامل ، محسنِ اعظم اور ھادیٔ اکبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالی مین ھدیۂ عقیدت کا فطری اظہار ھے اور ممتاز حسن ھی کے الفاظ مین :

" نعتِ رسول کی بنیاد یا تو عشقِ ذات ھے یا ادراکِ صفات ۔ یا تو وہ ذات رسالت سے ایک گہری اور والہانہ جذبے کا اظہار ھے یا صفاتِ رسالت کی عکاسی ۔ دونون کا مقصد اور حاصل یہ ھے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کی شخصیت اورکردار ھمارے سامنے آئین اور ایک مثالی حیثیت سے زندگی مین ھمارے لئے مشعل راہ کا کام دین"۔[۳]

ایک مسلمان خواہ کتنا ھی گنہگارکیون نہ ھو اور نکبت و عصیان کی صورتِ حال سے دوچار ھو ، وہ دل کی انتہائی گہرائیون سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ھے اور زندگی کی ھر قیمتی چیز پر آپ کی حیثیت کو ترجیح دیتا ھے ۔ خصوصاً اگر ایک مسلمان شاعر ھے تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ھوتی ھے کہ وہ نبی صلی اللہ

۱۔ لقد کان لکم فی رسولِ اللہ اسوۃٌ حسنۃ ، (الا حزاب ، آیت ۲۱)

۲۔ خیر البشر کے حضور مین ، ص ۱۹ ، ۲۰

۳۔ ایضاً ، ص ۲۰

علیہ وسلم کی مدح کرے ، ان کے حضور خراجِ عقیدت پیش کرے اور ساری ذہنی صلاحیتیں
آپ کے اسم گرامی کا بول بالا کرنے مین صرف کر دے - چنانچہ عربی اور فارسی کی طرح اردو
مین بھی ہر دور کے شعراء نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا
ہے اور اس عمل مین بےانتہا جوش و اخلاص کا مظاہرہ کیا گیا ہے -

شعرائے کرام نے نعت مین آپ کے ہر ہر وصف کا ذکر کیا ہے - چونکہ نبی
اکرمؐ کے خصائل و شمائل اور حالات و واقعات تمام جزئیات سمیت تاریخ و سیرت کی کتابون
مین محفوظ ہین اور اس وصف مین ساری انسانی تاریخ مین کوئی آپ کا ہمسر نہین - اس
لئے آپؐ کے اوصاف و مناقب بیان کرنے کے لئے جتنا وسیع میدان میسر ہے ، اتنا کسی دوسری
ہستی کے لئے ممکن ہی نہین - پھر چونکہ ہر مسلمان شاعر کو آپ سے غیر معمولی عقیدت
و محبت کا تعلق ہوتا ہے ، اس لئے وہ بےپایان خلوص اور بے انتہا گرمجوشی کے ساتھ
آپ کی مدح کرتا ہے یہی سبب ہے کہ مسلمان ادباء و شعراء نے نثر و نظم دونون مین
آپ کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے خصوصاً شعراء نے تمام اصنافِ سخن کو اپنے پاکیزہ
جذبات کا ذریعہ بنایا ہے اور غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، قطعہ اور رباعی نعت کے نغمات
سے بھر پور نظر آتے ہیں -

نعت گو شعرائے کرام نے ، بقول جناب نثار احمد " آپ کے سراپا کی اتنی
تعریف کی ہے کہ جتنی کسی بھی محبوب ہستی کے لئے روا نہین رکھی گئی - آپ کے اوصافِ
حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ مثلاً شجاعت ، سخاوت ، ذہانت ، ذکاوت ، صبر و استقامت ،
تحمل و بردباری ، امانت ، فرض شناسی و راست گوئی ، استقامت و عزیمت اور جانبازی ،
انکسار و فروتنی ، فصاحت و بلاغت اور رحمت و رافت وغیرہ پر طرح طرح سے روشنی ڈالی ہے -
آپ کے خلق و مروت اور عفت و پاکدامنی کا وہ نقشہ پیش کیا ہے ، جس کی نظیر ملنا ناممکن
ہے - آپ کے جمالِ با کمال کے ساتھ ساتھ آپ کے افعال و اشغال کی بھی مکمل تصویر

پیش کی ہے "۔[1]

نعت گوئی کی نزاکتیں اور شرائط

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کہنا جہاں بہت بڑا اعزاز ہے ، وہاں اس موضوع کی نزاکتیں شاعر پر کئی طرح کی ذمہ داریاں بھی عاید کرتی ہیں ۔ اسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک " نعت کی شاعری سخن گوئی کی سب سے مشکل قسم ہے اس لئے کہ ہرشخص محبت کے اس مختص النوع جذبے سے آشنا ہوتا ہے نہ اس کے اظہار پر قادر ہو سکتا ہے ۔ اکثر نعت گو رسمی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں ، اس لئے ان کی شاعری ، اعلیٰ شاعری کے درجے تک نہیں پہنچ سکتی "۔[2]

ڈاکٹر تحسین فراقی نعت گوئی کی نزاکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" واقعہ یہ ہے کہ جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے والہانہ شیفتگی اور شدید جذباتی وابستگی نہ پائی جاتی ہو ، کامیاب نعت کہنا ناممکن ہے اور ظاہر ہے کامیاب نعت وہی ہے جس کے پڑھنے سے حضورؐ کی متحرک حیاتِ طیبہ اپنی تمام تر آب و تاب اور اپنے تمام محاسنِ جمیلہ اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ جلوہ گر ہو کر دامنِ دل کھینچنے لگے "۔[3]

اور معروف شاعر جناب مجید امجد کی رائے اس ضمن میں مندرجہ ذیل ہے :۔

" جنابِ رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ذرا سی لغزش نعت کو حدودِ کفر میں داخل کر سکتی ہے ۔ ذرا سی کوتاہی مدح کو قدح میں بدل سکتی ہے ۔ ذرا سا شاعرانہ غلو ضلالت کے زمرے میں آ سکتا ہے ۔ ذرا سا عجزِ بیان اہانت کا باعث ہو سکتا ہے ۔

۱۔ " نوائے سروش " (مجموعۂ نعت) مرتبہ نثار احمد سیرت کمیٹی کراچی ربیع الاول ۱۳۸۷ھ ص ۱۲-۱۵

۲۔ " درخت اور دریچے " از ڈاکٹر سید عبداللہ دارالادب چوک انارکلی لاہور ۱۹۶۷ء ص ۱۳۲ مضمون عارف بوصیری کے آنسو ۔

۳۔ ماہنامہ شام و سحر لاہور نعت نمبر جلد ۲ جنوری فروری ۱۹۸۲ء ، ص ۱۰۸

فنِ شعرکے لحاظ سے اس کام کے لیے کمالِ سخنوری اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس کے لئے کمالِ آگہی درکار ہے اور پھر ان دونون چیزون کو جلا جس چیز سے ملتی ہے وہ عشق کا سرمدی جذبہ ہے جو لفظون کو تجلیات سے بھر رہتا ہے اور معانیمین وسعتین سمو دیتا ہے ۔ یون نعت ایک مقدس آزمائش ہے ۔ بیانِ عقیدت کی رو سے جو ہرایمان کی آزمائش اور غایتِ غایات کی جستجو کے ضمن مین قوت و ادراک کا امتحان"۔[۱]

سید رفتار عظیم صاحب کی رائے بھی یہی ہے کہ " نعت گوئی شاعر کی سب سے بڑی آزمائش ہے ۔ یہ ایک لطیف ، نازک ، پاکیزہ اور پُرسوز صنف سخن ہے ۔ یہان مبالغہ یا خلاف واقعہ بات ہرگز نہین ہونی چاہیئے"۔[۲]

گویا نعت گوئی کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی مدح مین غلو اور افراط و تفریط سے پرہیز کیا جائے ۔ اگر آپ کی ذاتِ اقدس کو عبدیت کی حدود سے بڑھا کر اُلوھیت کے مقام پر پہنچا دیا جائے ، تو یہ چیز اللہ اور اس کے رسولؐ دونون کی ناراضگی کا باعث ہو گی اور ہلاکت وگمراہی کا سبب بن جائے گی ۔۔ اِسی طرح اگر آپ کے ادب و احترام مین سَرمُو بھی کمی ہو گی ، تو یہ بھی نحوست اور بدبختی کی علامت ہو گی ۔ اسی لیے ان دونون خطرات سے محفوظ رہنے کا یہی طریقہ ہے کہ نعت لکھتے وقت مضامین اور الفاظ کا کڑا انتخاب کیا جائے یعنی آپ کو ان اوصاف سے متصف نہ کیاجائے جو اُلوھیت کی ذیل مین آتے ہین ، نہ آپ کی طرف انباتون کا انتساب کیا جائے جو آپ کی اعلیٰ و ارفع شان کے منافی ہین ۔ اسی طرح الفاظکے انتخاب اور استعمال مین بھی کمال حزم و احتیاط سے کام لیا جائے ۔

۱۔ بحوالہ دیباچہ " مخزن نعت " (مجموعہ نعت) مرتبہ پروفیسر محمد اقبال جاوید علمی کتاب خانہ ، لاہور مارچ ۱۹۷۹ء ، ص ۳۸

۲۔ ایضاً ص ۲۳

نعت گوئی کے ضمن مین ایک اور احتیاط یا شرط یہ ملحوظ رکھی جانی چاھیئے کہ آپ کی تعریف مین مبالغہ سے کام لے کر دیگر پیغمبرون کی توھین نہ کی جائے ۔ آپ یقیناً امام الانبیاء ھین،مگر کسی بھی دوسرے پیغمبر کو نعوذ باللہ آپ کا کفش بردار یا آپ کے مقابلے مین "گدائے بےنوا" کہنا نعت گوئی کے تقاضون کے منافی ھے ۔

نعت گوئی کے سلسلے مین ایک اور شرط یہ ھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ھوئے قرآن و سنت سے رھنمائی حاصل کی جائے اور تحسین کی بنیاد معتبر اور ثقہ روایات پر رکھی جائے ، من گھڑت اور وضعی باتون سے احتراز کیا جائے ۔ بہت سے نعت گو شعراء نے اپنی منظومات میں آپ سے ایسی باتین منسوب کی ھین جن سے حقیقت کا دور کا بھی واسطہ نہین ھے ۔ یہ دراصل آپ کی تعریف نہین بلکہ بالواسطہ تنقیص ھے اور اس سے آپ کی توھین کا پہلو نکلتا ھے ۔

اسی طرح نعت کی ایک اور شرط یہ بھی ھے کہ زبان و بیان مین شاعرانہ لطافت اور فنی نکات کا بھی خاص احتیاط سے لحاظ رکھا جائے اور جذباتِ عقیدت کی فراوانی کو بھی خاص حدود سے متجاوز نہ ھونے دیاجائے ۔ ان دونون امور کو بیک وقت قائم رکھنا خاصا مشکل ھوتا ھے ۔ جس کی وجہ سے بقول نثار احمد صاحب :

> " کبھی نعت کا رنگ بالکل پھیکا پڑ جاتا ھے اور کبھی اتنا گہرا ھوتا ھے کہ آپ کی ذات مین رسالت و نبوت کی جھلک کی بجائے محبوب مجازی کا پر تو دکھائی دینے لگتا ھے ۔ بہت کم شعراء ایسے ھین جو اپنے جذبات کو ایسے انداز اور ایسے پُراثر طریقہ سے پیش کرنے مین کامیاب ھوئے ھین جس سے پڑھنے والے پوری طرح لطف اندوز اور متاثر ھو سکین ۔ ساتھ ھی شاعرانہ لطافت اور محاسن بھی قائم رکھ سکین ۔ ورنہ عموماً نعتین اتنی سپاٹ اور شعریت سے اس حد تک عاری ھوتی ھین کہ ان کو محض منظوم کلام کہا جاسکتا

ہے اور تبرک سمجھ کر ہی ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔[1]

چنانچہ ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ :

" صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصدِ نبوت سے دل بستگی پائی جائے - جس میں جنابِ رسالتمآبؐ سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو ، بلکہ حضورؐ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو - وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل ، قصیدہ ہو یا مثنوی ، رباعی ہو یا مثلث ، مخمس ہو یا مسدس ، اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ، البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدروقیمت کا دارومدار اس کے نفسِ مضمون پر ہے - اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالت کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دوجہاںؐ کی بعثت کی جو اہمیت نوعِ انسانی اور جملہ موجودات کے لیے ہے ، اسے نمایاں کرنا ہو ، تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے - پیکرِ رسالت سے قرب کا جذبہ یقیناً ایک نعتیہ پہلو رکھتا ہے ، البتہ اگر شاعر کی توجہ صرف حضور کے حسن و جمالِ ظاہری تک رہ جائے ، اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے کہ حضور کے قد کا سایہ نہ تھا ، یا حضورؐ کے سر کے بال آخر وقت تک سیاہ تھے تو اس شاعری کا درجہ وہ نہیں ہو گا جو حقیقی نعتیہ کلام کا ہو سکتا ہے۔[2]"

اردو شاعری میں نعت گوئی ، مختصر جائزہ

اردو میں نعت گوئی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اردو شاعری کی

١- درائے سروش ، ص ١٩

٢- خیر البشرؐ کے حضور میں ، ص ١٥ - ١٦

تاریخ ۔ چنانچہ دکن کے قدیم ترین شعراء کے ہاں بھی نعت کے متفرق اشعار مل جاتے ہیں۔ مگر دکنی دور سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک اردو کی نعتیہ شاعری محض فنی محاسن اور لفظی صنعت گری کا ایک ذخیرہ ہے جس کا مقصد اکثر و بیشتر ثواب کمانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اس میں حضورؐ سے عقیدت کا بے پناہ مظاہرہ تو نظر آتا ہے ، مگر اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت ، اور خلوص عقیدت کے نتائج کا اظہار بہت کم دکھائی دیتا ہے ۔ یعنی اس کے بیشتر موضوعات حضورؐ کے دربار میں حاضری کی خواہش ، پلکوں سے روضے کی جاروب کشی ، جالیوں کے چومنے یا آنحضورؐ کی سراپانگاری ، شکل و شمائلِ نبویؐ اور اپنی بخشش کی سفارش وغیرہ کے بیان تک محدود ہیں ۔ اس نوعیت کی نعتیہ شاعری کو ڈاکٹر تحسین فراقی " معراج و معجزہ کی دیندارانہ شاعری " قرار دیتے ہیں[1] اور اس کے مانندہ شعرا مثلاً امیر مینائی ، محسن کاکوروی ، شاد عظیم آبادی ، بیدم وارثی ، احمد رضا خان بریلوی، کرامت علی خان شہیدی ، غلام امام شہید اور شاہ نیاز احمد بریلوی کا بھی یہ عالم ہے کہ ان کی بیشتر نعت گوئی سراپا نگاری اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی محاسن سے آگے نہیں بڑھتی اور نعت گوئی کا اصل مقصد یعنی آپ کی سیرتِ مطہرہ سے فیض یاب ہونے کا شوقِ فراواں تشنۂ بیان رہ جاتا ہے ۔

چنانچہ محسن کا اگرچہ اردو نعت گوئی کی تاریخ میں بڑا اونچا مقام ہے اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری " فی الواقع محسن کا قصیدۂ لامیہ اردو شاعری کے بہترین قصیدوں میں سے ایک ہے "[2] اور وہ غیر معمولی فنی اور ظاہری خوبیوں سے متصف بھی ہے،

۱۔ ماہنامہ شام و سحر نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۱۰٦

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو کی نعتیہ شاعری مطبوعہ ۱۹۷۴ء ، آئینہ ادب انارکلی لاہور ص ٦۵ ۔

مگر جیساکہ ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں کہ محسن کا کوئی کی حیرت انگیز قادرالکلامی ایک کارنامہ سہی ، مگر واقعہ یہ ہے کہ نعت گوئی کا اصل مقصد پسِ پردہ ہی رہ جاتا ہے اور وہ مقصد ہے حضورؐ کی ذاتِ ستودہ صفات سے کامل وابستگی اور انؐ کی سیرت سے فیضان حاصل کرنے کی شدید خواہش کی تشویق و ترویج "۔[1]

اسی طرح اگرچہ امیر مینائی نے اپنی عمر کا آخری حصہ نعت کے لئے وقف کر دیا تھا اور اس سلسلے میں ایک نعتیہ دیوان ان کی یادگار ہے۔[2] مگر بقول ڈاکٹر ممتاز حسن ان کے ہاں بھی " زیادہ تر استادانہ صنعت‌گری پائی‌جاتی ہے"۔ خصوصاً انہوں نے " معراج پر جو کچھ کہا ہے اس میں زیادہ تر الفاظ پر زور ہے"۔[3]

" معراج و معجزہ کی دیندارانہ شاعری " کے طلسم سے اردو نعت کو صحیح معنوں میں مولانا الطاف حسین حالی (١٨٣٧ - ١٩١٤ء) نے نکالا ، انہوں نے جہاں اردو غزل کو نیا رخ عطا کیا اور اردو تنقید نگاری میں انقلاب برپا کیا ، وہیں اردو نعت کو بھی نئی جہتوں سے روشناس کیا اور بقول ڈاکٹر تحسین فراقی :-

> " اردو میں جدید نعت گوئی کا اولین سنگِ بنیاد حالی نے " مدوجزرِ اسلام " کی شکل میں رکھا اور یوں پہلی بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلاب انگیز شخصیت شعری روپ میں ہمارے سامنے آئی کہ اس سے والہانہ محبت کرنے کو جی چاہا ..... اس کو اپنالینے اور اس میں ڈوب جانے کی آرزو جاگی " ۔[4]

١- ماہنامہ شام و سحر لاہور نعت نمبر جلد ٢ ، ص ١٠٦

٢- اردو کی نعتیہ شاعری ، ص ٦٨

٣- خیر البشر کے حضور میں ، ص ٢٢

٤- شام و سحر نعت نمبر جلد ٢ ، ص ١٠٦ ، ١٠٧

چنانچہ ڈاکٹر ممتاز حسن بالکل درست لکھتے ھین کہ :

" میری رائے مین اردو مین کوئی نعت حالی کے مسدس کے برابر موجود نہین ھے "۔

وہ نبیون مین رحمت لقب پانے والا
مرادین غریبون کی بر لانے والا،
مصیبت مین غیرون کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیرون کا ملجا ضعیفون کا ماویٰ،
یتیمون کا والی ، غلامون کا مولیٰ [۱]

ان چند شعرون مین کوئی تکلف ، کوئی مبالغہ کوئی طباعی ، کوئی صنعتگری نہین ، مگر جو تاثر ان مین موجود ھے ، اس کی نظیر اردو شاعری مین نہین ملتی" [۲]۔

ڈاکٹر ممتاز حسن مزید لکھتے ھین :۔

" ان اشعار کو نعت کی حیثیت سے دیکھا جائے ، تو ان کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئے گی کہ ھر شعر مین رسالت کا پر تو ھے - سرورِ دو عالمؐ کو گیسوؤن والا ، اور کسی ایسے ھی پیارے نام سے خطاب کرکے جذباتِ عقیدت کی تسکین کی کوشش کرنا اور بات ھے اور حضورؐ کی بشر دوستی اور انسان نوازی کی طرف توجہ دلا کر دنیا کو مقصدِ نبوت سے آگاہ کرنا اور بات - یہی حالی کی عظمت ھے - ان مین عشقِ ذات اور شعورِ صفات دونون بیک وقت موجود ھین [۳] "۔

۱۔ مسدس حالی ۔ تاج کمپنی لاہور۔ س۔ن۔ ص ۱۵
۲- خیر البشر کے حضور مین ، ص ۲۲ ، ۲۳
۳- ایضاً ، ص ۲۳

مولانا حالی ایک باعمل مسلمان تھے ، انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجے کی محبت ہے ۔ قصیدہ نعتیہ میں اپنے اس جذبے کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

اگر بقیع میں گز بھر زمین میسر آئے
کروں نہ طول امل روضۂ جناں کے لئے [١]

چنانچہ اسی قصیدہ میں انہوں نے حضور سرورِ دوعالمؐ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ۔

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمت جہاں معدوم
رہا نہ تفرقۂ روز و شب زمان کے لئے
بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہ زن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لئے [٢]

حالی نے اپنی آنکھوں کے سامنے امتِ مسلمہ کو زوال و ادبار کے اندھیروں میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا ۔ چنانچہ " مدّ و جزرِ اسلام " کے اخیر میں وہ نظم دکھائی دیتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں " عرضِ حال " ہے ، مگر دراصل " یہ اردو کا پہلا نعتیہ شہرآشوب ہے "۔[٣] شاعر نے نہایت کرب اور غیر معمولی دُکھ کے ساتھ مسلمانوں کی پستی و رسوائی کا نقشہ کھینچا ہے ۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے [۴]

١- کلیات نظم حالی جلد اول مطبوعہ مجلس ترقی ادب ، لاہور ١٩٦٨ء ، ص ٢٥٧
٢- ایضاً ، ص ٢٥٥ ، ٢٥٦
٣- ڈاکٹر تحسین فراقی ، شام و سحر نعت نمبر جلد ٢ ، ص ١٠٧
۴- مسدسِ حالی ۔ ص ١٢٥

چنانچہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا حالی نے نہایت خلوص ، بے پایاں محبت اور والہانہ شیفتگی سے نبی اکرمؐ کی مدح فرمائی ہے جس میں امتِ مسلمہ کے عمدہ عروج ادبار و زوال نے گہرے کرب اور دکھ کا احساس بھر دیا ہے۔ ایک عاشقِ رسول اور امت محمدیہ کے ایک سچے غمگسار کی حیثیت سے حالی کی نعت اردو شاعری کا بیش قدر سرمایہ ہے۔

.....

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) مولانا حالی کے معاصر ہیں - وہ فلسفی ، نقاد ، ادیب ، مورخ ، ماہرِ تعلیم اور فقیہ بھی تھے ، مگر ان کی شاعرانہ حیثیت بھی اپنی ایک اہمیت رکھتی ہے - وہ عربی ، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے - نبی اکرم سے گہری قلبی محبت رکھتے تھے اور "سیرت النبیؐ" اس کا واضح اور بین اظہار ہے۔ ۱۹سال کی عمر میں انہوں نے حج کیا اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران فارسی میں ایک نعتیہ قصیدہ بھی لکھا جو حب رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے[۱]۔

"کلیات شبلی"(اردو)[۲] میں سیرتِ مطہرہ کے حوالے سے پانچ نظمیں ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں - یہ نظمیں قصیدے کی ہیئت میں ہیں اور جوشِ بیان ، حسنِ کلام اور سلاست و روانی کے اعتبار سے قابلِ غور ہیں - ان نظموں میں پیغمبر اسلامؐ کی سیرت پاک کے مختلف گوشوں یعنی مساوات ، عدل ، عفوو درگزر کو موضوع بنایا گیا ہے اور جیساکہ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے اصول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا ، دوسری طرف ہماری

۱- "تذکرہ نعت گویانِ اردو" جلد دوم مرتبہ پروفیسر یونس شاہ مطبوعہ مکہ بکس ، لاہور نومبر ۱۹۸۴ء ، ص ۱۲۰ -

۲- مطبوعہ داتا پبلشرز ، لاہور ، س - ن

زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کے بہترین نمونے پیش کئے ۔ اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو ، مگر مولانا کی نظموں نے یہ دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے ، عموماً ان نظموں میں روایت کے الفاظ کا ٹھیٹ ترجمہ کر دیا گیا ہے ، پھر بھی کمال یہ ہے کہ خوبیٔ ادا اور تعبیر میں شاعری کا پورا زور ہے "۔[1]

اور بالکل درست لکھا ہے ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق نے کہ :

" علامہ نے نعت کو صرف والہانہ تصدیق ، جذب اور شوق کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے اخلاقی اور تاریخی رنگ دے کر اس میں انتہائی خوبی اور بلندی پیدا کی "۔[2]

مولانا حالی کے بعد اردو نعت کے دوسرے بڑے مجدّد علامہ اقبال ہیں[3] ۔ اقبال کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو گہرا قلبی و روحانی تعلق تھا وہ محتاجِ بیان نہیں، چنانچہ انہوں نے جگہ جگہ رسالتمآبؐ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ۔ ان منظومات میں والہانہ محبت اور سپردگی کا عجیب انداز ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب ،
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ ،
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب [4]

۱۔ مقدمہ کلیات شبلی (اردو) ایضاً ، ص ۱۹

۲۔ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق ، اردو میں نعتیہ شاعری ، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی، اکتوبر ۱۹۷۶ء ، ص ۳۷۱ ، ۳۷۲

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ماہنامہ شام و سحر نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۱۰۷

۴۔ کلیات اقبال اردو مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ، ص ۱۱۳

اور ذیل کے اشعار تو بقول ڈاکٹر ممتاز حسن نعت کی معراج ھین - [1]

وہ دانائے سبل ، ختم الرسل ، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی مین وھی اوّل ، وھی آخر،
وھی قرآن، وھی فرقان ، وھی یٰسین وھی طٰہٰ [2]

ملتِ اسلامیہ کی ھمہ نوع پریشانگی اور کس مپرسی کے دردناک مناظر اقبال کو تڑپاتے ھین تو وہ دربارِ نبیؐ مین فریاد کرتے ھین -

شیرازہ ھؤا ملت مرحوم کا ابتر،
اب تو ھی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے،
ھر چند ھے بے راحلہ و قافلہ و زاد،
اس کوہ و بیابان سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے [3]

ان کے علاوہ مختلف نظمون اور اشعار مین علامہ اقبال نے ھی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ھدیہ محبت پیش کیا ھے اور ھر مقام پر ان کا اسلوب جداگانہ اور منفرد ھے اور ان کے .... کلام کی یہ نعتیہ خصوصیت بھی انھین مجتہدانہ حیثیت بخش دیتی ھے -

اقبال کو نعت مین یہ " مجتہدانہ حیثیت " اس لیے حاصل ھوئی کہ :
بقول فقیر سید و حید الدین:

۱- خیر البشر کے حضور مین ، ص ۳۲
۲- کلیات اقبال اردو ، ص ۳۱۷
۳- کلیات اقبال اردو ، ص ۵۱۰ (ضرب کلیم ص ۳۸)

" عشقِ رسولؐ اقبال کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور ان کے ذہن و فکر پر چھا گیا تھا ۔ وہ کتنے بڑے فلسفی تھے اور فلسفے کا سارا معاملہ عقل کے بل بوتے پر چلتا ہے ، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو وہ عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی کوشش نہ کرتے تھے ۔ اس معاملے میں وہ ایمان بالغیب کے قائل تھے ۔ پس جو حضور نے فرمایا وہ دین و ایمان اور سر آنکھوں پر۔ اس بارگاہ میں چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں " ۔[1]

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی علامہ اقبال کی نعت کے متعدد نمونے نظر آتے ہیں جن میں علامہ کا مخصوص اسلوب پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے ، مگر اس کا مطالعہ میرے موضوع سے خارج ہے ۔

.....

اکا دکا مثالوں کے سوا اقبال نے براہِ راست نعت گوئی نہیں کی بلکہ بالواسطہ انداز میں نبی اکرمؐ سے گہری محبت کا اظہار کیا ہے یا آپ کی عظمت کی جانب اشارے کئے ہیں ۔ مثال کے طور پر بلالؓ کے عنوان سے بانگ درا میں دو نظمیں ہیں جن میں حضور رسالتمآبؐ کی رحمت و رافت اور علوِشان بیان ہوئی ہے ۔

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا ،
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی ۔[2]

۱۔ فقیر سید وحید الدین ، روز گار فقیر جلد اول از ، مطبوعہ لائن آرٹ پریس ، کراچی ۱۹۶۴ ص ۹۵

۲۔ کلیات اقبال (اردو) ، ص ۸۰

دوسری نظم مین شہنشاہِ روم سکندر اور حضرت بلال رض کی شخصیات کا موازنہ کیا گیا ہے اور آخیر مین نبی اکرم ص کے حوالے سے حضرت بلال رض کا سکندر پر تفوق یون ثابت کیا ہے -

اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا ، حبشی کو دوام ہے -[1]

اس طرح نظم " طرابلس " مین بھی حضورؐ اور سرزمینِ حجاز سے گہری قلبی وابستگی کا اظہار نظر آتا ہے " اور شفا خانہ حجاز " کا آخری شعر تو نعتیہ شاعری کا عجیب و غریب نمونہ ہے -

اورون کو دین حضور یہ پیغامِ زندگی
مین موت ڈھونڈتا ہون زمینِ حجاز مین[2]

اردو نعت مین اقبال کے متوازی جو نام بڑا نمایان نظر آتا ہے وہ مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۰ - ۱۹۵۶ء) ہین۔ مولانا ایک بلند پایہ صحافی ، عظیم قومی رہنما اور قادر الکلام شاعر تھے - ان کی منظومات کے تین مجموعے ہین بہارستان ، چمنستان اور نگارستان اور متفرق نعتیہ نظمین انہی مجموعون مین بکھری ہوئی ہین - مولانا بھی ایک باعمل مسلمان اور سرفروش مجاہد تھے اور ہمعصر تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی چنانچہ ایک طرف ان کی نعتون مین ہمین علامہ اقبال کی طرح نبی اکرم ص سے والہانہ عقیدت ، شیفتگی اور سوز و گداز دکھائی دیتا ہے اور دوسری جانب ان کے ہان حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے پہلو مقابلۃً زیادہ اجاگر ہوئے ہین - اس طرح ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول " آج کی

۱- کلیات اقبال (اردو) ص ۲۴۱

۲- ایضاً ، ص ۱۹۸

جدید ترین اردو نعت پر اقبال سے بھی زیادہ مولانا ظفر علی خان کا فیضان واضح نظر آتا ھے ۔[1] چنانچہ مولانا کی نعتوں مین ھمین ایسا درد ، سوز اور اضطراب نظر آتا ھے جو ان کے ذاتی احساسات سے زیادہ غلامی اور نکبت و افلاس کا نتیجہ دکھائی دیتا ھے " عرضِ حال بدرگاہ رب العزت بتوسط حضور خواجہ دوجہان " مین اسی نوعیت کا اندوہناک منظر ھے جس مین شاعر پہلے تاریخ کے اس سنہرے دور کو یاد کرتا ھے جب نبی اکرم ؐ کی برکت سے مسلمانون کو غیر معمولی عروج حاصل ھوا تھا اور ان کی عظمت و شوکت کا پرچم پوری دنیا مین لہرا رھا تھا ' مگر پھر بدقسمتی سے زوال کی کالی رات چھا گئی جس مین تباھی و بربادی کے خوفناک سانپ لہراتے محسوس ھوتے ھین ۔ اِس عالم مین مولانا حضور ؐ سے فریاد کناں ھین ۔

اے کہ میرا روان روان درد مین ھے بسا ھوا ـــــ ،
کس کو ترے سوا سنائین جاکے اپنی مشکلات ـــــ ،
سر پر اندھیری رات ھے گھر گئی ھے بھنور مین ناؤ
موج بلا ھے تاک مین دور ھے ساحل نجات ـــ ،[1]

اسی سے ملتا جلتا منظر ایک دوسری نظم " فریاد بحضور سرورِ کونین ؐ " مین جلوہ فرما ھے ۔ بلکہ یہ نظم اس اعتبار سے اپنے اندر آج بھی تازگی لئے ھوئے ھے کہ بدقسمتی سے امتِ مسلمہ کے جو حالات اُس وقت تھے ، آج کل بھی اُسی نوعیت کی صورتِ حال نظر آتی ھے ۔ عالمِ اسلام بظاھر آزاد ھے ، مگر بدترین قسم کی تہذیبی اور بالواسطہ سیاسی غلامی مین جکڑا ھوا ھے ۔ یورپین طاقتون کی سازشین آج بھی عروج پر ھین اور افغانستان فلسطین ، اریٹریا اور ھندوستان مین خونِ مسلم آج بھی ارزان ھے ۔

۱۔ شام و سحر نعت نمبر ۲ ص ۱۰۸

اے خاورِ حجاز کے رخشندہ آفتاب ،

صبحِ ازل ہے ، تیری تجلی سے فیض یاب ۔ ،

خیر البشر ہے تو ، تو ہے خیرالامم وہ قوم

جس کو ہے تیری ذاتِ گرامی سے انتساب

مغرب کی دستبرد سے مشرق ہوا تباہ ۔ ،

ایمان کا خانہ کفر کے ہاتھوں ہوا خراب

صدہا ترے غلام نصاریٰ کی قید میں

دن زندگی کے کاٹ رہے ہیں بصد عذاب

اے قبلۂ دو عالم واے کعبۂ دو کون

تیری دعا ہے حضرت باری میں مستجاب

یثرب کے سبز پردے سے باہر نکال کر

دونوں دعا کے ہاتھ بصدکرب و اضطراب

حق سے یہ عرض کر کہ ترے نا سزا غلام

عقبیٰ میں سرخروہوں تو دنیا میں کامیاب ۔[۱]

مولانا ظفر علی خان کی ایک مقبولِ عام نعت کا مطلع یوں ہے ۔۔۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو ۔۔۔

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

۱۔ خیالستان ، مکتبہ کاروان ، کچہری روڈ ، لاہور سن ۔ ن ، ص ۱۶-۱۷

اس کے آخری اشعار مین بھی فریاد کا انداز کار فرما ہے ۔

گرتے ہوؤن کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے

اے تاجدارِ یثرب و بطحا تمہی تو ہو

بھٹا سنائین جاکے تمہارے سوا کسے

ہم بے کسانِ ہند کے ملجا تمہی تو ہو ۔[۱]

مولانا ظفر علی خان کی اس نعت نے بھی بڑی شہرت حاصل کی جس کا مطلع

ہے ۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غارون مین ،

اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے دربارون مین ۔[۲]

....

نعت کا دورِ جدید

مولانا حالی ، شبلی ، علامہ اقبال اور ظفر علی خان کی نعت گوئی نے اس صنفِ سخن مین ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا ۔ خصوصاً تحریکِ پاکستان کے ساتھ اسلام کی گہری وابستگی اور پھر قیام پاکستان کے روح پرور واقع نے سلامتِ طبع رکھنے والے محب وطن اور محبِ اسلام شعراء کوغیر معمولی انداز مین متاثر کیا اور وہ خاص وارفتگی اور ذوق وشوق

۱۔ بہارستان ، کتب خانہ مقبول عام ، لاہور ، جون ۱۹۶۵ء ، ص ۹

۲۔ ایضاً

سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات کا ذکر کرنے لگے ۔ چنانچہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے الفاظ میں " تخلیق پاکستان کے بعد اردو نعت گوئی نے جس تیزی سے ترقی کے مراحل طے کئے ہیں وہ اردو شاعری کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے"[1] ۔ چنانچہ بہت سے شعراء نے اپنی نعتوں کے مجموعے مرتب کئے جو کمیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے قابل قدر ہیں اور تعداد میں ایک سو سے تجاوز کر چکے ہیں ۔

ان شعرا میں سے چند کے نام ذیل میں دیئے جا رہے ہیں :۔

حفیظ جالندھری ، نصر اللہ خان عزیز ، ماہر القادری ، احسان دانش ، عبدالکریم ثمر ، محمد عبداللہ نیاز ، علامہ اسد ملتانی ، محشر رسول نگری ، شورش کاشمیری ، نعیم صدیقی ، حفیظ تائب ، عبدالعزیز خالد ، یوسف ظفر ، انجم رومانی ، عاصی کرنالی ، غافل کرنالی ، عارف عبدالمتین ، طفیل ہوشیارپوری ، حافظ مظہر الدین ، راز کاشمیری ، رحمان کیانی ، حافظ لدھیانوی ، حافظ محمد افضل فقیر ، اعجاز رحمانی ، مظفر وارثی ، علیم ناصری ، خالد بزمی ، غلام رسول ازہر ، قیوم نظر ، عزیز حاصلپوری ، آسی ضیائی ، احمد ندیم قاسمی ، انور سدید ، سیف زلفی ، خالد احمد ، بشیر منذر ، مسرور کیفی ، حفیظ الرحمن احسن ، خورشید رضوی ، غلام رسول عدیم ، حفیظ صدیقی ، انور جمال ، ریاض حسین چوہدری ، یزدانی جالندھری ، گوہر ملسیانی ، جعفر بلوچ ، عابد نظامی ، راجہ رشید محمود ، آفتاب نقوی ، جلیل عالی ، عطاالحق قاسمی ،

۱۔ شام سحر" نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۱۰۹

قدیم نعت گو شعراء کے برعکس جدید نعت گوئی کا امتیازی فرق یہ ہے کہ اس میں :-

(۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سراپا نگاری اور معجزہ نگاری کا رجحان تقریباً ختم ہو گیا اور محض ثواب کی خاطر نعت گوئی کا دَور اپنے انجام کو پہنچ گیا - اس کی بجائے اصل توجہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری پر دی جانے لگی یعنی آپ کا بےپناہ حُسنِ اخلاق ، اپنوں بیگانوں سے رحمت وکرم کا انداز ، فیاضی ، سیر چشمی ، عفو و درگزر ، ایثار ، نعت کے پسندیدہ موضوعات بن گئے -

(۲) آج عالمِ اسلام جن مسائل میں گھرا ہوا ہے اور آج کا انسان جس روحانی کرب سے دوچار ہے ، جدید نعت گو شعراء نے اپنی نعتوں میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اس طرح بعض صُورتوں میں بقول ڈاکٹر تحسین فراقی " جدید نعت نے شہر آشوب کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے "[۱] بالفاظِ دیگر جدید نعت فرد سے لے کر ملت اسلامیہ تک کے اجتماعی مسائل سے پیدا ہونے والے گہرے کرب اور درد سے مرتب ہوتی ہے -

(۳) جدید نعت میں عبد اور معبود کے حفظِ مراتب کا گہرا شعور پایا جاتا ہے - قدیم نعت میں صوفیا کے زیر اثر غلو اور عدم احتیاط کی فضا عام تھی اور خدا اور رسول کا امتیازی فرق نظر انداز کر دیا گیا تھا - " احمد بےمیم " کا گمراہ کن تصور عام تھا اور توحید کے تقاضوں کو بری طرح مجروح کیا جاتا تھا ، مگر جدید نعت اس قسم کی توہم پرستی سے آزاد ہو گئی - یہاں نبی اکرمؐ کی تمام تر عظمتوں کا اعتراف ہے مگر اس تیّن

۱- شام و سحر ، نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۱۰۶

حقیقت کے ساتھ کہ وہ بہرحال اللہ کے بندے اور انسان تھے ۔

(۴) قیامِ پاکستان کے بعد یہاں اسلامی نظام کی تحریک شروع ہو گئی ۔ اور طاقتور اور موثر اسلامی لٹریچر نے تعلیم یافتہ طبقے کی بڑی تعداد کو قائل کر لیا کہ اسلام محض نماز روزے کا مذہب نہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم محض داعیٔ اخلاق نہیں تھے ، بلکہ انہوں نے انسانیت کو ایک مکمل ضابطۂ حیات اور نظام سیاست و تمدن بھی مرحمت فرمایا ہے ۔ چنانچہ بہت سے شعرائے کرام نے اپنی نعتوں میں جہاں حضور سرورکائنات کے اخلاقِ کریمانہ اور سیرتِ طیبہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ، وہاں یہ بھی وضاحت کی کہ انسانیت کے مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک دنیا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام جاری نہیں کیا جاتا اور معاشرتی نظام آپ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں استوار نہیں کیا جاتا ۔ ان شعرا میں خصوصاً ملک نصر اللہ خان عزیز ، ماہر القادری ، احسان دانش ، نعیم صدیقی ، محشر رسول نگری ، حفیظ تائب ، راز کاشمیری ، خالد بزمی ، عاصی کرنالی ، حفیظ الرحمن احسن ، اعجاز رحمانی اور جعفر بلوچ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

(۵) جہاں تک ہیئت اور اسلوب کا تعلق ہے ، قدیم نعت کا بیشتر حصہ قصائد اور مثنوی کی صورت میں ملتا ہے ، مگر اس کے برعکس جدید نعت میں بالعموم غزل کا انداز اختیار کیا گیا ۔ جدید ہیئتوں کے تجربے بھی ہوئے خصوصاً بعض بہت کامیاب اور خوبصورت آزاد نعتیہ نظمیں لکھی گئیں ۔

عہدِ حاضر کے چند نمائندہ شعراء

اب عہد حاضر کے چند نمایاں اور نمائندہ شعراء کی نعت گوئی کا جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ان کے تناظر میں ماہر القادری کی نعت کا محاکمہ کیا جا سکے ۔ حالی ، اقبال اور ظفر علی خان کے اثر سے جدید نعت گوئی کا قافلہ باقاعدہ رواں دواں ہو گیا اور اس سلسلے کا پہلا بڑا نام ابوالاثر حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ - ۱۹۸۲ء) کا ہے ۔ اور " شاہنامہ اسلام " ان کا شاہکار ہے جو عہدِ رسالت کی تاریخ پر مبنی چار جلدوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے ۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۲۹ء میں اور دوسری جلد ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی ۔ آخری جلد ۱۹۳۸ء میں منصۂ شہود پر آئی جو شہدائے احد کے حالات سے لے کر جنگ احزاب کی تفصیلات پر مشتمل ہے ۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ " حفیظ نے تاریخِ اسلام کو جس واقعیت اور جوشِ محبت کے ساتھ نظم کیا ہے ، اردو میں کسی اور کے یہاں اس کی مثال نہیں ملتی "۔[1] وہ رقمطراز ہیں کہ شاہنامہ اسلام " کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ حفیظ نے اس کے سارے اجزاء کو بڑی امنگوں اور بڑے ولولوں کے ساتھ حد درجہ صاف ستھری زبان اور دلآویز لب ولہجہ میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے ۔ نتیجۃً اس کے بہت سے ٹکڑے نہایت خوبصورت اور پُرزور و پراثر شاعری کا نمونہ بن گئے ہیں ۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ حفیظ نے اصل واقعات سے تجاوز نہیں کیا ۔ بلکہ زیادہ تر وہ روایتِ صحیحہ کے حدود میں رہے ہیں ۔" شاہنامہ

۱- اردو کی نعتیہ شاعری مقدمہ ، ص ۱۰۲ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۔

اسلام کے حاشیائی نوٹ بتاتے ہین کہ انہون نے جو کچھ کہا ہے زیادہ تر قرآن و حدیث ہی کو رہنما بنا کر کہا ہے ۔ حفیظ کا کمال یہ ہے کہ انہون نے اصل واقعات کو مسخ کئے بغیر ان مین شاعری کا جادو جگایا ہے"۔[۱]

فکرو فن کی ان خوبیون کے ساتھ شاہنامہ اسلام مین حالات و واقعات کی مناسبت سے شاعر نے جہان جہان نبی اکرمؐ کا ذکر کیا ہے ، عقیدت و محبت کی ایک دنیا آباد کر دی ہے اور حضورؐ کی سیرتِ اقدس منور و نمایان ہو کر نظرون کے سامنے آ جاتی ہے ۔ چنانچہ جلد اوّل مین وہ اشعار خصوصاً قابل ذکر ہین جو حضورؐ کی ولادت با سعادت کی مناسبت سے کہے گئے ہین اور جن مین ہادیٔ اعظمؐ کے آئندہ انقلابی اقدامات کی طرف اشارے کئے گئے ہین ۔ یعنی حضورؐ کی آمد سے کس طرح اجڑی بستیان آباد ہو گئین اور بے نواؤن ، ضعیفون ، یتیمون ، مظلومون اور غلامون کی خزان کس طرح بہارون مین تبدیل ہو گئی[۲]۔

ایک دوسرے مقام پر شاعر کتنے والہانہ انداز مین نبی اکرمؐ کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے ۔ اس مین ہدیۂ درود و سلام بھی ہے اور سیرتی پہلوؤن پر بھی گہری روشنی ڈالی گئی ہے ۔

زبان پر اے خوشا صلِّ علیٰ یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نام جبریلِ امین لے کر سلام آیا
محمدؐ جانِ عالم ، فخرِ آدم ، ہادیٔ اکرم — امامُ الانبیاء، خیر البشر ، پیغمبرِ اعظم

۱۔ اردو کی نعتیہ شاعری مقدمہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، ص ۱۰۲

۲۔ دیکھئے شاہنامۂ اسلام ۔ جلد اوّل مکتبہ تعمیرِ انسانیت ، لاہور ۱۹۸۵ء ص ۱۱۲

محمدؐ صاحبِ خلقِ عظیم و ناشرِ حکمت　　محمدؐ مصدرِ فیضِ عمیم و شافعِ امت

محمدؐ دیدہ و دل کی تجلّی بہرِ مہجوران　　محمدؐ آخری حرفِ تسلی بہرِ مزدوران

محمدؐ بیکسی کے درد کو پہچاننے والا　　سرشکِ گرم و آہِ سرد کو پہچاننے والا

محمدؐ زورِ معبودانِ باطل توڑنے والا　　محمدؐ حق سے رشتہ آدمی کا جوڑنے والا ۔[1]

حفیظ کی وہ نظم بھی اپنی معنویت ، ذوق و شوق اور زورِ کلام کے اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے جس میں انہوں نے نبی اکرم کے حضور سلامِ نیاز پیش کیا ہے ۔ اس سلام نے عوام و خواص میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی ۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی　　سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوعِ انسانی

سلام اے ظلِ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی　　ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی

تیرے آنے سے رونق آ گئی گلزارِ ہستی میں　　شریکِ حالِ قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ　　تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

اگرچہ "فقر" فخری رتبہ ہے تیری قناعت کا　　مگر قدموں تلے ہے فرِ کسرا ئی و خاقانی

ترا در ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو، ترا گھر ہو　　تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے ،

سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے[2]

. . . .

حفیظ جالندھری کے بعد اردو نعتگوئی میں دوسرا بڑا نام ملک نصر اللہ خان عزیز کا نظر آتا ہے ۔ موصوف (۱۸۹۷ - ۱۹۷۶ء) صفِ اول کے صحافی[3] ، صاحبِ طرز طنّاز،

۱۔ شاھنامہ اسلام ، جلداول، ص ۱۱۳

۲۔ ایضاً ، ص ۱۱۴

۳۔ "مدینہ" بجنور کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے خاص شہرت پائی " زمیندار " کوثر " اور ایشیا " سے بھی وابستہ رہے ۔

نامور شاعر اور صاحبِ دل نعت گو تھے "کاروانِ شوق" [1] ان کا مجموعۂ کلام ہے جس میں سات نعتیں بھی شامل ہیں جن میں پہلی ۱۹۲۹ء [2] میں اور باقی بعد میں لکھی گئیں -

نصراللہ خان عزیز ایک باعمل مسلمان اور راست فکر صحافی اور سیاست دان تھے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت اور محبت کا رنگ بڑا گہرا ہے وہ حضور کی محبت کو دونوں جہانوں کی کامیابی قرار دیتے ہیں اور آپ کی سیرتِ مطہرہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں -

غمِ فراقِ نبی میں جو بے قرار ہوا — وہ انبساطِ دو عالم کا رازدار ہوا
میں تیرے حسنِ تکلم پہ جان دیتا ہوں — کہ بات سنتے ہی دشمن بھی غمگسار ہوا
خدا نے عزتِ دارین کی عطا اس کو — جو تیری عزت و ناموس پر نثار ہوا [3]

ایک دوسری نعت میں بھی شاعر کا یہی مِلا جُلا انداز نمایاں ہے یعنی سیرت کا بیان اور حسنِ عقیدت -

تو نے دیا وہ درس مساواتِ عام کا
باقی نہ کہتری ہی رہی اور نہ مہتری
تو پیکرِ جمال ہے تو پیکرِ جلال
تجھ کو خدا نے بخشی ہے ہر ایک برتری
ممکن نہیں کہ تیری ثنا ہوسکے، مگر
یہ قول تیری مدح میں ہے، حرفِ آخری

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" [4]

۱- مطبوعہ "المحراب" سمن آباد، لاہور - جون ۱۹۶۹ء،
۲- کاروانِ شوق ، ص ۲۰
۳- ایضاً ، ص ۲۲
۴- ایضاً ، ص ۲۴

نصر اللہ خان عزیز بھی اس المیے کا گہرا احساس رکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہوتے ہوئے مسلمان غیروں کے محکوم ہو گئے - اس کا اظہار وہ فریاد اور شہرآشوب کی صورت میں یوں کرتے ہیں -

وہ قوم جس کا شجر تو نے خون سے سینچا ،
وہ جس کے غم میں تو راتوں کو اشکبار ہوا
وہ جس کے غم میں ترے بال تک سفید ہو ئے
تر حق سے جس کی شفاعت کا خواستگار ہوا
لقب دیا جسے خیر الامم کا خالق نے
وجس کے واسطے فردوس ہے قرار ہوا ،
وہ قوم آج ذلیل و خراب اتنی ہے
زمین کی پشت پہ اس کا وجود بار ہوا
بلند پھر یہ تری قوم برملا ہو جائے ،
حضور حق میں جو اس کے لئے دعا ہو جائے [1]

فنی نقطہ نظر سے عزیز کا اسلوب جاندار اور متاثر کرنے والا ہے - انہوں نے عقیدت کے جوش میں فن کے تقاضوں کو مجروح نہیں ہونے دیا اور بقول گوہر ملسیانی سادگی اور سلاست کے لحاظ سے بعض نعتیں تو بےمثال ہیں "[2]

ملک نصراللہ خان عزیز کے بعد نعت گو حضرات کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے جو دربارِ رسالت میں ہدیہ درود و سلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے

۱- کاروان شوق ، ص ۲۳
۲- " عصر حاضر کے نعت گو " مرتبہ گوہر ملسیانی مطبوعہ گوہر ادب صادق آباد ، ۱۹۸۳ء ، ص ۹۲

دکھائی دیتے ہین ۔ ان مین ماہر القادری ، حافظ مظہر الدین ، احسان دانش ، محشر رسول نگری ، نسیم صدیقی ، حافظ لدھیانوی ، رحمان کیانی ، عبدالعزیز خالد ، عاصی کرنالی ، حفیظ تائب ، راز کاشمیری ، خالد بزمی ، مظفّر وارثی ، عبدالکریم ثمر نے نعت گوئی مین خاص مقام حاصل کیا ۔ خصوصاً حافظ مظہر الدین (۱۹۱۲ - ۱۹۸۱ء) نے ساری شاعرانہ صلاحتین مدحتِ پیغمبر کے لئے وقف کر دین اور "تجلیات" " جلوہ گاہ" اور "بابِ جبریل" کے نام سے نعتون کے تین مجموعے یادگار چھوڑے ۔ حافظ صاحب سچے عاشقِ رسول ص ہین اس لئے انہون نے جو کچھ کہا دل کی گہرائیون مین ڈوب کر کہا ۔

؎ انہی کا ذکر ہے میرے سخن کا عزّ و شرف
انہی کا فیض ہے میری کلام کی تاثیر ۔[1]

؎ دور دور تک ان کے علم کی بٹتی دولت
دور دور تک پہنچا فیض ان کے سینے کا

؎ زیست کی راہون مین ظلمت کے سوا کچھ نہ تھا
اے عرب کے چاند ، تیری چاندنی کام آ گئی[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی مین جو انوکھا انقلاب برپا کیا ، اُسے حافظ مظہر الدین یون خراج تحسین پیش کرتے ہین ۔

تیری رحمت نے گداؤن کو بنایا سلطان ۔ ،
تری تدبیرون کی نوعِ بشر کی تنظیم
خالقِ سیرت و کردار ہین تیرے افکار ۔،
ضامنِ عدل و مساوات ہے تیری تعلیم[3]

۱۔ ماہنامہ شام و سحر لاہور ۔ نعت نمبر ۲ جنوری فروری ۱۹۸۲ء ص ۲۶۳

۲۔ تجلیات " ضیاء القرآن ، پبلیکیشنز ، لاہور ، ۱۹۸۳ء ، ص ۲٦

۳۔ ایضاً ص ۹٦

حافظ مظہر الدین کی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے بالکل درست لکھا ہے کہ حافظ مظہر الدین نے جس چاہت و خلوص، وارفتگی اور شیفتگی اور یکسوئی و توجہ کے ساتھ سیدِ کونین کی مدحت کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے ۔[1]

جناب احسان دانش (۱۹۱۴ - ۱۹۸۲ء) قادر الکلام شاعر اور صاحبِ طرز غزل گو تھے ۔ مگر ان پر اللہ کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ وہ ایک راست فکر مسلمان تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اٹوٹ محبت رکھتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے " داربن " کے نام سے ایک نعتیہ مسدس رقم فرمایا جس کے پہلے حصے میں نبی اکرمؐ کے محاسن اور آپ کے لائے ہوئے انقلابِ عظیم کے فضائل و برکات بیان کئے گئے ہیں جبکہ دوسرے حصے میں امتِ مسلمہ کی موجودہ المناک صورت حال کی عکاسی نظر آتی ہے ۔ پوری نظم خلوص و محبت ، وارفتگی و شیفتگی ، حقیقت نگاری ، درد مندی و خیر خواہی اور گرمجوشی کا نہایت دلآویز مرقع ہے ۔

انسانیت کو تو نے وہ آئین دے دیا
گویا پیام نازش و تمکین دے دیا
عالم کو ذوقِ جلوہ و تزئین دے دیا
ٹوٹے دلوں کو مژدۂ تسکین دے دیا

گونجی صفدروں میں صدا لا الہ کی
صورت نکال دی ہے خدا سے نباہ کی[2]

۱۔ شام و سحر نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۲۶۳

۲۔ " داربن " مطبوعہ دانش اکادمی ، لاہور ، ۱۹۷۳ء ، ص ۱۷

یون مسکرائی شام کہ تارے بکھر گئے
بگڑے ہوئے حیات کے تیور سنور گئے
غازہ مَلا جو وقت نے لمحے نکھر گئے
تاریکیون پہ نور کے لشکر اتر گئے

خود غرضیون مین رنگ مساوات آ گیا
رقت ہوئی تو لطفِ مناجات آ گیا [1]

" دارین " اپنے موضوع اور فنی خوبیون کے اعتبار سے بقول ڈاکٹر تحسین فراقی "جنابِ احسان دانش کی قادر الکلامی، نازک خیالی ، حضورؐ سے ان کی بےپایان محبت اور سیرتِ سرورِ عالمؐ سے ان کی جذباتی وابستگی کی ایک خوبصورت دستاویز ہے۔" [2]

محشر رسول نگری (۱۹۱۶ - ۱۹۸۳ء) بھی اپنی قسم کے منفرد نعت گو ہین انہون نے " فخر کونین " کے عنوان سے تین جلدون پر مشتمل ایک عظیم مسدس تخلیق کی ہے جو نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ اور سیرت و کردار کی تفصیلات پر مشتمل ہے ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہین کہ " ہر چند کہ اس نظم مین جو کچھ بیان کیا گیا ہے پورے جوشِ عقیدت اور تخیّلی گلکاری کے ساتھ بیان کیاگیا ہے لیکن کہین کوئی ایسی بات نظر نہین آتی جو اصل واقعات کے منافی ہو یا جس کی بنا پر مورخانہ نقطہ نظر سے حرف گیری کی جا سکے ۔ خوبی یہ ہے کہ شاعر نے سارے واقعات کو حددرجہ سادگی و صفائی اور روانی اور حُسن کاری کے ساتھ نظم کیا ہے۔" [3] چنانچہ مسدّس کا پہلا بند ہی شاعر کی قادرالکلامی کا مظہر ہے ۔

۱- " دارین " ، ص ۲۳

۲- شام و سحر نعت نمبر جلد ۲ ، ص 115

۳- اردو کی نعتیہ شاعری ، ص ۱۰۹

آئین روزگار کی تشکیل ہو چکی
مدت ہوئی کہ دین کی تکمیل ہو چکی
آیاتِ بینات کی تنزیل ہو چکی
دنیا میں بعد وحی کی ترسیل ہو چکی

انسانیت کا اسوۂ کامل حضور ہیں
اس کاروانِ زیست کی منزل حضور ہیں [1]

عہد حاضر میں یوں تو نعیم صدیقی ، حافظ لدھیانوی ، عبد الکریم ثمر ، خالد بزمی نے بھی نعت میں خاص مقام حاصل کر لیا ہے ، مگر اس صنفِ سخن میں جو تخصص اور انفرادیت حفیظ تائب (سن پیدائش فروری ۱۹۳۱ء) نے حاصل کی ہے ، حقیقت ہے کہ وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی - " صلوا علیہ و آلہ "[2] ان کی اردو نعتوں کا مجموعہ ہے اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے الفاظ میں " اگر اس نعتیہ مجموعے کو اردو کے جدید نعتیہ کلام کا گلِ سرسبد کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا " - [3] چنانچہ ڈاکٹر تحسین ہی کے نزدیک حفیظ تائب جدید نعت گوئی کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کی پہچان ہی نعتِ رسول بن گئی ہے [4] -

حفیظ تائب کی نعت کی خصوصیات مختصراً مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) انہوں نے الوہیت اور رسالت کا فرق شعوری طور پر قائم رکھا ہے اور بہت سے قدیم و جدید شعراء کے برعکس ان کے ہاں " احمدِ بے میم " قسم

۱- " فخر کونین " مطبوعہ سجاد پبلیکیشنز، آرٹ سکول روڈ، کوئٹہ، طبع دوم ۱۹۸۱ء ، ص ۱۱
۲- صلوا علیہ و آلہ ، مطبوعہ سیرت مشن پاکستان ، لاہور ، ۱۹۷۸ء
۳- شام و سحر نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۱۱۲
۴- ایضاً -

کی کوئی شے نظر نہیں آتی - اسی طرح ان کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی سراپا نگاری کی محض ایک آدھ جھلکی نظر آتی ہے -

(۲) حفیظ صاحب نے اپنی نعت میں جس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے ، وہ حضور کی سیرتِ مطہرہ ہے - حفیظ اس حقیقتِ ثابتہ سے بخوبی آگاہ ہیں کہ عہدِ حاضر کے جملہ مسائل و مشکلات کا حل صرف نبی اکرمؐ کے اتباع میں مضمر ہے -

(۳) تائب کی نعت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں تصنع اور بناوٹ کا کہیں نشان تک نہیں ملتا حالانکہ ان کی نعت تمام فنی محاسن سے آراستہ ہے -

(۴) حفیظ تائب کو روحِ عصر کا خصوصی شعور حاصل ہے ، اور عالم اسلام کی موجودہ سیاسی ، تہذیبی اور اخلاقی صورتِ حال اس کے سامنے ہے - وہ تاریخ کے اس المیے پر کڑھتا ہے کہ بدنصیب اُمتِ مسلمہ سیرت النبیؐ کے چشمۂ صافی سے دور ہٹ کر فرقوں کے زہریلے اور گدلے پانی کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھ رہی ہے - چنانچہ نعتیہ شہر آشوب کا جو انداز ہمیں حالی اور اقبال کے ہاں نظر آتا ہے ، وہی اسلوب حفیظ کے ہاں جلوہ گر ہے -

؎ اے نویدِ مسیحا تری قوم کا حال عیسیٰ کی بھیڑوں سے ابتر ہوا
اسکے کمزور اور بے ہُنر ہاتھ سے چھین لی چرخ نے برتری یا نبیؐ
روح ویران ہے ، آنکھ حیران ہے ، ایک بحران تھا ایک بحران ہے
گلشنوں ، شہروں ، قریوں پہ ہے پرفشاں ایک گمبھیر افسردگی یا نبیؐ

زیست کے تپتے صحرا پہ شاہِ عرب ترے اکرام کا ابر برسے گا کب

کب ہری ہوگی شاخِ تمنا مری ، کب مٹے گی میری تشنگی یا نبیؐ [١]

چنانچہ بالکل درست لکھا ڈاکٹر تحسین فراقی نے کہ " تائب کی نعت شیریں ہے ، میٹھی ہے ، پُر تاثیر ہے ، یہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ہم پر حاوی ہو جاتی ہے - ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے - ہم میں نفوذ کر جاتی ہے - ہم اسے پڑھ کر خود کو بالیدہ تر محسوس کرتے ہیں - ہم اس کی والہیت اور سپردگی کے تیز دھارے میں بہ جاتے ہیں " - [٢]

خصوصاً " قصیدہ آیۂ نور " [٣] حفیظ تائب کا شاہکار ہے بلکہ اردو نعتیہ قصائد میں سب سے ممتاز و منفرد ہے اور حضور کی سیرت طیبہ کا جتنا جمیل نقشہ اور شاعر کے سوز و گداز کا جس قدر موثر مرقع یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی - [۴]

ماہر کی نعت کا تجزیہ :

شاہیر اور معاصر نعت گو شعراء کے جائزے کی روشنی میں اب ہم ماہر القادری کی نعت پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جدید نعت گوئی کی تاریخ میں ان کا مقام و مرتبہ کیا ہے اور وہ کہاں کھڑے ہیں ؟

" ظہورِ قدسی " ماہر کے نعتیہ کلام پر مشتمل وہ اولین کتاب ہے جو ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ (مطابق عیسوی جنوری ۱۹۳۹ء) میں شائع ہوئی - [٥] اس میں دراصل ایک ہی طویل

١- صلو علیہ و آلہ - ص ۳۸ ، ۳۹

٢- شام و سحر ، نعت نمبر جلد ٢ ، ص ١١٣

٣- صلوعلیہ و آلہ ، ص ۲۵

۴- شام و سحر ، جلد نمبر ٢ ، ص ١١٢

٥- مطبوعہ مکتبہ طیبہ چار مینار حیدر آباد ، دکن ،

نعت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک کے حوالے سے شاعر کے جذبات اور درودوسلام پر مشتمل ہے ۱۹۳۱ء میں ماہر کا پہلا مجموعہ کلام "محسوسات ماہر" شائع ہوا[۱]، تو "ظہورِ قدسی" اس میں بھی شامل تھی اور جب ۱۹۴۳ء، میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام "نغمات ماہر" شائع ہوا، تو اس میں تین نعتیں شامل تھیں - یعنی "دربارِ اقدس میں" "حجّتِ کاملہ کا مبلّغِ اعظم" اور "نذرِ عقیدت"

ماہر کی نعتوں پر مشتمل پہلا باقاعدہ مجموعہ "ذکرِ جمیل" کے نام سے ۱۹۴۴ء سے منصّۂ شہود پر آیا[۲] جس میں "ظہورِ قدسی" سمیت ماہر صاحب کا وہ سارا نعتیہ کلام جمع کر دیاگیا جو اس وقت تک لکھا گیا تھا - اس میں "نغماتِ ماہر" کی تین نعتیں بھی شامل ہیں -

"ذکرِ جمیل" کے بعد ماہر کا چوتھا مجموعہ کلام "فردوس" نومبر ۱۹۵۵ء میں اشاعت پذیر ہوا -[۳] اس میں آٹھ نعتیں بھی شامل ہیں -

"فردوس" کے بعد ماہر کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا، تاہم ان کے ذاتی ماہانہ رسالے "فاران" اور ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی اور ماہنامہ "سیارہ" لاہور میں ان کا کلام چھپتا رہا - اس میں نعتیں بھی ہیں - علاوہ ازیں "گلہائے تازہ" کے عنوان سے انہوں نے مجموعۂ کلام کا ایک مسودہ بھی تیار کیا تھا جس پر لکھا ہے :- "فردوس" کی اشاعت کے بعد کا کلام" اس میں غزل کی ہئیت میں چھ نعتیں اور ایک طویل نعتیہ مسدّس شامل ہے -

یوں لگتا ہے کہ ماہر صاحب "حمد و نعت" پر مبنی ایک اور مجموعہ کلام مرتب

۱- مطبوعہ عبدالحق اکادمی حیدر آباد، دکن -
۲- مطبوعہ نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن
۳- ایضاً مکتبہ چراغِ راہ، لاہور

کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ، اس کے لئے انہوں نے ایک بیاض مختص کی تھی جس میں حمدیہ منظومات کے علاوہ پندرہ نعتیں بھی شامل ہیں"۔[1] گلہائے تازہ " اور متذکرہ بیاض کی صرف پانچ نعتیں " فاران " کے مختلف شماروں میں شائع ہوئی ہیں ۔ اس طرح ابتدا سے آخری زمانے تک ماہر القادری کے دستیاب نعتیہ کلام میں غزل کی ہیئت میں ۵۱ نعتیں اور پندرہ نظمیں ہیں ۔ دو فارسی نعتیں ان کے علاوہ ہیں۔[2]

ماہر القادری کی نعت رسمی اور رواجی نہیں ہے نہ انہوں نے اسے محض حصول ثواب کے لئے اختیار کیا ، بلکہ انہیں پیغمبر اعظمؐ حضور ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجے کی قلبی محبت تھی ۔ اس کا اظہار ان کی تحریروں میں جابجا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں بھی نمایاں انداز میں نظر آتا ہے " ذکرِ جمیل" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

" اگر میں خدانخواستہ مسلمان گھرانے میں پیدا نہ ہوا ہوتا اور میرے ماں باپ مجھے کافر بنا دیتے تو جس طرح عبداللہ بن سلام ، رسول اللہؐ کو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھے ، خدا کی قسم یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا " ، تو میری فطرت بھی نبی آخرؐ کی سیرتِ پاک سے متاثر ہو کر چیخ اٹھتی کہ زمین و آسمان کے مالک کی قسم یہ زندگی سچے اور نیک ہی کی ہو سکتی ہے ۔

اللہ تعالی نے اس آتشیں امتحان سے دور رکھا اور مجھے ایک ایسے مسلمان گھرانے میں پیدا کیا جہاں حمد و نعت اور منقبت کی ہی آوازیں آئیں اور آج تک ان کی صدائے باز گشت سن رہا ہوں ۔ میرے والد مرحوم کو ذاتِ رسالت مآبؐ سے عشق تھا ، شروع میں مرحوم نے کچھ

۱۔ " گلہائے تازہ کا مسودہ اور مذکورہ بیاض مجھے مشہور مصنف اور مورخ جناب طالب ہاشمی نے مرحمت فرمائیں ، طالب ہاشمی" فاران " کے مستقل لکھنے والے اور ماہر کے قریبی دوست ہیں۔

۲۔ یہ امر مسرت انگیز ہے کہ جنوری ۱۹۸۹ء میں طالب ہاشمی نے" ذکر جمیل" ہی کے عنوان سے ماہر کا نعتیہ کلام یکجا صورت میں شائع کر دیا ہے، مگر اس میں ماہر کا سارا غیر مدون نعتیہ کلام نہیں آیا ۔ مثال کے طور پر اس میں صرف ۲۳ نعتیہ غزلیں ہیں ۔

عشقیہ غزلیں کہیں ، مگر آخر میں نعت اور صرف نعت کہتے تھے۔ مدینہ جانے کی تمنا ہی میں دنیا سے چلے گئے " ۔[1]

" خدا کے فضل سے ہمارے سارے گھر کو حمد و نعت سے خاص شغف تھا - یاد نہیں، دل پہ نقش ہے یہ شعر -

جو ہو پل پہ لغزش کسی امتی کو
اسے آگے دیں گے سہارا محمد

" جسے میں نے اپنے بچپن میں اپنی بڑی بہن کی زبانی سنا تھا - دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ نعتِ رسولؐ میری گھٹی میں پڑی تھی ، ہوش سنبھالا تو شعر گوئی کے لئے طبیعت کو موزوں بلکہ آمادہ پایا - میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ میری شاعری کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی " ۔[2]

نبی اکرمؐ سے ماہر کو جو غیر معمولی عقیدت اور محبت ہے اس کا اندازہ " ذکرِ جمیل" ہی کے دیباچے کے اس اختتامی پیرے سے بھی ہوجاتا ہے -

"آخری تمنا یہ ہے کہ " ذکرِ جمیل " کا کچھ حصہ دربارِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی زبان سے عرض کر دوں اور اس کے بعد اسی جانِ حیات کے سامنے دم نکل جائے، جس کے قدموں پر جان نچھاور کرنے کے لئے دی گئی تھی " ۔[3]

" درِّ یتیمؐ " ماہر القادری کا وہ ناول ہے ، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

۱- ذکرِ جمیل " نفیس اکیڈمی ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۴۴ء ، ص ۱۱ ، ۱۲

۲- ایضاً - ص ۱۳

۳- ایضاً - ص ۲۱

حیاتِ طیبہ پر لکھا گیا ہے ۔ اس میں ماہر کی رسول اللہ سے محبت پھوٹ پڑتی ہے ۔ ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

" اس ناول کا ہیرو وہ انسانِ کامل ہے جس سے بہتر انسان پر آج تک سورج طلوع نہیں ہوا ۔ یہی ذاتِ گرامی خلاصۂ کائنات، فخرِ موجودات اور شرفِ انسانیت ہے "۔[1]

مزید لکھتے ہیں :۔

" یہ ناول (در یتیمؐ) میرے لئے ذخیرہ عقبیٰ اور توشہ آخرت ہے ۔ نہ جانے کتنی بار خود ہی لکھتے لکھتے بےاختیار رو دیا ہوں ۔ یہی آنسو میری زندگی کا سرمایہ اور میری خوشیوں کی گرانقدر متاع ہیں "۔[2]

عملی زندگی میں بھی ماہر کو جنابِ رسالتمآبؐ سے بہت محبت تھی ۔ اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنی ساری تحریری اور صحافتی صلاحیتوں کو اشاعتِ دین کے لئے وقف کر دیا اور ذاتی زندگی کو تعلیمات نبویؐ کے رنگ میں رنگ لیا ۔ چنانچہ حج کے دوران جب (جولائی ۱۹۵۳ء) داڑھی بڑھا لی اور وطن واپسی پر ان کے ایک دوست لالہ صحرائی صاحب نے انہیں پہلی مرتبہ باریش دیکھا تو مبارک باد پیش کی ۔ جس کے جواب میں کہا :

" آپ کی مبارک باد کا شکریہ ۔ تاہم مجھے اس بات کی ندامت ہے کہ زندگی کا ایک طویل عرصہ تارکِ سنت بن کر گزار دیا "۔[3]

اسی طرح اقبال صفی پوری نے کراچی میں سالانہ نعتیہ مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا ، تو بہت خوش ہوئے ۔ خوب حوصلہ افزائی کی اور کہا :۔

۱۔ " در یتیم " گوشہ ادب انارکلی ، لاہور اشاعت سوم ۱۹۸۰ء ، ص ۳

۲۔ ایضاً ، ص ۳
۳۔ ایضاً ، ص ۲۲
۴۔ ماہنامہ " فاران " کراچی ماہر نمبر دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۶۳

" اقبال تم نے اس مشاعرے سے بہت بڑا کام یہ کیا کہ لوگوں میں نعت گوئی کا شوق تازہ کر دیا اور ان شعراء سے بھی اچھی نعتیں کہلوائیں جنہیں کبھی یہ سعادت نصیب نہ ہوئی تھی - اس سے ادب میں اضافہ ہوا ہے اور لوگوں میں عشقِ رسول کا جذبہ بیدار ہوا ہے - خدا تم کو اس کی جزا دے " [1]

چنانچہ ماہر کی نعت میں نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ شیفتگی ، وارفتگی اور گہری قلبی محبت کا برملا اظہار ملتا ہے - انہوں نے جو کچھ کہا ہے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر کہا ہے - رسول اللہ کی محبت اور حرارتِ عشق نے ان کے دل کو جو غیرمعمولی سوز و گداز بخش دیا تھا ، اس کا اظہار ماہر کی نعت میں بڑے احسن طریقے سے ہوتا ہے - مترنم بحروں اور غیر معمولی شعریت سے بھی شاعر کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

محمد مصطفےٰ صلی علیٰ کیا نام پیارا ہے ۔ دلوں کی آرزو ہے ، دردمندوں کا سہارا ہے
زمانے بھر پہ ہے احسان تیری رہنمائی کا ۔ ترا نقشِ قدم کیا ہے ، ہدایت کا ستارا ہے
جو تو آیا تو دنیا کی ہوئی بھرسے چمن بندی ۔ تیرے دست کرم نے زلفِ گیتی کو سنوارا ہے
ترا قول و عمل بنیاد ٹھہرا دین و ایماں کی ۔ کہ یہ قدرت کا منشا ہے ، مشیت کا اشارا ہے
وہی حاصل ہے ماہر میری ساری زندگانی کا ۔ وہ اک لمحہ کہ جو یادِ محمد میں گزارا ہے [2]

....

تر حاصلِ کونین ہے محبوبِ خدا ہے ۔ تجھ سا کوئی دنیا میں نہ ہو گا نہ ہوا ہے
جس چیز کو کہتا ہے زمانہ مہِ تاباں ۔ یہ تو مرے سرکار کا نقشِ کفِ پا ہے [3]

۱- مجلہ "تعمیرِ نظریہ پاکستان" (بیادِ اقبال ماہر) ادارہ تعمیر ادب کراچی جون ۱۹۸۱ء ، ص ۱۹ -
۲- ذکر جمیل (طبع جدید) ص ۱۶۵
۳- ایضاً ، ص ۱۶۱

ان کی محفل تجلی کی روشن سحر   ان کی محفل سے باہر دھواں ہی دھواں [1]

علامہ اقبال کا مشہور نعتیہ شعر ہے ۔

عجب کیا گر مہ و پروین مرے نخچیر ہو جائیں

کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سرِ خود را "

ماہر نے اسی مفہوم کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے ۔

اُس ہاتھ کے قبضہ میں ہے کونین کی دولت

جس ہاتھ میں ہے گوشۂ دامانِ محمدؐ [2]

اس نعت کا ایک اور شعر شاعر کے جذبات کی مزید عکاسی کرتا ہے ۔

لایا ہوں بصد شوق یہ نذر دل و جاں

نادم ہوں کہ یہ بھی نہیں شایانِ محمدؐ [3]

مشہور نعت گو شاعر حافظ لدھیانوی لکھتے ہیں :۔

" نعت سچے جذبات کا عکس ہوتی ہے ۔ اس میں صرف تخیل کی پرواز ہی کام نہیں کرتی ، اس میں جذبے کی صداقت اور دلی کیفیات کا ہونا از بس ضروری ہے " [4]

اور ماہر کی نعت اس معیار پر پورا اترتی ہے ۔

کیف و مستی کا اک پیغام رنگیں تیرا نام

انبساطِ روح کی دعوت ترا ذکرِ جمیل [5]

۱۔ ذکر جمیل (طبع جدید) ص ۱۶۲

۲۔ ایضاً ، ص ۱۶۲

۳۔ ایضاً ، ص ۱۶۳

۴۔ ماہنامہ شام و سحر ، لاہور نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۲۷۳

۵۔ ذکر جمیل (طبع جدید) ص ۵۹

؎ اے نام محمد ﷺ صل علیٰ ماہر کے لئے تو سب کچھ ہے ۔۔۔۔[1]

ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا ، آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

؎ واعظ سے کہو ذکرِ محمد ﷺ ہی کیسے جاتے

یہ تو میرا ایمان ہے ، یہ تو مری جان ہے

؎ بندہ ہے وہ بندہ کہ اللہ کا محبوب

انسان وہ انسان کہ محبوبِ خدا ہے[2]

؎ زندگی کچھ بھی نہیں تیری محبت کے بغیر

اور بے روح محبت ہے اطاعت کے بغیر[3]

ماہر نبی اکرم ﷺ سے جس غایت درجے کی محبت رکھتے ہیں ، وہ آنحضور ﷺ کی سیرت مطہرہ کو جس طرح نوعِ انسا ن کے لئے معیارِ کامل سمجھتے ہیں اور جناب رسالتمآب ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو وہ ہر زمانے کے لئے رحمت و برکت خیال کرتے ہیں ، اس کا اظہار ذیل کی نعت سے ہوتا ہے جسے میں اس اعتبار سے ماہر صاحب کی نمائندہ نعت قرار دوں گا کہ اس میں شاعر کے جذبات و احساسات اور اس کے ذوق و شوق کا بھر پور اظہار ہوا ہے جیسے مترنم بحر بے اختیار دل کے تاروں سے جا ملاتی ہے ۔

ترا نُطق ، نطقِ یزداں ، تیری بات شرحِ قرآں

ترا نام دل کی تسکین ، تیرا ذکر راحتِ جاں

ہوئی تیری آمد آمد ، تو برائے خیر مقدم

کہیں کھل گئے گلستاں ، کہیں ہو گیا چراغاں

۱- ذکر جمیل (طبع جدید) ص ۱۰۲

۲- ایضاً ، ص ۱۶۹

۳- ایضاً ، ص ۱۷۲

ہے جہانِ آب و گل میں ترے دم قدم سے رونق

تو فروغِ بزمِ ہستی ، تو بہارِ باغِ امکاں

وہ ہے خوش نصیب جس کو ملی عزتِ غلامی

ترے در کے سب سلامی ، وہ فقیر ہو کہ سلطان

تری ذات سے محبت ، ترے حکم کی اطاعت

یہی زندگی کا مقصد ، یہی اصلِ دین و ایمان

ترا ذکر جب کیا ہے تو رواں ہوئے سفینے

ترا نام جب لیا ہے تو ٹھہر گئے ہیں طوفاں

ترے در پہ حاضری کا وہ سماں بھی کیا سماں تھا

مرے دل کی التجائیں ، مری آنسوؤں کی لڑیاں

تری زندگی کا پرتو ہے کمالِ آدمیت

تری شخصیت سے قائم ہے وقارِ نوعِ انساں

میں یہ نعت لکھ رہا ہوں کہ درود پڑھ رہا ہوں

میں غزل سنا رہا ہوں کہ چٹک رہی ہیں کلیاں [1]

صاف نظر آتا ہے کہ ماہر نے حضورؐ کی محبت کو دل کی تپش اور گرمی میں پکایا ہے اور جس طرح سورج کی گرمی میں فطری طور پر پک کر تیار ہونے والا پھل زیادہ شیریں اور فرحت بخش ہوتا ہے ، اسی طرح ماہر کی نعت محبت کے سوز میں پک کر شیریں اور پرتاثیر بن گئی ہے اور دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے ۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول نعت کا عظیم ترین مقصد سیرتِ مطہرہ کا ذکر ہے [2] اور ماہر القادری نے اس مقصد کو بڑے احسن طریقے سے پورا کیا ہے ۔ چنانچہ

۱۔ بیاض ماہر غیر مطبوعہ ۔

۲۔ شام و سحر لاہور ، نعت نمبر جلد ۱ ، ص ۲۹۲

ماھر کے نعتیہ کلام سے ایک اور بات جو مترشح ہوتی ہے ، وہ یہ ہے کہ موصوف نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کے بیان پر زیادہ زور دیا ہے اور یہی ضروری بھی تھا کہ اسی سیرت کا نام اسوہ حسنہ ہے اور یہی ہمارے لئے قابلِ تقلید و واجبِ اتباع ہے - اگرچہ نبی اکرم کی صورت بھی بےمثال تھی ، مگر سیرت کو نظرانداز کر کے محض صورت کے بیان پر زور دینا صورت پرستی تو کہلا سکتی ہے ، مگر اس سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جس کے حوالے سے آنحضور دنیا میں تشریف لائے تھے - دین و دنیا کی فلاح کا راز آپ کی بےداغ اور پاکیزہ سیرت کو اپنانے اور اس کے فیض عام کرنے میں مضمر ہے - چنانچہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ماھر نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات کو صحیح انداز میں پیش کیا ہے اور نعت گوئی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے - ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

کردار کا یہ حال صداقت ہی صداقت
اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآن ،
اشکوں سے ترے دین کی کھیتی ہوئی سیراب
فاقوں نے ترے دھر کو بخشا سر و سامان [1]

ترے کردار کا پرتو ہے عصمت ہو کہ تقویٰ ہو
ترے اخلاق کا صدقہ ہے نیکی ہو کہ سچائی [2]

جانِ حیات ہے ترے اخلاق کی جھلک
خود زندگی ہے موت کا سامان ترے بغیر [3]

۱- فاران دسمبر ۱۹۶۲ء ، ص ۳۱

۲- ذکر جمیل طبع جدید ، ص ۱۲۳

۳- فاران ستمبر ۱۹۷۷ ء ، ص ۳۹

چونکہ شاعر کو پیغمبر اعظم سے واقعۃً گہری دلی محبت ہے ، اس لئے خالی ذکر اذکار یا " معراج و معجزہ کی دیدارانہ شاعری " کی بجائے انہوں نے حضور کی سیرتِ مقدسہ اور شخصیتِ مطہرہ کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے ۔ خصوصاً " ذکرِ جمیل " میں نبی اکرمؐ کے اخلاق عالیہ یعنی آپ کی بےنفسی اور استغنا ، سادگی اور پاکیزگی ، عدل و مساوات اور انسانی احترام کی جی بھر کے تحسین کی ہے :

پیکرِ خُلق و عفو و مروت صلی اللہ علیہ وسلم — خون کے پیاسے دشمن کو بھی چھوڑ دیا تھا قبضہ پاکر
بھوکے سو رہنے کی عادت صلی اللہ علیہ وسلم — سائل کو ناکام نہ پھیرا بخش دیا جو کچھ تھا گھر میں
قاسمِ جنت اس پہ یہ حالت صلی اللہ علیہ وسلم — نانِ جویں کے سوکھے ٹکڑے پھٹے پرانے کپڑے ان کے
سادہ سادہ نیک طبیعت صلی اللہ علیہ وسلم — اپنے کپڑے خود دھو لینا ، خاک کے بستر پر سو لینا
بانٹ رہے تھے ، سب کو دولت صلی اللہ علیہ وسلم[1] — اپنی بیٹی کے سر پر تھا ایک دوپٹہ وہ بھی شکستہ

؎ اس وقت کہ مٹھی میں تری سارا عرب تھا
کہتے ہیں ترا نانِ جویں پر تھا گزارا ۔[2]

مقصود جہاں ، محبوب خدا اور اس پہ یہ شان فقر و غنا ؎
کپڑے بھی وہ خود دھولیتے ہیں ، فاقوں کی بھی عادت ہوتی ہے[3]

....

تیری وفا کی اک جھلک دست فگار فاطمہؓ
تیری معاشرت کی شان گرد قبائے حیدریؓ[4]

۱- ذکر جمیل طبع قدیم ، ص ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۶

۲- ایضاً ، ص ۹۸

۳- بیاض (غیر مطبوعہ)

۴- ذکر جمیل طبع قدیم ، ص ۱۰۱

بقول وارث سرہندی ماہر کی نعتوں میں حضور اکرمؐ کی سیرت اور تعلیمات کا بیان دلکش مگر سادہ انداز میں ہوا ہے ۔ مبالغے سے اجتناب کیا گیا ہے اور تکلف و تصنع کے بغیر بیان کا فطری حسن جگمگاتا اور دل میں اترتا چلا جاتا ہے ۔[۱]

(۳) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً محسنِ انسانیت ہیں ۔ انہوں نے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلائی اور ظلم و جور کے نوع بہ نوع اور تہ در تہ اندھیروں میں سسکتی بلکتی انسانیت کو صدیوں بعد عدل و مساوات اور یقین و اعتماد کے اجالوں میں آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا ۔ حضور رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں وہ نظامِ حکومت اور طریقِ معاشرت متعارف کرایا جس سے بہتر نظام آسمان کی نظروں نے کبھی نہیں دیکھا ۔ اس نظام میں بنیادی حیثیت اور اہمیت انسان ہی کو دی گئی اور اسی کی دنیاوی اور اُخروی ، جسمانی اور روحانی اور ذاتی و اجتماعی کامیابیوں کو پیش نظر رکھ کر لائحۂ عمل تیار کیا گیا ۔ چنانچہ دنیا میں آج جہاں کہیں روشنی اور بھلائی ہے ، وہ صرف محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کا فیضان ہے اور جہاں جہاں تاریکی اور بدی کا راج ہے ، وہ اس وجہ سے ہے کہ وہاں آپؐ کی ہدایات کو پسِ پشت ڈالا گیا ہے ۔

ماہر جانتے ہیں کہ حضورؐ دنیا میں تشریف نہ لاتے ، تو زمانہ آج بھی اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہا ہوتا چنانچہ بڑے ہی جذبہ و شوق اور غیر معمولی محبت و اخلاص سے آپ کے احسانات کا ذکر کرتے ہیں ۔

اے کہ ترے کرم سے ہے پست و بلند مستفید
اے کہ ترا وجود ہے وجہِ ظہورِ کائنات

۱۔ فاران ، مئی ۱۹۸۱ء ، ص ۳۰

کھول دیئے اک آن میں تو نے حقیقتوں کے راز
اک نظر میں توڑ دی تو نے حدِ تعینات ،
گردشِ چرخ چھوڑی اس کا نہ کچھ بھی کرسکی،
تو نے نگاہِ لطف سے بخش دیا جسے ثبات
اے کہ تری ظہور نے دھر سے محو کردیئے
کفر کے سب تکلفات ، شرک کے سب توھمات
صلِّ علیک یا نبیؐ روزِ ازل دیا گیا
تیرے اصول کو خلود ، تیری حدیث کو ثبات [1]

" ذکرِ جمیل " ھی کی ایک دوسری نعت میں نبی اکرمؐ کے احسانات کا تذکرہ یوں کیا گیا ھے ۔

ے دین و دنیا یکجا کرکے راز ترقی کے سمجھائے
یہ بھی رحمت وہ بھی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم [2]

ے تیری جلوون سے عبارت بزمِ ھستی کا چراغ
اے کہ تیرے دم سے وابستہ نظامِ کائنات
تیرے صدقے ، تو نے کی تنظیمِ بزمِ زندگی ،
تیرے قربان ، تونے دی ترتیب اجزائے حیات
کفر کی ظلمت کو فانوسِ تجلّا کر دیا ،
آدمیّت کا جہان میں بول بالا کر دیا [3]

۱۔ ذکر جمیل طبع جدید ، ص ۱۱۸

۲۔ ایضاً ، ص ۲۶

۳۔ ایضاً ، ص ۱۲۰-۱۲۱

ے انسان کو شائستہ و خوددار بنایا
تہذیب و تمدن تیری شرمندۂ احساں [1]

ے میرے سرکار ہیں دونوں جہاں کے واسطے رحمت
شریعت آپ کی ہے دین اور دنیا کی یکجائی
محمدؐ مصطفےٰ کے مکتب عرفان سے ملتی ہے،
خردمندی ، فراست ،حکمت و تدبیر ودانائی [2]

نبی اکرمؐ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر عجیب سرخوشی اور کیف و مستی کی کیفیت سےسرشار نظر آتا ہے اور اس کی نعت میں سہل ممتنع کے خوبصورت نمونے دکھائی دیتے ہیں -

وہ آئے اور آئے بھی قرآن لئے ہوئے
تنظیم کائنات کا سامان لیے ہوئے
نکلا حرا کے غار سے وہ نازشِ مسیح
سارے جہاں کےدرد کا سامان لئے ہوئے [3]

آپ سے پہلےنہ خوشبو تھی نہ رعنائی تھی
آپ آئے ہیں تو دنیا میں بہار آئی ہے [4]

اک کملی والے کے گھر سے دنیا کو تہذیب ملی ہے
دنیا تھی اور رات اندھیری آپ آئے تو صبح ہوئی ہے [5]

۱- فاران دسمبر ، ۱۹۶۲ء ، ص ۲۱
۲- ایضاً ، ستمبر ۱۹۷۷ء ، ص ۳۹
۳- ذکر جمیل طبع جدید ، ص ۱۶۸
۴- ایضاً، ص ۱۶۹
۵- ایضاً ، ص ۱۸۳

(۴) ماہر بجا طور پر یقین رکھتے ہیں کہ انفرادی و اجتماعی مسائل کا حل صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی اتباع و تقلید میں مضمر ہے اور حضورؐ کی رہنمائی کے بغیر نیکی تک دسترس ہو سکتی ہے نہ بدی کی پہچان ممکن ہے ۔ دنیا و آخرت کی ساری بہاریں آپ کے دم قدم سے ہیں۔ آپ ہی انسانیت کے درد کا درمان ہیں اور آپ ہی کی بدولت اللہ کی پہچان ممکن ہے۔ آپ اخلاقِ فاضلہ کا مکمل نمونہ ہیں اور آپ کے فیوض و برکات کے بغیر علم و تفکر کا ہر شعبہ جہالت کے سوا کچھ نہیں ۔ پھر ماہر کو نہ صرف خود یقینِ کامل ہے کہ بنی آدم کی جملہ فوزو فلاح ، آپ کی اتباع میں پوشیدہ ہے بلکہ وہ اس ایقان کو دوسروں تک منتقل کر دینا چاہتے ہیں ۔ اس طرح وہ آپ کے ہمہ جہت کارناموں کو بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں ۔ دیکھئے شاعر کے انداز میں یقین و اعتماد اور والہانہ پن کی کیسی شان پائی جاتی ہے ۔

نیکی ترے بغیر نہ ایمان تیرے بغیر
اک وہم ہے نجات کا امکان ترے بغیر

دنیا ہے ایک مزرعۂ ویراں ترے بغیر
عقبیٰ ہے صرف خوابِ پریشاں ترے بغیر

ممکن نہیں کسی سے مفکر ہو یا حکیم
انسانیت کے درد کا درمان تیرے بغیر

دشوار ہی نہیں ہے یہ امرِ محال ہے
اللہ کے وجود کا عرفان ترے بغیر ،

جانِ حیات ہے ترے اخلاق کی جھلک
خود زندگی ہے موت کا سامان تیرے بغیر

تجھ سے نہ ہو جو ربط وہ فکر و نظر ہی کیا
علم و خبر ہیں جہلِ نمایاں ترے بغیر

حکمت تری کنیز ، تفکّر ترا غلام

سمجھے ہیں کِس نے معنئ قرآن ترے بغیر [1]

اسی ضمن میں ماہر مشہور فلسفی جارج برنارڈ شا کے ہم زبان ہو کر کہتے ہیں کہ اگر دنیا کو مستقل امن درکار ہے تو وہ صرف محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی غلامی اور اس نظام میں مضمر ہے جسے آپ نے جاری و نافذ کیا تھا ۔

امن ناممکن محمد کی غلامی کے بغیر

جن کی رحمت جن کی شفقت اس جہان میں عام ہے [2]

(۵) ماہر نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ اور احادیث مبارک کو قرآن حکیم کے بعد شریعت اسلامی کا بنیادی منبع و ماخذ سمجھتے ہیں ۔ ان کا ایمان ہے کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اور مختلف نوعیت کے مروجہ سیاسی و سماجی نظام انسان کو سکون و راحت دینے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں ، محمد رسول اللّٰہؐ کی شریعت کی ضرورت زیادہ محسوس ہو رہی ہے ۔ چنانچہ ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی مسائل ان سب کی صحت و درستی صرف حضورؐ کے اسوہ حسنہ اور آپؐ کی شریعتِ کاملہ میں مضمر ہے ۔

کوئی دستور مکمل نہ کوئی نظم درست

تیری لائے ہوئے آئینِ شریعت کے بغیر [3]

پیغام سناتے ہیں یہ اب تک لبِ جبریل

ہے ذاتِ محمدؐ ہی یہ ہر خیر کی تکمیل [4]

۱۔ افکاران ستمبر ، ۱۹۷۷ء ، ص ۳۹

۲۔ ذکر جمیل طبع جدید ، ص ۱۵۷

۳۔ صحیفہ انوار مرتبہ عشقی الہاشمی مکتبہ شباب اردو سیالکوٹ ۱۹۶۰ء ، ص ۸۹

۴۔ ذکر جمیل طبع جدید ، ص ۱۱۳

ذاتِ نبیؐ پر ختم ہے کون و مکان کا ہر شرف
آپ رسولِ جزو و کل، آپ امامِ انس و جان [1]

ان کا اگر اقرار نہ ہو گا تکمیلِ توحید نہ ہوگی
عینِ ایمان ان کی الفت، صلی اللہ علیہ وسلم [2]

یہ بزمِ آب و گِل جتنی بھی برہم ہوتی جاتی ہے
محمدؐ کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے [3]

دین دراصل محمدؐ کی اطاعت کا ہے نام
یہ حقیقت مجھے قرآن نے سمجھائی ہے [4]

قرآن کی شرح آپ کا خلقِ عظیم ہے
اللہ کی کتاب ہے سیرت رسول کی
قول و عمل نبیؐ ہے معیارِ زندگی
فطرت کا آئینہ ہے شریعت رسول کی [5]

وہ راستہ جو حقیقت سے جاکے ملتا ہے
مرے حضورؐ کے نقشِ قدم کا صدقہ ہے

نبیؐ کا قول ہی ایمان کی بنا ٹھہرا،
خدائے قادر و برتر کو کس نے دیکھا ہے [6]

۱- ذکر جمیل طبع جدید، ص ۱۱۵
۲- ایضاً، ص ۱۳۶
۳- ایضاً، ص ۱۶۶
۴- ایضاً، ص ۱۷۹
۵- ایضاً، ص ۱۸۴
۶- فاران، جون ۱۹۷۴ء، ص ۳۷

(٦) مشہور نعت گو اور تجزیہ نگار جناب اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی لکھتے ہیں :-

" اگرچہ نعت گوئی کی فضا بہت وسیع ہے ، مگر اس میں پرواز کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ حضور والا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تعارف کے لئے شریعت نے کچھ حدود مقرر کئے ہیں - مرغِ تخیل کی پرواز ان حدود کے اندر ہونی چاہیئے - متجاوز ہو جائے تو یہ نیک کام گناہ کا باعث ہو جاتا ہے" -[١]

چنانچہ ماہر نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت لکھتے ہوئے شرعی حدود سے سرِمُو انحراف نہیں کیا نہ کہیں بھی مبالغہ یا غلو کا انداز اختیار کیا ہے - ماہر بدعات سے سخت بیزار ہیں اور توحید کے ایک سرگرم مبلغ کی حیثیت سے وہ خاص شہرت رکھتے ہیں - یوں بھی بعثتِ نبوی ص کا سب سے بڑا مقصد اثباتِ توحید ہے - چنانچہ ماہر نے اپنی نعت میں جہاں نبی اکرم ص کی ذاتِ گرامی اور تعلیمات و صفات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہاں نعت کو اثباتِ توحید اور تبلیغِ دین کا وسیلہ بھی بنایا ہے - ان کا ایمان ہے کہ جب تک انسانیت آپ کی اتباع نہیں کرتی اور خصوصاً توحید کے تقاضوں کو سختی سے ملحوظ نہیں رکھا جاتا ، وہ کبھی امن و سکون سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی -

بندے اور اللہ میں رکھا ہو عالَم میں فرقِ مراتب ،
شرک کے دشمن ، ماحی بدعت صلی اللہ علیہ وسلم
فرمایا تم قبر کو میری سجدہ گاہ ہر گز نہ بنانا
اللہ اللہ پاسِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم[٢]

١- ماہنامہ شام و سحر نعت نمبر جلد ١ جنوری ، فروری ١٩٨١ء ، ص ٢٥
٢- ذکر جمیل طبع جدید ، ص ١٣٥

ــہ   یا نبیؐ آپ کا دین اور ہو بدعت کا شکار

امتی جدّتِ افکار تک آ پہنچے ہیں [1]

ــہ   خدا بچائے مسلمان کو شرک و بدعت سے

وہ دین ہی نہیں جو دین میں اضافہ ہے [2]

بالفاظِ دیگر ماہر نے الُوہیّت اور رسالت میں واضح فرق ملحوظ رکھا ہے، احتیاط کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور انتہائی سرخوشی میں بھی شرعی تقاضوں کو جذبات پر فوقیت دی ہے -

کس بھرم رہتا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے

اک سمت شریعت ہوتی ہے ، اک سمت محبت ہوتی ہے [3]

اور ظاہر ہے کہ وہ محبت کے مقابلے میں شریعت ہی کا پاس کرتے ہیں کہ منشائے نبیؐ بھی یہی ہے -

ماہر نبی اکرمؐ کو قرآن کی تعلیم کے عین مطابق انسان سمجھتے ہیں (مگر ایسا انسان جوہر اعتبار سے بےمثال و عدیم النظیر ہے) اسی لئے بہت سے شعراء کے برعکس انہوں نے اپنی نعت میں نبی کریمؐ سے براہِ راست استمداد یا استعانت کا انداز اختیار نہیں کیا - "کاروانِ حجاز" میں لکھتے ہیں :-

" عشقِ رسولؐ اپنی جگہ ایمان بلکہ ایمان کی جان ، لیکن ایسے شعر جن میں حضورؐ سے استمداد اور استعانت چاہی جائے اور حضورؐ سے استغاثہ کیا جائے ، خود حضورؐ کی تعلیم کی عین ضد ہے ، مگر کیا قیامت ہے کہ آپؐ کے بعض امتی عقیدت و محبت کے ان مبالغوں

۱- " فردوس " ص ۲۲

۲- بیاض (غیر مطبوعہ)

۳- " فردوس " ص ۱۲

مین الجھ کر رہ گئے ۔ ایسی باتون سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مقدس کو کس قدر اذیّت ہوتی ہو گی"۔[1]

اور ماہر کا یہ نقطۂ نظر ذیل کے شعر مین بڑی خوبی سے نمایان ہوتا ہے ۔

ع ۔ بندہ ہے وہ بندہ کہ اللہ کا محبوب ہے،
انسان وہ انسان کہ مقصودِ جہان ہے[2]

چنانچہ جناب وارث سرہندی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ماہر نے اپنی نعت مین سُکر و خود فراموشی کا کہین مظاہرہ نہین کیا ۔ پیغمبر خود شعور و خود آگاہی کا سرچشمہ ہوتا ہے ، اس لئے ماہر کی نعت شعور و بیداری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے ۔[3] اور ڈاکٹر ریاض مجید کی یہ رائے درست ہے کہ :

" ماہرالقادری نے نعت کے علاوہ اپنے مختلف مضامین ، تبصرون اور تحریرون مین بھی نعت کے ذیل مین رواج پا چکنے والے غیر محتاط رویون اور مشرکانہ عقاید و خیالات کے خلاف جہاد کیا اورعملی طور پر بھی نعت گوئی کا ایک صحیح اور حقیقت پسندانہ معیار قائم کیا جو قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور جس مین توحید کا تصور مجروح نہین ہوتا ۔ انہون نے اپنی نعت گوئی کو شاعرانہ رنگ آمیزیون سے دور رکھ کر اسے اسلامی خطوط پر تحریر کیا" ۔[4]

(۷) ہر عاشقِ رسولؐ کی طرح ماہر کو اس مبارک و مطہر شہر سے بھی

۱۔ کاروان حجاز ، ص ۱۹
۲۔ ذکر جمیل طبع جدید ، ص ۱۶۹
۳۔ ماہنامہ " فاران " مئی ۱۹۸۱ء ، ص ۳۱
۴۔ " اردو نعت " مقالہ پی ایچ ڈی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ، ۱۹۷۶ء ، ص ۳۳

بے پناہ محبت ہے جہاں نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ مقدسہ کے قیمتی گیارہ سال بسر فرمائے، جہاں تاریخ کی فیصلہ کن جنگیں لڑی گئیں ۔ جہاں آپ نے ایک مثالی اسلامی ریاست قائم فرمائی اور نوعِ انسانی کو ایک انوکھے انقلاب سے روشناس کیا اور آخرکار اسی بستی کو آپ کی آخری آرام گاہ کا شرف حاصل ہوا ۔ ماہر کو مدینہ منورہ سے غیر معمولی محبت ہے اور اس کا اظہار ان کے کلام میں بار بار ہوتا ہے ۔

مدینہ کی زمیں میں جاذبیت کس غضب کی ہے،
جبینِ شوق اک اک گام پر خم ہوتی جاتی ہے ۱،
مدینہ جانے والے ، میری جانب سے یہ کہہ دینا ،
تمہاری یاد بھی اب مستقل غم ہوتی جاتی ہے ۲

یہ رہگزر ہے مدینے کی اس کا کیا کہنا
تجلیوں کا مسلسل ظہور ملتا ہے
جہاں میں اور کہیں بھی سکون ملے نہ ملے
مگر مدینے پہنچ کر ضرور ملتا ہے ۳

سراپا نور ہے خاکِ مدینہ
یہاں کی موت کیا ہے زندگی ہے ۴

سراپا حسن ہے شامِ مدینہ
یہی تو صبحِ فردوسِ بریں ہے
مدینہ کی یہ راتیں اللہ اللہ
اندھیرا ہے ، مگر نور آفریں ہے ۵

---

(۱) ذکر جمیل طبع قدیم ، ص ، ۱۰۰ (۲) ذکر جمیل ، طبع قدیم ، ص ۱۰۰ ۔
(۳) فاران دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۳۶ ، (۴) فاران دسمبر ۱۹۷۳ء ، ص ۳۶
(۵) بیاض (غیر مطبوعہ)

مدینہ کے ذکر اور وہاں کی حاضری کو ماہر شرف و سعادت کی گویا آخری منزل سمجھتے ہیں اور روضۂ رسولؐ کی حاضری کا تصوّر انہیں نہال کر دیتا ہے۔ چنانچہ مدینہ کی بات کرتے ہوئے ماہر کا لہجہ سچے عاشق کا لہجہ بن جاتا ہے جس میں محبت کی گرمی بھی ہے اور نرمی بھی ، اور عشق کی سرمستی و سپردگی بھی ۔ ماہر کی ایسی والہانہ اور مخلصانہ محبت کا شاید نتیجہ تھا کہ اُنہیں بار بار مدینہ منورہ کی زیارت اور روضہ رسولؐ پر حاضری کی سعادت میسر آئی ۔ فراق کے جانگسل لمحات وصال کی لذتوں سے ہمکنار ہوتے رہے ، روضۂ اقدس کی زیارت نے انہیں نئے سرور اور سرشاری سے بہرہ مند کیا۔ ان کی ترسی ہوئی نگاہوں کی پیاس بجھ گئی اور حضوری کا ایک ایک لمحہ ابدی لذت کی علامت بن گیا ۔

وہ مدینہ کی مسجد وہ سجدے میرے
لوحِ تقدیر جیسے جبین بن گئی [1]

ماہر وہ ہر اک گام پہ جنت کے نظارے ،
اب تک میری آنکھوں میں مدینہ کاسماں ہے [2]

راہِ طیبہ کے ببولوں پہ مچلتی ہے نگاہ
مرحبا دیدۂ فردوس نگر کیا کہنا

سنگریزے ہیں کہ جاگی ہوئی قسمت کے نجوم
خارِ منزل ہیں کہ انگشتِ خضر کیا کہنا [3]

خاکِ حجاز پرنثار ، ایک نہیں ہزار بار ،
لالہ و سرو و سمن ، ماہ و نجوم و کہکشاں [4]

۱- " فرنویس " ص ۲۲
۲- بیاض (غیر مطبوعہ)
۳- " فردوس " ص ۲۱
۴- بیاض (غیر مطبوعہ)

یہ کوئے محبت ہے مدینہ کی گلی ہے،
دنیا بھی یہی ہے ، مری عقبیٰ بھی یہی ہے
مژدہ تجھے بخشش کا مدینہ کے مسافر
یہ رہگزر گلشنِ جنت سے ملی ہے [1]

سرورِ دو جہاں کا مقدس حرم
قبلۂ اہلِ دل ہے یہی آستاں
اس طرح دم جو نکلے تو کیا پوچھنا ،
سامنے ان کے روضہ کی ہوں جالیاں
اے مسافر مدینہ کے تجھ پر سلام ،
تیرے قدموں کے نیچے ہیں کون و مکاں [2]

مدینہ منورہ سے ماہر کی غایت درجے کی محبت کا اظہار ذیل کے اشعار سے بھی ہوتا ہے - یہ اشعار ان کی غیر مطبوعہ بیاض میں شامل ہیں -

اتنا ہو فزوں شوق و تمنائے مدینہ	جس سمت نظر جائے ، نظر آئے مدینہ
جیسے کہ ابھی عرش سے اترے ہیں فرشتے	اللہ رے ، یہ صبحِ تجلائے مدینہ
زاہد تجھے جنت کی تمنا ہو مبارک	میرے لئے فردوس ہے صحرائے مدینہ
یہ کنجِ چمن، یہ روشِ گل ، یہ لبِ جو	دلچسپ مناظر ہیں ، مگر ہائے مدینہ
ماہر تجھے مژدہ ہو کہ بخشش کی سند ہے	یہ شوق، یہ حسرت ، یہ تولّا تجھے مدینہ [4]

۱- بیاض (غیر مطبوعہ)
۲- ایضاً
۳- ایضاً

(۸) ماہر ان لوگوں کی تعریف میں بھی رطب اللسان ہیں جو حضورؐ کے سچے متبع اور اطاعت شعار ہیں - دراصل ماہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو دنیا کی اہم ترین متاع سمجھتے ہیں اور جو خوش بخت اس متاع گرامایہ سے فیض یاب ہوتے اور دنیا کی مادی آسائشوں کو ٹھکرا کر فقر و استغنا کی شان اختیار کرتے ہیں ، ماہر ان پر رشک کرتے ہیں -

ــــہ مدینہ کے فقیروں کی نہ پوچھو
فقیری میں بھی شانِ خُسروی ہے
وہ رشکِ قیصر و کسریٰ ہے ماہر
جسے ایمان کی دولت مل گئی ہے [۱]

ــــہ حالِ تباہ دیکھ کر ان کو بھی پیار آ گیا ،
تجھ پر خدا کی رحمتیں اے مرے قلبِ ناتواں [۲]

(۹) ماہر کی نعتوں میں حالی ، اقبال ، احسان دانش اور حفیظ تائب کی طرح عصری شعور کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں - وہ عالمِ اسلام اور مسلم معاشرے کے اخلاقی ، روحانی اور مادی زوال پر شدید کرب میں مبتلا ہیں اور حضورؐ سے فریاد کے انداز میں اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہیں - " ذکر جمیل " میں " ساقی نامہ " کے عنوان سے ایک نعت میں حضورؐ سے یوں مخاطب ہیں -

ـــہ نگاہ و دل پہ قبضہ کر لیا ہے علمِ حاضر نے ،
کوئی منکر ، کوئی باغی ، کوئی حیران ہے ساقی
جہاں میں انتشار و برہمی کا دور دورہ ہے ،
اِدھر طغیان ہے ساقی ، اُدھر طوفان ہے ساقی

۱- بیاض (غیر مطبوعہ)

۲- فردوس ، ص ۱۹

بتوں کی طرح قبروں کی طرف پیشانیاں خم ہیں ،
خدا کے ماننے والوں کا یہ ایمان ہے ساقی ،
مسلمان نا مسلمانوں کی صف میں آئے جاتے ہیں
کہ اب ایمان اک ٹوٹا ہوا پیمان ہے ساقی[1]

مسلمانوں کی وہ اقبالمندی کیا ہوئی آخر ،
وہی قرآن ہے ساقی ، وہی اسلام ہے ساقی ،
زمانہ آگیا تہذیب افرنگی کے پھندوں میں ،
کہ ہم رنگ زمین پھیلا ہوا اک دام ہے ساقی
خدا والوں کی دنیا میں اندھیرا ہوتا جاتا ہے
جہاں کل صبح رقصاں تھی، وہاں اب شام ہے ساقی[2]

ماہر نے " فریاد " کے عنوان سے ایک مسدس میں ماضی کی شان و شوکت کے حوالے سے حالیہ نکبت و ادبار کا مرثیہ لکھا ہے اس میں بڑے کرب سے کہتے ہیں :

یا ہی چار طرف غم کی فراوانی ہے
ظلم کا زور ہے اور کفر کی طغیانی ہے
اہلِ باطل کے لیے عیش ہے آسانی ہے
جانِ مسلم کو مصیبت ہے پریشانی ہے

۱- ذکرِ جمیل ، طبع جدید ، ص ۸۷ ، ۸۸
۲- ایضاً ، ص ۹۰

چین ملتا نہیں کعبہ کے نگہبانوں کو
سخت مشکل ہے زمانہ میں مسلمانوں کو [1]

اس سلسلے کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں :-

ع نام لیوا ہیں ترے پامالِ صد رنج و محن
یک نظر یا رحمۃ اللعالمین برمانگ من [2]

ع اے حامی بیکس ، ختم الرسل ، یہ حال ہے تیری امت کا ،
دنیا میں کسی کی بھی ہو خطا ، الزام ہمیں پر آتے ہیں [3]

ع حق شناسوں میں کوئی ایک بھی فاروق نہیں
لوگ اب جراتِ انکار تک آ پہنچے ہیں

تابکے ضبط ؟ میری مصلحت اندیش خرد
معرکے جب رسن و دار تک آ پہنچے ہیں [4]

-----

(۱۰) ماہر نے متعدد نظمیں ایسی لکھی ہیں جو حضور کی سیرتِ اقدس کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں - یہ نظمیں بےاختیار مولانا شبلی کی یاد تازہ کر جاتی ہیں - وہی خلوص ، رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی سے وہی گہری قلبی وابستگی ، وہی صداقتِ بیان اور مبالغے سے مکمل احتراز ، وہی زبان کی سادگی اور رعنائی - ان میں سے " اسیرانِ بدر " " جانوروں سے حسنِ سلوک " اور " شاہِ حبش کے

۱- ذکرِ جمیل طبع قدیم ، ص ۷۵-۷۶

۲- ایضاً ، ص ۹۰

۳- " فردوس " ص ۱۵

۴- ایضاً ، ص ۲۲

دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر " خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

" اسیرانِ بدر[1] " میں شاعر " جنگِ بدر " کا منظر پیش کرتا ہے ۔ فتح کے بعد بہت سے کفار گرفتار ہوتے ہیں اور انہیں مسجدِ نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا جاتا ہے ۔ رات کے وقت وہ تکلیف اور کرب سے کراہتے ہیں ، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے اور وہ سخت اضطراب کی حالت میں صحنِ مسجد میں ٹہلنے لگتے ہیں ۔ صحابہؓ اس کا سبب دریافت کرتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ جب تک قیدی رسیوں سے بندھے ہیں ، میں سو نہیں سکتا ، چنانچہ قیدیوں کی مشکیں کھول دی جاتی ہیں۔

اس نظم میں ایک طرف اشاعت کے لئے نبی اکرمؐ کی بےپایاں رحمت و شفقت اور آپ کے اخلاقِ عالیہ کا ایک پہلو سامنے آتا ہے ۔ جبکہ اخیر میں شاعر امتِ مسلمہ کے موجودہ حالات کے حوالے سے اپنے کرب کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تبارک و تعالی سے شکوہ کرتا ہے کہ اس کے پیغمبر علیہ اسلام نے دشمنوں کی مشکیں بھی کھول دی تھیں' لیکن اب ان کی امت کی مشکیں کسی ہوئی ہیں اور وہ غیروں کی غلامی ہوئی ہے ۔ آخری شعر اختصار و بلاغت کا خوبصورت نمونہ ہے ؎

مالکِ کون و مکان ، بادشہِ عرش سریر

نام لیوا ہیں تیرے بندِ غلامی میں اسیر[2]

یہ نظم مقصدیت ، فن ، نعت اور دعا کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے---

---

۱- ذکر جمیل طبع قدیم ، ص ۳۳

۲- ایضاً ، ص ۳۳

"جانوروں سے حسنِ سلوک"[1] مثنوی کے اسلوب میں دوسری نظم ہے جس پر شبلی کا رنگ گہرا نظر آتا ہے ۔ نبی اکرمؐ ایک روز ایک باغ میں تشریف لے جاتے ہیں ۔ وہاں ایک اونٹ بھوکا پیاسا کھڑا تھا ۔ وہ آپ کو دیکھ کر بلبلانے لگا ، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے آپ نے اسے پیار کیا اور اس کے مالک کو سرزنش فرمائی کہ جانوروں پر رحم کرو اور ان کے حقوق ادا کرو ۔[2]

اس واقعہ کو ماہر نے نظم کیا ہے ۔ پوری نظم پر والہانہ انداز چھایا ہوا ہے ۔ آغاز یوں ہوتا ہے ۔

احمدِ مرسل نبیٔ انس و جان
رحمتِ عالم پناہِ بیکسان،
ایک دن اک باغ میں پہنچے حضور
بن گیا ہر ذرہ رشکِ شمعِ طور
اے زہے ، رنگینیٔ نقشِ قدم،
جس پہ قربان نزہت باغ ارم ،
راہ کیا اندازِ تھے رفتار کے ،
خاک کے ذرے گلستان بن گئے
صحن میں اس باغ کے اِک اونٹ تھا
صدمۂ جوع و عطش میں مبتلا
بلبلا اٹھا ستم کش جانور
رحمتِ عالم کو آتا دیکھ کر

۱۔ ذکر جمیل طبع قدیم ، ص ۹۳
۲۔ سیرت النبیؐ جلد ۳ ، سید سلیمان ندوی طبع چہارم ۱۹۸۵ء ، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد ، ص ۵۹۷

آئے سرکارِ جہان اس کے قریب ،
جاگ اٹھے اونٹ کے خُفتہ نصیب
سر پر اس کے ہاتھ پھیرا پیار سے
جانِ رحمت راحتِ کونینؐ نے [1]

اونٹ کو امان مل گیا اور اس کی شکایت رفع ہو گئی تو شاعر محبت ، عقیدت اور سرمستی سے آپ کے حضور مین ہدیہ درود و سلام پیش کرتا ہے اور اخیر مین التجا بھی -

السلام اے فاتحِ بدر و تبوک ،
جانور کے ساتھ یہ حسنِ سلوک
السلام اے رحمةٌ للعٰلمین ،
السلام اے مرکزِ دنیا و دین
السلام اے بیکسون کے غمگسار ،
السلام اے قلبِ مضطر کے قرار
اے پناہِ خستہ حالی السلام
مظہرِ شانِ جمالی السلام ،
قادرِ مطلق کے پیارے السلام
بے سہارون کے سہارے السلام
آپ کی امت ہے باحال تباہ ،
اس طرف بھی اک عنایت کی نگاہ [2]

• شاہِ حبش کے دربار مین حضرت جعفر کی تقریر [3] چھوٹی بحر مین ایسی

۱- ذکرِ جمیل طبع جدید ، ۱۰۰ ، ۱۰۱
۲- ایضاً ، ص ۱۰۲
۳- ذکرِ جمیل طبع قدیم ، ص ۱۰۵

پُر تاثیر مثنوی ہے جو بے اختیار دل میں اُتر جاتی ہے ۔ روانی ، زور اور سلاست کے اعتبار سے نظم قابلِ تعریف ہے اور سہلِ ممتنع کا خوبصورت نمونہ ۔ حضرت جعفر رض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی خوبیاں یوں بیان کرتے ہیں ۔

هم اس کی زندگی کو جانتے ہیں ،
کہ بچپن سے اسے پہچانتے ہیں
وہ ہے اک پیکرِ صدق و امانت ،
بہت ہی نیک باطن پاک طینت
ہے اس کی زندگی بے داغ و سادہ
وہ سچا ہے زیادہ سے زیادہ ،
سبق توحید کا ہم کو سکھایا ،
کہ سیدھا راستہ اس نے بتایا ،
کہا اس نے کہ ذاتِ حق کو پوجو
بتو انسان بُری باتوں کو چھوڑو
نہیں حق کے سوا معبود کوئی
پرستش چھوڑ دو لات وہبل کی
دل آزاری کسی کی بھی نہ چاہو
کیا ہے وعدہ تو اس کو نبا ہو
سدا آپس میں مل جل کر رہو تم
برائی سے بچو نیکی کرو تم [1]

---

۱ ۔ ذکر جمیل طبع قدیم ، ص ۱۰۷ ۔ ۱۰۸

" تہذیبِ حاضر سے خطاب "[1] بھی نعتیہ نظم ہے جو یوں لگتا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے دوران میں لکھی گئی ۔ بدامنی اور تباہی و بربادی کے تناظر میں شاعر دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کو اگر امن میسر آ سکتا ہے تو وہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام نافذ کرنے سے ۔

امن ناممکن محمدؐ کی غلامی کے بغیر
جن کی رحمت ، جن کی شفقت اس جہان میں عام ہے[2]

ماہر کی نعتیہ منظومات میں " صبح انسانیت "[3] اور " صبح سعادت "[4] کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے ۔ دونوں کا موضوع ایک ہے یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پوری انسانیت کس طرح تاریکی کے اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی اور آپ کے ورودِ مسعود کے بعد دنیا میں کیسا صالح اور ہمہ جہت انقلاب آیا ۔

" صبح انسانیت " مثنوی کی ہیئت میں ۲۴ اشعار پر مشتمل ایک موثر اور دلاویز نظم ہے ۔ اس میں شاعر نے ابتدا میں بعثت نبوی سے قبل کی دنیا کے ہمہ نوع زوال کا اجمالی نقشہ پیش کیا ہے ۔

یہ جہانِ آب و گل مدت سے تاریکی میں تھا
تھی مسلط ہر طرف ظلم و جہالت کی گھٹا
کاروانِ زندگی بہکا ہوا ، بھٹکا ہوا ،
سارا عالم ایک سکتہ ، ساری دنیا اک خلا ۔

۱- ذکر جمیل طبع جدید ، ص ۱۵۳

۲- ایضاً ، ص ۱۵۸

۳- ایضاً ، ص ٦۱

۴- ایضاً ، ص ۷۷

اہلِ دانش بھی فریبِ جہل میں آئے ہوئے ،
بے یقینی کے اندھیرے ذہن پر چھائے ہوئے

اور پھر اس بے مثل انقلاب کے فیوض و برکات کا ذکر کیا ہے جو رحمۃ للعالمینؐ کی تشریف آوری سے دنیائے انسانیت کو نصیب ہوئیں - اس حوالے سے شاعر کا والہانہ پن دیدنی ہے -

یک بیک ابھرا حرا کے غار سے اک آفتاب
وہ محمد مصطفٰے ، اُمّی لقب ، رحمت مآب
جس کی سیرت کا ورق طائف بھی ہے، خیبر بھی ہے
جو ظہورِ حق بھی ہے،مَظہَر بھی ہے، مُظہِر بھی ہے
جس کا احسان اور کرم انسانیت پر قرض ہے
وہ بشر ، خیر البشر ، جس کی اطاعت فرض ہے
جس نے انسان کو طریقے زیست کے سمجھا دیئے
دین و دنیا میں توازن کے لئے کیا چاہیئے
ذوق کو پاکیزگی ، وجدان کو تقدیس دی
ذہن کو تابندگی ، فکر و نظر کو روشنی

عالمِ انسانیت پر حضور کے احسانات گنوانے کے بعد ماہر آخر میں براہ راست آپ کے حضور میں خراجِ عقیدت اور صلوٰۃ و سلام پیش کرتے ہیں -

الصلوٰۃ و السلام اے رحمۃ للعالمین
السلام اے امّیِ ، الرّسولُ الاَمین
السلام اے پیشوائے اولین و آخرین
آپ ہی کا سب تصدق ہے وہ دنیا ہو کہ دین

فنی اعتبار سے بھی یہ نظم اپنی بےساختگی ، سلاست ، زورِ بیان کی خاص شان رکھتی ہے اور امید ہے کہ اردو کی نعتیہ مثنویون مین تادیر زندہ رہے گی -

" صبحِ سعادت " مسدس ہے اور اتفاق سے یہ بھی ۲۲ بندون پر مشتمل ہے- راجہ رشید محمود کے بقول " مسدس مین جوش و جذبہ اور رفعت و شکوہ کے عناصر کار فرما ہوتے ہین ، لیکن بیان مین توازن ، بانکپن اور آہنگ ضروری ہے " -[1]
جبکہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے الفاظ مین " ہماری شاعری مین مسدس نظم کی ایک ایسی قسم ہے جس کا نبھانا آسان نہین ہے - اچھے اچھے مشاق شاعر بھی رہ جاتے ہین اور بھرتی کے شعرون سے چول بٹھانے کی کوشش کرتے ہین"[2] یہی سبب ہے کہ اردو مین کامیاب مسدس بہت کم ہین اور مولانا حالی کی " مدوجزرِ اسلام " اور اقبال کی شکوہ و جوابِ شکوہ اور چند دیگر نظمون کے علاوہ مسدس خال خال ہی نظر آتی ہے - تاہم عصرِ حاضر مین احسان دانش اور محشر رسول نگری کے بعد ماہر نے اس صنف مین قادر الکلامی اور کامیابی کی مثال قائم کی ہے اور نعت کے حوالے سے وہ " صبحِ سعادت " کے عنوان سے ایک بھرپور نظم یاد گار چھوڑ گئے ہین - چنانچہ اس مین جوش و جذبہ بھی ہے ، بانکپن اور توازن بھی اور ایک خوبصورت دلآویز آہنگ بھی - قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ پوری نظم مین کوئی بند یا شعر بھرتی کا نہین ہے - شاعر نے قدرتِ کلام کا مظاہرہ کیا ہے اور کڑے انتخاب کا بھی -

مولانا سید سلیمان ندوی مسدس کی صنفی حیثیت کے متعلق لکھتے ہین :-

---

۱- ماہنامہ شام و سحر نعت نمبر شمارہ نمبر ۲ ، ص ۱۰۳

۲- مقدمات عبدالحق ، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ، اردو مرکز ، لاہور ۱۹۶۴ء ، ص ۲۶۰

" مسدس کی یہ صورت ہے کہ اس کا ایک ایک بند گویا کتاب کا ایک مختصر باب یا تحریر کا ایک پورا گراف ہوتا ہے جس میں ایک ایک واقعہ الگ الگ ادا ہوتا جاتا ہے ۔ نظم کی رفتار پہلے مصرع میں تمہید، دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں واقعہ کی تفصیل اور پانچویں اور چھٹے میں نتیجہ کی تاثیر بنتی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کہاں سے چیز شروع ہوئی، کہاں تک اوپر چڑھی اور پھر کہاں سے نیچے اتری ۔ ہر نئے بند کے شروع اور خاتمہ پر سامع کا نفس تبدیلِ ذائقہ اور تجدیدِ احساس کے لئے مستعد اور تیار رہتا ہے"۔[1]

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ " صبحِ سعادت " اس معیار پر پورا اترتی ہے اور اپنی اثر پذیری، سوزو گداز اور کیفیت و لذت کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے ۔ مثال کے طور پر نظم کے ابتدائی حصے میں قبلِ اسلام کی حالتِ زار کا یوں نقشہ کھینچا گیا ہے ۔

ایک ہی رنگ پہ دنیا تھی عرب ہو کہ عجم ،
کہیں تخییل کے بُت تھے، کہیں پتھر کے صنم
لات و عزیٰ کی خدائی کی جو کھاتے تھے قسم
ان کا اک کھیل تھی پامالیِ تقدیسِ حرم
شرک و بدعت کا اندھیرا تھا سیہ کاری تھی
ہر طرف ظلم و جہالت کی عملداری تھی ،

۱۔ بحوالہ دیباچہ " فخرِ کونین " حصہ دوم، ص ۵۷۵

خشت و سنگ و شجرو زر تھے بشر کے مسجود ،
خواہشِ نفس کے رنگین تقاضے معبود ، ،
کہین ثابت نہ رہین خلق و مروت کی حدود
جیسے انسان کو تھی اپنی تباہی مقصود
زندگی جنسِ معاصی کی خریدار ہوئی
آدمیت تھی کہ رسوا سرِبازار ہوئی

عقل آوارہ و سرگشتہ ، نگاہین بے نور ،
غیب کا لطف ہی حاصل نہ میسر تھا حضور
بےیقینی کے اندھیرے مین بھٹکتا تھا شعور
ایک مدت سے حقیقت تھی نظر سے مستور
حال ابتر تھا بہت حکمتِ یونانی کا
فلسفہ ایک مرقع تھا پریشانی کا

نظم کے دوسرے حصے مین اس انقلاب کی برکات کا ذکر ھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے نتیجے مین برپا ھوا - اس حوالے سے شاعر کے والہانہ پن کے ساتھ ساتھ اس کا تاریخی شعور بھی لائقِ توجہ ھے -

کس قدر شوخ ھے رخشندہ و خوش تاب کرن
جگمگاتے ہوئے یہ دشت و چمن کوہ و دمن ،
مطلعِ فجر کا اللہ رے ، برساختہ پن ،،
دل بھی بیدار ہوئے ، فکر و نظر بھی روشن
منتظر سب تھے اسی صبح سعادت کے لئے
آنکھین بے خواب تھین انوارِ رسالت کے لئے

کس قرینہ سے ہوئی محفلِ ہستی آباد ،
نہ کوئی نقش بدی کا نہ کہیں شروفساد
خیرو حکمت کے طریقون کا وہ حسنِ ایجاد
عمل و قول کی سچائی پہ رکھ دی بنیاد
علم و دانش کا ہر نقش ابھرتا دیکھا
رنگ تہذیب و تمدن کا نکھرتا دیکھا

ہر برائی کو دیا دیس نکالا جس نے ،
ڈگمگاتے ہوئے انسا ن کو سنبھالا جس نے
آدمیّت کو نئے طرز پہ ڈھالا جس نے
کر دیا مشرق و مغرب مین اجالا جس نے
اُسی انسان کو محبوبِ خدا کہتے ہین
نام سنتے ہین تو سب صلِّ علیٰ کہتے ہین

خلافتِ راشدہ یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اس کے عملی نفاذ کو انسانیت کی معراج اور مقصدِ اولیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ماہر رقمطراز ہین ۔

خود عمل کرکے دکھایا کہ حکومت کیا ہے
اصل مین رابطۂ دین و سیاست کیا ہے
جس کو اللہ کی کہتے ہین " خلافت" کیا ہے
آدمی چیز ہے کیا ، بارِ امانت کیا ہے
دین کی راہ مین ساحل بھی ہے طوفان بھی ہے
صرف صُفّہ ہی نہین ، بدر کا میدان بھی ہے ،

ماہر کو حضور سرورِ عالمؐ سے جو غائت درجے کی محبت ہے اور آپؐ ہی کی نسبت سے وہ حجازِ مقدس کے لئے جو گہری قلبی وابستگی رکھتے ہیں، اس کا اظہار بھی دیکھنے کی چیز ہے -

ارضِ بے کشت و زراعت کی پھبن ،
جس کے اونٹوں پہ نچھاور ہوں غزالانِ ختن
جس کے ذروں پہ ہوں قربان بدخشان و عدن
جس کے کانٹوں پہ فدا لالہ و گل، سرو و سمن
جلوۂ لوح و قلم غارِ حرا تک پہنچا ،
دفعۃً ذہن بشر وحی خدا تک پہنچا

• ظہورِ قدسی •

• ظہورِ قدسی • کو اگر ماہر کا شاہکار کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو گا - یہ مثنوی انہوں نے ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن کے ایک جلسۂ سیرت النبیؐ میں سنائی - جلسہ کی صدارت مشہور مورخ اور عالمِ دین مولانا مناظر احسن گیلانی کر رہے تھے - ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ (جنوری ۱۹۳۹ء) میں یہ نظم اسی عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی - دیباچہ مولانا گیلانی نے رقم فرمایا تھا - موصوف لکھتے ہیں :-

• سب سے پہلا کام ماہر کی اس نظم کا یہ ہے کہ انہوں نے حتی الوسع پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قسم کے صفات منسوب کرنے سے احتراز کیا ہے ، جن میں شانِ نبوت سے کوئی مناسبت نہیں ہے لیکن عام شعرا جس کے انتساب میں بےباک ہیں - یہ تو ان کا

سلبی کارنامہ ہے ۔

اس کے بعد انہوں نے سیرت طیبہ کی مستند کتابوں اور احادیث کے معتبر ذخیروں سے ، ان سچے واقعات کا انتخاب کیا ہے جن کی توثیق و تصدیق پر محدثین اور علماء سیر کی مہرین ثبت ہو چکی ہین ۔ پھر ان ہی واقعاتِ صادقہ کو اپنے خاص بلیغ اور اچھوتے انداز مین انہون نے نظم کا لباس پہنایا ہے "۔[1]

نظم کے بےپناہ تاثر کے بارے مین مولانا لکھتے ہین :۔

" رہی ان کی شعریت ، اس کے متعلق اسی قدر عرض کر سکتا ہون کہ وہ پڑھتے جاتے تھے اور بےاختیار میرے دل سے آنسوؤن کا سیلاب بہہ بہہ کر آنکھون کی راہ سے نکل رہا تھا ۔اگر شعر کی بلندی و پستی کا معیار اس کی تاثیری کیفیت ہے تو کم از کم اس معیار پر میرے خیال مین ان کی یہ نظم بلند مقام کی مستحق ہے اورسچ تو یہ ہے کہ جس ذاتِ برتر و گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کی نظم کا تعلق ہے ، کیا اس بلندی کی ہمسری کا تصور مین کوئی کر سکتا ہے ؟ پھر اسی پر نظم کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے "۔[2]

مولانا آگے چل کر رقمطراز ہین :۔

" مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ تعالی ماہرالقادری کے اس سلام کے بعد میلادی مجالس کے سلامون کی تاثیر و افادہ مین ایک بڑا انقلاب پیدا ہو گا

... اور وہ دن کچھ دور نہین ہے کہ ماہرکا یہ سلام پشاور سے برما تک اور کھاٹ منڈو سے راس کماری تک کے علاقون کو فتح کر لے گا "۔[3]

۱۔ دیباچہ ظہور قدسی مطبوعہ مکتبہ علمیہ ، چار مینار حیدر آباد ۱۳۵۷ھ ص ۵
۲۔ ایضاً ، ص ۵ ، ۶
۳۔ ایضاً ، ص ۶

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس نظم کا موضوع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت ہے ۔ یہ ۸۹ اشعار پر مشتمل ہے ۔ بیس اشعار میں تمہید ہے ۔ بیس اشعار تبریک پر مشتمل ہیں ۔ تیرہ اشعار میں نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت پر مسرت و بہجت کا اظہار کیا گیا ہے ۔ پچیس اشعار سلام کے ہیں اور آخری گیارہ میں درود بھیجا گیا ہے ۔

تمہید کے آغاز میں تشبیب کا سا انداز نمایاں ہے ۔ اس صبح کا منظر دکھایا گیا ہے جب نبی اکرم ﷺ دنیا میں تشریف لائے ۔ شاعر کے ذہن کی لوح پر وہ مبارک ، بے حد مقدّس منظر ابھرتا ہے اور وہ غیر معمولی قسم کی سرشاری اور مستی میں ڈوب جاتا ہے ۔ اسے پوری کائنات مسرت وانبساط کی کیفیت میں نظر آتی ہے اور فطرت کا ہر مظہر سراپا استقبال دکھائی دیتا ہے ۔ بلاشبہ تمہید میں ماہر کے قلم نے بقول صبامتھراوی عقیدت کے غنچے کھلائے ہیں اور محبت کے پھول بوسائے ہیں ۔[1]

سَحر کا وقت ہے معصوم کلیاں مسکراتی ہیں
ہوائیں خیر مقدم کے ترانے گنگناتی ہیں ،
مئے عشرت چھلکتی ہے ستاروں کے کٹوروں سے
اُبلتی ہے شرابِ خاد مئی کے سکوروں سے
کُھبی جاتی ہے آنکھوں میں گل ولالہ کی رعنائی
کہ جیسے درحقیقت خاک پر جنت اُتر آئی ،
بھلائی کا اجالا اپنے مرکز پر سمٹ آیا
شبابِ رفتۂ عالم پلٹ آیا پلٹ آیا ،

۱۔ فاران مئی ، ۱۹۸۱ء ، ص ۲۲

سجائی جا رہی ہے محفلِ ہستی قرینے سے ،
وہ جلوے کار فرما ہیں گزر جائیں جو سینے سے

اصولی اعتبار سے دیکھیں تو یہ محض روایتی نوعیت کی شاعری نہیں ہے نہ اس میں کسی مبالغے کا احتمال ہے - اس مادی کائنات کا ایک روحانی پہلو بھی ہے - چنانچہ روحانیت کے امام کی تشریف آوری پر مظاہرِ فطرت خوشی کا اظہار کیوں نہ کرتے -

طرب کے جوش سے ایک ایک ذرہ مسکراتا ہے ،
زمین کی آج قسمت پر فلک کو رشک آتا ہے
مسرت کے اثر سے مثلِ صبحِ خُلد ہیں خندال ،
حرم کے در ، صفا کی وادیاں ، عرفات کا میدان

اور جب وہ ساعتِ سعید آتی ہے تو شاعر زبانِ حال سے ہر مظہرِ فطرت سے مبارک سلامت کی صدائیں سنتا ہے - تبریک کے اس بند میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی صفات بیان کی گئی ہیں اور بعض شعروں کے ہر مصرع کا آغاز "مبارک" سے اور اختتام "تشریف لے آئے" سے ہوتا ہے - اس طرح حضورؐ کی چالیس صفات ہدیۂ تبریک کے ساتھ بیان ہوئی ہیں- کسی میں مبالغہ نہیں ، تاریخ سے انحراف نہیں - وہ صفات یہ ہیں - شہِ ہر دوسرا ، محمد مصطفےٰ ، غمگسارِ بیکساں ، شفیعِ عاصیاں ، جہاں کی روشنی ، ہادیٔ دینِ مبین ، وجہِ تخلیقِ جہاں ، رہبروں کے پیشوا ، شمعِ بزمِ انبیاء ، دردمندوں کی دوا ، مخبرِ صادق ، چشمۂ صدق و صفا ، محبوبِ خدا ، پیکرِ صبر و رضا ، شمس الضحیٰ ، بدر الدجیٰ ، بدر الدجیٰ ، کاشفِ اسرارِ حق ، مظہرِ انوارِ حق --- فنی طور پر بیان کا شکوہ ، حُسنِ ادا ، جذبات کی فراوانی اور مسرت و بہجت ایک ایک شعر سے ہویدا ہے -

مبارک رہبروں کے پیشوا تشریف لے آئے
مبارک شمعِ بزمِ انبیاء تشریف لے آئے
مبارک دستگیرِ بے نوا تشریف لے آئے
مبارک دردمندوں کی دوا تشریف لے آئے
مبارک دافعِ رنج و الم تشریف لے آئے
مبارک صاحبِ جود و کرم تشریف لے آئے

نظم کا تیسرا بند تیرہ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں بھی شاعر نے اپنی بے پایاں محبت ، والہانہ قلبی وابستگی اور غیر معمولی مسرّتوں کا اظہار کیا ہے ۔ یہاں بھی نبی اکرمؐ کی صفات بیان کی گئی ہیں ۔ مگر مختلف پیرائے میں۔یوں لگتا ہے شاعر پر سرمستی و دیوانگی کا سا عالم طاری ہے ۔ وہ لہجہ بدل بدل کر حضورؐ کی ثنا خوانی کرتا ہے اور جذبات کی فراوانی اور مسرت کا وفور اُبل اُبل پڑتا ہے ۔ صاف نظر آتا ہے کہ شاعر کی روح اور اس کا وجدان بول رہا ہے ۔

وہ آئے جن کے آنے کی زمانے کو ضرورت تھی ،
وہ آئے جن کی آمد کے لئے بے چین فطرت تھی
وہ آئے جن پہ حق کے فضل کی تکمیل ہونی تھی
وہ آئے جن کی ٹھوکر پر نچھاور سطوتِ دارا ،
وہ آئے جن کے آگے سرد ہر باطل کا انگارا ،
وہ آئے جن کے آنے کو گلستاں کی سحر کہئے
وہ آئے جن کو ختم الانبیاء خیر البشر کہئے

چوتھے بند میں ماہر کا وہ سلام ہے جو اردو نعت کی تاریخ میں خاص شہرت کا حامل ہے اور جسے مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

اس بحر مین ۲۵ اشعار هین - هر مصرعے کا آغاز " سلام اس پر " سے هوتا هے اور یون حضور رحمۃ اللعالمین کی پچاس صفات بیان کرکے هدیۂ سلام و عقیدت پیش کیا گیا هے -

سلام اس پر کہ جس نے بیکسون کی دستگیری کی ،
سلام اس پر کہ جس نے بادشاهی مین فقیری کی ،
سلام اس پر کہ جس نے خون کے پیاسون کی قبائین دین
سلام اس پر کہ جس نے گالیان سن کر دعائین دین

شاعر نے عام روایت سے هٹ کر اُسوہ حسنہ کے مختلف پہلو بیان کئے هین - اُس همہ گیر انقلاب کو خراج عقیدت پیش کیا هے جس نے پوری نوعِ انسانی کی قسمت بدل ڈالی نیز عالم انسانیت پر آپ کے احسانات بیان کئے هین -

سلام اس پر کہ جس کے گھر مین چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اس پر جو بھوکا رہ کر اورون کو کھلاتا تھا
سلام اس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے هین
سلام اس پر بُرون کو جس کو فرمایا ،" یہ میرے هین "
سلام اس پر فضا جس نے زمانہ کی بدل ڈالی
سلام اس پر کہ جس نے کفر کی قوت کچل ڈالی ،

ماهر نے حضور رسالتمآبؐ کے اسوہ حسنہ کے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا هے جو حق و باطل کے معرکے مین تاابد روشنی کا مینار بنا رهے گا -

سلام اس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی،
اُلٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت، اوجِ دارائی
سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں،

" ظہورِ قدسی " کا آخری بند درود پر مشتمل ہے اس میں گیارہ اشعار ہیں اور بائیس مرتبہ درود بھیجا گیا ہے۔ یہاں بھی حضور ختم الرسل ؐ کے فطری محاسن بیان کئے گئے ہیں اور مبالغے یا تصنع کا دُور دُور تک کہیں گزر نہیں ہے۔

درود اس پر کہ جس کا نام تسکینِ دل و جان ہے،
درود اس پر کہ جس کے خُلق کی تفسیر قرآن ہے،
درود اس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی
درود اس پر کہ جس کا تذکرہ عینِ عبادت ہے
درود اس پر کہ جس کی زندگی رحمت ہی رحمت ہے۔

تجزیہ نگار اور شاعر جناب خالد علیم اردو میں نعتیہ مثنویوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" شعرا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت پر اس عالم رنگ وبو کی مسرت انگیز کیفیت کو اپنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہوئے زورِ تخیّل اور قوتِ بیان کے جوہر دکھائے ہیں۔ خصوصاً محسن کاکوروی کی مثنوی " صبحِ تجلی " زبان و بیان کی باریکیوں اور صناعی کا شاندار نمونہ ہے، لیکن ماہر القادری کے ہاں ان اوصاف کے ساتھ جذبے کی جو شدت اور خلوص موجود ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ محسن کی مثنوی میں اگرچہ یہ خلوص اور جذبہ موجود ہے، لیکن

ان کی مثنوی پڑھتے ہوئے قاری زبان و بیان کی باریکیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے ، لہذا ان سرمدی کیفیتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حقیقی میں پائی جاتی ہیں۔ محسن نے اپنے تخیل اور بیان کی ساری قوتیں شاعرانہ صناعی میں صرف کرتے ہوئے ایک طویل مثنوی لکھ دی ، لیکن اس کے باوجود مدح کے بیان میں تشنگی محسوس ہوتی ہے ۔ محسن کے ہاں عقیدتاً بھی بعض اشعار محلِ نظر ہیں ، مثلاً

نازل ہے زمین پہ کبریائی
بندے کے لباس میں خدائی

مگر ماہر کے ہاں ایسا نہیں ہے ۔ وہ جذبات اور زبان و بیان کی سحر کاریوں سے مغلوب ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی اوصاف کو فراموش نہیں کرتے ، بلکہ پوری ہوشمندی ، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ شایانِ شان الفاظ میں ہدیۂ خلوص پیش کرتے ہیں اور جادۂ اعتدال پر قائم ہو کر حضورؐ کے اُسوہ حسنہ اور سیرت کے مضامین کو قلم بند کرتے ہوئے اپنے جذبات کی خوبصورت انداز میں ترجمانی کرتے ہیں ان کے ہاں الفاظ کا انتخاب اور سادگیٔ بیان قابلِ قدر ہے "۔[1]

مختصراً "ظہورِ قدسی" میں نبی اکرمؐ سے شاعر کے عشق و ارادت کا اظہار نہایت دل نشین اور موثر پیرایے میں ہوا ہے ۔ صفائی بیان ، سادگی و پُرکاری اور صدق و خلوص سے ماہر نے فکر و نظر کے نئے نئے گوشے منوّر کئے ہیں ۔ انہوں نے بارگاہِ رسالتؐ میں اپنی عقیدت مندی کو جس انداز میں پیش کیا ہے ، اس میں مبالغے کا کہیں دخل نہیں ۔

۱۔ ماہنامہ شام و سحر لاہور نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۹۸ ، ۹۹

انہوں نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو پوری تاریخی صداقت کے ساتھ نظم کیا ہے جس میں وارفتگی اور جذبات کی فراوانی سے وہ حُسن اور نکھار پیدا ہے جو بصیرت افروز بھی ہے اور ایمان کی تازگی کا سبب بھی -

ماہر کی نعت پر ایک عمومی نظر

جہاں تک فن اور تکنیک کا تعلق ہے ماہر کا نعتیہ کلام عمومی طور پر ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے - فصاحت ، بلاغت ، سلاست ، روانی ، محاکات ، منظرنگاری جذبات نگاری ، حقیقت نگاری ، روز مرہ کی صفائی ، محاورات کا برمحل استعمال ، تشبیہات و استعارات کی ندرت ، صنائع لفظی و معنوی ، زبان کی مٹھاس ، لہجے کی شیرینی اور الفاظ کا توازن ان کی نعتوں میں عام ہے - اس اعتبار سے "ظہورِ قدسی" تو خصوصاً ادبِ عالیہ میں شمار کی جا سکتی ہے -

ماہر نے نعت لکھتے ہوئے شاعری کے مختلف اسالیب اختیار کئے ہیں - مثنوی ، مسدس ، قصیدہ اور ترکیب بند کا پیرایہ اور بجتی ہوئی مترنم بحروں اُنہیں پسند ہیں - نعت کہتے وقت وہ الفاظ کا خاص خیال رکھتے ہیں - وہ جانتے ہیں کہ نعتیہ اشعار میں یہ احتیاط بہت ضروری ہے - جذبے کی صداقت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے مزاج کو سمجھنا اور ان کے برمحل استعمال کا سلیقہ نعت کے تقدس کے لئے شرطِ لازم ہے - مشہور نعت گو شاعر حافظ لدھیانوی نے نعت میں زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نعتیہ شاعری عام شاعری سے بالکل مختلف ہوتی ہے - جب تک شاعر ادب کے قرینے اور نعت اور غزل کے فاصلوں سے کماحقہٗ آگاہ نہیں ہوتا ، اُسے نعت کہنے کا صحیح ڈھنگ نہیں آ سکتا [۱] - اس معیار کو دیکھیں تو ماہر کے ہاں ایک

۱- شام و سحر نعت نمبر جلد ۲ ، ص ۲۷۵

شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو عام انسانی محبوب اور اس کی خصوصیات سے مطابقت رکھتا ہو ۔ بالفاظ دگر ماہر نے غزل اور نعت میں واضح فرق ملحوظ رکھا ہے اور نعت کے اشعار صرف نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کے تناظر میں لکھے گئے ہیں ۔ نعت میں انہوں نے غزل کا اسلوب ضرور اختیار کیا ہے ، مگر غزل کے محبوب کو ایوانِ نعت میں داخل نہیں ہونے دیا ۔ یہاں حضور سرورِ کائناتؐ ہی جملہ اوصاف حسنہ کے ساتھ ان کے محبوب ہیں --- اس طرح پروفیسر سید یونس شاہ کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ ماہر القادری کی نعتیہ شاعری میں جذبہ اور فن دونوں کی مناسب آمیزش نے فکر و نظر کو جلا بخش دی ہے "۔[1]

نعت گوئی میں ماہر کا مقام

نعت گوئی میں ماہر کا اگرچہ اپنا ایک انداز ہے ، مگر صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے مشاہیر شعراء سے بھی اثرات قبول کئے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے حالی سے سوز و اخلاص ، شبلی سے واقعہ نگاری ، ظفر علی خان سے قادر الکلامی اور برجستہ گوئی ، اقبال سے شوکتِ بیان اور رفعتِ فکر کے رموز و نکات حاصل کئے ہیں اور انہیں اپنی خدا داد شاعرانہ صلاحیتوں سے آمیز کر کے اپنی انفرادیت کا نقش ابھارا ہے۔ ماہر کی نعت اس اعتبار سے مکمل ہے کہ اس کے لئے جس گداز ، جس خلوص و احساس ، جس عصری شعور ، جس احساسِ توازن ، جس فکرِ سلیم ، جس وسعتِ مطالعہ ، اور قادرالکلامی کی ضرورت تھی ، ماہر کے ہاں وہ سب جامعیت کے ساتھ موجود ہیں اور بغیر کسی مبالغے کے کہا جا سکتا ہے کہ ماہر کی نعت میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو اعلیٰ معیار

۱۔ تذکرہ نعت گویان اردو جلد ۲ ، مکہ بکس اردو بازار لاہور ۱۹۸۳ء ، ص ۳۹۷

کی نعت میں ہونی چاہئیں اور انہوں نے وہ ساری شرائط پوری کی ہیں جو نعت کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں - نعت کہتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ حضورؐ کا جلال و جمال ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور باطنی کیف و سرور اور قلبی جذبے و شوق کا اثر پھوٹ پھوٹ پڑتا ہے - چنانچہ ماہر نے جس چاہت و خلوص ، وارفتگی ، شیفتگی اور یکسوئی و توجہ اور توازن کے ساتھ سیدِ کونینؐ کی مدح کی ہے ، وہ خاص انہی سے مخصوص ہے -

ماہر بلا شبہ ان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے نہایت خلوص اور لگن سے نعت کا احیاء کیا اورمشکل حالات میں لوگوں سے اس کا لوہا منوایا - ماہر کو اگرچہ نبی اکرمؐ کی محبت وراثت میں ملی تھی ، مگر وہ اس اجالے میں اپنی تحقیق اور جستجو کے سہارے آگے بڑھے ہیں انہوں نے محبت اور عقیدت سے صداقت کا یہ سفر طے کیا اور تشکیک کر قریب نہیں پھٹکنے دیا - حالانکہ وہ دور غلامی ، ترقی پسندی ، دنیا پرستی اور مادیّت کا تھا اور بیشتر باکمال شعراء ان منفی قدروں سے متاثر بھی تھے -

موضوع اور فن کی خوبیوں کے اعتبار سے دیکھیں اور کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے جائزہ لیں تو لاریب ماہر کا شمار اردو کے چند صفِ اول کے نعت گو شعراء میں کیا جا سکتا ہے - وہ اس اعتبار سے خصوصی انفرادیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے نعت کو دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنایا ، نعت کے حوالے سے اس نظام کی اشاعت کی جسے نبی اکرمؐ نے نافذ فرمایا اور بڑے ہی یقین و اذعان کے ساتھ سیرت نبوی[۲] اور شریعتِ محمدیؐ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا -

چنانچہ بالکل درست لکھا ڈاکٹر ریاض مجید نے کہ :

" ماہر نے نعت کو اصلاح و تبلیغ کا ذریعہ بنایا اور اس کے ذریعے ایک طرف تو لادینیت اور ملحدانہ افکارو نظریات کی نفی کی اور دوسری طرف اسلامی عقاید میں ہندی اثرات کے سبب جو غلط عناصر پیدا ہو چکے تھے ، اس کی بیخ کنی کی اور ان مقاصد کےحصول کے لئے نعت کو ایک تحریک کے طور پر استعمال کیا ۔ ماہر کی نعت گوئی کا مقصد آنحضرتؐ کی بعثت کے مقاصد اور پیغام کو عام کرنا ہے " ۔[1]

اور حفیظ الرحمن احسن کی رائے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ :

" ماہر القادری کا اندازِ نعت گوئی بڑا دلپذیر اور فکر و خیال کی پاکیزگی و رعنائی کا آئینہ دار ہے ، جسے خلوص کی حلاوت اور جذبے کی صداقت و طراوت شئے دیگر بنا دیتی ہے ۔ زبان و بیان پر جو قدرت و دسترس اُنہیں حاصل ہے اس کا اظہار ان کی عام شاعری کی طرح ان کی حمدیہ و نعتیہ شاعری میں بھی ہوا ہے ۔ ان کے اشعار خوبئ ادا، حُسنِ ابلاغ اور رعنائی اظہار کا بہترین نمونہ ہیں ۔ نعت کے مخصوص آہنگ میں ان کے ہاں عشق و محبّت کی والہانہ سپردگی اور جذب و سرمستی کے ساتھ فکر کی پاکیزگی و رفعت ، احساس کی نظافت و طہارت اور عقیدہ و مسلک کی صحّت و درستی پہلو بہ پہلو چلتی ہیں اور اس طرح ان کے تال میل سے ان کا وہ مخصوص اسلوبِ نعت گوئی وجود میں آتا ہے جو انہیں عصرِ حاضر کے نعت نگاروں میں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے " ۔[2]

۱۔ " اردو نعت " مقالہ پی ایچ ڈی ۱۹۷۶ء ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ، ص ۳۵۱

۲۔ ذکر جمیل ۔ مرتبہ طالب ہاشمی ۔ " بزم فاران " ، لاہور ، ۱۹۸۹ء ، ص ۱۲ (دیباچہ) ۔

باب - ۳

=========

ماہر القادری کی غزل گوئی

=====================

قبل اس کے کہ ماہر کی غزل پر گفتگو کی جائے ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے فن اور اس کے مقتضیات کے بارے میں ضروری باتیں کر لی جائیں :-

"میرزا ادیب کے الفاظ میں " غزل ہماری شاعری کی سب سے بڑی صنعت ہے " -[1] رشید احمد صدیقی اسے اردو شاعری کی آبرو[2] سمجھتے ہیں اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نزدیک " غزل گوئی اردو شاعری کی سب سے اہم اور معتبر روایت ہے - اتنی معتبر و اہم کہ اگر اسے اردو شاعری کے ایوان سے خارج کر دیا جائے ، تو اس کی فضا فسردہ اور بے جان نظر آنے لگے " -[3]

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ لغت نگاروں نے غزل کے معنی " بازی کردن از جوانی و حدیثِ محبت و عشقِ زنان " بتائے ہیں جس کو اگر قبول کرلیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غزل میں جذبات کی شدت ایک بنیادی عنصر ہے " -[4] لیکن شدتِ جذبات کے ساتھ ساتھ غنائیت ، سوز و گداز اور نزاکتِ ادا بھی غزل کے جزوِ لازم ہیں - سیّد باقر حسین کے نزدیک غزل کی بنیادی خصوصیات چار ہیں : (۱) تغزل (۲) صوت و آہنگ (۳) ایمائیت اور رمزیت (۴) اختصار اور جامعیت -[5]

۱- " تنقیدی مقالات " مرتبہ میرزا ادیب ، لاہور اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء ، ص ۷

۲- " جدید غزل " از رشید احمد صدیقی / اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ۱۹۷۹ء ، ص

۳- پیش لفظ " بیسویں صدی میں اردو غزل " مرتبہ نیاز فتح پوری ، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۸۷ء ص ۱۳

۴- " غزل اور متغزلین " از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ، اردو مرکز لاہور ، دسمبر ۱۹۵۴ء ص ۵ (دیباچہ)

۵- " نقوش " غزل نمبر اکتوبر ۱۹۸۵ء ، ص ۵۸۰

نصیر الدین ہاشمی کے الفاظ میں " غزل دراصل تغزل کا دوسرا نام ہے "۔[1]

اور تغزل کی تعریف ڈاکٹر سید عبداللہ نے یوں کی ہے :۔

" تغزل دراصل بیان کی اس دل آسا ، خیال انگیز اور وجد آفریں کیفیت کا نام ہے جو جذباتِ درد و شوق کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے ۔ اس کا پیرایۂ بیان رمزی اور ایمائی ہوتا ہے ۔ یہ شیریں ، سبک اور خیال انگیز لفظوں میں خاص طور سے جلوہ گر ہوتی ہے ۔ الفاظ و جذبات کی اس دھیمی موسیقی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی لطافت کو کسی قسم کا ثقل اور کسی نوع کی رکاکت گوارا نہیں ۔ غزل کی عمارت خارجی طور پر سبک ، سلیس اور شیریں الفاظ سے تیار ہوتی ہے ، مگر اس کی روح ان لطافتوں سے ظہور میں آتی ہے جو لذتِ الم اور درد و شوق کا نتیجہ ہے "[2] پروفیسر حمید احمد خان کے نزدیک " غزل کا مضمون ضخیم نہیں ہوتا ، مگر نوک دار ضرور ہوتا ہے ۔ غزل میں جو بات کہی جاتی ہے ، وہ ہلکا سا انشراح ، لطف و استعجاب پیدا کئے بغیر نہیں رہتی "[3] ۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی رائے میں غزل کا موضوع دراصل عشقِ مجازی ہے ۔[4]

مگر حمید احمد خان کے نزدیک غزل گو شعرا کو حیاتِ انسانی پر تبصرہ بھی بہت مرغوب ہے اور غزل بھی دیگر اصنافِ ادب کی طرح زمانے کے رجحانات کے متوازی چلتی ہے مگر اس کی ترغیبات وقتی نہیں عصری ہوتی ہیں ۔[5]

بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سید عابد علی عابد کے الفاظ میں غزل کے بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ " نقوش " شمارہ ۳۱-۳۲ ، مئی ، جون ۱۹۵۳ء ، ص ۶۵

۲۔ " مباحث " از ڈاکٹر سید عبداللہ ، علمی کتاب خانہ ، لاہور ۱۹۷۹ء ، ص ۳۰۲

۳۔ تنقیدی مقالات ، مضمون " غزل کا مطالعہ " از حمید احمد خان ، ص ۱۱۸ ، ۱۱۹

۴۔ اردو غزل ، ڈاکٹر یوسف حسین خان ، آئینہ ادب ، لاہور ، ۱۹۶۲ء ، ص ۸۰

۵۔ تنقیدی مقالات ، ص ۱۲۱ ، ۱۲۲

(۱) غزل کو اصلاً ناز و نیاز کی کیفیات اور حسن وعشق کی وار دات سے مربوط ہونا چاہیے ۔

(۲) زبان جہاں تک ہو سکے ، نرم و شیریں اور بیان دلکش و دلپذیر ہونا چاہئے کہ سخن کے پردے میں صنفِ نازک سے گفتگو مطلوب ہے ۔

(۳) غزل کو ابتذال اور چھچھورے پن سے پاک ہونا چاہیئے ۔

(۴) محبوبہ سے خطاب کا انداز و اسلوب نیاز مندانہ ہونا چاہیئے ۔ غزل سرا کے لیے تفاخر و تکبر کا اظہار ممنوع ہے ۔

(۵) جہاں تک ہو سکے ، محسناتِ کلام سے احتراز کرنا چاہیئے ، تاکہ بات پیچیدہ نہ ہو جائے اور توجہ اصل مقصد سے ہٹ کر صنائع و بدائعِ لفظی و معنوی پر مرکوز نہ ہو جائے ۔[۱]

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غزل کے موضوعات محض عشقِ مجازی تک محدود کر دیئے جائیں ، بلکہ جس قدر زندگی اور اس کے مسائل وسیع ہیں ، غزل کے موضوعات بھی اتنے ہی وسیع ہونے چاہیں ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے اس موقف پر غیر معمولی زور دیا ہے کہ " غزل کو بہ اعتبارِ مضامین اور خیالات کے ، جہاں تک ممکن ہو ، وسعت دینی چاہیئے "[۲] اور غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا وہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس کو ہر قسم کے جذبات کا آرگن بنانا چاہیئے "۔[۳] چنانچہ عملی طور پر مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور اقبال نے ثابت کر دیا کہ واقعی غزل میں ہر نوع کے اخلاقی ، سیاسی اور سماجی موضوعات بڑی خوبصورتی سے ادا ہو سکتے ہیں ، اور اس سے غزل کا حسن ، نزاکت اور فن مجروح نہیں ہوتا ۔

۱۔ "اصولِ انتقادِ ادبیات" ، از سید عابد علی عابد ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ۱۹۶۰ء ، ص ۳۲۵ ، ۳۲۶ ۔

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ، اگست ۱۹۸۱ء ، ص ۱۲۱

۳۔ ایضاً ، ص ۱۵۹

غزل کے بارے میں بنیادی ضروری باتیں کرنے کے بعد اب ہم اُس ادبی و سیاسی فضا پر ایک نظر دوڑاتے ہیں ، جو بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں کارفرما تھی اور جس سے ماؔہر خاصی حد تک متاثر بھی ہوئے ۔

جیساکہ باب اوّل میں وضاحت ہو چکی ہے ، ماہر القادری ۱۹۲۹ء میں بسلسلہ ملازمت حیدر آباد دکن میں آئے ۔ بقولِ ماہر " یہ وہ زمانہ تھا کہ میری نو مشقی کا دور ختم ہو چکا تھا اور دوسرے دور کو شروع ہوئے بھی دو تین سال گزر چکے تھے " ۔[۱] یہی وہ دور تھا جب ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول علامہ اقبال ایک بڑے اور گھنے سایہ دار درخت کی مانند ادب و شعر بلکہ فکر و نظر کی پوری فضا پر چھائے ہوئے تھے ۔[۲] اور جیساکہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے وضاحت کی ہے اقبال کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی فکر اسلامی ہے ۔ وہ ایک مثالی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے اسلامی اصولوں کو بنیاد بناتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ دنیاکا کوئی اعلیٰ نظام اسلامی تصورِ معاش و معاد کو جذب کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔[۳] اور ڈاکٹر پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ " اپنی بےمثال فنی مہارت اور منفرد فکری عظمت کی بنا پر علامہ اقبال کو اردو شعروادب کی آبرو کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا ۔ مقصد و فن کا ایسا متوازن اور حسین و جمیل امتزاج عالمی ادب میں بھی مشکل ہی سے ملے گا " ۔[۴]

بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں اقبال کے علاوہ چار دیگر شعراء کا طوطی بول رہا تھا اور انہوں نے اردو شعر و ادب خصوصاً غزل پر غیر معمولی اثرات مرتب کئے ، وہ حسرت موہانی ، اصغر گونڈوی ، فانی بدایونی اور جگر مراد آبادی تھے ، ان میں بقول پروفیسر آسی ضیائی رامپوری

۱۔ "یاد رفتگان" جلد دوم / مرتبہ طالب ہاشمی ، البدر پبلیکیشنز ، لاہور ۱۹۸۶ء ، ص ۱۵۶

۲۔ " اردو ادب" ۱۸۵۷ سے ۱۹۶۶ء از ڈاکٹر سید عبداللہ مکتبہ خیابان ادب ، لاہور ۔ ۱۹۶۷ء ، ص ۲۰۱ ۔

۳۔ ایضاً ، ص ۱۰۳ ۔

۴۔ اقبال بحیثیت شاعر مرتب پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ، مجلس ترقی ادب ، لاہور طبع اول ، مارچ ۱۹۷۷ء ، ص ۱۳

حسرت (۱۸۷۵-۱۹۵۰ء) کا رنگ ان کے استاد تسلیم لکھنوی اور ان کے استاد نسیم دھلوی کے ذریعے مومن خان سے متاثر ھے - جو جرات کے رنگ کے دلدادہ تھے - یہ رنگ جرات کے ھان زیادہ عریان اور مومن کے ھان پیچیدگیٔ خیال کے ساتھ وابستہ ھے - حسرت نے اپنی شاعری کو ان دونوں باتوں سے پاک رکھا - ان کی سادگی مین ایک شریفانہ متانت اور نرمی ھے - ان کی غزل صحیح معنون مین غزل ھوتی ھے - جس مین صرف شاعر متکلم اور محبوب مخاطب ھوتا ھے - اس مین روز مرہ کی باتین نہایت دلاویزی سے بیان کر دی جاتی ھین اور غزل کی عمومیت ملحوظ رکھتے ھوئے اس کے مضامین ایسے پیش پا افتادہ ھوتے ھین جو ھر شخص کو اپنی زندگی مین پیش آ سکتے ھین - اس کے باوجود ان کے کلام مین ایسی شائستگی ، گھلاوٹ اور گداز ھوتا ھے کہ چند محدود خیالات و مضامین کے باوجود ھر نئی غزل دامن دل کھینچتی ھے -[1]

اور ڈاکٹر یوسف حسین خان نے جیساکہ لکھا ھے " حسرت کی غزل گوئی نے یہ بات ثابت کر دی کہ کلام کے لطف اور تاثیر کا انحصار نہ تو شاعر کی رند مشربی پر ھے اور نہ اس کی پارسائی پر بلکہ حسنِ ادا پر ھے جو خارجی احوال سے بڑی حد تک بےنیاز ھوتی ھے "-[2]

اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ء - ۱۹۳۶ء) ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول مفکرانہ غزل گوئی کے استاد ھین کہ انھون نے عشق و محبت کے علاوہ کائنات کی حقیقتون کے بارے مین بھی سوال اٹھائے ھین اور کہین کہین جواب بھی دیئے ھین -[3] اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی کے الفاظ مین اصغر کے کلام کا ابتدائی حصہ جوش و اضطراب اور پیچیدگی و بےقراری کی فضا رکھتا ھے ، لیکن بعد مین سکوت و سکون کی کیفیت طاری ھو گئی ھے -[4] اور جیساکہ جمیل نقوی نے

۱- "شب تاب چراغان" از پروفیسر امان اللہ خان آسی ضیائی ، شاہ اینڈ سنز سیالکوٹ س - ن ص ۱۱۷ -

۲- تنقیدی مقالات مرتب میرزا ادیب ، لاھور اکیڈمی ، لاھور ۱۹۶۴ء ، ص ۲۲۶ -

۳- "اردو ادب " ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء ، ص ۱۳۶ -

۴- "فنِ تنقید اور شعرا پر تنقیدین" از اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی ، مکتبہ کاروان ، لاھور - ۱۹۷۷ء ، ص ۴۷۵

لکھا ہے " اصغر گونڈوی کی قوت اور گیرائی کا سبب ان کی متانت ہے ۔ وہ غالب کی طرح خواص کے شاعر ہیں ۔ یہی چیز ہے جس نے ان کا دامن سوقیانہ پن سے بچالیا ہے ۔ وہ اپنے ساتھ درد کا سوز و گداز اور غالب کا وقار لے کر آئے تھے "۔[۱]

حسرت اور اصغر کے بعد موجودہ صدی کے نصفِ اول میں فانی بدایونی(۱۸۷۹ء ۔ ۱۹۴۱ء) نے خاص شہرت حاصل کی ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں موصوف " موت کے شاعر ہیں "۔[۲] ان کی شاعری میں یاس اور غم کا اتنا غلبہ ہے کہ جی اچاٹ ہونے لگتا ہے لیکن فانی کا غم مصنوعی نہیں ، اس میں سچائی کی جھلک ہے ۔ اس طرح انہوں نے دراصل موت کو گوارا بنانے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ فانی کی شاعری اگرچہ غم کی شاعری ہے ، مگر اس کے خلوص میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ۔ انہوں نے زندگی کو جیسا پایا ، ویسا ہی ظاہر کیا ہے ۔[۳]

جگر مراد آبادی (۱۸۹۳ء ۔ ۱۹۶۰ء) بقول پروفیسر شمیم احمد ابتدا میں[۴] ایک ٹھیٹ قسم کے روایتی شاعر تھے ۔[۵] جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں " غیر معتدل جذباتیت ہے " جس کے زیر اثر وہ ہیجانی جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ اس طرح ان کی شاعری " کسی اعلیٰ اجتماعی معنویت سے محروم ہے "۔[۶] البتہ " آتشِ گل " میں جوش اور ہیجان کی کیفیت نہیں رہی ۔ سنجیدگی آگئی ہے اور فکر و تامل کے پہلو بھی پیدا ہو گئے ہیں ۔[۷]

۱۔ " انتخابِ اصغر " ، ترتیب و مقدمہ جمیل نقوی ، اردو اکیڈمی سندھ نقش دوم ۱۹۸۲ء ص ۳۲

۲۔ " اردو ادب " ، ص ۱۳۸

۳۔ ایضاً ، ص ۱۳۹ ،

۴۔ یعنی " شعلہ طور میں "

۵۔ ۲ ۲ = ۵ از شمیم احمد قلات پبلیشرز ، کوئٹہ ۱۹۷۷ء ، ص ۳۱۳

۶۔ " اردو ادب " ص ۱۴۰

۷۔ ایضاً ، ص ۱۴۱

اس دور میں بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی وہ خارجی حالات و حوادث سے بھی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔[1] جس کا اظہار ان کی غزل میں بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

سیاسی صورت حال
=============

جہاں تک سیاسی صورت حال کا تعلق ہے، ۱۹۲۵ء تک برصغیر کا سیاسی مطلع خاصا صاف ہو گیا تھا، مگر انقلاب انگیز طوفانوں کی بو بھی چہار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ عدمِ موالات اور تحریکِ ہجرت مدت ہوئی ختم ہو چکی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد بھی محض سراب ثابت ہوا تھا۔ اور ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی تھیں اور آخر کار علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں باضابطہ طور پر ہندوستان میں ایک الگ خودمختار اسلامی مملکت کا تصور پیش کر دیا۔[2] آزادیٔ کامل کی تحریک تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔

۱۹۳۶ء میں برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے نام سے بظاہر ادبی اور اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا، مگر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں یہ دراصل سیاسی اور اشتراکی تحریک تھی۔[3] چونکہ پروفیسر رشید احمد صدیقی ہی کی رائے میں اس تحریک سے وابستہ لوگوں کی اکثریت ملک کے خیر خواہ تھے نہ شعر و ادب کے بلکہ وہ ملکی و علمی حوالے سے معروف اخلاقی اقدار اور تہذیبی روایات کے بھی مخالف تھے۔[4] بلا شبہ اس تحریک کو شعراء و ادباء کے ایک وسیع حلقے میں خاص پذیرائی حاصل ہوئی، لیکن اپنے منفی مقاصد اور گروہی نقطۂ نظر کی

۱۔ "جدید غزل" از پروفیسر رشید احمد صدیقی اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۷۹ء، ص ۴۷۔

۲۔ "تحریک آزادی" از پروفیسر فاروق اختر نجیب، علمی کتاب خانہ، لاہور، طبع ہفتم ۱۹۷۵ء، ص ۲۲۸۔

۳۔ "جدید غزل" ایضاً، ص ۴۳۔

۴۔ ایضاً، ص ۴۶

وجہ سے اس تحریک نے ذہنوں کو بھی مسموم کیا اور بقول ماہر القادری زبان و ادب اور غزل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ۔[1]

یہ حقیقت بڑی حیرت انگیز ہے کہ اس ہنگامہ خیز سیاسی اور ادبی صورت حال کے باوجود پورے ہندوستان میں شعرو ادب کو اس زمانے میں خاص فروغ حاصل ہوا ۔ پورے ہندوستان میں مشاعروں کی روایت مستحکم ہو گئی تھی اور شہر شہر قریہ قریہ میں مشاعرے ہوتے تھے اور عام داد سخن دی جاتی تھی ۔ ادبی رسائل و جرائد کی کثرت تھی اور بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے بھی ادبی جرائد شائع ہوتے تھے ۔ نتیجہ یہ کہ شعر و شاعری کا چرچا عام تھا اور جیساکہ باب اول میں وضاحت کی جا چکی ہے ، خصوصاً حیدرآباد دکن میں تو شعرا و ادباء کی خاص قدر افزائی کی جاتی تھی اور نظامِ دکن اور ان کے وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی سرپرستی نے اہلِ فضل و کمال کو وہاں جمع کر دیا تھا ، اس لیے حیدرآباد اور پوری ریاست میں شعروادب کا غیر معمولی چرچا تھا اور شاید ہی کوئی دن گزرتا تھا کہ وہاں شعرو سخن کی محفلیں نہ جمتی ہوں ۔[2] حیدر آباد دکن میں جن شعرا کو خاص شہرت ملی، ان میں سے فانی بدایونی ، جوش ملیح آبادی ، جلیل مانک پوری ، عزیز لکھنوی ، صفی لکھنوی، امجد حیدر آبادی ، علی اختر حیدر آبادی ، خاص قابل ذکر ہیں ۔

یہ تھی برصغیر اور حیدر آباد دکن کی سیاسی و ادبی صورتِ حال جس میں ماہرالقادری نے شعر و سخن کے میدان میں قدم رکھا اور چند ہی سالوں میں نہ صرف مشاعروں کی دنیا پر چھا گئے، نہ صرف عوام و خاص میں یکساں مقبول ہو گئے،[3] بلکہ ہندوستان کے مقبول ترین ادبی

۱۔ ماہنامہ " چراغ راہ " جولائی ۱۹۶۰ء ، انٹرویو ماہر القادری ، ص ۲۳

۲۔ "حیدر آباد دکن کے شعرا" از حمید الدین شاہد ، آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد دکن، ۱۹۵۸ ، ص الف (دیباچہ)

۳۔ " وارث سرہندی " " فاران " ، دسمبر ۱۹۷۸ ء ، ص ۳۵۱ ۔

جرائد یعنی "مخزن" ، "ہمایون" (لاہور) " معارف " (اعظم گڑھ) " جامعہ " (دہلی) " اردو" (اورنگ آباد) وغیرہ میں بھی ان کی منظومات اہتمام سے شائع ہونے لگیں - ان کی زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۲ء تک " ظہورِ قدسی " اور " ذکرِ جمیل " کے علاوہ ان کے تین مجموعہ ہائے کلام شائع ہو گئے - جن کی اجمالی تفصیل یوں ہے :-

۱- محسوساتِ ماہر ۱۹۴۲ء ادارہ اشاعتِ اردو ، حیدر آباد -

۲- نغماتِ ماہر ۱۹۴۳ء ادارہ اشاعتِ اردو ، حیدر آباد -

۳- جذباتِ ماہر ۱۹۴۴ء کتب خانہ تاج آفس ، محمد علی روڈ ، بمبئی نمبر ۳

ماہر کا چوتھا مجموعہ کلام " فردوس " کم و بیش گیارہ سال کے بعد نومبر ۱۹۵۵ء میں مکتبہ چراغِ راہ ، لاہور سے شائع ہوا - مرتب صورت میں یہ ان کا آخری مجموعۂ کلام ہے - وفات تک ان کی غزلیات انکے ذاتی رسالہ " فاران " میں ، ماہنامہ "سیارہ " لاہور میں اور ماہنامہ " چراغ راہ " کراچی میں خاصے تسلسل سے چھپتی رہیں ، معدے چند غزلیات " نیا دور " کراچی اور " نقوش " اور ماہنامہ " اردو ڈائجسٹ " میں بھی شائع ہوئیں -

مذکورہ بالا مجموعہ ہائے کلام کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہر کے کلام میں غزلیات کا حصہ تقریباً ایک تہائی کے برابر ہے - اور باقی ۲/۳ حصہ مختلف موضوعات پر مبنی مسلسل نظموں پر مشتمل ہے - [1] یوں لگتا ہے کہ ماہر مجموعہ کلام کی ترتیب و تدوین کے وقت غزلیات کا کڑا انتخاب کرتے تھے - اور معیار سے فروتر اشعار کو کتاب میں شامل نہیں کرتے تھے- [2] موصوف انتخاب اور تنقید کا کڑا معیار رکھتے تھے اور اس ضمن میں اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتے تھے - چنانچہ یہ دلچسپ امر ہے کہ ایک زمانے میں کراچی سے " گرد و پیش "

۱- چاروں مجموعوں کی ضخامت ۷۸۶ صفحات ہے - جس میں غزلیات صرف ۲۷۳ صفحات پر محیط ہیں -

۲- " فردوس " ، ص ۱۷۳

نام کاایک ماھنامہ شائع ھوتا تھا ۔ اس کے ایک خاص نمبر مین ماھر القادری کی نظم بھی
شائع ھوئی ۔ رسالہ تبصرے کے لیے ماھر کے پاس بھیجا گیا اور انھون نے " فاران " مین اس پر
تبصرہ کرتے ھوئے لکھا کہ " ماھر القادر کی نظم مین نگاہ کو "چشم " کے معنی مین استعمال
کیا گیا ھے ۔ جو قابل غور ھے " ۔[1]

اسی طرح ماھر اپنے سارے کلام کا ایک نظر ثانی شدہ ایڈیشن مرتب کرنا چاھتے تھے۔
اس امر کا اعلان کرتے ھوئے انھون نے لکھا :

" مین اپنے تمام شائع شدہ کلام کا انتخاب کر رھا ھون ۔ تاکہ جو بھرتی کی غزلیں
اور نظمین ھین انھین نکال دیا جائے .... مین اس پر خود مقدمہ لکھون گا ۔
جس مین اپنے کلام کی کمزوریون کی خود نشاندھی کرون گا کہ جن اشعار کو خارج
کیا گیا ھے ان مین فن و زبان اور اظہار و بیان کے کیا اسقام تھے "۔[2]

خود احتسابی کی اس روش کے حوالے سے صاف سمجھ مین آتا ھے کہ ماھر کے مجموعہ
ھائے کلام مین غزلیات کی تعداد کیون کم ھے ؟

ماھر کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ بھی ھوتا ھےکہ ۱۹۴۳ء تک یعنی پہلے تین
مجموعون کا مزاج اور لہجہ بعد کے کلام سے خاصا مختلف ھے ۔ اس لیے ان کے کلام کو دو
ادوار مین تقسیم کیا جا سکتاھے ۔

ماھر کی شاعری کا دور اوّل

ماھر القادری کی دورِ اوّل کی غزل اس روایت کی آئینہ دار ھے جو قدیم زمانہ

۱۔" فاران " اکتوبر ۱۹۶۵ء ، ص ۲۹

۲۔" فاران " فروری ۱۹۶۵ء ، ص ۲

سے چلی آ رہی تھی اور جو حسرت موہانی پر ختم ہو گئی تھی ۔ یہ وہ روایت تھی جس کے ماننے والوں کا عقیدہ یہ تھا کہ غزل معنوی اعتبار سے جو کچھ بھی ہو ، اس مین بیان کی لطافت اور زبان کی حلاوت ضرور ہونی چاہیے ۔ چنانچہ جیساکہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل گوئی کے انداز مین جو انقلاب آیا ، اس سے غزل کے مضامین وموضوعات مین وسعت ضرور پیدا ہوئی ، مگر اس امر مین کوئی شبہ نہین کہ چند مستثنیات کے سوا غزل کو زبان و بیان کے اعتبار سے سخت نقصان پہنچا اور شیرینی اور گھلاوٹ کا بنیادی عنصر خاصا مجروح ہوا ۔ فکرومضامین کے علاوہ لہجے مین منفی نوعیت کی تبدیلیان ہوئین اور غنائیت کہ غزل کی جان تھی ، وہ شوروخروش اور بلند آہنگی مین دب کر رہ گئی ۔ غزل کو نیا بنانے کے جوش مین نامانوس تشبیہات اور استعارات نے مانوس اور معانی سے لبریز رموزو علائم کی جگہ لے لی ، اس طرح اگرچہ غزل کا ڈھانچہ وہی رہا ، مگر غزل اپنی دیرینہ روایتون سے خاصی ہٹ گئی ۔[1]

اس صورتِ حال کے خلاف ردعمل ہوا اور غزل کو اس کی بنیادی روایتون کے قریب لانے کا کام بہت سے شعرا نے کیا ۔ جن مین حسرت ، اصغر اور جگر کے ساتھ ساتھ ماہر القادری کی خدمات بھی یقینا" بڑی وقیع ہین ۔[2] یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ نقاد حضرات

۱۔ سخنور نئے اور پرانے از ڈاکٹر سید عبداللہ ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ، ۱۹۷۶ء ، ص ۱۷۲ ، ۱۷۳ ۔

۲۔ شاعری کے بارے مین ماہر نے اپنا نقطہ نظر ایک سوالنامہ کے جواب مین تحریر کیا ہے جو پہلے ماہنامہ چراغ راہ میں ، جون ۱۹۶۵ء مین شائع ہوا اور پھر فاران " مین بھی شامل کیاگیا (جولائی ۶۵ء) وہ رقمطراز ہین :۔

" میرے خیال مین اچھی نظم اور اچھا شعر وہ ہے جس مین تخیل کی نزاکت، رعنائی اور جدت کے ساتھ اسکا اظہار بھی موزون انداز مین ہوا ہو، مین اس معاملے مین شبلی نعمانی کا مقلد اور ہم نواہون جو تخیل پر اسلوبِ بیان اور پیرایہ ادا ، اظہار و بیان اور آہنگ و الفاظ کو ترجیح دیتے ہین "۔ ص ۲۱

" لفظون کا بر محل اور صحیح استعمال ، زبان و محاورہ اور روزہ مرہ کی صحت ، الفاظ کا موزون درو بست جسے عربی مین " انسجام " کہتے ہین اسکے ساتھ تخیل کی نزاکت اور بلندی اور خیال کی گہرائی ۔ ان عناصر سے اچھا شعر ترکیب پاتا ہے" ۔ ص ۲۱

نے ماہر سے انصاف نہیں کیا اور ترقی پسندوں کے خلاف انہوں نے جو مسلسل محاذ گرم رکھا اور جس کی تفصیل الگ باب کی متقاضی ہے ، اس کی سزا انہیں یہ ملی کہ انہیں یکسر نظرانداز کیا گیا اور غزل توکجا ، نظم ، لُغت اورخاکہ نگاری میں بھی انہیں کسی توجہ کے قابل نہ سمجھا گیا ۔[۱] ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غزل میں لطافت بیان کو بحال کرکے اور اسمیں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کرکے اس کو ایک نئے ذائقے سے جس طرح ماہر نے روشناس کیا ، وہ خاص انہی کا حصہ ہے ۔

یوں تو ماہر کی غزل میں متنوع موضوعات ہیں ۔ مگر ڈاکٹر پروفیسر تحسین فراقی کے بقول " ان کی غزل کامرکزی نقطہ حسن و عشق ، تصوراتِ عشق ، شدائدِ عشق ، کیفیاتِ و داغ و وصل اور ناز و نیازِ عشق ہیں چنانچہ ان کی غزلیات کا ستر پچھتر فیصد حصہ اسی حسن و عشق اور انہی متنوع کیفیاتِ حسن و عشق کے لیے مخصوص ہے "۔[۲] ذیل میں اس دور کی شاعری کی مختلف کیفیات کا جائزہ لیا جا رہا ہے:۔

سرشاری و سرمستی اور تغزل کی شان
=========================

ماہر کی دور اول کی شاعری میں سرمستی اور سرشاری کی کیفیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے وہ محبوب کے جمال میں سرشار ہیں اور اس کے نازو ادا کی تعریف کرتے نہیں تھکتے اس میں ہجر و وصل کی لذتیں بھی ہیں اور مضطرب شباب کی سیماب صفت کیفیات بھی۔ مگر ہر کیفیت میں وقار اور پاکیزگی کا ایک خاص انداز نظر آتا ہے ۔ خاص بات یہ ہے کہ جذبات

۱۔ ماہر القادری ایک جگہ لکھتے ہیں " مجھ سے یہ گروہ ہمیشہ خفا رہا ہے ۔ اسے خفا ہونا ہی چاہیئے کہ میں ان کے مسلک کا شدید مخالف ہوں " ۔ فاران ، اپریل ۱۹۵۱ء ، ص ۳۱

۲۔ سہ ماہی " سیارہ " لاہور شمارہ نمبر ۲۳ ستمبر ، اکتوبر ۱۹۸۶ء ، ص ۸۱

کے خلوص اور صداقت نے ان کے بیان میں خاص طرح کی رنگینی ، شیرینی اور غنائیت بھر دی ہے -

ـــہ خزاں بھی آئی میں سامنے بہار بہ وش | تری تصورِ رنگیں نے خوب کام کئے - [1]

ـــہ ہر ذرہ دل بن جاتا ہے ہر چیز نظر ہوجاتی ہے | جس سمت وہ نظریں اٹھتی ہیں کونین ادھر ہوجاتی ہے - [2]

ـــہ اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا

سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی - [3]

ـــہ اتنی تو مے ناب میں گرمی نہیں ہوتی

ساقی نے کوئی چیز نگاہوں سے پلا دی - [4]

ـــہ اللہ رے مرے ذوق بیحد کی فروانی | آیا مرے حصے میں چھلکا ہوا پیمانہ

منزل میں محبت کی ہستی ہی رکاوٹ ہے | کل بزم میں کہتا تھا جلتا ہوا پروانہ

کچھ عکس ہیں ساقی کی مخمور نگاہوں کے | شیشہ ہے نہ بادہ ہے ، مینا ہے نہ پیمانہ - [5]

ـــہ نگاہِ مستِ ساقی اک طلسمِ رنگ و مستی ہے | کہیں پیمانہ بن جائے ، کہیں مے خانہ ہو جائے - [6]

ـــہ ماہر انہیں کی یاد میں ہوتی ہے صبح و شام

گزرے تھے چند دن جو کہیں پر کسی کے ساتھ

لغزش پہ میری تھام لیا ہاتھ ناز سے

ساقی نے پھر مذاق کیا بیخودی کے ساتھ [7]

۱- جذبات ماہر ، ص ۱۱۶
۲- ایضاً ، ص ۱۲۱
۳- محسوسات ماہر ، ص ۱۷۳
۴- ایضاً ، ص ۱۷۳
۵- ایضاً ، ص ۲۱۱
۶- نغمات ماہر ، ص ۱۷۱
۷- جذبات ماہر ، ص ۸۸

ـــہ اُسے کونین کی کوئی خوشی راس آ نہین سکتی
جسے تیری نواز شہائے بے پایان نے مارا ہے[۱]

ـــہ گھٹا ، سبزہ ، ستارے ، پھول سب اپنی جگہ پر حق
تیری کافر جوانی ، پھر تری کافر جوانی ہے[۲]

ـــہ جامِ شراب ، مست گھٹا ، مطرب و بہار
سب آ چکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے[۳]

ـــہ خدا کرے کہ کہ اُسے تا ابد سکون نہ ملے
وہ دل جو تیری محبت مین بقرار نہ ہو[۴]

ـــہ اُس کے ہی تصوّر مین ہے اشکون کی روانی
جو ایک تبسم مین زمانے کو ھنسا دے[۵]

ـــہ گیسو ھین اور عارضِ رنگین کی تابشین
وہ ایک ھی ادا مین ھین شام و سحر فروش[۶]

۱ـ جذبات ماہر ، ص ۸۹
۲ـ ایضاً ، ص ۹۰
۳ـ نغمات ماھر ، ص ۱۲۳
۴ـ محسوسات ماہر ، ص ۲۳۱
۵ـ ایضاً ، ص ۲۱۷
۶ـ ایضاً ، ص ۲۱۸

ــہ خفا نہ ہوں تو میں ان کی نگاہ سے پوچھوں
مجھے خمار سا رہتا ہے کیوں بغیر پئے [1]

ــہ میں نے ہی کچھ نہ سمجھا میری ہی تھیں خطائیں
وہ دل کی دھڑکنوں سے دیتے رہے صدائیں

ــہ میخوار میکشی سے کس طرح باز آئیں،
ساقی کی مست نظریں کرتی ہیں التجائیں [2]

ــہ بڑے شوق و توجہ سے سنا دل کے دھڑکنے کو
میں یہ سمجھا کہ شاید آپ نے آواز دی ہوگی [3]

ــہ دنیا نے یہ سمجھا کہ توجہ کی نظر ہے
کیا بیت گئی دل پہ یہ دل ہی کو خبر ہے [4]

اسی ضمن میں ماہر القادری کی ایک نمائندہ غزل پیش کی جا رہی ہے - اس میں جذبات کی شائستگی ، لہجے کی نرمی ، خیال کی پاکیزگی ، بیان کی سادگی اور فن کی پختگی نمایاں نظر آتی ہے اور سب سے بڑھ کر غنائیت کہ جس کے بغیر غزل بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان بیروح اور بے رس ہے ، [5] اس غزل کی خاص خصوصیت ہے - پھر معاملاتِ عشق و محبت اور جوانی کے خاص احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ نکتہ آفرینی اور شوخی و

۱- جذبات ماہر ، ص ۱۱۵
۲- ایضاً ، ص ۸۰
۳- ایضاً ، ص ۹۹
۴- ایضاً ، ص ۱۰۷
۵- اردو غزل ، ص ۲۲

طنز کا خوبصورت انداز ملتا ہے ؎

میں روتا ہوں ستمگر کو ہنسی معلوم ہوتی ہے
ابھی دردِ محبت میں کمی معلوم ہوتی ہے

ترے کوچے میں جُھرمٹ ہے شہیدانِ محبت کا
یہاں تو زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے

جو تم سے ہو سکے تو صِرف دم بھر کو ٹھُہر جاؤ
مجھے یہ سانس شاید آخری معلوم ہوتی ہے

تمہارا دل کسی بےتاب دل کا حال کیا جانے
تمہیں تو عاشقی اک دل لگی معلوم ہوتی ہے

تمنا پاک ، دل معصوم ، فطرت کس قدر سادہ
محبت سادگی ہی سادگی معلوم ہوتی ہے

دلِ بےتاب کی مجبوریاں اور آہ کیا کہئے
ترے غم سے بڑی شرمندگی معلوم ہوتی ہے

میرا افسانۂ پر درد بھی تاثیر رکھتا ہے ،
وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو نیند سی معلوم ہوتی ہے

میری بےتابیٔ دل کا فسانہ سن کے فرمایا
تیری ہر بات ماہر شاعری معلوم ہوتی ہے [1]

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ماہر کے دورِ اوّل کے کلام میں تفکر کی گہرائی کی کمی ہے اور اس کی ہمیں ان کے ہاں توقع بھی نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ حسرت اور جگر کے دبستان

۱۔ محسوسات ماہر ، ص ۱۶۳

کے شاعر ہین اور ان دونون شعراء کے ہان بقول ڈاکٹر سید عبداللہ فکر کا عنصر اور اعلی اجتماعی معنویت کی کمی ہے ۔[۱] مگر حسن و عشق کے تعلق سے پیش پا افتادہ موضوعات بھی ماہر نے اس خوبصورتی سے بیان کئے ہین کہ وہ بےاختیار دل کے تارون کو گدگداتے لگتے ہین ۔

یہ کیون کہون کہ لگی آگ آشیانے کو
کیا ہے برق نے روشن سیاہ خانے کو

شراب ، نغمہ ، جوانی ، گھٹائین ، موسمِ گل
صدائین دو ہرے گزرے ہوئے زمانے کو

بھری چمن مین بس اک اوس وقتِ ماتم ہے
سمجھ رہی ہے جو کلیون کے مسکرانے کو

یہ روز روز کی مَشقِ سجود ختم تو ہو
جبین مین جذب ہی کر لون نہ آستانے کو

قفس مین بھی وہ کہین بجلیون کی یورش ہو
بنا رہا ہون تصور مین آشیانے کو

یہ بیخودی ہے تری مست انکھڑیون کی قسم
کہ رند بھول گئے ہین شراب خانے کو

گزر رہی ہے کچھ اس ڈھب سے زندگی ماہر
کہ جیسے میری ضرورت نہین زمانے کو[۲]

۱۔ اردو ادب ۱۸۵۷ سے ۱۹۶۶ء ، ص ۱۳۲ تا ۱۳۱
۲۔ نغمات ماہر ، ص ۱۵۴ ، ۱۵۵

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ماہر کی یہ غزل سادگی و پرکاری کے ساتھ اپنے اندر ایک خاص قسم کا بانکپن اور رعنائی بھی رکھتی ہے اور اس کا موازنہ معاصر شعراء کے اچھے سے اچھے کلام سے کیا جا سکتا ہے - بلاشبہ ان خوبیوں کی حامل متعدد غزلیات اور بہت سے اشعار ماہر کے کلام میں موجود ہیں - چند غزلیات کا محض حوالہ دینے پر اکتفا کرتا ہوں -

؏ مرا شوق دیدار پھر جوش پر ہے ، محسوساتِ ماہر ، ص ۲۱۲

؏ عرصۂ ہستی جنونِ عشق کے قابل نہیں محسوساتِ ماہر ص ۲۲۰

؏ کب ترا مجھ کو تصور سحرو شام نہ تھا ، نغماتِ ماہر ، ص ۱۳۳

؏ اپنی ہستی کا جو حاصل کہیں عرفان ہو جائے نغماتِ ماہر ، ص ۱۵۷

؏ جذبِ الفت کے یہ آثار نمایاں کیوں ہیں ، جذباتِ ماہر ، ص ۸۱

؏ ایک ناکام مسرت کے سوا کچھ بھی نہیں ، ایضاً ، ص ۸۲

؏ اضطرابِ اہلِ دل جیسے کہ نہ معلوم ہے ، ایضاً ، ص ۹۲

؏ محفل میں ایک ایک کی حالت تباہ تھی ، ایضاً ، ص ۹۳

؏ کچھ اس طرح نگاہ سے اظہار کر گئے ، ایضاً ، ص ۹۳

؏ اسے طوفان کی شدت سے کیا آزردگی ہوگی ، ایضاً ، ص ۹۸

؏ وہ داستان جو خونِ وفا سے لکھی گئی ، ایضاً ، ص ۱۰۶

؏ کیوں اپنی تباہی پہ مجھے غم نہ ہوا تھا ، ایضاً ، ص ۱۱۱

؏ ہر حقیقت منظر ہستی پہ لانی چاہیے ، ایضاً ، ص ۱۱۳

؏ بہاروں کے محبت نے جب پیام دیئے ، ایضاً ، ص ۱۱۵

؏ ہم ڈوبنے والے موجوں کی توہین گوارا کیا کرتے ، ایضاً ، ص ۱۳۰

یہ امر قابل ذکر ہے کہ دور اوّل کے آخری مجموعہ کلام یعنی " جذبات ماہر " مین ماہر کی غزل مین زبان و بیان کے اعتبار سے مزید نکھار پیدا ہوا ہے ۔ تخیل کی رعنائی، نزاکت اور جدت مین اضافہ ہوا ہے اور شوخی اور سرمستی کے ساتھ ساتھ درد اور کسک کا انداز نمایان ہوا ہے ۔ شاید اس کا سبب بھی کا وہ ماحول ہو جہان سے ماہر دل پر پتھر رکھ کر نکل کھڑے ہوئے تھے اور جس کا تذکرہ باب اوّل مین موجود ہے ۔ اس سلسلے کی صرف ایک غزل نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہون سہ

وہ داستان جو خونِ وفا سے لکھی گئی
تم سے سنی گئی نہ مجھی سے کہی گئی

اے بیقرارِ شوق ، مرے خوش نصیب دل
دھڑکن کی آڑ سے تجھے آواز دی گئی

فردا کی فکر ہے نہ گزشتہ کا کوئی غم
اب بے خودی کا دور ہے وہ آگہی گئی

کس کو خبر مریضِ شبِ غم نے کیا کہا
کروٹ کے ساتھ آخری ہچکی سنی گئی

اس جانِ آرزو کی ندامت بھری نگاہ ...،
محشر مین داد خواہ کے ہوشون کو سی گئی

یہ زورِ برق وباد ، یہ غمناک سی فضا
شاید کہین بنائے نشیمن رکھی گئی

فریاد اے محبتِ مجبور کے خدا ....،
وہ کیا کرے کہ جس سے خوشی چھین لی گئی

میں وہ کہ تم کو سونپ دیئے جان و دل تمام
تم وہ کہ تم سے مجھ کو تسلی نہ دی گئی

ماہر ازل کے روز جو بٹنے لگے نصیب
قسمت میں میری مرگِ مسلسل لکھی گئی ۔ [1]

حوصلہ مندی
=============

یہ امر دلچسپ ہے کہ ماہر کے پورے کلام میں ایک تو رقیب کا کہیں ذکر نہیں ملتا دوسرے ایک آدھ شعر کے سوا [2] ان کے ہاں مایوسی یا حزن کا اظہار ناپید ہے ۔ اس کے برعکس ماہر ایک حوصلہ مند شاعر ہے اور جگہ جگہ اس نے حوصلہ مندی ، علوِّ ہمت اور درویشی اور استغنا کا اظہار کیا ہے ۔ وہ بقول میر جانتا ہے کہ حوصلہ شرط عشق ہے اور اس کی وہ تکرار کے ساتھ تائید کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ یوں بھی ماہر کا ذہنی پس منظر مذہبی ہے اور خصوصاً مذہبِ اسلام کا مطالعہ اور اس پر عمل انسان کو صبر و عزیمت اور حوصلہ مندی کی ایک منفرد شان سے متعارف کراتا ہے اس سلسلے میں ذیل کے اشعار کا لہجہ دیکھیے :-

؎ عقل کہتی ہے دوبارہ آزمانا جہل ہے
دل یہ کہتا ہے فریبِ دوست کھاتے جائیے

میں درکچھ فطرت ہی پائی ہے عجب مشکل پسند
میری ہر مشکل کو مشکل تر بناتے جائیے ۔ [3]

۱۔ جذبات ماہر ، ص ۱۰۶ ، ۱۰۷

۲۔ ہم نشیں میری طرح تو بھی چمن کو بھول جا
جب قفس میں ہے تو پاسِ خاطرِ صیاد کر (نغمات ماہر ص ۱۸۹)

؎ ابتدا وہ تھی کہ جینے کے لیے مرتے تھے
انتہا یہ ہے کہ مرنے کی بھی حسرت نہ رہی (جذبات ماہر ، ص ۹۶)

؎ ماہر ازل کے روز جو بٹنے لگے نصیب
قسمت میں میری مرگ مسلسل لکھی گئی (جذبات ماہر ، ص ۱۰۷)

۳۔ محسوسات ماہر ، ص ۲۰۹ ۔ اس مقام پر اصغر کا شعر یاد آتا ہے ۔
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث میں اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

۵ـ آنکھیں مری نمناک ہیں ہونٹوں پہ ہنسی ہے
یہ بھی تری انداز کی فردوس گری ہے ۔ [1]

ناکامیوں نے حوصلے دل کے بڑھا دیئے ،
یعنی شکستِ عشق ہے فتح و ظفر فروش [2]

جفائے یار پہ پردا پڑا رہے ماہر
جو میرے دل میں ہے آنکھوں سے آشکار نہ ہو [3]

جانے کیا اس کی نگاہوں نے فسوں پھونک دیا
دل کسی طرح بھی آمادۂ فریاد نہیں [4]

دردِ الفت کو بہر صورت چھپانا چاہیئے
زخم کھا کر بھی خوشی سے مُسکرانا چاہیئے [5]

غم سے گھبرا کر پکارا شادمانی چاہیئے
اے دلِ بیتاب تجھ کو شرم آنی چاہیئے

بابِ زنداں بند ، گُلشن دور ، زخمی بال و پر
قوتِ پرواز پھر بھی آزمانی چاہیئے [6]

حوصلہ مندی کے ساتھ ساتھ ماہر کے ہاں ایک خاص کی بےنیازی ، درویشی اور استغنا کا انداز بھی ملتا ہے ۔ جو حوصلہ مندی سے بھی آگے کی چیز ہے ۔ اس

۱ـ محسوسات ماہر ، ص ۱۷۵

۲ـ ایضاً ، ص ۲۱۹
۳ـ ایضاً ، ص ۲۳۱
۴ـ لغات ماہر ، ص ۱۲۵
۵ـ ایضاً ، ص ۱۳۱
۶ـ جذبات ماہر ، ص ۱۱۴

سلسلے کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں :۔

ء۔ مانا مقامِ عشرتِ ہستی بلند ہے ،
میں دل کو کیا کروں کہ اسے ناپسند ہے ، [١]

ء۔ نوید عیش ہے اس کے لیے پیامِ اجل ،
وہ دل کہ جس کو ترے غم سے آشنائی ہے [٢]

ء۔ سود و زیاں کا خطرہ بھی دیکھ نہ دل میں آنے پائے
عشق کے مذہب میں ماہر یہ تو شرک پستی ہے [٣]

اور اس شعر میں تو خود اعتمادی اور عظمت عشق کا عجیب انداز ملتا ہے ۔

ء وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے ۔ [٤]

درد و کسک
========

اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ ماہر کے دورِ اول کی شاعری کے ابتدائی زمانے میں غم کا بیان بہت مدھم ہے ، مگر کہیں کہیں درد اور کسک کا وہ انداز نظر آتا ہے ۔ جسے ڈاکٹر سید عبداللہ رقت سے تعبیر کرتے اور غزل میں اس کا وجود لازمی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " غزل صرف شوق و رغبت کا نام نہیں ، اس میں درد والم

١۔ محسوسات ماہر ، ص ٢١٥

٢۔ نغمات ماہر ، ص ١٦٧

٣۔ ایضاً ، ١٣٧

٤۔ ایضاً ص ١٤٣

کی بھی آمیزش ہوتی ہے "۔[1] خصوصاً جذبات ماہر " میں یہ لے خاصی تیز ہو گئی ہے ۔

ہ اب تری محبت میں زندگی کی ہر ساعت
یاد بن کے آتی ہے ، آہ بن کے جاتی ہے ۔[2]

ہ ایک ایک گام پہ دنیا مجھسے ٹھکراتی ہے
مجھ کو اس زحمتِ بیجا پہ ہنسی آتی ہے ۔[3]

ہ بیمارِ ہجر حد قیامت کی ہو گیا آنکھوں میں انتظار کی دنیا لئے ہوئے ۔[4]

ہ آج تک یاد ہے وہ لذتِ آغاز مجھے دیکھ پھر دیکھ نگاہِ غلط انداز مجھے ۔[5]

ہ تو برباد جہاں ناخوش ، وہ بھی کچھ بیزار سے ہیں
ہم جو اے دل کہتے تھے نالے راس نہ آئیں گے ۔[6]

ہ مدت ہوئی وہ کر بھی چکے پرسشِ بیمار
اور دیدۂ بیمار ابھی جانبِ در ہے ۔[7]

ہ ماہر نہ وہ محفل ، نہ وہ جلوے ، نہ مدارات
مدت ہوئی خالی مری آغوش نظر ہے ۔[8]

۱۔ مباحث از ڈاکٹر سید عبداللہ علمی کتاب خانہ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۳۹۷
۲۔ محسوسات ماہر ، ص ۲۲۲
۳۔ نغمات ماہر ، ص ۱۳۹
۴۔ ایضاً ، ص ۱۶۶
۵۔ ایضاً ، ص ۱۷۳
۶ ۔ جذباتِ ماہر ، ص ۱۰۳
۷ ۔ ایضاً ، ص ۱۰۸
۸ ۔ ایضاً ، ص ۱۰۸

ـــہ بہار ، اوس ، ہوا ، موجِ بو ، سرودِ ہزار
کسی نے بھی نہ چمن میں گلوں کے چاک سیئے ۔ [1]

ـــہ پتلیاں آخری گردش میں ہیں اب بھی آ جاؤ
رسم کی رسم ، تماشہ کا تماشہ بھی ہے ۔ [2]

ـــہ بڑے شوق و توجہ سے سُنا دل کے دھڑکنے کو
میں یہ سمجھا کہ شاید آپ نے آواز دی ہو گی ۔ [3]

نکتہ آفرینی
============

ماہر کی دور اوّل کی شاعری میں اگرچہ تفکر کا رنگ بہت گہرا نظر نہیں آتا مگر متعدد ایسے اشعار موجود ہیں ۔ جن میں انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہلکا پھلکا تبصرہ کیا ہے اور اس تبصرے میں نکتہ آفرینی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے ۔ یہ رائے زنی عشقِ مجازی کے حوالے سے بھی ہے اور وار داتِ زندگی کی متنوع ہماہمی کے تناظر میں بھی ۔ اس کی بنیاد مشاہدے پر بھی ہے اور فکر پر بھی ۔

ـــہ ایک عالم کو کر دیا مغرور سعدیؔ آئینہ گر کو کیا کہیے ۔ [4]

۱۔ جذبات ماہر ، ص ۱۱۵

۲۔ جذبات ماہر ، ص ۱۲۷

۳۔ محسوسات ماہر ، ص ۹۹

۴۔ نغمات ماہر ، ص ۱۹۷

ہ — اُن وہ دردِ دل مداوا جس کا ہو سکتا نہیں
ہائے وہ بیمار جس کا درد چارہ ساز ہے ۔ [۱]

ہ — یہ تو اک پردہ ہے درد و غم چھپانے کے لیے
تم کو میری مسکراہٹ پر نہ جانا چاہیئے [۲]

ہ — زندگی جب عذاب ہوتی ہے عاشقی کامیاب ہوتی ہے [۳]

ہ — جو ڈوب گیا وہ پار اترا جو سطح پہ تھا وہ تر نہ سکا ۔ ۔ ۔ ،
دریائے محبت کا ماہر ساحل بھی ہے ، اور ساحل بھی نہیں ۔ [۴]

ہ — جب کوئی پھول مسکراتا ہے مجھ کو دل کا خیال آتا ہے ۔ [۵]

ہ — ترکہ افسوس وندامت کے سوا سب کچھ ہے
میں کہ افسوس و ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ [۶]

ہ — پھولوں کو دیکھ کر مجھے کیا یاد آ گیا ،
آنسو نکل پڑے جو چمن میں ہنسی کے ساتھ ۔ [۷]

ہ — خدا ہی کو خبر ہے کس جگہ ڈوبے کہاں نکلے
مِری دل کا سفینہ ہے ، تمناؤں کا دھارا ہے ۔ [۸]

---

۱ ۔ نغمات ماہر ، ص ۱۲۶
۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۳۲ ،
۳ ۔ ایضاً ، ص ۱۳۵
۴ ۔ ایضاً ، ص ۱۲۸
۵ ۔ ایضاً ، ص ۱۸۸
۶ ۔ جذبات ماہر ، ص ۸۳
۷ ۔ ایضاً ، ص ۸۷
۸ ۔ ایضاً ، ص ۸۹

ـــه کہا روزِ ازل ہر شے نے اک چشمِ کرم ہم پر
صدا آئی کہ جب تک آدمی کا دل نہ بن جائے -[1]

ـــه لذتِ ذوقِ وفا سے فطرتاً محروم ہے
حُسن کہتے ہیں جسے ظالم نہیں مظلوم ہے -[2]

ـــه مانا مری نگاہ پہ ثابت ہے جرمِ دید
تیری نگاہ بھی تو شریکِ گناہ تھی -[3]

ـــه دعوئ تری الفت کا مسلّم نہ ہوا تھا ،
جب تک کوئی پامالِ شبِ غم نہ ہوا تھا -[4]

ـــه زمانہ موت سے اب اس قدر نہیں ڈرتا
ارے یہ کس نے محبت کے راز کھول دیئے -[5]

ـــه رخ کے سب پردے اٹھادے اور اٹھا کر چھوڑ دے
اک اضافہ اور کر دے میرے محسوسات میں -[6]

اس ضمن میں ماہر نے شوخی کے انداز میں اور اعتماد کے ساتھ حسن کی مجبوری اور بیبسی اور عشق کی عظمت پر بھی اظہار خیال کیا ہے :-

---

۱- جذبات ماہر ، ص ۹۱
۲- جذبات ماہر ، ص ۹۲
۳- ایضاً ، ص ۹۳
۴ - ایضاً ، ص ۱۱۱
۵ - ایضاً ، ص ۱۱۵
۶ - ایضاً ، ص ۱۲۷

ــہ الفت ہی نہیں خود حسن بھی ہے مشتاقِ نظر پابجرِ طلب
جو آپ ہی تھے محتاجِ سکون وہ دل کا مداوا کیاکرتے ۔[1]

ــہ حسن کو عشق کی ضرورت ہے
یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے ۔[2]

ــہ ان کو ماہر خبر نہیں شاید عاشقی حسن ساز ہوتی ہے ۔[3]

اور حُبِ صادق اور ہوس کا فرق بھی واضح کیا ہے :۔

ــہ محبت کو خیال ما سوا چھُو بھی نہیں سکتا ۔۔ ،
ہوس کی جادہ پیمائی فقط سو دوزیاں تک ہے ۔[4]

ماہر کے کلام کے دورِ اوّل میں اگرچہ محدودے چند ، مگر ایسی مثالیں موجود ہیں ، جہاں فکر کی گہرائی اور رمزیت کی ایک خاص شان نظر آتی ہے ۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :۔

ــہ فغاں ٹوٹے ہوئے دِل کی جسے تم کھیل سمجھے ہو
مجھے وابستۂ نظمِ جہاں معلوم ہوتی ہے[5]

ــہ ذرا دریا کی تہ تک تو پہنچ جانے کی ہمت کر
تو پھر اے ڈوبنے والے کنارا ہی کنارا ہے[6]

ــہ منزل کا رخ بدل کر نزدیک ہو رہا ہوں
جب ان کی جستجو تھی ، اب اپنی جستجو ہے[7]

۱۔ جذباتِ ماہر ، ص ۱۳۰
۲۔ نغمات ماہر ، ص ۱۲۹
۳۔ ایضاً ، ص ۱۹۱
۴۔ ایضاً ، ص ۱۳۵
۵۔ ایضاً ، ص ۱۲۸
۶۔ جذبات ماہر ، ص ۸۹
۷۔ ایضاً ، ص ۹۷

ہ۔۔ میرے ان کی درمیاں اب دل بھی کیوں حائل رہے
یعنی یہ قیدِ تمنا بھی اٹھادی چاہئے ۔[١]

ہ۔۔ اپنی ہستی کا جو حاصل کہیں عرفان ہو جائے
ہر حقیقت دل انسان پہ نمایاں ہو جائے ۔[٢]

نفسیاتی حقیقت آرائی
===================

دور اوّل کی غزل میں ماہر کے ہاں عشق و محبت کے حوالے سے نفسیاتی حقیقت آرائی کی مثالیں بھی نظر آتی ہیں ۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی " اس ذیل میں انہوں نے شبابِ حالی کی غزل سے بھی اثرات قبول کئے ہوں ۔[٣] لیکن اصلا ایسی نفسیات آرائی گہری بصیرت سے پیدا ہوتی ہے جو درحقیقت ایک وہبی شے ہے "۔[٤] ذیل میں وہ اشعار دیکھئے جن میں ماہر کسی نفسیاتی رمز کی گرہ کشائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں :۔

١۔ جذبات ماہر ، ص ١١٢

٢۔ نغمات ماہر ، ص ١٥٧

٣۔ اس ضمن میں حالی کے چند اشعار یہ ہیں :۔

ہ۔۔ قلق اور دل میں سوا ہو گیا دِلاسا تمہارا بلا ہو گیا

ہ۔۔ آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بُتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

ہ۔۔ عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

٤۔ سہ ماہی " سیارہ " لاہور شمارہ ٢٣ ، ص ٩٨

ھ۔۔ میرے حال دل کی کس صورت میں رسوائی ہوئی
روک لی ظالم نے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی ۔[۱]

ھ۔۔ تم کسی کے دل کو بھی کیا دکھا نہیں سکتے
اس طرح کی باتوں سے آس ٹوٹ جاتی ہے[۲]

ھ۔۔ آہ پر خفگی نہیں ہے ، بے سبب
بات کی سمجھی گئیں گھرائیاں[۳]

ھ۔۔ منزلِ الفت میں کب کا ہو گیا ہوتا ہلاک
وہ تو یہ کہئے مجھے اندازۂ منزل نہیں[۴]

ھ۔۔ مجھ کو تسکین سی ملتی ہے مسلسل ماہر
دل جو امید سے بیگانہ ہوا جاتا ہے[۵]

ھ۔۔ میری ہر بات پہ چہرہ متغیر کیوں ہے
تم تو کہتے تھے کوئی بات مجھے یاد نہیں[۶]

ھ۔۔ میری جانب کبھی بھولے سے بھی نظریں نہیں اٹھتیں
وہ مجھ کو التفاتِ خاص کے قابل سمجھتے ہیں[۷]

ھ۔۔ دل کی بیتابی کسی صورت نہ پنہاں رہ سکی
مسکراہٹ درد کی غماز بن کر رہ گئی[۸]

۱۔ محسوسات ماہر ، ص ۲۱۲
۲۔ ایضاً ، ص ۲۲۲
۳۔ ایضاً ، ص ۲۲۵
۴۔ ایضاً ، ص ۲۲۱
۵۔ ایضاً ، ص ۲۳۰
۶۔ نغمات ماہر ، ص ۱۲۵
۷۔ ایضاً ، ص ۱۳۸
۸۔ ایضاً ، ص ۱۶۹

ـــہ درد دل آپ کی آنکھوں سے عیاں ہے ماہر
اس طرح آپ کوئی راز چھپایا نہ کریں [1]

ـــہ جو تیرے التفاتِ خاص کی عادت سے واقف ہے
اُسے بے وجہ تیری کم نگاہی کا گلہ کیوں ہو [2]

ـــہ جذبِ دل کے یہ آثار نمایاں کیوں ہیں
آپ خاکم بدہن آج پریشان کیوں ہیں [3]

ـــہ دنیا نے یہ سمجھا کہ توجہ کی نظر ہے
کیا بیت گئی دل پہ یہ دل ہی کو خبر ہے [4]

اخلاقی مضامین

ماہر رائج الوقت تصوف کے مخالف تھے چنانچہ ان کی شاعری میں متصوفانہ مضامین ناپید ہیں ، تاہم وہ ابتدا ہی سے دینی فکر و عمل کے حامل تھے اور اس کے پرچارک بھی تھے ۔[5] دور اوّل کی غزل میں اگرچہ اس نوعیت کے اشعار کم ہیں ، مگر انہوں نے جابجا اعلی اخلاقی قدروں کی جانب لطیف اشارے کئے ہیں :-

ـــہ اپنی ہستی کا جو حاصل کہیں عرفان ہو جائے
ہر حقیقت دلِ انسان پہ نمایاں ہو جائے [6]

۱- نغمات ماہر ، ص ۱۸۵

۲- ایضاً ، ص ۱۹۲

۳- جذبات ماہر ، ص ۸۱

۴- ایضاً ، ص ۱۰۷

۵- ماہر کی نظم نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ پہلو سامنے آئے گا ۔

٦- نغمات ماہر ، ص ۱۵۷

ہ۔ بھید کھل جائے بقا کا جو کہیں اے ماہر
آدمی موت پہ سو جان سے قربان ہو جائے [1]

ہ۔ مل جائے مجھ کو ماہر اے کاش زندگی میں
اک جذبِ والہانہ ، اک سوزِ عارفانہ [2]

ہ۔ نفس کی آمد و شد سے پتا معلوم ہوتا ہے
کہ اس پردے میں کوئی دوسرا معلوم ہوتا ہے [3]

ہ۔ جوانی میں خدا کی یاد سے یہ بےرخی ماہر
کوئی اتنا بھی مست و بیخود و غافل نہ ہوجائے [4]

اخلاقی مضامین ہی کے ضمن میں ماہر کے کلام میں عبرت پذیری اور حادثاتِ زمانہ سے سبق آموزی کا پہلو بھی نظر آتا ہے جو خاصا تہ دار ہے ۔ اس اہم موضوع پر بھی انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے :۔

۔۔ چمن میں سوگ ہے اس بد نصیب غنچے کا
جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا [5]

ہ۔ اب آندھیوں کے جھونکے اس کو اڑا رہے ہیں
پھولوں میں پل رہا تھا کل تک جو آشیانہ [6]

۱۔ نغمات ماہر ، ص ۱۵۸
۲۔ ایضاً ، ص ۱۶۳
۳۔ ایضاً ، ص ۱۶۸
۴۔ جذبات ماہر ، ص ۹۲
۵۔ محسوسات ماہر ، ص ۱۸۵
۶۔ نغمات ماہر ، ص ۱۶۳

۵۔ شکستوں پر شکستیں کھا رہا ہے رزم ہستی میں
مگر انسان کی خود بیدی ، خود آرائی نہیں جاتی[1]

طنزیہ انداز

ماہر کی غزل میں طنز اور شوخی کا انداز بھی نظر آتا ہے جو تحسین فراقی کے بقول " بہت لطیف انداز میں ظہور کرتی ہے ۔ اس سے غزل کا افق چمک جاتا ہے اور اس میں ایک گہری معنویت پیدا ہو جاتی ہے "۔[2] ماہر کا طنز غزل کی روایت کے مطابق پہلودار ہے ۔ وہ زاہد اور شیخ کی دنیا داری اور ریاکاری کو بھی موضوع بناتا ہے ۔ محبوب کی بوالعجبیوں کو بھی نشانہ بناتا ہے ، اپنے آپ پر بھی طنز کرتا ہے اور زمانے کی ستم ظریفیوں پر بظاہر ہنستا ، مگر دراصل ماتم کناں نظر آتا ہے ۔
مثالیں مندرجہ ذیل ہیں :۔

۶۔ حسن کو گر بے وفا میں نے کہا تو کیا ہوا ،
کیوں خفا ہو ، حسن کیا کوئی تمہارا نام ہے ؟[3]

۷۔ میری بیتابیٔ دل کا فسانہ سن کے فرمایا
تری ہر بات ماہر شاعری معلوم ہوتی ہے[4]

۸۔ وہ بھری بزم میں آتے ہیں جو پیمانہ بکف
شیخ بھی ساقی میخانہ ہوا جاتا ہے[5]

۱۔ جذبات ماہر ، ص ۱۰۹

۲۔ سہ ماہی " سیارہ " شمارہ ۲۳ ، ص ۹۵

۳۔ محسوسات ماہر ص ، ۱۸۳

۴۔ ایضاً ، ص ۱۹۴

۵۔ ایضاً ، ص ۲۳۰

ھ۔۔ عشق تو آدمی کی فطرت ہے کاش ناصح کو بھی خبر ہوتی [1]

ھ۔۔ زاھد تیری نماز کا انداز ھائے ھائے
احسان جیسے کر دیا پروردگار پر ، [2]

ھ۔۔ محشر میں شانِ عفو کی دلچسپیاں نہ پوچھ
زاھد بھی ہے گناہ کی حسرت لیئے ہوئے [3]

ھ۔۔ دلِ مجروح ، چشمِ خونفشاں ، اسبابِ ویرانی
عطا کی کوئی حد بھی ہے مجھے وہ اور کیا دیتے [4]

ھ۔۔ یوں کر رھا ھوں ان کی محبت کے تذکرے
جیسے کہ ان سے میری بڑی رسم و راہ تھی [5]

ھ۔۔ وہ خود بھی کہنے لگے دیکھ کر میری حالت
نہ اس طرح کوئی بیتاب ہو کسی کے لیے [6]

سہل ممتنع
=============

ماہر نے چھوٹی بحروں اور آسان زمینوں میں متعدد ایسی غزلیں لکھی ھیں جو سہل ممتنع کی بہت خوبصورت مثال ھیں اور شاعر کی قادر الکلامی پر شاھد عادل۔

۱۔ نغمات ماہر ، ص ۱۳۱
۲۔ ایضاً ، ص ۱۳۳
۳۔ ایضاً ، ص ۱۶۰
۴۔ ایضاً ، ص ۱۸۴
۵۔ جذبات ماہر ، ص ۹۳
۶۔ ایضاً ، ۱۱۵

دیکھئے ان میں شوخی بھی ہے ، طنز بھی ، سوزو گداز بھی اور معنی آفرینی بھی :-

ع ۔۔ کس کی جرات ہے جو ساقی سے کہے
ختم ہوتی جاتی ہے
آپ زلفوں کو پریشان نہ کریں
دیکھئے رات ہوئی جاتی ہے
عشق میں اور یہ شکوے ماہر
آپ کو مات ہوئی جاتی ہے [1]

ع ۔۔ جو نظر دل کے پار ہوتی ہے ۔۔۔ حاصلِ روز گار ہوتی ہے ۔۔۔
جب کوئی دل پہ ہاتھ رکھتا ہے ۔۔۔ خلش بےشمار ہوتی ہے ۔۔
رگِ گل سے گزر رہی ہے کوئی ۔۔۔ یا نظر دل کے پار ہوتی ہے ،
ضبط ایمان ہے میرا لیکن ۔۔۔ آہ بےاختیار ہوتی ہے ۔۔۔ ،
وہ نظر سے ملا رہے ہیں نظر ۔۔۔ شرحِ برق و شرار ہوتی ہے [2]

ع ۔۔ الٰہی خیر میری حسرتوں کی
نشیمن پھر بنایا جا رہا ہے
اجل ہے زندگی کا دورِ ثانی
قدم آگے بڑھایا جا رہا ہے
سناتے ہو کسے روداد ماہر ؟
وہاں تو مسکرایا جا رہا ہے [3]

۱- جذبات ماہر ، ص ۱۰۰

۲- ایضاً ، ص ۱۱۰

۳- ایضاً ، ص ۱۲۰

--ه مرا شوقِ دیدار پھر جوش پر ہے
یہاں سے وہاں تک نظر ہی نظر ہے
خدا کے لئے اک ذرا مسکرا دو
شبِ غم کو پھر انتظارِ سحر ہے
مرے ذوقِ سجدہ کا عالم نہ پوچھو
نظر آسمان پر ، جبین خاک پر ہے
مرے حال پر اور اتنی نوازش
وہ کیوں مہربان ہیں خدا کو خبر ہے [۱]

--ہ مست آنکھوں کا دھیان آتا ہے
سامنے جب شراب ہوتی ہے [۲]

--ہ آپ اس شانِ تغافل سے کہاں جاتے ہیں
میرا گھر دیکھئے ویرانہ ہوا جاتا ہے [۳]

--ہ وہ بھی دل کے ذکر پر ہنسنے لگے
دور جا پہنچیں مری رسوائیاں [۴]

اور یہ شعر تو گویا ضرب المثل بننے کے لائق ہے :

--ہ اس نے غم دے کے مجھ سے فرمایا
یہ مری آخری عنایت ہے [۵]

۱- محسوساتِ ماہر ، ص ۲۱۴
۲- نغماتِ ماہر ، ص ۱۵۶
۳- محسوساتِ ماہر ، ص ۲۲۹
۴- ایضاً - ص ۲۲۳
۵ . نغماتِ ماہر ، ص ۱۳۰

غزل میں حمدیہ اشعار

ماہر کی دورِ اوّل کی غزل میں ایک ممتاز اور منفرد خوبی یہ ہے کہ انہوں نے غزلیات میں جگہ جگہ حمدیہ اشعار بھی کہے ہیں ۔ یوں لگتا ہے کہ یہ انداز انہوں نے اقبال کی تقلید میں اختیار کیا ہے کہ وہ اقبال سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں ۔ اقبال نے متعدد غزلوں کے اندر یا اواخر میں بالعموم نعت یا نعتیہ فریاد کا انداز اختیار کیا ہے ۔[1] مگر ماہر القادری نے غزل میں جابجا اللہ تبارک و تعالی کی حمدوثنا کی ہے اور اس کے فضل و کرم اور قدرتِ کاملہ کی مختلف کیفیات کو بڑے ہی ادب و احترام اور ذوق و شوق سے بیان کیا ہے ۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ماہر توحید اور احترامِ خداوندی کے معاملے میں بڑے حساس ہیں اور انہوں نے اللہ جل شانہ ، کے معاملے میں کبھی شوخی کا اسلوب اختیار نہیں کیا ، ماہر کی متفرق غزلوں میں سے چند حمدیہ اشعار ذیل میں دیئے جا رہے ہیں :۔

؎ چیر کر ہر خاک کے ذرہ کلیجہ دیکھنا
کون ہے ایسی جگہ جو یار کی منزل نہیں[2]

؎ کوئی اس پردے میں سرگرمِ تماشا ہے ضرور
ورنہ بے وجہ نہیں سانس کا آنا جانا[3]

۱۔ " وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے " والے نعتیہ اشعار بال جبریل کی ایک غزل میں شامل ہیں (کلیات اقبال اردو ، ص ۳۱۷) اور

؎ نوائے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی ، مرا ایمان ہے زناری

بال جبریل ہی کی ایک غزل کا آخری شعر ہے ۔ (ایضاً ص ۳۳۰)

۲۔ محسوسات ماہر ، ص ۲۲۰

۳۔ ایضاً ، ص ۲۳۲

ہ ــ میں کہ خود اپنی جگہ پر بھی نہیں ہوں موجود
وہ کہ ہر جا ہیں و لیکن کہیں آباد نہیں [1]

ہ ــ تیرے سجدے میں ہم نے اپنی پیشانی جہاں رکھ دی
تجلّی نے تری واں وسعتِ کون و مکاں رکھ دی [2]

ہ ــ ہر ذرہ تری نور کا اقرارِ مجسم ... ،
ہر پھول تیرے حسن کی رنگیں ہے گواہی [3]

ہ ــ پتے پتے سے نمودار ہے شانِ وحدت
ذرے ذرے کو یقین ہے تیری یکتائی کا [4]

ہ ــ یکتائیٔ جمال کی حیرت نہ پوچھئے
ہر ماسوائے وہم سے بیزار ہو گئے [5]

دوسرا دور
========

ماہر کی غزل کا دوسرا دور " فردوس " (سن اشاعت ۱۹۵۵ء) اور اس کے بعد ۱۹۷۸ء تک متفرق رسائل (ماہنامہ فاران " ، ماہنامہ سیارہ " لاہور ماہنامہ " چراغ راہ " کراچی) میں شائع ہونے والی غزلیات پر مشتمل ہے ۔ اس دور کی غزلیات میں دروں بینی کے ساتھ ساتھ بیروں بینی کی بھی معتدبہ عکاسی نظر آتی ہے ۔ چنانچہ ان میں قیام پاکستان کے بعد کے حالات پر بھی رمزوکنایہ کے انداز میں بھر پور تبصرہ

---

۱ ــ نغمات ماہر ، ص ۱۲۵
۲ ــ ایضاً ، ص ۱۲۷
۳ ــ ایضاً ، ص ۱۳۰
۴ ــ ایضاً ، ص ۱۹۳
۵ ــ جذبات ماہر ، ص ۹۴

کیا گیا ہے ، حکمت و موعظت کے مضامین بھی بیان ہوئے ہین ، معاصر منفی خیالات و تحریکات کی مذمت بھی کی گئی ہے اور اقبال کی تقلید مین گل افشانی بھی نظر آتی ہے ۔ درون بینی بھی مدحِ محبوبِ مجازی اپنی جگہ موجود ہے اور بےاختیار دل کے تارون کو چھیڑ دیتی ہے ۔ آئیے ان سب کا جائزہ لین ۔ مگر پہلے ماہر کی نظریہ شعر پر ایک نظر ڈال لین کہ اس کا اظہار انہون نے مختلف مقامات پر متعدد بار کیا ہے ۔ ماہر اپنی غزل اور عمومی شاعری کے بارے مین یون اظہار خیال کرتے ہین :-

ــه متاعِ عیش و مسرت کے ڈھونڈنے والو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ،
سوائے درد میری شاعری مین کچھ بھی نہین [۱]

ــه یہ لازمی ہے کہ دل بھی شریک ہو ماہر
دماغ ہی سے فقط شاعری نہین ہوتی [۲]

ــه کوئی سنے یا نہ سنے مین سنائے جاتا ہون
میرا کلام ہے ماہر سرودِ مستانہ [۳]

ــه مین ہر افق سے طلوع ہو کر جہان مین ظاہر ہوا ہون ماہر
کہین میرا طرز ناصحانہ ، کہین میرا رنگ عاشقانہ [۴] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ،

ــه ماہر میرے شعرون کے خاکے اس طرح مرتب ہوتے ہین ۔ ۔ ۔ ،
کچھ دل بھی تقاضا کرتا ہے ، کچھ ان کا اشارہ ہوتا ہے [۵]

۱- فردوس ، ص ۱۲۱ ،
۲- ایضاً ، ص ۱۲۸
۳- ایضاً ، ص ۱۳۲
۴- ایضاً ، ص ۱۵۵
۵- ایضاً ، ص ۱۵۹

ھ۔ جان شعر و ادب ہے اے ماھر

صرف پاکیزگیٔ فکر و خیال [1]

ھ۔ حسن کے نازو ادا کی شرح فرماتا ہوں میں۔۔۔۔۔،

شعر کیا کہتا ہوں ماھر پھول برساتا ہوں میں [2]

ھ۔ میرے آھنگ کی شوخی نہ ملے گی ماھر ،

یوں تو آئیں گے بہت نغمہ سرا میرے بعد [3]

ھ۔ تو ھیں ھنر بھی ہے یہ رسوائیٔ فن بھی

پیری میں اگر شعر جوان ہو نہیں سکتا [4]

ان اشعار پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماھر دل کے احوال کو بڑے خلوص اور درد سے بیان کرنے کو شاعری کا جزوِ لازم سمجھتے ھیں ۔ وہ حسن و عشق کے معاملات و کیفیات کو بھی موضوع بناتے ھیں ۔ جس میں سرمستی (سرودِ مستانہ) اور سرخوشی (پھول برسانا) کی فضا غالب ہوتی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ان کے آھنگ میں ایسی شوخی ملتی ہے جس کا رنگ عمر کے کسی حصے میں مدھم نہیں ہوتا ۔ اور جس کے زیر اثر وہ پیری میں بھی جوانوں والی باتیں کرتے ھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فکر وخیال کی پاکیزگی کو شعر و ادب کی جان قرار دیتے ھیں ۔ چنانچہ ماھر کی شاعری کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ دورِ ثانی کی شاعری (خصوصاً فردوس) میں مقصدیت کا تناسب خاصا بڑھ گیا ہے مگر غزل کے آھنگ میں اخیر وقت تک کوئی فرق نہیں آیا ۔ [5]

۱۔ فردوس ، ص ۱۷۶

۲۔ " فاران ، دسمبر ۱۹۷۱ء ، ص ۳۰

۳۔ ایضاً ، نومبر ۱۹۷۳ء ، ص ۳۸

۴۔ ایضاً ، نومبر ۱۹۷۵ء ص ۱۹

۵۔ انٹرویو چراغ راہ ، مئی ، جون ۱۹۶۵ء ، ص ۱۸

دور ثانی کی خصوصیات

ملکی اور قومی صورت حال پر تبصرہ

قیامِ پاکستان عہدِ حاضر کی سیاسی تاریخ کا یقیناً بہت بڑا معجزہ ہے۔ دنیا کے نقشے پر ایک نظریہ کی بنیاد پر ایک نیا ملک وجود مین آیا اور وہ نظریہ اور مقصد اتنا پاکیزہ اور مقدس تھا کہ پورا عالمِ اسلام اسے امید اور رشک کی نظرون سے دیکھنے لگا تھا ، مگر افسوس قائداعظم کی وفات کے بعد حکمرانون کی ناعاقبت اندیشیون اور عام اہلِ سیاست کی ہوسِ اقتدار نے یہان ایسے حالات پیدا کئے جو کسی طرح بھی قابلِ رشک نہ تھے ۔ ہمہ گیر قسم کے انتشار ، بےعملی اور نفسا نفسی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ مین لے لیا ۔ اسلامی نظام کا نفاذ کہ قیامِ ملک کا مقصدِ اول تھا ، نظرون سے اوجھل ہوتا چلا گیا بلکہ بنیادی انسانی حقوق تک معرضِ خطر مین پڑ گئے اور جو مخلص سیاسی و دینی رہنما اسلام اور حقوق کی بات کرتا ، اُسے لائقِ تعزیر سمجھا جاتا اور پسِ دیوارِ زندان بھیج دیاجاتا ۔ اس صورت حال پر ماہر بڑے کرب اور درد کے ساتھ تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہین ؎

زاغ و کرگس پوکوشی بدوش ہین
اور شاہین ہین کہ زیرِ دام ہین [۱]

ماہر وطنِ عزیز کی ناگوار صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے عموماً چمن ، بہار ، خزان ، صیّاد ، گلچین ، کشتی ، ملاح ، پتوار ، اور طوفان کا استعارہ استعمال کرتے ہین ۔

۱۔ فردوس ، ص ۱۰۵

۵۔ نہ جانے اب کے برس ہو گیا بہار کو کیا ۔۔؟
دبی دبی سی چٹک ہے گھٹی گھٹی سی مہک [۱]

۶۔ آئینِ چمن بندی بھی نہیں ، دستورِ نوا سنجی بھی نہیں ،
اب اس سے زیادہ گلشن کا شیرازہ پریشان کیا ہو گا ۔۔
جس کشتی کی پتواروں کو خود ملّاحوں نے توڑا ہو
اس کشتی کے ہمدردوں کو پھر شکوۂ طوفان کیا ہو گا
مدت سے کشاکش جاری ہے ۔ صیاد میں اور گلچینوں میں
تنظیمِ گلستان ہونے تک انجامِ گلستان کیا ہو گا ۔۔ [۲]

۷۔ یہ حالت ہو گئی ہے ان دنوں اپنے گلستان کی
نہ جانے کب خزان جائے ، نہ جانے کب بہار آئے [۳]

وطن عزیز میں جاہ پسند ، بے اصول اور ابن الوقت حکمرانوں اور سیاست دانوں کی چیرہ دستیوں پر ماہر بار بار احتجاج کرتے ہیں ؎

یارانِ ہوس وقت کے دھارے پہ رواں ہیں
اے حسن ترے عاشقِ جانباز کہاں ہیں
دشمن ہیں بہاروں کے ، پرستارِ خزاں ہیں
تقدیر سے جو لوگ چمن کے نگراں ہیں [۴]

۱۔ فردوس ، ص ۱۰۷
۲۔ ایضاً ، ص ۱۲۵
۳۔ ایضاً ، ص ۱۷۵
۴۔ فاران ستمبر ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵

ــ ۵ اپنے گلشن مین کہان فصلِ بہار اے ماھر
چند کلیون کے چٹک جانے سے کیا ھوتا ھے [1]

ــ ۵ یہ رنگِ بہاران کبھی دیکھا نہ سنا تھا
کلیون کو چٹکنے کی اجازت بھی نہین ھے [2]

ــ ۵ کیا وقت ھے ، کیا دَور ھے جس دَور مین یارو
قاتل پہ بھی قاتل کا گمان ھو نہین سکتا [3]

پاکستان مین مختلف ادوار مین حکمران اور امیر طبقے کی طرف سے ظلم و ستم کا جو انداز روا رکھا گیا اور مجموعی اعتبار سے عدمِ انصاف ، طبقاتی تقسیم اور منافقت کا جو چلن عام ھوا ، اس پر ماھر کا لب و لہجہ اشاراتی و رمزیاتی سے آگے بڑھ کر براہ راست (DIRECT) شکل اختیار کر لیتا ھے اور وہ قدرے جھنجھلاھٹ اور غصے مین مبتلا ھو کر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ھین -

ــ ۵ کمائی مین حصہ نہ محنت کا بدلہ وڈیرون سے تنگ آگیے ھین کمین ،
کچھ ایسے بھی انسان دیکھے ھین/ مین نے لبون پہ اجالا ، دلون مین اندھیرے
یہان کر گسون کے مزے آ رھے ھین ممولون کے اجڑے ھوئے ھین بسیرے ،
یہ دنیا ھے یا کوئی بازی گری ھے کہ دل کی دوا بیچتے ھین سپیرے [4]

براہِ راست تنقید کی دو اور مثالین ملاحظہ ھون :

ــ ۵ مظلوم نہ دین عدل و مروت کی دھائی
شاھون کی طبیعت پہ یہ الفاظ گران ھین [5]

۱ـ فاران اکتوبر ۱۹۶۲ء ، ص ۲۵
۲ـ ایضاً ، جون ۱۹۷۲ء ، ص ۳۲
۳ـ ایضاً ، نومبر ۱۹۷۵ء ، ص ۱۹
۴ـ ماھنامہ " سیارہ " لاھور ، نومبر ۱۹۶۲ء ، ص ۳۳
۵ـ فاران ، ستمبر ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵

ہ۔۔ یہ ملک و جاہ والے جو صاحبِ حشم ہین ،

کچھ یادگارِ کے ہین ، کچھ جانشینِ جم ہین [۱]

ماہر اگرچہ اخیر تک ملکی حالات پر کڑھتے رہے ، مگر وہ بہرحال مایوس نہین تھے اور انہین امید تھی کہ اللہ کوئی ایسی صورت پیدا کرے گا کہ صورتِ حال مثبت رنگ اختیار کرے گی ۔

ہ۔۔ مین مطمئن ہون اگرچہ خراب ہے ماحول

خزان کے بعد کا عالم بہار ہوتا ہے ، [۲]

ہ۔۔ گونجے کا کسی روز یہان نعرۂ تکبیر

یہ قصر یہ ایوان جو محرومِ اذان ہین [۳]

ہ۔۔ مظلوم نہ گھبرائین کہ برحق ہے قیامت ،

دنیا ہے یہ ، انصاف یہان ہو نہین سکتا [۴]

حکمت و موعظت کا انداز

غزلِ ماہر کے دورِ ثانی مین ایسے اشعار کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جو حکمت و موعظت اور تربیت و عبرت پذیری کی ذیل مین آتے ہین ۔ اس کا ایک سبب تو اقبال کا گہرا اثر ہے جو ماہر کی نظم و غزل پرغیر معمولی انداز مین حاوی نظر آتا ہے ۔ (ماہر پراقبال کے اثرات کا جائزہ الگ فصل مین لیا جائے گا) ۔ تاہم ماہر نے مختلف موضوعات مثلاً تاریخ ، دینِ اسلام اور دیگر مذاہب کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور

۱۔ فاران ، ستمبر ۱۹۶۱ء ، ص ۳۸

۲۔ فردوس ، ص ۱۷۵

۳۔ فاران ، ستمبر ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵

۴۔ فاران ، دسمبر ، ۱۹۷۵ء ، ص ۱۹

ان کے حاصلِ مطالعہ اور رشحاتِ فکر کا پر تو ان کی غزل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ اقبال اور شاید غالب ہی کی تقلید میں ماہر بھی غم کی تحسین کرتے نظر آتے ہیں ۔ اور یقین ، سوزِ جگر اور محنت کی عظمت کے گن گاتے ہیں ۔

ہے ۔ نسیمِ صبح یہ کہتی ہوئی گزر ہی گئی سمجھ شوق کو موجِ نفس بھی ہے مہمیز [1]

ہے ۔ کوئی کرے نہ میری دل کی دھڑکنوں کا علاج

میرے لیے ہیں یہی نغمہ ہائے دلآویز [2]

ہے ۔ سکون و عیش تو اہلِ ہوس کی قسمت ہے

ازل کے دن سے محبت رہی ہے بے آرام ۔۔، [3]

ہے ۔ غم میسر ہے تو لس کے بعد پھر کیا چاہیئے یہ مقامِ شکر ہے شکوہ نہ کرنا چاہیے [4]

ہے ۔ رضائے دوست جہاں لازمی نہیں ہوتی

کچھ اور چیز ہے وہ بندگی نہیں ہوتی

دلوں کے واسطے نورِ یقین ضروری ہے

فروغِ مہر سے تابندگی نہیں ہوتی ، [5]

ہے ۔ ٹھوکروں ہی سے تو ملتا ہے سراغِ منزل

ظلمتوں ہی سے نمودار سحر ہوتی ہے ۔ [6]

ہے ۔ اے دوست تیری زیست ہے اک جُہدِ مسلسل

فرصت بھی میسر ہو تو فرصت نہ سمجھنا [7]

۱۔ فردوس ، ص ۱۰۵
۲۔ ایضاً ، ص ۱۰۶
۳۔ ایضاً ، ص ۱۱۳
۴۔ فاران ، جون ۱۹۷۶ء ، ص ۳۲
۵۔ فردوس ، ص ۱۲۸
۶۔ ایضاً ، ص ۱۳۷
۷۔ ایضاً ، ص ۱۳۱

ـــ۵ یہ کہہ کے دل نے مری حوصلے بڑھائے ہیں ،
غموں کی دھوپ سے آگے خوشی کے سائے ہیں[1]

ـــ۵ دل ہے اک جنت آباد یقین کے دم سے
بےیقینی ہو تو یہ باغ بھی ویرانہ ہے ۔[2]

ـــ۵ یقین کے ساتھ شانِ بےنیازی وہ درویشی ہے رشکِ کجکلاہی[3]

ـــ۵ بے اثر ہیں سیکڑوں نغمے نہ ہو گر دل میں سوز
ایک نالے سے بدل جاتا ہے رنگِ انجمن[4]

ماہر محنت اورعملِ مسلسل سے آگے بڑھ کر جُہدو پیکار کے حامی ہیں ۔ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ، طوفانؔ سے لڑنا اور دار ورسن سے معانقہ کرنا ، ماہر کو بہت پسند ہے ۔ ماہر ایک انقلابی دینی جماعت سے وابستہ تھے ، وہ دل و جاں سے چاہتے تھے کہ وطنِ عزیز میں اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات نافذ ہو اور ظاہر ہے اس مقصد کے لیے ہمہ نوع قربانیوں کی ضرورت ناگزیر ہے اور اس پاکیزہ عزم کے حامل انسان کے لیے کوہ وقار ہونا بڑا ضروری ہے ۔ یہ موضوع سامنے آتا ہے تو ماہر کا جوش و خروش بڑھ جاتا ہے ۔

ـــ۵ نہ تاجِ قیصر و سنجر نہ دولتِ پرویز مرے لیے ہے بہت کچھ متاعِ خود داری
کہاں کی محفلِ نغمہ ، کہاں کے قصرو چمن ترا مقام تو ہے بُوذری و کراری[5]

۱۔ ماہنامہ " سیارہ " ، لاہور فروری ۱۹۶۳ء ، ص ۲۲

۲۔ فاران ، جولائی ۱۹۷۱ء ، ص ۳۵

۳۔ فردوس ، ص ۱۳۹

۴۔ ایضاً ، ص ۱۵۲

۵۔ ایضاً ، ص ۱۱۶

ہ-- وہ سفینہ جو کنارے سے گریزاں ہو گا اس کو کیا شکوہ بربادی طوفاں ہوگا ۔ ،
آندھیاں آئیں گی تنظیمِ گلستاں ہوگی بجلیوں ہی سے نشیمن میں چراغاں ہوگا [۱]

ہ-- مصیبت کا بھی اک مقصد ہے دنیا کے حوادث میں
کہ اک ٹھوکر لگے اور آدمی ہشیار ہو جائے
لیے کیا زندگی کا لطف جس کی یہ تمنّا ہو
مجھی پر صَرف سارا التفاتِ یار ہو جائے [۲]

ہ-- ہُوا دارورسن کا معرکہ جب گرم دنیا میں تو ہنستے کھیلتے وابستگانِ زلف یار آئے [۳]

ماہر غیر معمولی توحید پرست تھے (موصوف کی دینی نگارشات کا الگ سے جائزہ لیا جائے گا) وہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے گہرا قلبی و علمی تعلق رکھنے کے قائل ہیں اور آخرت پر محکم یقین رکھتے ہیں ۔ دورِ ثانی کی غزلیات میں اس جانب بھی اشارہ کرتے ہیں ۔

ہ-- رضائے دوست جہاں لازمی نہیں ہوتی
کچھ اور چیز ہے وہ بندگی نہیں ہوتی [۴]

ہ-- عقل باین یقین و عزم شرک میں مبتلا بھی ہے
فضلِ خدا پہ ہے نظر منّتِ ناخدا بھی ہے
موت کی شکل دیکھ کر آدمی مطمئن نہ ہو
یعنی اس انتہا کے بعد اور اک ابتدا بھی ہے [۵]

۱- فردوس ، ص ۱۳۲
۲- ایضاً ، ص ۱۵۸
۳- ایضاً ، ص ۱۷۵
۴- ایضاً ، ص ۱۲۸
۵- ایضاً ، ص ۱۳۶

ـــہ تری نام سے جس کو نسبت نہ ہوگی وہ افسانہ ہوگا حقیقت نہ ہوگی ۔ ۔ ،

جو سجدے مین دل بھی جھک گا نہ ماہر وہ کچھ اور شے ہے عبادت نہ ہوگی [1]

اور ماہر بجا طور پر یقین رکھتے ہین کہ جب قومین مجاہدانہ حرارت کھو دیتی ہین، محنت اور عملِ پیہم سے جی چرانے لگتی ہین اور عیش کوشی کی دلدادہ بن جاتی ہے ، تو زوال ان کا مقدر بن جاتا ہے ۔

ـــہ رقص و نغمہ ، شراب و عیش و نشاط ان دریچون سے جھانکتا ہے زوال [2]

ماہر زندگی اور موت کے معاملے مین بڑے سنجیدہ ہین ۔ وہ زندگی کو بے مقصد جانتے ہین نہ موت کو معمول کا ایک اتفاقیہ واقعہ قرار دیتے ہین بلکہ وہ دونون کو عبرت اور سبق آموزی کی نظر سے دیکھتے ہین ۔

ـــہ صدائین آج بھی آتی ہین طاقِ کسریٰ سے

ورق ورق ہے مری زندگی کا عبرت خیز [3]

ـــہ مسافرانِ عدم تھے لحد کی منزل تھی

پھر اس کے بعد کسی کی خبر نہین آتی [4]

ماہر حسبِ سابق زندگی اور اس کے مختلف شعبون کے بارے مین تبصرہ اور نکتہ طرازی کا انداز یہان بھی اختیار کئے ہوئے ہین ۔ بعض اشعار مین مشاہدے اور فکر کی گہرائی اہم بات ہے ۔

۱۔ ماہنامہ " سیارہ " لاہور فروری ۱۹۶۵ء ، ص ۷۱

۲۔ فردوس ، ص ۱۷۶

۳۔ ایضاً ، ص ۱۰۶

۴۔ فاران مئی ۱۹۶۲ء ، ص ۳۸

ہ۔۔ مین تجربہ کی بنا پر یہ بات کہتا ہون . . . ،

نہ عشق سادہ طبیعت ، نہ حسن ہے معصوم [1]

ہ۔۔ محبت جس کو سمجھے تھے وہ اک پر تو ہوس کا تھا

بہت دن مین کُھلا ماہر فریبِ نفسِ امّارہ [2]

ہ۔۔ جہان جنون سے بھی ہے چشمکِ حریفانہ

گزر رہا ہے اب اُن منزلون سے دیوانہ [3]

ہ۔۔ گدازِ شمع سے واقف نہ سوزِ غم کی خبر

الجھ رہا ہے ابھی روشنی سے پروانہ [4]

ہ۔۔ پرنظارِ لُطفِ تجلّی ، ہر نفس پیغامِ دوست

ایسے عالم مین ہے کس کو فرصتِ آوارگی [5]

ہ۔۔ نظارہ گر ہیب نہین ہے ، نہین سہی

یہ بھی بہت ہے دید کی حسرت نظر مین ہے [6]

ہ۔۔ حسن کو خود بھی محبت کی طلب ہے ماہر

ہر تماشے کو ضرورت ہے تماشائی کی [7]

بعض لوگ اعتراض کرتے ہین کہ سیاست ، تاریخ اور پند و نصائح کے مضامین

۱۔ فردوس ، ص 115

۲۔ ایضاً ، ص ۱۳۱

۳۔ ایضاً ، ص ۱۳۳

۴۔ ایضاً ، ص ۱۳۴

۵۔ ایضاً ، ص ۱۴۳

۶۔ ایضاً ، ص ۱۵۴

۷۔ فاران ، جنوری ۱۹۷۶ء ، ص ۲۷

سے غزل لگاؤ نہیں کھاتی اور جو شعرا اس طرح کے مضامین غزل میں باندھتے ہیں، وہ ایک تو غزل پر زیادتی کرتے ہیں، دوسرے اس نوعیت کے اشعار قابل تعریف نہیں سمجھے جاتے -- مگر یہ اعتراض فرسودہ ہو چکا ہے - مثال کے طور پر ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اقبال کی سیاسی و عمرانی غزلیات کو غزل ماننے سے انکار کیا ہے کہ ان کے نزدیک غزل کا اصل موضوع مجازی ہے -[1] مگر عابد علی عابد نے اس اعتراض کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ جب متصوفانہ غزل کو نقادوں نے (بشمول یوسف حسین خان) باقاعدہ غزل تسلیم کیا ہے اور جب عشقِ مجازی کے بعد عشقِ حقیقی کا بیان غزل نے قبول کر لیا تو ایک تیسری قسم کے عشق (عشقِ حبیب العین یا عشقِ انسانیت) کے بیان سے غزل کیوں غزل نہیں رہتی - بالخصوص اس حالت میں کہ اس نئے عشق کا بیان بھی اسی جوش و خروش سے ہوا ہو جو غزل کی روایت کا حصہ ہے -[2] آگے چل کر عابد علی عابد مزید لکھتے ہیں " یہ لازم نہیں ہے کہ غزل لازماً درون بینی کی مظہر ہو، یہ برون بینی بھی ہو سکتی ہے - غزل میں جو بات کہی جاتی ہے وہ ہلکا سا انشراح، لطیف سا استعجاب پیدا کئے بغیر نہیں رہتی "-[3] اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برون بینی کے حوالے سے ماہر کے جتنے اشعار اوپر نقل کئے گئے ہیں، وہ متذکرہ خصوصیات کے حامل ہیں - ان میں خلوص ہے، صداقت ہے، جوش و خروش ہے - تاثر ہے، انشراح اور استعجاب ہے اور سب سے بڑھ کر وقار اور سنجیدہ تفکر ہے -

آل احمد سرور نے مولانا اقبال سہیل کی غزل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے

۱- اردو غزل، ص ۸۳

۲- اصولِ انتقادِ ادبیات، ص ۳۲۱،

۳- ایضاً، ص ۳۵۱

لکھا ہے " یہ غزل کا اعجاز اور مولانا کی کرامت ہے کہ مولانا نے غزل کے بلیغ اشارون مین ہماری قومی جدوجہد کی پوری داستان بیان کر دی - غزل پھر بھی غزل رہی"[۱] اس معیار سے بھی دیکھین تو ملکی سیاست اور قومی حالات کو موضوع بنانا اور حکمت و بصیرت کی باتین کرنا اور وہ بھی فن کے تقاضون کو ملحوظ رکھتے ہوئے ، کوئی عار کی بات نہین -

اس ضروری وضاحت کے بعد ماہر کی غزل کی دیگر خصوصیات بیان کی جاتی ہین :-

منکرات کی تنقیص
===============

جیساکہ عرض کیا گیا ماہر ایک باعمل مسلمان تھے اور ایک دینی تحریک سے وابستہ- ان کے علم اور عمل کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اثباتِ توحید اور ردِّ بدعت کے معاملے مین کسی مصلحت کے قائل نہ تھے اور خصوصاً دنیادار علماء کی عمومی روش سے پریشان و بیزار تھے - اس لیے دورِ شادی کی غزل مین انہون نے ان موضوعات کی جانب بھی اشارے کئے ہین - دیکھئے منکرات کی تنقیص یون کرتے ہین :-

ـــہ چلے ہین غم کے مٹانے کو سوئے میخانہ ،
یہ خود کشی کے ارادے ، یہ زندگی سے گریز[۲]

ـــہ تو جا تو رہا ہے طرفِ میکدہ اے دوست
کر دے نہ تجھے مست پیالون کی کھنک دیکھ[۳]

ـــہ جام و مینا کی کھنک کتنی خوش آہنگ سہی
خود کشی پر اے دوست مجھے مجبور نہ کر[۴]

۱- " ادب اور نظریہ" از آل احمد سرور مضمون " مولانا سہیل کی شاعری " ادارہ فروغ اردو لکھنو ۱۹۵۴ء ، ص ۱٦٨

۲- فردوس ، ص ۱۰٦

۳- ایضاً ، ص ۱۱۰

۴- فاران ، نومبر ۱۹٦۳ء ، ص ۳۵

ماہر علمی برائیوں کے ساتھ ساتھ خلافِ اسلام تحریکوں اور فکری گمراہیوں پر بھی تنقید کرتے ہین ۔ وہ اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک کے بھی سخت مخالف تھے اور اس ضمن مین کسی لوشۂ لاشم کے قائل نہ تھے ۔ نثر اور نظمون مین انھون نے ان دونون تحریکون کا خوب تعاقب کیا ہے (جس کا جائزہ الگ فصل مین لیا جائے گا) مگر غزل مین دو ایک اشعار مین محض اشارہ کرنے پر اکتفا کیا ہے ۔

؎ زمین و زن کی مساوات و اشتراک کا درس
جہان مین زندہ ہوا پھر سے فتنۂ مزدک [1]

؎ ماہر یہ جدتین ، یہ ترقی پسندیان
جتنے بھی عیب تھے ، وہ ہنر ہو کے رہ گئے [2]

اسی طرح ماہر تصوف کی مروج صورت سے بیزار تھے اور اسے اسلام سے متصادم و متخالف سمجھتے تھے ۔ ایک شعر مین کہتے ہین :-

؎ مین اس منزل سے گزرا کاروانِ آگہی لے کر
کہ جس منزل مین ٹھوکر کھاگیا منصور بیچارا [3]

طنزیہ انداز

غزل کے دور اول کی طرح دور ثانی مین بھی ماہر کے ہان طنز کا ایک لطیف اسلوب نظر آتا ہے ۔ اس طنز کا نشانہ شاعری کی عام روایت کے مطابق زاہد ، شیخ اور مذہبی رہنما بنے ہین ۔ فرق یہ ہے کہ دیگر شعرا نے بالعموم اپنی رندی اور بے عملی کی وجہ سے متذکرہ طبقے کو نشانۂ تضحیک اور ہدفِ تنقید بنایا ہے ۔ مگر ماہر

۱- فردوس ، ص ۱۰۷

۲- ایضاً ، ص 151

۳- ایضاً ، ص ۱۳۰

کی ناراضگی کا سبب ریاکاری ، دنیا طلبی اور مجاہدانہ جذبے کی وہ کمی ہے جو بدقسمتی سے ایک مذہبی طبقے کا طرۂ امتیاز بن گئی ہے ۔ چنانچہ ماہر کی طنز میں تحقیر کے بجائے کرب اور درد مندی کا جذبہ کارفرما ہے جو مثبت طنز کی خاص علامت ہے ؂

کیا کام اسے معرکۂ تیغ و سناں سے
واعظ تو فقط بحثِ مہر کے لئے ہے

ڈر ہے کہیں زاہد کو پشیمان نہ کر دے
وہ سجدہ جو حور و کوثر کے لئے ہے [1]

ماہر کو یہ صدمہ بھی ہے کہ ایک مذہبی طبقہ قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ بدعات کا بھی پرستار و پرچارک ہے ۔ وہ نہ صرف صحیح عقاید کی تبلیغ نہیں کرتا ، بلکہ راست فکر اور راست عمل مسلمانوں کو فتوؤں کی سان پر چڑھاتا اور بہتان طرازی کرتا ہے ۔ اس پر ماہر اپنے کرب کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

ع ۔ صنم کدوں کے پجاری ہیں مسجدوں کے امام
حرم کے بھیس میں ہے پھر فروغِ بت خانہ [2]

ع ۔ دوستو زاہدِ خودبین سے سنبھل کر رہنا
راہ چلتوں پہ یہ الزام لگا دیتا ہے [3]

ع ۔ تکبیر میں اخلاص نہ سجدوں میں صداقت
زاہد کی نمازوں کو عبادت نہ سمجھنا [4]

۱۔ فردوس ، ص ۱۰۹

۲۔ ایضاً ، ص ۱۳۳

۳۔ ایضاً ، ص ۱۳۲

۴۔ ایضاً ، ص ۱۲۱

ــ ۵ جنابِ شیخ کی توبہ کو کیا کہوں ماہر
میں جانتا ہوں بڑھاپے کی پارسائی ہے [۱]

ــ ۵ کل تک تھے بصد شوق حرم کے نگہبان
سُنتے ہیں کہ اب معتکفِ کوئے بتاں ہیں [۲]

ــ ۵ بڑھتے ہی جا رہے ہیں لات و ھبل کے سائے
اور شیخ ہیں کہ اب تک آسودۂ حرم ہیں [۳]

بعض مذہبی طبقوں میں بدعات پرستی پر بھی ماہر پریشان ہیں اور ان کی نشاندہی کرتے ہوئے انہیں آڑے ہاتھوں لیتے ہیں ۔

ــ ۵ یہ سجدہ ہائے ریائی کے داغ ارے توبہ
کہ مسجدوں میں بنا دی گئی ہیں تصویریں [۴]

ــ ۵ یقین مرکز توحید پر رہا لیکن تصورات کے سانچے میں ڈھل گئے اصنام ۔۔

ــ ۵ وہ زہد جوکہ رضامند ہو غلامی پر ہے ایسے زہد پہ آبِ و ہوائے خلد حرام

ــ ۵ جبین پہ داغِ غلامی لبوں پہ موجِ درود جنابِ شیخ پہ مشکل سے آئیگا الزام [۵] ۔۔

ــ ۵ زینتِ منبر و محراب نظر آتے ہیں
فکرِ انسان کے تراشے ہوئے اصنام ابھی [۶]

۱۔ چراغ راہ ، کراچی دسمبر ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵

۲۔"فاران" ستمبر ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵

۳۔ "فاران" مئی ۱۹۷۲ ء ، ص ۵۶

۴۔ فردوس ، ص ۱۱۲

۵۔ ایضاً ، ص ۱۱۳، ۱۱۴

۶ ۔ ایضاً ، ص ۱۳۶

ماہر کے ہاں طنز کاایک اور پہلو بھی ہے جس میں وہ خود غرض احباب، اپنے محبوب اور جنابِ شیخ کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں ۔ یہاں ان کی شوخی کا مخصوص رنگ بھی عود کر آیا ہے ۔

ع ۔۔ مرے احباب کی طرزِ نوازش آہ کیا کہیے..،
مجھے دینا پڑا شاید بھلائی کا بھی کفارہ [۱]

ع ۔۔ وفا شناس نہیں ہم وفا شعار بھی ہیں
وہ کہہ رہے تھے ہنسی روک لی میں نے [۲]

ع ۔۔ خدا نکردہ محبت سے میں کروں توبہ
جنابِ شیخ مصنف ہیں اس فسانے کے [۳]

اقبال کی تقلید
==============

ماہر اقبال کے غیر معمولی شیدائی اور عقیدت مند تھے ۔ ان کی شاعری اور افکار و نظریات سے موصوف نے گہرا اثر قبول کیا تھا [۴] اور اس اثر کا پر تو ان کی شاعری کے خاصے بڑے حصے پر صاف دیکھا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلے کا تفصیلی جائزہ تو الگ فصل میں لیا جائے گا ۔ تاہم حوالے کے طور پر چند اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں جو اقبال کی فکر اور مخصوص لب و لہجے کی تقلید میں کہے گئے ہیں ۔ اقبال اگر دبستان تھے ، تو ماہر اس دبستان کے سب سے سرگرم مقلد و مؤید تھے ۔ وہی

۱۔ فردوس ، ص ۱۳۱

۲۔ ایضاً ، ص ۱۳۲

۳۔ فاران مئی ۱۹۷۲ء ، ص ۵۶

۴۔ انٹرویو ماہر القادری چراغ راہ ، کراچی مئی،جون ۱۹۶۵ء ۷ ص ۲۰

اقبال کا مجاہدانہ اور رجزیہ انداز ، وہی گریۂ نیم شبی ، عقل پر عشق کی برتری کا وہی اسلوب ، اور جمال کے مقابلے میں جلال کی برتری کا پیرایہ ۔ نمونے کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

۔۔۵	یہ کون پچھلے پہر رات کو ہے محوِ سجود	دعا کو ڈھونڈ رہی ہیں ابھی سے تاثیریں
۔۔۵	حدیثِ عشق کی تشریح کوئی کھیل نہیں	جگر کے خون سے لکھی گئی ہیں تفسیریں
۔۔۵	ہر احتیاط پہ ذوقِ طلب نے چٹکی لی	جنوں تو راس نہ آئیں خرد کی تدبیریں [1]
۔۔۵	مری نگاہ میں حسنِ جوہرِ شمشیر	تری نگاہ میں آرائشِ غلافِ نیام [2]
۔۔۵	ہوس ہے مصلحت انگیز اور عشق غیور	جنوں کا ایک طریقہ ، خرد کے لاکھ رسوم [3]

آگے چل کر غزلیات میں یہ اقبالی لے مزید تیز ہوتی ہے ، ملاحظہ ہو :-

۔۵	مسلم کہ ہے من جملۂ آیاتِ الٰہی	مسجد میں فرشتہ ہے تو میدان میں سپاہی
	ہر سانس ہو تیرے لئے پیغامِ قیامت	کھل جائیں ترے دل پہ جو اسرارِ نواہی
	توحید کا اقرار زباں سے یہ کہاں تک	دے اپنے عمل سے بھی تو اے دوست گواہی
	ہو روس کی تہذیب کہ آئینِ فرنگی	دونوں میں ہے اللہ کے بندوں کی تباہی [4]

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں ،
بغیر سوزِ دروں زندگی میں کچھ بھی نہیں ..)
جو یہ نہیں ہے تو پھر آدمی میں کچھ بھی نہیں

۱- فردوس ، ص ۱۱۳
۲- ایضاً ص ۱۱۴
۳- ایضاً ، ص ۱۱۵
۴- ایضاً ، ص ۱۱۷

حیات نام ہے اک اضطرابِ پیہم کا . . . ،
دل و نگاہ کی آسودگی میں کچھ بھی نہیں

لبوں پہ حرفِ محبت دلوں میں بغض و نفاق . . ،
یہ دوستی ہے تو پھر دشمنی میں کچھ بھی نہیں [1]

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اقبال کے رنگ میں ماہر کے یہ اشعار محض اقبال کے نظریات و عقائد کا چربہ نہیں ہے ، بلکہ انہیں ماہر کے اپنے افکار و اعمال کی تخلیقی جھلک بھی نمایاں ہے ۔ اس کا تفصیلی جائزہ آگے چل کر لیا جائے گا ۔

عشقِ مجازی
===========

غزلِ ماہر کے پہلے دور کی طرح دورِ ثانی میں، فکرونظر کا زاویہ حالانکہ خاصا تبدیل ہو گیا ہے مگر، حسنِ مجازی کی شان میں وہ یہاں بھی برابر رطب اللسان نظر آتے ہیں اور جمالِ محبوب انہیں آخر تک سرمستی و سرشاری کی ایک خاص کیفیت میں محو رکھے ہوئے ہے ۔ جذبات کے خلوص کی وجہ سے اُنکی شاعری میں جو غنائیت ، شیرینی اور رنگینی امتیازی اور بنیادی خصوصیت کی حیثیت سے حاوی نظر آتی ہے ، وہ یہاں بھی غالب دکھائی دیتی ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وقار ، ضبط اور عظمتِ عشق کا ایک خاص اسلوب جاری و ساری ہے جو ماہر کو معاصرین میں ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے ۔

؎ تیری نگاہ نے کچھ سوز کر دیا پیدا
میرا فسانۂ الفت نہ تھا اثر انگیز [2]

۱- فردوس ، ص ۱۲۰

۲- ایضاً ، ص ۱۰۶

ھ— نگاہِ شوق یہی وقتِ آزمائش ہے ،
وہ سامنے ہے تجلی، پلک نہ جائے جھپک

ھ— شباب و حسن کی توبہ ، یہ رنگ آرائی . . . . ،
ابھی لبوں پہ شفق ہے ابھی جبین پہ دھنک [1]

ھ— ستارۂ صبح سو نہ جائے ، طلوع خورشید ہو نہ جائے ــــ ،
زمانہ کروٹ نہ لینے پائے کہ حسن ابھی خوابِ ناز مین ہے [2]

ھ— حریمِ دل مین کوئی بےجھاز آتا ہے
چراغِ شوق و تمنا بجھا دیا جائے [3]

ھ— دیکھتے ہین آپ ماہر کو عجب انداز سے ،
کچھ توجہ ، کچھ حیا ، کچھ ناز ، کچھ بیگانگی [4]

ھ— وہ جو آئے تھے تو اے ضبط بہ عنوانِ خوشی
کم سے کم ایک ہی آنسو سرِ مژگان ہوتا [5]

ھ— آپ کے عہد مین کہین حسن کو لوگ ہے وفا . . ،
آپ کو کچھ خبر بھی ہے ، آپ نے کچھ سنا بھی ہے [6]

ھ— ان کی رفتار کی ہم نے تو یہ صورت دیکھی
چال کی چال قیامت کی قیامت دیکھی [7]

۱- فردوس ، ص ۱۰۷
۲- ایضاً ، ص ۱۳۱
۳- ایضاً ، ص ۱۳۵
۴- ایضاً ، ص ۱۳۴
۵- ایضاً ، ص ۱۲۵
۶- ایضاً ، ص ۱۳۶
۷- ایضاً ، ۱۵۱

۸۔۔ وہ محشرِ اضطراب بھی ہیں، وہ جانِ صبر و قرار بھی ہیں
جہاں جہاں وہ ٹھہر گئے ہیں وہیں وہیں رک گیا زمانہ [1]

۸۔۔ ہم اٹھ کے تیری بزم سے جائیں تو کہاں جائیں
ہے اِس کے سوا بھی کوئی فردوس نظر اور [2]

۸۔۔ اس کی باتیں چٹک شگوفوں کی   اس کی رفتار یا نسیمِ شمال [3]

یہ امر قابل ذکر اور اہم ہے کہ بعض معروف ترین معاصر متغزلین کے برعکس ماہر کی غزل میں ابتزال یا عریانی کا انداز نظر نہیں آتا ۔ ابتزال کو وہ عقیدۃً نامناسب خیال کرتے ہیں ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

" شاعری کی شوخی اور رنگینی کے ہم منکر نہیں ہیں ۔ وصل و اختلاط کی جھلکیاں بھی شعر میں آتی ہیں ، مگر یہ بڑا ہی نازک مقام ہے ۔ یہاں شاعر کو تلوار کی باڑھ پر چلنا پڑتا ہے ۔ جس کے دونوں طرف نازک آبگینے چُنے ہوئے ہیں ۔ ذرا سی بے احتیاطی سے یہ آبگینے چُور ہو جاتے ہیں۔ جن ہوس پرست شاعروں نے وصل و اختلاط کے عمل کو شاعری میں نظم کر دیا ، انہوں نے تہذیب و انسانیت اور خود شعرو ادب کے ساتھ مذاق بلکہ ظلم کیا " ۔ [4]

اسی طرح ایک اور جگہ عریاں نگاری کی مذمت میں رقمطراز ہیں :۔

" لیلیٰ مجنوں ، شیریں فرہاد ، وامق و عذرا ، ہیر رانجھا ، نل اور دمنتی جیسے عاشقوں کی داستانوں نے شعر و ادب کو بہت کچھ دیا ہے ، مگر شاعری میں جہاں ہوا و ہوس کا رنگ زیادہ شوخ اور عریاں ہو گیا ہے وہاں فن کاری نے سیہ کاری کا روپ دھار لیا ہے" ۔ [5]

۱۔ فردوس ، ص ۱۵۵ ،
۲۔ ایضاً ، ص ۱۷۵
۳۔ ایضاً ، ص ۱۷۶
۴۔ "اقبال ریویو" کراچی جولائی ۱۹۶۰ء مضمون "اقبال میں کردار نگاری" از ماہر القادری ص ۱۷
۵۔ "فاران" دسمبر ۱۹۷۷ء ، ص ۱۸۔۱۹ ،

چنانچہ ماہر کے اشعار میں سرخوشی و سرمستی ، رعنائی اور بانکپن کا اسلوب بدرجہ اتم موجود ہے ، مگر ابتذال یا چھچھورپن کہیں نظر نہیں آتا ۔ درج بالا اشعار اس کی واضح دلیل ہیں ۔ اس ضمن میں مزید اشعار ملاحظہ فرمائیں :۔

ہ۔۔ تذکرہ جب وفا کا ہوتا ہے میں تمہاری مثال دیتا ہوں [۱]

ہ۔۔ نہ التفات جسے کہہ سکیں نہ بیزاری
اِس اہتمام سے اس نے نظر چرائی ہے [۲]

ہ۔۔ ساقی کی نگاہوں کا پیمانہ ہی چھلکا
دیں قلقل مینا نے صداؤں پہ صدائیں [۳]

ہ۔۔ اے شمع تیرے سوزِ نمایاں کی خیر ہو
میرے بھی دل میں آگ ہے لیکن دبی ہوئی

ہ۔۔ یہ ہے سواد منزل جاناں سنبھل کے چل
شاید یہیں کہیں ہو قیامت چھپی ہوئی [۴]

ہ۔۔ پیتا ہے کوئی جام سے ، کوئی نگاہ سے
یہ اپنے اپنے ذوق و طبیعت کی بات ہے

ہ۔۔ ہر حسن ، ہر کمال ، ہر اک منظرِ جمال
جیسے انہی کی شکل و شباہت کی بات ہے [۵]

۱۔ ماہنامہ "سیارہ" لاہور مئی ۱۹۶۲ء ، ص ۶۳

۲۔ ماہنامہ "چراغ راہ" نومبر ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵

۳۔ فاران فروری ۱۹۵۷ء ، ص ۴۷

۴۔ فاران جنوری ۱۹۵۹ء ، ص ۲۵

۵۔ "فاران" مئی ۱۹۶۱ء ، ص ۵۰

ذیل مین ماہر کی دو غزلیات نقل کی جا رہی ھین جو ان کی وفات سے تین چار سال پہلے بالترتیب مارچ ۱۹۷۲ء اور دسمبر ۱۹۷۵ء مین " فاران " کی زینت بنین ان مین حیرت انگیز طور پر دورِ اول کی سی رعنائی ، سرخوشی اور غنائیت حاوی نظر آتی ھے یہ اس امر کا ثبوت ھے کہ ماہر کی شاعری اخیر تک اخلاص اور صداقت پر استوار اور تصنع و آورد سے پاک رہی ۔ غزلین یہ ھین :۔

۔۔۔ دیدنی ھے میری مظلوم محبت کا خلوص — شکوے کرتا ھون مگر لب پہ دعا آتی ھے

کتنے طوفانِ بلا سر سے گزر جاتے ھین — پھر کہین منزلِ تسلیم و رضا آتی ھے

درد و غم رنج و مصیبت بھی بڑی نعمت ھین — دل شکستہ ہو تو پھر یادِ خدا آتی ھے

سوزِ غم ھی سے ھے ، سب ظاہر و باطن کا فروغ — دل سلگتا ھے تو چہرے پہ جِلا آتی ھے [1]

کیا یہ بہار بھی مجھے نہ آسکے گی راس
بجلی چمک رہی ھے نشیمن کے آس پاس

نظارۂ جمال قیامت سے کم نہ تھا ۔۔
یہ عشق کا ھے معجزہ قائم رھے حواس

اے دوست تو کہ شعلہ و برق و شرار تھا
کس نے بنا دیا ھے تجھے مصلحت شناس

مین نے ھنسی ھنسی مین کیا تھا وفا کا ذکر
اتنی ذرا سی بات پر تم ہو گئے اداس

آنکھون کی تشنگی کا تمھین تجربہ نہین
تم دیکھتے رہو گے تو بڑھتی رھے گی پیاس

۱۔ فاران مارچ ۷۲ ، ص ۲۰

ماہر پڑا ہے اس سے محبت میں واسطہ
میری سکوت کو جو سمجھتا ہے التماس [1]

اس کے علاوہ ان کے دورِ ثانی میں کم از کم ۲۵ غزلیات ایسی نظر آتی ہیں جو حسنِ کلام کے اعتبار سے ماہر کی نمائندہ غزلیات قرار دی جا سکتی ہیں ، طوالت کے خوف سے ان کا ذکر قلمزد کیا جاتا ہے ۔

نکتہ طرازی
===========

دورِ اوّل کی طرح دوسرے دور میں بھی متعدد ایسے اشعار موجود ہیں جن میں معنی آفرینی اور نکتہ طرازی کا انداز نظر آتا ہے ۔ تبصرہ کا یہ اسلوب فکر اور مشاہدے پر مبنی ہے اور زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں پر حاوی ہے ۔

ہاں دعا دے میری اس خوش نگہی کو اے دوست
اس سے پہلے ترے جلوؤں کا یہ عالم تھا کہاں [2] ۔۔ ہ

مجھ کو خود اپنی خموشی پہ ترس آتا ہے
کون سمجھے گا زمانہ میں محبت کی زبان [3] ، ۔۔ ہ

اس کی بیگانہ نگاہی پہ نہ جا اے ماہر
حسن انسان کو سنجیدہ بنا دیتا ہے [4] ۔۔ ہ

ضبطِ غم ، فکرِ وفا ، پاسِ جنون ، وصل و فراق
کتنے طوفان محبت میں گزر جاتے ہیں [5] ۔۔ ہ

۱۔ " فاران " اگست ۱۹۷۶ء ، ص ۱۰

۲۔ " فردوس " ، ص ۱۲۶

۳۔ ایضاً ، ص ۱۲۶
۴۔ ایضاً ، ص ۱۳۳
۵۔ ایضاً ، ۱۶۳

ھ۔ نہ جانے کیا وقت آیا ہے دل پر
تمہیں بھول جانے کو جی چاہتا ہے [1]

ھ۔ وفا کا ذکر ہی کیوں چھیڑتے ہیں اہلِ وفا
جب ان کی خاطرِ نازک پہ بار ہوتا ہے [2]

ھ۔ تغافل کا گلہ ان سے نہ کرنا تھا ابھی ماہر
یہ تم نے کیا کیا جھنجھلاہٹ ہوئی سازی کو ہار آئے [3]

ھ۔ شوق تنہا ہے ، مگر اس کے ہزاروں عالم
حُسن کے پاس فقط انجمن آرائی ہے [4]

ھ۔ یارب میرے غرورِ محبت کی خیر ہو ..
میں ان سے کہہ رہا ہوں مجھے بھول جائیے [5]

ھ۔ پارسائی میں بھی آوارگی کا رنگ ہے ،
سہل سمجھے تھے مزاجِ دل بدل جانے کو ہم [6]

دردو کسک

=======

غزلِ ماہر کے دورِ ثانی میں بھی درد و کسک کا ایک خاص انداز پایا جاتا ہے یعنی متعدد ایسے اشعار ان کی غزلیات میں موجود ہیں جنہیں پڑھ کر دل پر بے اختیار رقت سی طاری ہو جاتی ہے ۔ ایسے اشعار میں درد ، کسک ، سوز اور

۱۔ فردوس ، ص ۱۶۳
۲۔ ایضاً ، ص ۱۷۴
۳۔ ایضاً ، ص ۱۷۶
۴۔ "فاران" اگست ۱۹۶۳ء ، ص ۳۳
۵۔ "فاران" جنوری ۱۹۶۸ء ، ص ۳۸
۶۔ "فاران" مئی ۱۹۶۸ء ، ص ۵۳

غم کی ایک اثرانگیز فضا محسوس ہوتی ہے ۔ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہ۔ جس چوٹ سے دل میں ہل چل ہے آہوں میں وہ ظاہر کیا ہو گی
سینہ میں جو محشر برپا ہے اشکوں سے نمایاں کیا ہو گا ؟
خلوت ہو کہ جلوت ہو ماہر دل کھویا کھویا رہتا ہے ۔،
اس غم کی تلافی کیا ہوگی ، اس درد کا درمان کیا ہو گا [۱]

ہ۔ دل کی چوٹیں کہیں آواز میں ڈھل سکتی ہیں ،
اتنی پُر سوز ہے اس پر بھی ادھوری ہے فغان [۲]

ہ۔ میں تری یاد کو اے دوست دعا دیتا ہوں ،
زندگی غم میں بھی راحت سے بسر ہوتی ہے [۳]

ہ۔ ہو گئے تھے جس دن اسیر ہم سب چمن کے آثار کہہ رہے تھے
تم آو گے جب چمن سے چھٹ کر بہار جاتی ہوئی ملے گی..، [۴]

ہ۔ بزم میں احساسِ فرقت اور ہو جاتا ہے تیز
مار ڈالے گا یہ ربطِ شمع و پروانہ مجھے [۵]

ہ۔ اک اک ادا تری دمِ رخصت نظر میں ہے
اب تک وہ دل نشین قیامت نظر میں ہے [۶]

ہ۔ اب تبسم کا ہے یہ رنگ دھواں ہو جیسے
آج نغمہ کا یہ عالم ہے فغان ہو جیسے

۱۔ " فردوس " ص ۱۲۵
۲۔ ایضاً ، ص ۱۲۶
۳۔ ایضاً ، ص ۱۲۷
۴۔ ایضاً ، ص ۱۵۳
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً ، ص ۱۵۴

۔۔۵ قافلۂ مہر و وفا کا یہ کہاں آ پہنچا

زندگی راہ میں خود سنگِ گراں ہو جیسے

دردِ دل سخت ہے جانکاہ مگر کیا کیجئے

زندگانی کی یہی روحِ رواں ہو جیسے [1]

۔۔۵ جلا دیئے ہیں سرِ شام آنسوؤں کے چراغ

کہ شاید آج وہ زحمت کریں ادھر کے لیے

متاعِ درد بھی غارت گروں کی نذر ہوئی

رکھا ہی کیا ہے یہاں سعی چارہ گر کے لیے [2]

۔۔۵ سنا ہے دھر میں غم بھی ہے اور مسرت بھی

یہ دھوپ چھاؤں مگر میرے گھر نہیں آتی [3]

آخری زمانے کی شاعری میں ماھر کے ہاں درد اور کسک کا تناسب خاصا بڑھ گیا ھے ۔ اس کا سبب جہاں عمر کے تقاضے میں مضمر ھے ، وہاں ملکمیں کارفرما سیاسی گھٹن اور معاشرتی و تہذیبی اعتبار سے اخلاقی انحطاط اور حکمرانوں کی طرف سے اس رجحان کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی بھی اس کا باعث ہو سکتا ھے ۔ وجہ کچھ بھی ہو ، صاف نظر آتا ھے کہ ماھر کے لہجے میں رقت اور بے بسی کا انداز زیادہ نمایاں ہو گیا ہے ۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں :۔

۱۔ ماھنامہ " سیارہ " لاہور دسمبر ۱۹۶۴ء ، ص ۸۵

۲۔ فاران ، جولائی ۱۹۸۷ء ، ص ۵۲

۳۔ فاران ، مئی ۱۹۶۲ء ، ص ۴۸

ہ— ساقی بھی دور جام بھی بادل گھرے ہوئے
اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کئے ہوئے
صیاد نے اجازتِ فریاد دی تو ہے
میں پھر بھی ڈر رہا ہوں زبان کھولتے ہوئے [1]

ہ— اب موسم گل یاد نہ گلشن کی فضا یاد
اس طرح قفس میں رہے کچھ بھی نہ رہا یاد
صیاد نے پوچھا ہے اسیرانِ قفس سے
کس کس کو ہے کلیوں کے چٹکنے کی صدا یاد [2]

ہ— گزرے ہوئے شباب کی یوں یاد آئے ہے
پانی پہ جیسے کوئی لکیریں بنائے ہے [3]

ہ— دل کی لگی پہ اشک بہانے سے فائدہ ،
شبنم سے بھی کہیں کوئی شعلے بجھائے ہے [4]

ہ— یہ بے تعلقی کی اذیّت کہ ہائے ہائے
اے دوست دشمنی کا زمانہ بُرا نہ تھا
فردوسِ گوش ، لذّتِ دل ، جنّتِ نگاہ
تم میرے پاس تھے تو میرے پاس کیا نہ تھا [5]

ہ— خود میری طرف دیکھ کے بیگانہ نگا ہی
یہ حادثہ لفظوں میں بیان ہو نہیں سکتی [6]

۱— فاران فروری ۱۹۶۶ء ، ص ۳۰
۲— ایضاً نومبر ۱۹۶۷ء ، ص ۵۴
۳— ایضاً ، مئی ۱۹۷۱ء ، ص ۵۱

ہ-- ساقی بھی دور جام بھی بادل گھرے ہوئے
اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کئے ہوئے

صیاد نے اجازتِ فریاد دی تو ہے
میں پھر بھی ڈر رہا ہوں زباں کھولتے ہوئے [۱]

ہ-- اب موسم گل یاد نہ گلشن کی فضا یاد
اس طرح قفس میں رہے کچھ بھی نہ رہا یاد

صیاد نے پوچھا ہے اسیرانِ قفس سے
کس کس کو ہے کلیوں کے چٹکنے کی صدا یاد [۲]

ہ-- گزرے ہوئے شباب کی یوں یاد آئے ہے
پانی پہ جیسے کوئی لکیریں بنائے ہے [۳]

ہ-- دل کی لگی پہ اشک بہانے سے فائدہ ،
شبنم سے بھی کہیں کوئی شعلے بجھائے ہے [۴]

ہ-- یہ بے تعلقی کی اذیّت کہ ہائے ہائے
اے دوست دشمنی کا زمانہ بُرا نہ تھا

فردوسِ گوش ، لذّتِ دل ، جنّتِ نگاہ
تم میرے پاس تھے تو میرے پاس کیا نہ تھا [۵]

ہ-- خود میری طرف دیکھ کے بیگانہ نگاہی
یہ حادثہ لفظوں میں بیاں ہو نہیں سکتی [۶]

۱- فاران فروری ۱۹۶۶ء ، ص ۳۰
۲- ایضاً ، نومبر ۱۹۶۷ء ، ص ۵۴
۳- ایضاً ، مئی ۱۹۷۱ء ، ص ۵۱
۴- ایضاً ، مئی ۱۹۷۱ء ، ص ۵۱
۵- ایضاً ، اگست ۱۹۷۴ء ، ص ۴۷
۶- ایضاً ، نومبر ۱۹۷۵ء ، ص ۱۹

سہل ممتنع

ماہر کے دورِ ثانی مین بھی متعدد غزلیات سہل ممتنع کی خوبصورت مثال پیش کرتی ہین ۔ چھوٹی سبک بحرین ، بلا کا بیساختہ پن ، سادگی و پُرکاری اور معنی آفرینی غرض ماہر نے اس مشکل شعبے مین واقعی قادرالکلام ہونے کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے ۔ چند غزلیات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ملاحظہ فرمائین ۔

ـــہ حسن والون کے لطف و کرم دیکھ کر — سوچتا ہون مین کیون پارسا بن گیا
مین تو گمراہ تھا میرا نقشِ قدم — دوسرون کے لئے رہنما بن گیا
بےیقینی کے اِس دورِ تاریک مین — آدمی آدمی کا خدا بن گیا
اس تعلق پہ ماہر مجھے ناز ہے — انکا انکار بھی آسرا بن گیا [1]

ـــہ سوزِ غم ہر کسی سے چھپانا پڑا — دل لہو تھا مگر مسکرانا پڑا
بجلیون کا تو رخ تھا قفس کی طرف — راستے مین میرا آشیانا پڑا
کھوئی کھوئی اچٹتی اچٹتی نظر — کس قدر ٹھیک دل پہ نشانا پڑا [2]

ـــہ دیکھ کر ان کے مسکرانے کو — طول دیتے رہے فسانے کو
روشنی دوسرون کی قسمت ہے — رہ گئے ہم دیئے جلانے کو
ہم خود اپنی ہنسی اڑاتے ہین — مسکراتے ہین غم چھپانے کو
آ رہے ہین وہ حضرتِ ناصح — اور کچھ الجھنین بڑھانے کو
جب کبھی ان کی یاد آتی ہے — بے وفا کہہ لیا زمانے کو [3]

۱ـ چراغ راہ ، کراچی جولائی ۱۹۶۰ء ، ص ۳۵
۲ـ فاران مئی ۱۹۵۹ء ، ص ۳۸
۳ـ ایضاً ، مئی ۱۹۶۸ء ، ص ۵۳

ـــہ جاگتے رہئے مگر کیا ہو گا ، وقت پر اپنے سہرا ہـو گا ،
مجھ کو اک شخص نے برباد کیا تم نہ ہو گے کوئی تـم سا ہو گا
مین کہان جراتِ دیدار کہان پہلے اس نے مجھسے دیکھا ہو گا
اتنی شمعون کی ضرورت کیاتھی کیاابھی اور اندھیرا ہو گا
پرسش حال کو وہ آئے ھـین درد کم ھو کے زیادا ھـو گا
مین تو آمادۂ فریـاد بھی تھا غیرتِ عشـق نے روکا ھــو گا
آہِ مـظلوم سے اک دن ماھـر شیـش محلـون مین دھماکاھوگا [1]

ســپـاٹ بے رنگ انداز
==============

اس کا مطلب یہ نہین کہ ماھر کی غـزل خامیون اور کمـزوریون سے معرّیٰ ھے ۔ ایسا نہین ، بلکہ ان کے ھان خصوصاً " فردوس " مین متـعـدد غـزلیات ایسی نظر آتی ھین جو سپاٹ اور بےرنگ ھین ۔ ان پر مقـصدیت بلکہ صحیح تر لـفظون مـین نعـرہ بازی اس طرح حاوی ھوگئی ھےکہ وہ محـض قافیہ پیمائـی کی ایک مقـدس مگـر مضحکـہ خـیز اور بچگانہ مثال بن کر رہ گئی ھین ۔ مثال کے طور پـر ایک غـزل کـے چنـد اشعـار ملاحظہ ھون ۔ پوری غـزل اسی قماش کی ھے ۔

ـــہ قـصر استبـداد کی بنیاد ڈھا سکتا ھون مین . . . . .،
ظلم کے شُعـلون کو پھونکـو ن سے بجھا سکتا ھون‌مین
مست ھاتھی کو بھی میدان سے بھگا سکتا ھون مـین
ایک زخمـی شیر سے پنجہ لـڑا سکتا ھون مـیـــن
شہـنـمِ گل سے لگا سکتا ھون کہسـارون مـسین آگ
بجلیون سے آشیـانے کو بچـا سکتـا ھــو ن مـــین [2]

۱۔ فاران ، نومبر ۱۹۷۱ ء ، ص ٦۰
۲۔ فردوس ، ص ۱۱۱ ، ۱۱۲

ایک اور غزل کے تیور بھی اسی نوعیت کے ہیں :-

۵ــ دل کی دھڑکن سے پیالوں کی کھنک دب جائے گی
عیش کا افسانہ دنیا اب نہیں دھرائے گی
خاک کے ذرے بھی ڈالیں گے ستاروں پر کمند
پھول کی پتی شفق کو آئینہ دکھلائے گی
کوئی بھی اس کو نہیں دے گا سہارا دیکھنا
موجِ بوئے گل اگر چلتے میں ٹھوکر کھائے گی [۱]

حاصل کلام
=========

غزلِ ماہر کے دورِ اول اور دورِ ثانی میں نمایاں فرق یہ ہے کہ پہلے دور پر عشقِ مجازی سے متعلق موضوعات حاوی ہیں اور تغزّل کی شان نمایاں نظر آتی ہے ، جبکہ دوسرے دور کی غزل میں موضوعات کی رنگا رنگی ہے اور خصوصاً سیاسی و سماجی شعور کی جھلکیاں واضح دکھائی دیتی ہیں ۔ اس دور کی غزل محض شاعر کے دل کی پکار اور اس کے ذاتی درد و غم کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں غمِ دوراں کی وسعت پیدا ہو گئی ہے اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ غم غمِ محبوب کی طرح حسین اور دلکش بن گیا ہے ۔ بلا شبہ فردوس میں اس کی لَے قدرے مدھم ہو گئی اور شوخی و رنگینی کا تناسب کم ہو گیا ہے ، مگر تغزل کا آہنگ آخر زمانے تک یکساں انداز میں قائم رہا ۔ خود ایک انٹرویو کے جواب میں کہتے ہیں " یہ نہیں ہے کہ میں اُس وقت تو شیطان تھا اور اب فرشتہ بن گیا ہوں ۔ ذوقِ جمال اور رنگین مزاجی کا اب بھی وہی عالم ہے " [۲]

۱- فردوس ، ص ۱۱۸ ، ۱۱۹

۲- ماہنامہ چراغ راہ مئی ، جون ۱۹۶۵ء ، ص ۱۸

مجموعی اعتبار سے ماہر کی غزل میں سب سے نمایاں عنصر نغمگی کا ہے۔ کوئی غزل دیکھ لیجئے، وہ دورِ اوّل کی ہو یا دورِ ثانی کی، وہ لمبی بحر میں ہو یا چھوٹی بحر میں، اس میں خوش آوازی سے پیدا ہونے والی لطیف غنائیت تاثر اور جذب کا ایک سماں باندھ دیتی ہے یعنی ان کے کلام میں وہ وجد آفرین لحن ہے جو تغزل کی روح ہے ۔ دوسری خوبیاں اپنی جگہ موجود ہیں ۔ مگر نغمگی اور موسیقیت نے ان خوبیوں کو خاص حسن اور تاثر عطا کر دیا ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ شاعر کی روح میں غیر معمولی قسم کا نشاطیہ رفور بھرا ہوا ہے جو ان کے ہر شعر کو مترنم بنا دیتا ہے ۔ اس ضمن میں محض مثال کے طور پر صرف دو غزلیں نقل کرتا ہوں ۔ جو غنائیت اور ترنم کا خاص اسلوب رکھتی ہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ دونوں غزلیات ان کے دور آخر کی ہیں ۔ یعنی ایک ۱۹۷۱ء کی اور دوسری ۱۹۷۶ء کی ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تغزل کا بانکپن، بیساختگی اور شوخی کا جو انداز جذباتِ ماہر (۱۹۴۴ء) میں کارفرما تھا، کم و بیش تیس سال کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ درد اور کسک کی خوبیوں کا اضافہ ہو گیا ۔ غزلیات مشتے نمونہ از خروارے ۔

ـــہ

میں تو غم دیدہ تھا میری ہر خوشی جاتی رہی ،
آپ کے ہونٹوں کی آخر کیوں ہنسی جاتی رہی
ان کی مرضی وہ نہ آئے میرے گھر وعدے کی شب
کم سے کم یہ تو ہوا ، بے رونقی جاتی رہی
دل دھڑکتا ہے تمنّائے سکوں کے ساتھ ساتھ
کیا کروں گا میں اگر یہ بے کلی جاتی رہی
یہ میرا شوق طلب تھا جام و صہبا کے بغیر
آنکھ ساقی سے ملی اور تشنگی جاتی رہی

میرے اظہارِ تمنا پر وہ اب برہم نہیں . . .

رفتہ رفتہ بات کی پیچیدگی جاتی رہی . . .

زندگی یہ کیون ہے ماہر فضا ناساز گار . . .

مین وہ جگنو ہون کہ جس کی روشنی جاتی رہی[1]

کیا یہ بہار بھی نہ مجھے آسکے گی راس

بجلی چمک رہی ہے نشیمن کے آس پاس

نظارۂ جمال قیامت سے کم نہ تھا

یہ عشق کا ہے معجزہ قائم رہے حواس

اے دوست تو کہ شعلہ و برق و شرار تھا

کس نے بنا دیا ہے تجھے مصلحت شناس

مین نے ہنسی ہنسی مین کیا تھا وفا کا ذکر

اتنی ذرا سی بات پر تم ہو گئے اداس ،

آنکھون کی تشنگی کا تمہین تجربہ نہین

تم دیکھتے رہو گے تو بڑھتی رہے گی پیاس

ماہر پڑا ہے اس سے محبت مین واسطہ

میرے سکوت کو جو سمجھتا ہے التماس[2]

غرض ماہر کی غزل مین آخر زمانے تک تازگی ، نغمگی اور رعنائی

کا انداز قائم رہا ۔ انہون نے غزل کی کلاسیکی روایت کا خوب احترام کیا ہے ،

۱۔ فاران ستمبر ۱۹۷۱ء ، ص ۳۰

۲۔ ایضاً ، اگست ۱۹۷۶ء ، ص ۱۰

غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کے نغمے سنائے ہیں اور رمزیت واشاریت کے ساتھ ساتھ لطافت و رنگینی کا اسلوب برقرار رکھا ہے ۔ زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار اور نئے تقاضوں سے وہ بھی متاثر ہوئے ہیں مگر وہ غزل اور تغزل کے تقاضوں سے دستکش نہیں ہوئے ۔ اس سے ان کے کلام میں خیال و بیان کی رنگینی و رعنائی اور رچاؤ پیدا ہوا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی " ماہر کے بعض اشعار میں ایسی برجستگی اور ایسا بےساختہ پن ہوتا ہے کہ ان کے ضرب المثل ہو جانے کا قوی امکان ہے اور ظاہر ہے کہ کسی شاعر کی اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے شعر زبانوں کی سیادت کریں اور حافظوں پر حکمرانی "![1] ایسے اشعار ان کے پہلے مجموعے سے لے کر آخری زمانے تک کے ذخیرے میں نظر آتے ہیں ۔

۔۔۔ فرہاد کی فریاد کہانی کی کہانی یہ بات جو بےتاب نگاہوں نے کہی ہے

اس نے غم دے کے مجھ کو فرمایا یہ مری آخری عنایت ہے

تم آگئے زہے قسمت تمہاری عمر دراز ..

تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

گھٹا، سبزہ، ستارے، پھول، سب اپنی جگہ برحق ..

تری کافر جوانی، پھر تری کافر جوانی ہے

۱۔ سہ ماہی " سیارہ " لاہور سالنامہ ۱۹۸۶ء ، شمارہ ۲۳ ، ص ۹۷

کسی صورت طبیعت مجھ سے بہلائی نہیں جاتی
ذرا سی آپ سے تکلیف فرمائی نہیں جاتی

پتلیاں آخری گردش میں ہیں اب بھی آ جاؤ
رسم کی رسم تماشا کا تماشا بھی ہے

آتے آتے ہی محبت میں قرار آئے گا
ہوتے ہوتے ہی علاجِ غمِ پنہاں ہو گا

ان کی رفتار کی ہم نے تو یہ صورت دیکھی
چال کی چال قیامت کی قیامت دیکھی

دل نے آغازِ محبت میں دعا مانگی تھی
جیت ہی جیت رہے ، ہار نہ ہونے پائے

زندگی موت میں تبدیل ہوئی جاتی ہے
آخری حکم کی تکمیل ہوئی جاتی ہے

میری بساط کو دیکھ اور میرے دل کو دیکھ
اٹھا لیا ہے ترا بار عاشقی میں نے

لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود افسوس اور حیرت کی بات یہ ہے کہ

کسی نقاد نے غزل گوئی کے حوالے سے ماہر کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ڈاکٹر تحسین فراقی ہی کے الفاظ میں :-

"ماہر نے غزل کے روایتی رموز و علائم سے جو کام لیا اس نے انہیں جگر ، حسرت اور اصغر کی غزل کے برابر توکھڑا نہیں کیا ، مگر ان کی غزل کہیں کہیں اس مقام کو بڑی کامیابی سے چھوتی ہے حالانکہ اسی اشاریت ، ایمائیت ، نزاکتِ خیال ، برجستگی ، برساختگی اور حسنِ اضافی کی گوناگون کیفیات کی عمدہ عکاسی کے باعث اسے غزل میں اہم مقام حاصل ہے"۔[1]

اور آخر میں تحسین فراقی ماہر کے معاملے میں نقادان ادب کی بےنیازی کے حوالے سے ایک اہم سوال کرتے ہیں "کیا ماہر کی توانا روایتی غزل سے اعتنا نہ کرکے ہم اپنی تاریخِ غزل کی ایک اہم کڑی کو کھوبیٹھنے کے جرم کا ارتکاب تو نہیں کر رہے ؟ یہ سوال ہمارے آپ کے سبھی کے سوچنے کا ہے"۔[2]

....

١- "سیارہ نمبر ٢٣ ، ص ٩٩

٢- ایضاً"

باب - ۳

ماہر القادری کی نظم نگاری

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ، ماہر القادری کی شاعری کا تقریباً دو تہائی حصّہ نظموں پر مشتمل ہے اور یہ نظمیں ہفت رنگ ہیں یعنی ان میں خالص رومانی نظمیں بھی ہیں ، ملّی اور اصلاحی بھی ہیں اور تاریخی بھی - ان کی خاصی بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو اقبال کی پیروی میں لکھی گئی ہیں اور وہ بھی ہیں جو ایک خاص مقصدیت کے پیش نظر تحریر کی گئی ہیں - مزید یہ کہ اس ذخیرے میں ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو کسی ہنگامی اور وقتی حادثے یا واقعے کے تناظر میں لکھی گئی ہیں لیکن قبل اس کے کہ ماہر کی نظم نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا جائے ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں نظم نگاری کی تاریخ کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ ماہر کی نظم کا مقام متعیّن کرنے میں آسانی پیدا ہو جائے -

نظم کیا ہے ؟

بقول پروفیسر احتشام حسین :

" جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو - اِس کے لئے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی اس کی ہیئت ہی معیّن ہے " -[1]

ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں " نظم کو جو بات دوسری تمام اصناف سے ممتاز اور متمیّز کرتی ہے وہ اس کی وحدت ، احساسِ تعمیر اور خیال و تاثر کے پہلو وار اور ترتیب وار اظہار کا انداز ہے " -[2]

۱- " نگار " کراچی اصناف سخن نمبر جنوری فروری ۱۹۵۷ء (سالنامہ) مضمون " اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقاء - ص ۱۲۹

۲- ماہنامہ " آجکل " دہلی اپریل ۵۸ء نظم نمبر مضمون ڈاکٹر محمد حسن ، اردو نظم کا ارتقاء ، ص ۸۰

ڈاکٹر خواجہ زکریا کے نزدیک " اچھی نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس کے تمام اشعار میں خیال کا ارتقا ہو ۔ اگر کوئی شعر خارج کر دیا جائے تو خیال میں ربط نہ رہے اگر کوئی شعر بڑھا دیا جائے تو بھرتی کا معلوم ہو ۔ اگر اشعار کی ترتیب بدل دی جائے تو نظم درہم برہم ہو جائے " ۔[1]

بالفاظ دیگر نظم کا ایک متعین موضوع ہوتا ہے اور اس میں شاعر بیانیہ ، فلسفیانہ یا مفکرانہ انداز میں کچھ خارجی اور کچھ داخلی یا دونوں قسم کے تاثرات بیان کرتا ہے ۔ موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ان نظموں کو مختلف شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مثلاً موضوع اور بنیادی آہنگ کے لحاظ سے رومانی ، سیاسی ، اخلاقی ، عشقیہ ، مذہبی ، اخلاقی ، ہجویہ ، فلسفیانہ ، مفکرانہ ، منظومیہ ، بیانیہ وغیرہ اور ہیئت اور ظاہری ساخت کے اعتبار سے بہ شکلِ مثنوی ، بہ شکلِ غزل ، مثلث ، مربع ، مخمس ، مسدس ، مثمن ، مسمط ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، قصیدہ ، مستزاد ، آزاد نظم اور گیتوں کی مختلف شکلوں وغیرہ ۔ اور جیسا کہ سید عابد علی عابد کی رائے ہے " باقی اصنافِ سخن کی طرح منظومات یا نظمیں بھی جمالیاتی قدر و قیمت رکھتی ہیں ۔ اس لئے ان کی قدر و قیمت پرکھتے وقت ان کے موضوع و معانی کی رفعت و بلندی ملحوظِ خاطر رہتی ہے " ۔[2]

اردو نظم نگاری پر ایک نظر :

اردو میں نظم نگاری کے نمونے شاعری کے دکنی دور ہی سے نظر آتے ہیں ۔ بعد میں نظم نگاری نے قصیدہ ، مرثیہ ، اور مثنوی کی صورت میں پیش قدمی کی اور میر تقی میر ، سودا ، میر حسن ، میر انیس اور مومن نے نظم نگاری کو ترقی اور کمال سے روشناس کیا ۔ نظیر اکبر آبادی نظم نگاری کو موضوعات اور زبان و بیان کے اعتبار سے زندگی کے بہت قریب لے آئے اور بقول ڈاکٹر

۱۔ " نئے پرانے خیالات " از ڈاکٹر خواجہ زکریا ۔ لاہور اکیڈمی لاہور ستمبر ۱۹۷۰ء ، ص ۱۲۱

۲۔ " اصولِ انتقادِ ادبیات " از عابد علی عابد ۔ مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۶۰ء ، ص ۵۱۶ ، ۵۱۷

وزیر آغا انہوں نے شعر کو آسمان سے اترنے اور زمین کی بوباس سونگھنے کی طرف متوجہ کیا اور یوں اپنے وطن کی دھرتی اور اس کی اشیا ہی کو نہیں بلکہ اس کی روایات ، تلمیحات اور ثقافتی مظاہر سے بھی گہری وابستگی کا ثبوت بہم پہنچایا [١] -

نظم نگاری ایک علیحدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے اپریل ١٨٧٤ء میں انجمن پنجاب کے مشاعرے سے وجود میں آئی جب مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے روایتی طرحی غزلوں کی بجائے ایسی موضوعاتی نظموں کا سلسلہ شروع کیا جس میں ربطِ بیان اور خیال کی وحدت موجود تھی [٢] - حالی نے اپنی نظموں کے مجموعے کے دیباچے میں اس مشاعرے کی غرض و غایت یوں بیان کی :

" اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبستِ عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وُسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے [٣] " -

" مقدمہ شعر و شاعری " میں بھی مولانا حالی نے غزل کے مقابلے میں مسلسل نظم (مثنوی) کو " مفید اور کار آمد " صنف قرار دیا [٤] - اور عملاً بہت سی منظومات تخلیق کیں جن میں " مد " و جزرِ اسلام یا " مسدّسِ حالی " کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی - حالی شاعری کے لئے سادگی ، اصلیت اور جوش کو ضروری سمجھتے ہیں ، اس کے لئے " نیچرل " ہونا لازمی قرار دیتے ہیں اور اخلاق کے ساتھ اس کا گہرا تعلق قائم کرتے ہیں [٥] - چنانچہ حالی جو جدید نظم کے امام ہیں ، ان کی نظموں میں قابلِ ذکر

١- " اردو شاعری کا مزاج " از ڈاکٹر وزیر آغا ، مکتبہ عالیہ لاہور ، ١٩٧٨ء ، ص ٣٣٠

٢- تاریخِ ادبِ اردو " رام بابو سکسینہ (ترجمہ) علمی کتاب خانہ لاہور طبع ثانی ١٩٧٨ء ، ص ٣٠٩

٣- کلیاتِ نظمِ حالی جلد اول مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی - مجلس ترقی ادب لاہور ، ١٩٦٨ء ، ص ٥١

٤- مقدمہ شعر و شاعری مکتبہ جامعہ نئی دھلی اگست ١٩٨١ء ، ص ٢٠٢

٥- ایضاً - ص ٦٧ ، ٦٨ ، ١٠٢

امر یہ ہے کہ یہ ساری خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں چنانچہ بالکل درست فرمایا ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کہ " مولانا حالی اردو ادب کے چند بزرگ ترین معماروں اور محسنوں میں سے ہیں - وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر اور نظمِ جدید کے پیشوا تھے - ان کی شعری تخلیقات کا دائرہ معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع اور جملہ اصنافِ سخن پر محیط ہے .... حالی کی نظموں نے سب سے پہلے ہمارے قومی و ملی شعور کو بیدار کیا اور ان عظیم اقدار کا احساس دلایا جن پر ہماری تہذیب کی عمارت قائم ہے - قومی وجود کے تحفظ اور ماضی و حال کے تسلسل کے لئے کلامِ حالی آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کل تھا "[۱] -

بقول ڈاکٹر محمد حسن ادبی اعتبار سے حالی کی نظموں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کی ساری غیر ضروری حدبندیوں کو توڑ دیا اور اسے ہر قسم کے افکار و مسائل اور جذبات و احساسات کے اظہار کے قابل بنا دیا[۲] - ڈاکٹر محمد حسن ہی کے الفاظ ہیں :

" اندازِ بیان کے اعتبار سے " نیچرل شاعری " کے تقاضوں کے پیش نظر حالی نے شاعری کا حُسن تشبیہ و استعارے، تلمیح یا خیال بندی کے جوہر کے بغیر پیدا کرنے کی کوشش کی - ان کا فن بیرونی آراستگی اور آرائشِ در و بام کا فن نہیں ہے بلکہ اندرونی تب و تاب کا فن ہے - وہ صیقل کے قائل نہیں بلکہ ایسے حُسنِ سادہ کے قائل ہیں جو غازہ اور زیور سے کم و بیش بے نیاز ہو "[۳] -

اردو نظم کے دوسرے بڑے شاعر مولانا محمد حسین آزاد ہیں ڈاکٹر محمد حسن کی رائے میں " آزاد کا مجموعۂ نظم گو حالی کی نظموں کے مقابلے میں " بے بضاعت ہے لیکن آزاد نے اردو شاعری میں رنگینی اور سجاوٹ پیدا کرنے کا ایک نیا راستہ پیش کیا "[۴] - آزاد کی نظمیں اصلاحی ، اخلاقی مضامین اور فطری منظر کشی کے نمونوں پر مشتمل ہیں - تاریخی اعتبار سے آزاد کی شاعری بڑی قابلِ قدر ہے - اُنہوں نے تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ تمثیل نگاری کو رواج دیا اور ڈرامائی

۱- کلیات نظم حالی جلد اول - ص ۲۵

۲- ماہنامہ " آجکل " دہلی اپریل ۱۹۵۸ء ، ص ۹

۳- ایضاً -

۴- ایضاً -

تصورون سے اپنی شاعری کو آب و تاب عطا کی ۔

اکبر الہ آبادی نے اپنی منظومات میں جہاں طنز اور مزاح کا مخصوص اسلوب اختیار کیا اور اس میں شہرت حاصل کی ، وہاں انہوں نے خالص سنجیدہ نظمیں بھی لکھیں ۔ مثال کے طور پر نواب محسن الملک کی فرمائش پر لکھی جانے والی ایک مسدس اپنی سنجیدگی ، درد مندی ، اور تاثیر کے اعتبار سے مولانا حالی کی " مسدس " کی یاد دلاتی ہے ۔ مثال کے طور پر ایک بند ملاحظہ ہو :

غضب ہے حبِّ اسلامی سے خالی سب کا سینہ ہے ،
حسد ہے ، ناتوانی بھی ہے ، بے مہری ہے ، کینہ ہے
بس اپنے ہی مزے کے واسطے ہر اک کا جینا ہے
یہی قومی ترقی کا ، ذرا سوچو تو زینہ ہے

کہاں ہے اب مسلمانوں میں باہم بے غرض الفت
جو باقی شاعروں میں ہے تو ہے وہ اک مرض الفت ۔ [1]

اسی طرح ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی تحقیق کے مطابق اقبال کی " ضرب کلیم " کی بیشتر نظمیں جو قطعات کی صورت میں ہیں ، وہ اکثر و بیشتر اکبر کی تقلید میں لکھی گئی ہیں کہ نصف صدی بیشتر اکبر نے انہی موضوعات پر اسی انداز میں لکھنا شروع کر دیا تھا ۔ [2]

شبلی نعمانی ایک نامور مؤرخ اور سوانح نگار ہی نہ تھے بلکہ فارسی ، عربی اور اردو کے قادر الکلام شاعر بھی تھے ۔ انہوں نے سیاسی اور تاریخی موضوعات پر بہت سی نظمیں لکھیں جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کے دور میں خصوصاً بہت پسند کی گئیں ۔ [3]

۱۔ اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ۔ مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۸۰ء ، ص ۳۵۹

۲۔ ایضاً ۔ ص ۳۷۳ ۔

۳۔ " کلیات شبلی " داتا پبلشرز لاہور (س ۔ ن) ، مقدمہ سید سلیمان ندوی ۔ ص

بقول ڈاکٹر محمد حسن :

" شبلی کی نظموں میں روانی ، سادگی اور ترنم بنیادی جوہر کی حیثیت رکھتے ہیں - ان کی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے وقتی موضوعات اور ہنگامی حادثات کو نظموں کا موضوع بنایا - شاعری کو " وارداتِ قلبیہ " کے محدود دائرے سے آگے بڑھا کر اسے ایک ایسا رنگین اسلوب بخش دیا جو ہر بات کو سلیقے سے کہنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے - شبلی کی نظموں میں معمولی واقعات کو شعری تجربے میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے - اسی لئے بجا طور پر انہیں اردو میں سیاسی اور موضوعاتی شاعری کا امام کہا جا سکتا ہے - شبلی کی نظموں میں بیان کا خلوص ، جذبے کی گرمی اور ترنم اور روانی کی اہمیت ہے " -[1]

شبلی کے بعد جس شاعر نے اردو نظم کو فکر و فن کے اعتبار سے درجۂ کمال تک پہنچایا وہ حضرت اقبال ہیں - موصوف محترم نے بیشمار نظمیں لکھیں - بقول صوفی غلام مصطفےٰ تبسم " ان کا انداز بیان فلسفیانہ ہے - وہ ہر شے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں - طلوعِ صبح کا ذکر ہو یا شفقِ شام کا ، کوہسار کا منظر ہو یا سبزہ زار کا موسم ، بہار کا تذکرہ ہو یا خزاں کا ، کشمکش زیست کا سوال ہو یا فسردگئ مرگ کا ، وہ انہیں دیکھتے ہیں اور ان میں یکسر محو ہو کر حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں " -[2]

چنانچہ بالکل درست لکھا ڈاکٹر پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے کہ " اقبال کی شاعری نفاست اور سلیقے سے ترشا ہوا ایک ایسا نگینہ ہے جو ایک کم پڑھے لکھے شخص سے لے کر ایک عالمِ بے بدل ، متکلّم اور فلسفی تک کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہے - نظریاتی اعتبار سے اقبال کے مخالفین کو بھی اس کی اس عظمت پر ایمان لاتے ہی بنتی ہے اور یہ محض شعرِ اقبال کا اعجاز ہے " -[3]

۱- ماہنامہ " آجکل " دہلی اپریل ۱۹۵۸ء ص ۱۰

۲- نیرنگ خیال اقبال نمبر ادارہ نقوش لاہور نومبر ۱۹۷۷ء ، مضمون " اقبال کی شاعری " - ص ۲۰۱

۳- " اقبال بحیثیت شاعر " مرتبہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی - مجلس ترقی ادب لاہور ، مارچ ۱۹۷۷ء " عرضِ مرتب " ص ۱، ۲ -

اور ان کی اس رائے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ :

" اپنی بے مثال فنی مہارت اور منفرد فکری عظمت کی بنا پر علامہ اقبال کو اردو شعر و ادب کی آبرو کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا ۔ مقصد و فن کا ایسا متوازن اور حسین و جمیل امتزاج عالمی ادب میں بھی مشکل ہی سے ملے گا " ۔[۱]

اردو نظم نگاری میں مولانا ظفر علی خان کا بھی ایک خاص مقام ہے انہوں نے نعت گوئی کے ساتھ ساتھ مختلف النوع ہنگامی اور سیاسی موضوعات پر بہت سی زور دار نظمیں لکھیں جو اپنی گوناں گوں خوبیوں کی وجہ سے خاص و عام میں محبوب قرار پائیں ۔ مولانا بے مثال قادر الکلام اور بدیہہ گو شاعر تھے ۔ بلند آہنگی ، منظر نگاری ، طنز و مزاح اور سنگلاخ زمینوں کے اعتبار سے مولانا ظفر علی خان کا واقعی کوئی جواب نہیں ۔ وہ ایک کاٹ دار اور تیکھے اسلوب کے حامل تھے جس کے بل پر انہوں نے کتنے ہی معرکے لڑے اور اپنوں کی سرخروئی اور دشمنوں کی ہزیمت کا سبب بنے ۔[۲]

علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کے ساتھ ساتھ چکبست ، صفی لکھنوی ، سرور جہان آبادی اور نظم طبا طبائی نے اردو نظم میں موضوعات کی سنجیدگی اور مقصدیت ، فکر انگیزی اور ترتیب و تسلسل کو قائم رکھا ۔

اختر شیرانی (۱۹۰۵ - ۱۹۴۸ء) اور جوش ملیح آبادی (۱۸۹۴-۱۹۸۲ء) نے اس فضا کو تبدیل کر دیا اور اخلاقی و اصلاحی پہلو کو ترک کر کے انہوں نے اردو نظم میں رومانی شاعری کا آغاز کیا ۔ چنانچہ ڈاکٹر یونس حسنی کے بقول " رومانیت کی بنیادی خصوصیات کو جس حد تک اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں سمویا اور جس فنکارانہ انداز میں اس کا اظہار کیا ،

۱- " اقبال بحیثیت شاعر " مرتبہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ، مجلس ترقی ادب لاہور مارچ ۱۹۷۷ء " عرض مرتب " ص ۱، ۲ ۔

۲- پروفیسر محمد یونس حسرت ، مجلہ چناب " ظفر علی خان نمبر مولانا ظفر علی خان گورنمنٹ ڈگری کالج وزیر آباد ، ۱۹۸۳ء ، مضمون کلام ظفر علی خان کے ادبی محاسن " ص ۱۵۳ ۔

وہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آیا "۔[۱] اور ڈاکٹر حسنی ہی کے الفاظ میں " مختلف مناظر ، کیفیات اور احساسات کی صورت گری میں اختر کو بڑی مہارت حاصل ہے ۔ ان کی بنائی ہوئی تصاویر حسین اور دلکش ہیں ۔ وہ حسن کے مصور ہیں "۔[۲] تاہم ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول " اختر شیرانی کی رومانی شاعری ایک بڑی حد تک سطحی ہے کہ اس کی حدود جوانی کے معاشقے سے آگے نہیں جا سکیں "۔[۳] لیکن جیسا کہ آل احمد سرور نے لکھا ہے " اختر کے ہاں لذتیت ہے مگر عریانی نہیں ، جسمانی محبت ہے مگر پستی اور ابتذال نہیں ۔ عورت اُن کی نظر میں کوئی کھلونا نہیں بلکہ دیوی ہے "۔[۴]

ڈاکٹر عبدالمغنی کے نزدیک جوش کی قادر الکلامی اور شعریت ہر شبہے سے بالاتر ہے وہ ایک فطری اور وجدانی شاعر ہیں اور زبان و بیان کے تمام وسائل پر بے پناہ قدرت رکھتے ہیں ۔ الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات کے استعمال میں ان کی چابک دستی ماہرانہ ہے ۔ ان کے تجربات بھی وسیع اور متنوع ہیں "۔[۵] مگر تنقیدی شعور کی کمی کی وجہ سے وہ یہ تمیز نہیں کر پاتے کہ ان میں کیا گفتنی ہے اور کیا ناگفتنی ؟ ۔ انتخاب و ترتیب اور تراش و خراش کا فنی عمل جوش کی شاعری میں گویا معدوم ہے ۔[۶] اسی لئے مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں " جوش کی انقلابی شاعری کا بہترین حصہ اکثر و بیشتر اک کف دردھان چند سے زیادہ وقیع نہیں ۔ جوش کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے "۔[۷]

۱۔ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب ڈاکٹر یونس حسنی ۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۶ء ، ص ۱۳۳

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۷۶

۳۔ اردو شاعری کا مزاج ڈاکٹر وزیر آغا مکتبہ عالیہ لاہور ، ۱۹۷۸ء (طبع ثانی) ص ۳۶۰

۴۔ ادب اور نظریہ آل احمد سرور ، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء ، ص ۸۳ ، ۸۴ ۔

۵۔ " تشکیلِ جدید " از ڈاکٹر عبدالمغنی کتاب منزل پٹنہ (بھارت) ۱۹۷۶ء ، ص ۱۰۲

۶۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۸ ۔

۷۔ بحوالہ " فکر و فن " از خلیل الرحمن اعظمی ۔ آزاد کتاب گھر دھلی ۱۹۵۶ء ، ص ۱۳۲

حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء - ۱۹۸۲ء) ابتداء میں بقول ڈاکٹر شمس الدین صدیقی " ھلکی پھلکی ، خوبصورت لطیف جذباتی و رومانی گیت ما نظموں اور نظم ما گیتوں کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ھوئے کیونکہ انہوں نے اردو بحروں کو بڑے سترنّم طریقے سے استعمال کیا اور کئی کامیاب ھیئتی ، عروضی، صوتی تجربے کئے " -[1] اور جیسا کہ سید ضمیر جعفری (پیدائش 1918) نے لکھا ھے " حفیظ نے اردو شاعری میں چونچل شاعری کے ایک نئے دبستان کا اضافہ کیا .... اس نے اظہار کے اچھوتے پیرائے ، منظر کشی کے نئے زاویے ، محسوسات کے نادیدہ افق اور آرٹ کے ممکنات کے نئے نئے راستے دریافت کئے .... حفیظ کی نظم بےساختہ سادگی اور بےساختہ نغمے کا ایک دلکش امتزاج ھے -[2]

مشاھیر اور معاصر نظم نگار شعراء کے اجمالی جائزے کے بعد ماھر کی نظم کے مختلف شُعبوں کا تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ھے -

ماھر کی رومانی نظمیں :

ماھر القادری اپنی متعدد نظموں کے حوالے سے شاعروں کے اس زمرے میں شامل ھیں جنہوں نے ابتداء میں غیر شعوری طور پر اردو شاعری میں مغرب سے آئے ھوئے ان رجحانات کو اپنایا جنہیں " رومانیت " کے نام سے یاد کیا جاتا ھے -

رومانیت سے مراد بقول ڈاکٹر سید عبداللہ " وہ شاعرانہ رویہ ھے جو صرف جذبے کی رھنمائی میں ابھرتا ھے اور حقائقِ زندگی کا سائنسی یا فکری تجزیہ نہیں کرتا بلکہ محض تخیلی جذباتی ھوتا ھے اور ایسی آرزوؤں کے خواب دیکھتا ھے جو اس جہانِ بےثبات میں بہت کم شرمندۂ تکمیل

۱- تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ھند دسویں صدی اردو ادب (پنجم) ناشر پنجاب یونیورسٹی لاھور ۱۹۷۲ء مضمون " ادبی منظر " از ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ، ص ۳۹ -

۲- سید ضمیر جعفری " افکار " کراچی " حفیظ نمبر " ۱۹۷۳ء مضمون " حفیظ — ایک نئی آواز " ص ۵۱۹-۵۲۰

ہوتی ہیں یا وہ ایسی گم شدہ خوشیوں کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے جو واپس نہیں آ سکتیں ۔ وہ ان کے لئے غم کھاتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس غم کا کچھ فائدہ نہیں ، وہ غم کی آگ میں سلگتا جلتا رہتا ہے " ۔[۱]

عُرفِ عام میں " رومانیت " اس شاعری کو کہتے ہیں جس میں عورت کے حُسن و جمال ، اس کی شخصیت اور عمومی انداز واسالیب بیانیہ انداز میں قلم بند کی جاتی ہیں ۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو محسوساتِ ماہر ، نغماتِ ماہر اور جذباتِ ماہر میں بہت سی نظمیں ہیں جو رومانیت کی ترجمان ہیں ۔ مثال کے طور پر " حُسنِ رہگزر "[۲] میں ماہر نے باغ کی روش پر محوِ خرام ایک حسینہ کے حسن و جمال کی تصویر کشی کی ہے جو بلا شبہ مرقع نگاری اور قدرتِ کلام کا خوبصورت نمونہ ہے ۔ اس میں ایک بھرپور جوانی کی ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے ۔ حسن کا پندار ، رفتار کی شوخی و مستی ، ناز و ادا اور تبسّمِ پنہاں غرض محاکات نگاری کا ایک سجیلا اسلوب سامنے آتا ہے ۔ تشبیہات کا بانکپن اس پر مستزاد ہے ۔

؎
تاروں کے کٹورے بھی جو دیکھیں تو چھلک جائیں
اس شان سے ماتھے پہ جھلکتا تھا پسینہ
بے چین تھا پارے کی بھی فطرت سے زیادہ
طوفانِ جوانی میں اداؤں کا سفینہ ،
وہ لب متبسّم تھے بصد شوخی و انداز
کلیوں کو سکھا دیں جو تبسّم کا قرینہ
میں بیخود و سرشار تھا بے ساغر و مینا

۱۔ " سخن ور نئے اور پرانے " حصہ اول از ڈاکٹر سید عبداللہ ۔ ص ۱۲۷

۲۔ " محسوساتِ ماہر " ص ۲۹ ۔

هر ذرّہ کو مدهوش بناتی هوئی گزری
آنکھوں کے پیالوں سے پلاتی هوئی گزری
وہ حُسن ، وہ انداز ، وہ شوخی، وہ لگاوٹ
رفتار سے اک حشر اٹھاتی هوئی گزری

جو شعر کہ منّت کشِ الفاظ نہیں هے
وہ شعر نگاہوں سے سناتی هوئی گزری

قابلِ ذکر امر یہ هے کہ ماهر نے نظم کی غنائیت کو پوری طرح برقرار رکھتے هوئے اسے هوسناکی سے معرّا، ایک باوقار اور پاکیزہ لب و لہجہ عطا کیا ۔ نظم کے چار بند هیں پہلے تین بند ٹیپ کے ایک ایک مصرع پر اختتام کو پہنچتے هیں اور اُس مصرع میں شاعر اس منظرِ جہاں سوز پر اپنا رد عمل بیان کرتا هے ۔

— میں نے بڑی مشکل هی سے اپنے کو سنبھالا
— میں بیخود و سرشار تھا بے ساغر و مینا
— هیں نقش مرے دل پہ وہ معصوم جفائیں

" وہ راتیں یاد آتی هیں "[۱] بڑے نازک موضوع پر ایک ایسی نظم هے جسے شاعر نے والہانہ پن کے باوجود بڑی احتیاط ، وقار اور شائستگی سے نبھایا هے ۔

" مشاهدہ "[۲] میں بھی " حسنِ رهگزر " کی مانند ایک طرح دار نسوانی حُسن کی دلاویز تصویر کشی هے ۔ تشبیہات کا بانکپن یہاں زیادہ نمایاں هے جو بے اختیار دل کے تاروں سے کھیلنے لگتا هے —

۱۔ محسوسات ماهر ۔ ص ۶۰

۲۔ ایضاً ۔ ص ۶۳

اُس جان گلستاں نے انگڑائی ناز سے لی
یا طاقِ میکدہ سے شیشہ کوئی اتارا

رنگیں لبوں پہ رقصاں ہلکی سی مسکراہٹ
جیسے شفق کسی ضو میں اک کانپتا ستارا

یہ چال ، یہ قیامت ، یہ ناز ، یہ شرارت
حل ہو گیا ہے جیسے شوخی میں گرم پارا

یہ کس نے مسکرا کر یوں جیسی منظر سے دیکھا
جنبش میں آ گیا ہے دل کا نظام سارا

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ یہاں حسن میں کہیں بے حجابی کا مظاہرہ دکھائی نہیں دیتا ۔ وقار کا انداز حاوی ہے اور نظم میں تغزل کی شان نمایاں ہے ۔ پھر خاص بات یہ ہے کہ ماہر محاکات نگاری میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں ۔ وہ ایسی مکمل تصویریں بناتے ہیں جو بولتی چالتی ہنستی گاتی اور مسکراتی دکھائی دیتی ہیں ۔ یہ ان کی فن کاری کا کمال ہے کہ ان کی تصویریں زندگی کی جملہ رعنائیوں سے مزیّن ہوتی ہیں ۔

ماہر طبعاً جمال پسند ہیں ۔ وہ ہر شے اور ہر رنگ میں حسن کے متلاشی رہتے ہیں اور حسن جہاں بھی ہو ، ان کی توجّہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتا ہے چنانچہ متذکرہ دو نظموں کے علاوہ بھی متعدد نظمیں ہیں جن میں ماہر نے عورت کی رعنائی اور ظاہری حسن و ادا کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے ۔ ان میں " پنگھٹ کی صبح "[1] اور " پنگھٹ کی شام "[2] ، " چل دیئے "[3] " سرودِ مستانہ "[4] ، " واردات "[5] ، جمنا کا کنارہ "[6] ، " یاد رہے "[7] ، " پہلی ملاقات "[8] ، " ریل کے سفر میں "[9] ، " پھول والی "[10]

۱۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۹۳ ۲۔ محسوسات ماہر ، ص ۹۵
۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۱۵ ۴۔ ایضاً ۔ ۱۱۹ ۵۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۶
۶۔ نغمات ماہر ۔ ص ۷۳ ۷۔ نغمات ماہر ۔ ص ۷۸ ۸۔ جذبات ماہر ص ۲۹
۹۔ جذبات ماہر ۔ ص ۳۲ ۱۰ جذبات ماہر ۔ ص ۵۹

" کو دیکھ کر "[1] " اور " اک شب حاصلِ زندگانی "[2] قابل ذکر ھین - ان سب مین ماھر نے مختلف زاویون سے عورت کی دلربائی اور عالم آرائی کو مزے لے لے کر بیان کیا ھے - چند مثالین ملاحظہ فرمائیے :

چڑھتا ھوا شباب مکمل جوانیان
موضوعِ حسن و عشق مجسم کہانیان
تہذیبِ عہدِ رفتہ کی زندہ نشانیان
کھیتون کی شاھزادیان گاؤن کی رانیان

آتے ھی ان کے منظرِ ساحل بدل گیا ،
ماحول حسن و نکہت کے سانچے مین ڈھل گیا -[3]

" جمنا کے کنارے " مین ایک حسینہ کی یون تصویر کشی کی ھے :

اللہ رے اٹھلاتی ھوئی چال کی شوخی — رک جائے جسے دیکھ کے بہتا ھوا دھارا
نکھرے ھوئے ماتھے پہ وہ رنگین سا قشقہ — جس طرح گھٹاؤن مین دمکتا ھوا تارا
قشقہ پہ وہ چاندی کا چمکتا ھوا جُھومر — جس طرح کہ انگارے پہ ٹھہرا ھوا پارا[4]

" پہلی ملاقات " مین " کسی " کا سراپا کس والہانہ ذوق و شوق سے کھینچا گیا ھے :

لبون پر تبسم کے انوار رقصان ، — جبین مین محبت کی شمعین فروزان
وہ ماتھے کی افشان ستارون کی دنیا — وہ ھونٹون کی لالی کہ صبحِ بدخشان
وہ آنکھون کے ڈورے گلابی گلابی — وہ زلفِ معنبر پریشان ، پریشان[5]

۱- جزبات ماھر - ص ۲۹ ۲- جزبات ماھر - ص ۷۱
۳- محسوسات ماھر - ص ۹۲ ۴- نغمات ماھر - ص ۷۲
۵- جزبات ماھر - ص ۲۹

اسی طرح " پھول والی " کے حسن و دلربائی کی مرقع نگاری میں تغزّل کی شان دیکھئے ۔

گھاٹیوں میں گھومتی پھرتی ہے کتنی تیز تیز
تہمد میں سوئے ہوئے سبزے کو چونکاتی ہوئی

گا رہی ہے چوڑیوں کے ساز پر ساون کا گیت ،
جسمِ خس میں زندگی کی روح دوڑاتی ہوئی

آرسی میں دیکھتی جاتی ہے چہرے کی بہار
اپنے جلوے دیکھ کر تسکین سی پاتی ہوئی

اس کے آتے ہی چمن میں حشر برپا ہو گیا ،
بوئے گل بھی پھر رہی ہے ٹھوکریں کھاتی ہوئی ۔ [1]

" ..... کو دیکھ کر " میں بھی کسی حسینہ کے حسنِ جہان سوز کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ۔ اسلوب کا بانکپن لائقِ داد ہے ۔

شباب و نکہت کی تصویرِ ناز سرتا پا
نشاط روح کی فردوس ، حسن کی دُنیا

تری نگاہ میں پنہاں تجلّیات کے طور ،
کہ جن کے سامنے جھک جائیں زاہدوں کے غرور

نکل رہے ہیں یہ کیا ایک ساتھ شمس و قمر
کہ موتیوں کی ہے جھالر سڈول شانوں پر ۔ [2]

۱- جذباتِ ماہر - ص ۶۰

۲- ایضاً - ص ۶۹

اور اس شعر میں تو ماہر نے پوری ایک تاریخ بیان کر دی ہے - رمز و ایما اور جامعیت کا غیر معمولی انداز اور نظم کے ایک شعر میں۔تغزل کی شان دیکھئے :-

وہ ظالم ادائیں وہ کافر نگاہیں
اُلٹ دیں ذرا دیر میں خانقاہیں ۔ [1]

اپنی ذات اور تجربات و مشاہدات کے حوالے سے بھی ماہر کی کئی نظمیں ہیں - ان میں سے " ریل کے سفر میں " [2] خاص قابلِ ذکر ہے - چار چار شعروں پر مشتمل تین بند ہیں اور ہر بند ایک ٹیپ کے مصرع پر ختم ہوتا ہے - تینوں مصرعوں میں غضب کی مرقع نگاری اور تاثیر پائی جاتی ہے :

ع - گردن میں اس کی خم تھا لیکن بقدرِ مینا ۔
ع - سانچے میں ڈھل گئی تھیں فردوس کی ہوائیں
ع - جاتا ہوا لڑکپن ، آتی ہوئی جوانی ۔

اس نظم میں بعض اشعار تغزل اور شعریت کا خاص انداز رکھتے ہیں :-

کتنا صبیح چہرہ،کتنی سیاہ زلفیں
پھیلا ہوا اجالا، سمٹی ہوئی گھٹائیں

نظروں کے سامنے تھی وہ روحِ شادمانی
میں یہ سمجھ رہا تھا دیکھا ہے غیر فانی [3]

ماہر کے ہاں چند نظمیں ایسی ہیں جو رومانی اور فکری نوعیت کا ملا جلا اسلوب رکھتی ہیں اور محض عورت کے حسن و جمال ہی کی مرقع نگاری پر مشتمل نہیں ہیں - مثال کے طور پر " عورت " [4] میں انسانی زندگی اور کائنات میں عورت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے ، اس کی مختلف حیثیات

۱- جذبات ماہر - ص ۷۱ ۲- جذبات ماہر ص ۳۲
۳- ایضاً - ص ۳۳ ۴- نغمات ماہر - ص ۸۳

کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے ۔ اس کی جوانی اور بڑھاپے کی برکات و فیوض پر روشنی ڈالی گئی ہے اور انسانی معاشرے پر اس کے جلال و جمال کے گہرے اثرات کی طرف اشارے کئے گئے ہیں ۔ پوری نظم میں احترام ، عقیدت اور وقار کا انداز نمایاں ہے ۔ اختر شیرانی نے بھی اسی عنوان سے ایک نظم " شمعِ حرم " میں لکھی ہے ۔[1] جو مسدس ہے اور پانچ بندوں پر مشتمل ہے ، مگر اس میں محض عورت کی جذباتی انداز میں تحسین کی گئی ہے ماہر کے ہاں شعریت اور تغزل کے ساتھ ساتھ فکری پہلو غالب ہے اور سنجیدگی سے عورت کی عظمت اور اہمیت بیان کی گئی ہے ۔

" جوان ہونے سے کچھ پہلے "[2] میں نسوانی زندگی کی نوعمری کے اُس زمانے کی نفسیاتی کیفیت کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے جب اطوار پر بے نیازی اور لاپروائی کی کیفیت غالب ہوتی ہے ۔ نہ اپنا ہوش ہوتا ہے نہ دوسروں کی توجہ کی طلب یا پروا ہوتی ہے ۔ نظم میں شاعر کے عمیق مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے ۔ چھوٹی بحر میں شعریت اور تشبیہات کا کمال دیکھئے :

بہت سادہ طبیعت بھولی بھالی	کہ جیسے بن کھلی کلیوں کی ڈالی
زمانہ کی ہوا سے بے خبر ہے	نظر معصوم ، دل معصوم تر ہے
کنول کے پھول کی مانند سادہ	حیا فطرت زیادہ سے زیادہ
نگاہیں مطمئن چہرہ ہے مسرور	یہ عالم ہے پشیمان نہ مغرور

اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی حسنِ تغزل کی ایک خوبصورت مثال ہے ۔

اسی طرح " حسین دوشیزہ "[3] میں بھی انہوں نے ایک ایسی دوشیزہ کی رعنائی جمال کا

۱۔ دیکھئے " اختر شیرانی اور اس کی شاعری " مرتبہ ایس اختر جعفری ۔ آئینہ ادب لاہور ص ۱۷۶ ۔

۲۔ نغمات ماہر ۔ ص ۱۰۶   ۳۔ جذبات ماہر ۔ ص ۵۳

ذکر مزے لے لے کر کیا ہے جو دلربائی اور حسنِ کامل کی زندہ تصویر ہے اور اس کے ساتھ ہی معصومیت اور بلندئی کردار کا بھی لائقِ فخر نمونہ ہے ۔

ــــہ آنکھیں وہ حیا کوش کہ نظارے سے بیزار
عارض ہیں وہ نازک کہ پسینہ سے گراں بار

اونچی ہے ستاروں سے بھی اخلاق کی رفعت
پھولوں سے بھی بڑھ کر کہیں معصومی کردار

اصل میں ماہر طبعاً اور عقیدۃً عورت کو سراپا حیا دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کی عصمت شعاری اور عفت کی تحسین کرتے ہیں ، یہی سبب ہے کہ انہیں طوائف سے شدید نفرت ہے اور وہ اس کی ہمدردی میں تحلیل نفسی کی بحث میں نہیں پڑتے ۔ طوائف پر ان کے مجموعوں میں دو نظمیں ملتی ہیں [1] ۔ اور دونوں میں ان کا ردعمل بڑا شدید ہے اور اس پر غصہ اور غضب ناکی غالب ہے ۔ یقیناً یہ ایک راست فکر مسلمان کا جذباتی ردعمل ہے ، مگر فنی طور پر " طوائف " خاصی کمزور نظم ہے ۔ اس میں وعظ کا رنگ غالب ہے اور وہ بھی تہدید آمیز انداز میں ــــہ

تیری ہر شوخی لچر ہے تیرا ہر انداز پوچ
سخت تر ہے سنگ و آہن سے تیری باہوں کا لوچ ۲
تیری پیشانی کا ہر خط معصیت آلودہ ہے
تیرا ہر اقدام فاسد جام ہے بیہودہ ہے ، ۳

" فریب " ۵۱ اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ہے جس میں وہ طوائف کے کوٹھے ، اس کے کردار اور فریب کارانہ ، پرتصنع اداؤں کی منظر کشی کرتا ہے ــــہ

۱۔ " طوائف " محسوسات ماہر ص ۳۵ ، " فریب " جذبات ماہر ۔ ص ۲۲
۲۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۳۵
۳۔ ایضاً ۔ ص ۳۶

ایک جنّت جس میں دوزخ کے شرارے بند ہیں

آبگینے قند کے اور زہر پارے بند ہیں ۔[1]

اس نظم میں شاعر اپنی ایک لغزش کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ وہ طوائف کے حسن و جمال اور عشوہ وناز کے دلفریب مصنوعی کردار سے دھوکا کھا کر وہاں پہنچ گیا مگر جلد ہی سنبھل گیا اور وہاں سے راہِ فرار اختیار کر گیا ــ

ایک ہی آنسو میں سب دامن کی چھینٹیں دھل گئیں

شُکر ہے بس ایک ہی ٹھوکر میں آنکھیں کھل گئیں ۔[2]

ماہر طوائف کو " دشمنِ مہر و وفا اور غارت گرِ شرم و حیا " قرار دیتے ہیں اور ان خواتین پر ناز کرتے ہیں جو عفت شعار اور پاکدامن ہیں ۔ " مسلمان لڑکی "[3] میں ایک باحیا مثالی مسلمان لڑکی کے کردار کی تعریف کرتے ہیں ــ

اے تو کہ ہے اخلاق کے پھولوں کا خزانہ

دُنیا بڑی پُرپیچ ہے نازک ہے زمانہ

سورج کی کرن تیرے تقدس کی ہے شاہد

کلیوں کی زبان پر ہے تری عصمت کا فسانہ

اور پھر اسے نصیحت کرتے ہیں ــ

کاغذ کے ہیں یہ پھول نہ خوشبو نہ طراوت

افرنگ کی تہذیب کے دھوکے میں نہ آنا

ماہر عورت کی مظلومیت پرکڑھتے ہیں اور ہندو مت کے زیر اثر مسلمانوں میں بیوہ عورت کے بارے میں جو منفی رویّہ اختیار کیا گیا ہے ۔ اس پر سخت کرب کا اظہار کرتے ہیں ۔ " نوجوان بیوہ "[4] اس سلسلے کی ایک موثر اور خوبصورت مگر دردناک مثال ہے ۔ اس میں شاعر بتاتا ہے کہ

۱۔ جذبات ماہر ۔ ص ۲۲ ۲۔ جذبات ماہر ص ۲۸

۳۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۴۹ ۴۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۲۵

ایک نوجوان بیوہ اپنے رفیق حیات کی موت کے بعد گویا جہنم میں گر جاتی ہے اس سے ساری خوشیاں چھین لی جاتی ہیں ، دوسری شادی گناہ سمجھی جاتی ہے ، کنواریاں اس سے کتراتی اور سہاگنیں پہلو بچاتی ہیں - اس کے لئے مسکرانا اور اچھے کپڑے پہننا مہا پاپ بن جاتا ہے - ماہر نے اس نظم میں ایک بدنصیب نوجوان بیوہ کے جذبات و احساسات کی گویا تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے - اس میں رقت اور اثر انگیزی کا یہ عالم ہے کہ قاری بے اختیار گہری کرب کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اور غیر انسانی اور غیر فطری رسوم و رواج سے نفرت ہو جاتی ہے - فی الحقیقت شاعر نے تشبیہ و استعارہ اور حسنِ بیان کا وہ انداز اختیار کیا ہے کہ ابلاغ کا حق ادا ہو گیا ہے - یہ نظم فن اور مقصدیت کی بہترین عکاس ہے :-

ایک غم کی رات جس کی صبح ہو سکتی نہیں
اک کلی جو اوس سے بھی منہ کو دھو سکتی نہیں

اک بھیانک خواب جس کی خود کشی تعبیر ہے
ایک انسان جو غم و اندوہ کی تصویر ہے

اک چمن جس پر بہار آتے ہی بجلی گر پڑی
اک مسلسل مرگ ، اک مبہم قیامت کی گھڑی

ایک دکھیاری نہیں جس کا کوئی جز بیکسی
ایک کہرے کی سحر جس میں نہیں تابندگی -[1]

اس نظم کو پڑھ کر مولانا حالی کی " مناجاتِ بیوہ " یاد آتی ہے جو واحد متکلم میں ہے اور جس کے بعض حصے اتنے درد انگیز ہیں کہ کلیجہ تھام کر پڑھنے پڑتے ہیں -[2] دونوں میں فرق یہ ہے کہ حالی کے مزاج اور موضوع کی مناسبت سے " مناجاتِ بیوہ " کا لب و لہجہ دھیما ہے اور عجز و دعا کا اسلوب

۱- محسوسات ماہر ، ص ۲۶

۲- دیکھئے کلیات نظم حالی ، جلد دوم - ص ۳۵

رکھتا ھے ، جبکہ نوجوان بیوہ کا انداز تاثراتی ھے ۔ اس میں احتجاج کی کیفیت چھائی ہوئی نظر آتی ھے اور اسی مناسبت سے اس کا آھنگ پُر جلال ھے ۔

ماھر کی رومانی نظموں میں ھوس پرستی کے مناظر بہت کم ھیں ۔ مجموعی اعتبار سے پاکیزگی اور وقار کا انداز نمایاں ھے ۔ اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ھوتا ھے :-

دکھا کے عشق کسی پاکیزگی کا اک منظر
ھوس پرست زمانے کو شرمسار کریں ،
نگاہ جس طرح پھولوں کو چوم لیتی ھے
اسی طرح ہم ایک دوسرے کو پیار کریں [1]

ماھر کی منظریہ شاعری :

اردو میں منظریہ شاعری کا آغاز بھی نیچرل شاعری کے ساتھ ہوا اور شعراء اپنے ماحول کے فطری مناظر کی تصویر کشی کرنے لگے ۔ آزاد ، حالی ، اسمٰعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی سے ھوتی ہوئی یہ روایت اقبال اور ظفر علی خان تک پہنچی ۔ ماھر نے دیہاتی علاقے میں پرورش پائی تھی اور احساسِ حسن کے ساتھ ساتھ وہ مناظرِ فطرت کے حسن سے بھی عمر بھر متاثر رہے ۔ چنانچہ ان کی شاعری میں متعدد ایسی نظمیں موجود ھیں جن میں موصوف نے قدرتی مناظر کی بڑی ھی خوبصورت تصویر کشی کی ھے ۔ اور قدرتِ بیان ، قوتِ متخیّلہ اور عمیق مشاھدے کی مدد سے مناظر میں گویا جان ڈال دی ھے ۔ " پنگھٹ کی صبح " اور " پنگھٹ کی شام " [2] ۔

۱۔ محسوسات ماھر ۔ ص ۵۲ ۔

۲۔ ایضاً ۔

کے عنوان سے مسدس کی ہیئت میں دو نظمیں ہیں ، ان کے آغاز میں صبح اور شام کے مناظر کی عکاسی کی گئی ہے - میر انیس کے انداز میں ماہر کی قادر الکلامی ملاحظہ فرمائیں :

لبِ دریا صبح کا منظر

ٹھنڈی ہوا ، خوش فضا، بھاپ کا دھواں
جاڑے کی رُت، بہار کے دن ، صبح کا سماں
لہروں پہ تیرتی ہے ، حبابوں کی کہکشاں
موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں
آئی ہوا تو اوس کے موتی ڈھلک گئے
سر سبز پتّوں کے پیالے چھلک گئے

آئی کرن نگاہ کے پر تولتی ہوئی
کہرے کی ہر لطیف گرہ کھولتی ہوئی
شبنم کے تاب ناک گہر رولتی ہوئی
پانی میں روشنی کی شکر گھولتی ہوئی
موجوں کی بیقرار جبینیں چمک گئیں
وہ جوشِ نکہت ہے کہ ہوائیں بہک گئیں ۔[۱]

شام کا منظر

پیڑوں کی چھاؤں ، ریت کے ذرّے ، شفق کی ضو
ساحل کو چومتی ہوئیں موجیں بہ طرزِ نو

۱- محسوسات ماہر ، ص ۹۳ ، ۹۴

خورشید کی چراغ کی بجھتی ہوئی سی لو
بربط سا چھیڑتی ہوئی ندی کی تیز رو
موجوں کے جزر و مد میں عجب اہتمام ہے
فردوس کی سحر ہے کہ پنگھٹ کی شام ہے [1] -

" گنگا کے کنارے " [2] میں بھی شاعر کا مشاہدہ اور تخیل مل کر عجیب سماں پیدا کرتا ہے - تشبیہات تخلیق کرنے میں ماہر خاص مہارت رکھتے ہیں - چنانچہ پنگھٹ کی صبح اور شام والی نظموں کی طرح اس نظم میں بھی تشبیہات نے منظر کی دلآویزی کہیں زیادہ بڑھا دی ہے --

فردوس میں بیٹھا ہوں کہ گنگا کے کنارے
بھرتی ہیں نگاہیں جو نظارے پہ نظارے
پانی میں حبابوں کا یہ رہ رہ کر ابھرنا
جیسے پسِ چلمن کوئی کرتا ہے اشارے ،
یہ چاندنی رات اور یہ لہروں کی کشاکش
آئینہ پہ چلتے ہوئے ہلسور کے آرے
ٹھہرے ہوئے ساحل پہ یہ بگلوں کی قطاریں
موروں کے پرے جیسے ہوں کوثر کے کنارے

آبِ رواں کے دلآویز نظاروں کے علاوہ ماہر نے موسمِ بہار کی رعنائیوں ، صحنِ چمن کی جولانیوں اور تتلی کی اڑانوں کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے - اس سلسلے میں ان کی تین نظمیں خاص اہمیت کی حامل ہیں یعنی " بہار " [3] ، " تتلی " [4] ، اور " صبحِ چمن " [5] - " بہار " میں موسم بہار

۱- محسوسات ماہر - ص ۹۵
۲- محسوسات ماہر - ص ۲۳
۳- ایضاً - ص ۱۲۸
۴- ایضاً - ص ۱۲۷
۵- نغمات ماہر - ص ٦٩

کی رعنائیوں کا بیان بڑے ہی خوبصورت اور والہانہ انداز میں کیا گیا ہے ۔ تشبیہات حسبِ معمول اپنے اندر بانکپن کا خاص انداز رکھتی ہیں ۔ شاعر کا مشاہدہ بھرپور ہے ۔ جزئیات نگاری سے بڑی کامیابی سے کام لیا گیا ہے اور نظم کا مجموعی تاثر گہرا ہے ۔ خاص بات یہ ہے کہ نظم کا آخری شعر اپنے اندر لطیف مقصدیت رکھتا ہے اور دعوت فکر دیتا ہوا نظر آتا ہے ۔

یوں جھومتا ہے سبزۂ خوابیدہ بار بار ــــہ

جیسے کسی حسین کی آنکھوں میں ہو خمار

رشکِ عروس نو ہیں درختوں کی کونپلیں

غیرت دہِ بہشت ہے دامانِ کوہسار ،

رنگینیوں میں ڈوب گئی ہے کلی کلی

دوشیزۂ بہار ہے گلشن سے ہم کنار

ہنگامۂ بہار پہ روتا ہے میرا دل

ماہر میں سوچتا ہوں جب اس کا مآلِ کار ۔ [1]

تتلی میں شاعر کی فطری معصومیت اور حسن کی ہر صورت سے اس کی ذہنی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔گیارہ اشعار پر مشتمل چھوٹی بحر کی یہ مثنوی سہل ممتنع کی ایک خوبصورت مثال ہے تتلی کو دیکھ کر شاعر کو اللہ تعالی کی قدرتِ کاملہ کی یاد آتی ہے اور وہ بڑی ہی محبت اور ذوق و شوق سے تتلی کی نقل و حرکت اور اٹھکیلیوں سے محظوظ ہوتا ہے ۔ خاص بات یہ ہے کہ نظم شعریت اور حقیقت بیانی کا امتزاج ہے اور سادگی و پرکاری اور حسنِ بیان کا شاہکار ہے ۔ ساری نظم شاعر کی قدرت کلامی کا دلآویز نمونہ ہے ۔ چند اشعار بطورِ مثال ــــہ

اے حسن کی شان اجتماعی　　پروردۂ صد بہارِ خوبی

نقاش کی صنعت مکمل ،　　اے پیکر جنبشِ مسلسل ،

یہ نقشِ حسین پروں پہ تیرے　　جیسے کوئی حور مسکرا دے ۔ [2]

۱۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۱۲۸
۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۷

" صبحِ چمن " بیس اشعار پر مشتمل میر حسن کی مثنوی " سحر البیان " کی بحر میں ایک کامیاب اور قابلِ تحسین نظم ہے جس میں سلاست ، روانی اور ربط کے تسلسل کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری کی خوبصورت مثالیں موجود ہیں ۔ حسی اور تخیلی تشبیہات کا حسن اپنی بہار دکھاتا ہے اور مناظر کے بیان میں مبالغے یا تصنع کی بجائے سادگی اور فطری بہاؤ نظر آتا ہے ۔ یہ نظم بھی ماہر کی قادرالکلامی اور سہل ممتنع کا قابل تحسین نمونہ ہے ۔ چند اشعار بطور نمونہ ـــــ

وہ کہرے کی چادر بہت ہی مہین　　دھندلکا مگر بے نہایت حسین ،
ہوا ڈالیوں سے جو ٹکرا گئی　　کلی کے لبوں پر ہنسی آ گئی ،
چٹک کر جو غنچوں نے آواز دی　　گلوں کی مہک نے بھی انگڑائی لی
وہ سبزے کی بدمست انگڑائیاں　　مچلتی ہوئی سبز پرچھائیاں
وہ بھولی وہ بھولی چنبیلی کے پھول　　محبت کے جس طرح سادہ اصول
گلستاں کی زینت مہکتے گلاب　　کہ جیسے عروسِ دنی کا شباب
درختوں کے پتے ہیں یا مورچھل　　ہر اک شاخ حافظ کی رنگین غزل ۔ [۱]

ـــــ

ماہر نے یادِ ماضی کے حوالے سے بھی مناظر فطرت کی تصویر کشی کی ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی چار نظمیں قابل ذکر ہیں یعنی " عہدِ رفتہ کی یاد میں " ، " دکن کی برسات " ، " وطن کی یاد " اور " بغداد کے چمن میں ایک شام " ۔ [۲]

" عہدِ رفتہ کی یاد میں " میں شاعر اپنے بچپن اور گاؤں کی یادیں تازہ کرتا ہے اور اس حوالے سے کئی قدرتی مناظر بھی نظروں کے سامنے آ گئے ہیں ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گاؤں کی

۱۔ نغمات ماہر ۔ ص ۶۹

۲۔ محسوسات ماہر ص ۱۰۸ ، یوں لگتا ہے کہ یہ نظم اختر شیرانی کی مشہور نظم " مجھ کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے " سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے مگر دونوں کا موضوع اور لب و لہجہ یکسر مختلف ہے ماہر کے ہاں یادوں کا کینوس زیادہ متنوع اور وسیع نظر آتا ہے ۔

زندگی کی طرح یہ مناظر بھی سادہ ھین اور ان کے اظہار مین بھی کسی تکلف یا تصنع سے کام نہین لیا گیا ـ واقعیت اور خلوص اور شاعر کی قدرتِ کلامی نے ان تصویرون مین ایک خاص حسن اور دلکشی بھر دی ھے ــــ

گاوٗن کے وہ لہلہاتے سبزہ زار
خوشنما طائر قطار اندر قطار
نالیان کھیتون کی مثلِ آبشار
ھر طرف سرسون کے پھولون کی بہار

زندگانی کا فسانہ یاد ھے ،
مجھ کو اب بھی وہ زمانہ یاد ھے

جامنون کے پیڑ ساون کی گھٹا
کوئلو ن کی کوک اور ٹھنڈی ھوا
کیف ز ا ماحول ، مستانہ فضا
آم کھانے اور کھلانے کا مزا

زندگانی کا فسانہ یاد ھے ،
مجھ کو اب بھی وہ زمانہ یا د ھے

شاعر کا مشاھدہ، اس کی باریک بینی اور پھر اس حوالے سے تشبیہ کا حسن دیکھئے ــــ

جھاڑیون سے وہ طلوعِ آفتاب
ٹوٹتا ھے جیسے دلہن کا حجاب
بج رھا تھا خود ھی پتون کا رباب
سامعہ مسرور ، منظر ہین کامیاب

زندگانی کا فسانہ یاد ھے ،
مجھ کو اب بھی وہ زمانہ یاد ھے

"دکن کی برسات" [1] میں ہر طرح کے مناظر ہیں خصوصاً موسم اور عورت کا حسن مل کر عجیب امتزاج پیدا کرتے ہیں - شاید یہی سبب ہے کہ مسرت اور سرخوشی کا ملا جلا احساس نظم کی ساری فضا پر طاری ہے - اس میں ایک جانب گنگناتی ہواؤں ، لڑکھڑاتی گھٹاؤں ، غرم بوندوں ، پپیہے کی پُر درد تانوں ، لڑکیوں کے اڑتے دوپٹوں اور شاعر کے دل پُر درد کی دہکتی چوٹوں کا ذکر ہے اور دوسری طرف موسم برسات میں دکن کے کوچہ و بازار کے مناظر زندہ و متحرک نظر آتے ہیں جن میں یکوں ، سائیکلوں اور موٹروں کی دوڑیں ہیں ، آموں ، قلفیوں اور چائے خانوں کی تصویر کشی ہے اور آم بیچنے والی ایک دوشیزہ کی شخصیت کی عکاسی ہے - مشتے نمونہ از خروار ملاحظہ ہوں دو مثالیں :-

چمن کا پتہ پتہ دُھل رہا ہے ۔۔۔ اندھیرے میں اجالا گھل رہا ہے
کسی بدمست دوشیزہ گھٹا کا ۔۔۔ سرِ کہسار جُوڑا کھل رہا ہے
خوشی ماحول پر چھائی ہوئی ہے
کہ پھولوں میں زمانہ تل رہا ہے

ہوا ٹھنڈی ، فضا بدمست سی ہے ۔۔۔ شرابِ زندگانی ڈھل رہی ہے ،
عجب رُت ہے نہ سردی ہے نہ گرمی ۔۔۔ ہوا میں اچھا درجہ کی نرمی
بڑی برکت رم جھم ہو رہی ہے ۔۔۔ گھٹا جیسے فضا کو دھو رہی ہے
مسرت کاروان در کاروان ہے
دکن برسات میں جنت نشان ہے

ہیئت اور فن کے اعتبار سے "دکن کی برسات" کا مطالعہ قابلِ ذکر ہے - نظم کے پانچ بند ہیں پہلے تین بند قصیدے کی ہیئت یعنی ایک ردیف اور قافیے کے ساتھ ہیں - جبکہ چوتھا اور پانچواں بند مثنوی کی صورت میں ہے - تیسرے بند کے بعد ایک غزل بھی ہے - خاص بات یہ بھی ہے کہ

۱- نغمات ماہر - ص ۹۰

کسی بند کے اشعار کی تعداد یکسان نہین - یون لگتا ہے جیسے برسات کے موسم کا نشہ شاعر کو بھی بدمست بنا چکا ہے اور وہ جھومتا لڑکھڑاتا ہوا غیر مرتب ترانے گاتا جا رہا ہے -

" وطن کی یاد مین "[1] مولانا حالی کی طویل نظم " حبِ وطن "[2] کی تقلید اور رنگ مین لکھی گئی ہے - وہی مثنوی کی ہیئت ، وہی مسرت و فراق کی فضا ، یارانِ وطن کی وہی یاد، البتہ دونون شاعرون کے لہجے کا فرق واضح ہے - حالی کی نظم مین غیر معمولی طوالت ، دھیما پن اور سلاست ہے اور غمگینی کی فضا نسبتاً زیادہ ہے - جبکہ ماہر کی نظم مین اختصار و جامعیت ہے اور اداسی کے ساتھ ساتھ شوخی اور تیزی کا ایک خاص ماحول غالب ہے - ماہر اپنے وطن کی حسین فضاؤن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہین ، چاندنی راتون مین احباب کی محفلون ، موسم برسات مین باصری کے نغمون ، جاڑون مین الاؤ کے کنارے دوستون کی خوش گپیون کو یاد کرتے ہین ، قدرتی مناظر کی یاد تازہ کرتے ہین اور اخیر مین دکن کے جان نواز ماحول کے باوجود اپنی اداسی اور وطن سے دور ہونے کی بنا پر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہین - اس اشعار پر مشتمل یہ ایک کامیاب مثنوی ہے اور متاثر کرتی ہے -

" بغداد کے چمن مین ایک شام " غالباً اُس دور کی یاد ہے ، جب ماہر نے مولانا عبدالقدیر بدایونی کی معیت مین عراق کی سیاحت کی تھی اور جس کا ذکر بابِ اول مین کیا جا چکا ہے - اس مین اصل تذکرہ تو " عراقی نازنینون " کے " ہجوم" کا ہے جو شام سے پہلے ایک باغ مین محوِ خرام تھین ، لیکن نظم کے آغاز مین باغ کے دلکش مناظر کی بھی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے - اس طرح حسنِ فطرت اور حسن نسوانی کے ساتھ شاعر کے احساسات گھل مل کر عجیب کیف و سرخوشی کی فضا بنا دیتے ہین ---

---

۱- نغماتِ ساحر - ص ۹۲

۲- دیکھئے کلیات نظمِ حالی جلد اوّل - مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۸ء ، ص ۳۹۱ -

جس طرف دیکھو جمالِ رنگ و بو تھا آشکار ۔،
پتیاں ، سبزہ ، شگوفے ، اوس کے قطرے ، بہار
ہر روش پر مضمحل دل کی کلی کھلتی ہوئی
شام سورج کی شعاعوں سے گلے ملتی ہوئی
نغمۂ صد عیش تھا شورش شگوفوں کا سکوت
پتی پتی دے رہی تھی سکر و مستی کا ثبوت
تھی چمن کی اجتماعی شان و شوکت دیدنی
زندگی ، مستی ، جوانی ، حسن ، نغمہ ، تازگی

اور ان صد رنگ مناظر کے نتیجے میں شاعر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ۔۔

دل سے یکسر ہو گئے تھے محو سب اندوہ و غم
یاسمین کے پھول کی سوگند ، نرگس کی قسم ،

ماہر نے کبھی بھی مشاہدہ کائنات سے آنکھیں بند نہیں کیں ۔ زندگی اور کائنات سے ان کی دلچسپی برابر قائم رہی اور خصوصاً مناظرِ فطرت سے وہ حصولِ مسرت کے علاوہ دانش آموزی اور نصیحت پذیری کا کام بھی لیتے ہیں ۔ وہ خوبصورت اور حیرت ناک مناظر دیکھتے ہیں تو انہیں بے اختیار خالقِ کائنات کی بے مثال صنعت گری یاد آتی ہے ۔ " بہار " اور " تتلی " میں عبرت پذیری اور یادِ خداوندی کی جھلکیاں دیکھی جا چکی ہیں ، آئیے اسی ضمن میں ان کی ایک نظم "حُسن"[۱] پر نگاہ ڈالتے جائیں کہ اس میں شاعر کو کائناتِ رنگ و بو میں حُسن ہی حُسن نظر آتا ہے ، وہ اس کے مختلف مظاہر سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کی سلامتِ فکر اسے خالقِ حسن تک لے جاتی ہے

۱۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۸۳

دس اشعار کی یہ نظم فنی اعتبار سے مکمل اور فکر انگیز ہے ---

حسن ہے سارا جہان ذوق تماشا کی قسم،
زلفِ لیلیٰ کی قسم ، عارضِ سلمیٰ کی قسم

شاہدِ حسن کی ایک موجِ تبسم ہے سحر
چاند سورج کی قسم ، عقدِ ثریا کی قسم

حسن ہر رنگ میں اک شان نئی رکھتا ہے
شامِ فرقت کی قسم ، صبحِ تمنا کی قسم

اخیر میں شاعر دعا کرتا ہے جس سے اس کی راست فکری کا اندازہ ہوتا ہے ---

چشمِ ماہر کو بھی اب حُسنِ بصیرت سے نواز
حُسن والے تجھے اپنے رُخِ زیبا کی قسم

ماہر کی ملّی اور تاریخی نظمیں :

اردو میں ملّی اور تاریخی منظومات کا سلسلہ مولانا حالی کی مسدّس "مد و جزرِ اسلام" سے شروع ہوتا ہے جو اس سلسلے کی پہلی اہم کڑی اور دورِ اصلاح کی عہد آفرین نظم ہے - اس میں شاعر نے اسلامی تاریخ کے روشن ماضی کے پُرتاثیر مرقع پیش کر کے اپنے زمانے کے درماندہ حال مسلمانوں کو اپنی حالت پر غور کرنے کی دعوت دی - مسدّسِ حالی سے متاثر ہو کر بعض دوسرے شاعروں نے بھی تاریخی اور ملی نظمیں لکھنی شروع کیں - شوق قدوائی کی مسدّسِ قومی (۱۸۸۹ء) ، نظم طباطبائی کا ساقی نامہ (خطاب بہ اہلِ اسلام) صفی لکھنوی کی قومی نظمیں اور اسمٰعیل میرٹھی کی چند نظمیں خصوصاً "آثارِ سلف (۱۸۸۹ء) اس سلسلے میں شمار کی جا سکتی ہیں - شبلی نعمانی کے تاریخی شعور اور ملی جذبے نے اس سلسلے کو بڑی تقویت پہنچائی - شبلی کو اسلامی تاریخ سے والہانہ محبت تھی اور وہ مسلمانوں کے روشن ماضی کی عظیم الشان روایات اور قابلِ فخر کارناموں

کو دنیا کے سامنے پیش کر کے دشمنانِ اسلام کے مختلف الزامات کا جواب بھی دینا چاہتے تھے ۔[1]

شبلی کے بعد علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان نے ملی شاعری کو اوجِ کمال پر پہنچایا بقول مولانا سید ابو الحسن علی ندوی "عالم اسلامی نے اس سو سال میں جدید طبقہ میں شاید اقبال سے بڑا کوئی دیدہ ور پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ عصرِ حاضر کے مشرق کے سب سے بڑے مفکر و فلسفی ہیں"[2] جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے پوری امامت خصوصاً ملتِ اسلامیہ کو تجدید و احیائے دین کا انقلابی پیغام دیا ۔ چنانچہ ان کی نظمیں جہاں موضوعات کے اعتبار سے منفرد و یکتا ہیں وہاں فنی / نقطۂ نظر سے بھی وہ بہترین خصوصیات کی حامل ہیں ۔[3] بقول ڈاکٹر سید عبداللہ اقبال کی تاریخی نظمیں جوش انگیزی سے زیادہ حکمت آموزی اور بصیرت افروزی کے مقصد سے لکھی گئی ہیں[4] ۔

مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء - ۱۹۵۶ء) قادر الکلامی میں یقیناً بے مثل تھے ۔ انہوں نے سیاسی ، قومی ، مذہبی اور ہنگامی موضوعات پر بے شمار نظمیں لکھیں جو عموماً زمیندار میں چھپتی تھیں اور بڑی برصغیر میں پسند کی جاتی تھیں ۔ آغا شورش کاشمیری کے الفاظ میں " ہر شعری میدان میں ان کا شبدیز قلم بگٹٹ نظر آتا ہے ۔ جتنے اصنافِ سخن ہیں سب ان کے پامال ہوئے ہیں ۔ وہ شعر کہتے کہاں ، لٹاتے تھے ۔ ہر بحر میں انہوں نے طبع آزمائی کی ۔ وہ اپنی خصوصیت کے ایک ہی شاعر ہیں جن کی نعتیں، نظمیں اور ہجویں قومی رضاکاروں سے لے کر سیاسی رہنماؤں تک کا طرۂ خطابت بنی رہی ہیں "[5] ۔

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، " ظفر علی خان ادیب و شاعر " ، مکتبۂ خیابانِ ادب لاہور ۔ ۱۹۶۷ء ، ص ۱۷۱ ۔

۲۔ " نقوشِ اقبال " مولانا ابو الحسن علی ندوی ، مجلس نشریات اسلام کراچی ، ۱۹۷۳ء ، ص ۷۱ ۔

۳۔ ڈاکٹر عبدالمغنی ، " نقطۂ نظر --- کتاب منزل پٹنہ (بھارت) ۱۹۵۶ء ، ص ۲۲۶ مضمون " اقبال کا فن " ۔

۴۔ سخنور نئے اور پرانے جلد دوم ۔ ص ۱۲۲

۵۔ شورش کاشمیری ، ظفر علی خان ۔ مطبوعاتِ " چٹان " لاہور ۔ س ۔ ن ، ص ۱۲۲ ، ۱۲۵

ماہر القادری نے ادبی مواہیر کی شعری روایت کو آگے بڑھایا اور متعدد ملی اور تاریخی نظمیں تخلیق کیں ۔ خصوصاً وہ شبلی اور اقبال سے بےحد متاثر تھے ۔[1] خدا نے انہیں اس ملی درد مندی ، تاریخی شعور اور بصیرت و حکمت سے بھی نوازا تھا جو شبلی اور اقبال کا طرّۂ امتیاز تھا ، چنانچہ ان کی تاریخی اور ملی نظموں میں جگہ جگہ ان دونوں بزرگوں کی فکر کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے ۔

ماہر کی ملّی نظموں میں میں اس حمد کا ذکر سب سے پہلے کروں گا جو " محسوسات ماہر" میں " فرض اولین " کے عنوان سے سرفہرست ہے ۔ اس میں اللہ تبارک و تعالی کی حمد و ثنا کی گئی ہے اور اقبال کے فکری لب و لہجے میں اللہ کی رحیمی و کریمی ، شوکت و جبروت اور اس حوالے سے کائنات کے عالمِ حیرت کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ؎

ارے یہ کس کی تجلّی نے کر دیا مدھوش
نگاہ محوِ تحیّر ، زبان ہے خاموش ،

حرم کی راہ سے گزرا ہے قافلہ دل کا
وہاں بھی عالمِ حیرت ، وہی فضائے خموش

مشاہدہ بھی تجلّی سے خاک ہو جاتا
بھلا ہوا وہ نگاہوں سے ہو گئے روپوش

کہا جو دل نے مرے لا الٰہ الا اللہ
کسی کے جلوۂ رحمت نے کھول دی آغوش ۔[2]

" ذبحِ عظیم " ٢٠ شعروں پر مشتمل ایک خوبصورت ، مثنوی اور بامقصد ملّی نظم ہے ۔ اس میں دعوت و عزیمت کے حوالے سے ان قدسی صفت حضرات کی قربانیوں کا ذکر ہے جنہوں نے اپنا خون دے

١۔ انٹرویو چراغ راہ مئی جون ۶۵ء ۔ ص ٢٠ ، ٢١

٢۔ محسوساتِ ماہر ۔ ص ١٩ ، ٢٠

کر شجرِ اسلام کی آبیاری کی ۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی پوری تاریخ قربانی اور شہادت سے عبارت ہے ؎

ملتِ بیضا کی عظمت صرف قربانی میں ہے
لذّتِ آبِ بقا ، تلوار کے پانی میں ہے

اور اس ضمن میں شاعر نے جو مثالیں دی ہیں اور تاثراتی انداز میں اپنے موقف کی جس طرح وضاحت کی ہے ، اس کی چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں ؎

بام و در پر جو نظر آتی ہیں یاں رنگینیاں
سُورِ عینِ مُصطفےٰؐ کے خون کی ہیں جھلکیاں

ابرِ نیساں ہے یہاں پر خونچکاں حنبلِ دربند
بلبلیں گاتی ہیں یاں افسانۂ خونِ شہید

اسوۂ غازی کے زخموں کے یہاں فانوس ہیں
یاں کے رہنے والے دردِ عشق سے مانوس ہیں[1] ۔

" افغانی نوجوان " اگرچہ ایک الگ نظم ہے ، مگر اس کا تعلق بھی دراصل تاریخ دعوت و عزیمت ہی سے ہے ۔ یہ ایک زندہ نظم ہے جو آج کے شہرۂ آفاق افغان مجاہد کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے اور اس کی سادگی ، درویشی مگر تہوّر و شجاعت اور دینداری کا جیتا جاگتا مرقع پیش کرتی ہے ؎

دل قوی ، چہرے پہ شادابی ، نگاہیں مطمئن
جا رہا ہے حرّیت کا صور پھونکتا ہوا

چل رہا ہے پتھروں کے راستہ پر تیز تیز
ہر نفس میں ایک تازہ زندگی پاتا ہوا

ملگجی ٹوپی ، پھٹے جوتے ، گریباں تار تار
چل رہا ہے پھر بھی اِک دنیا کو ٹھکراتا ہوا

۱۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۷۲

قبلہ رو ہو کر کھڑا وہ ہو گیا بہرِ نماز
عظمتِ اسلام کی تاریخ دہراتا ہوا [1]

" مشرقی خاتون " [2] میں ایشیائی (مسلمان) خاتون کی عفت و عصمت ، وفا و ایثار اور حیا و پاکیزگی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اور اسے مغربی تہذیب کی یلغار سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے ۔۔۔

یہ دیکھ شعلہ مغربی تہذیب غیرت سوز کا
وہ تیری جانب بڑھا للہ دامن کو بچا

یہ ایک خوبصورت پاکیزہ نظم ہے جس میں ایک طرف مشرقی اسلامی تہذیب پر بے پناہ اعتماد کا اظہار ہوتا ہے جبکہ دوسری جانب مغربیت کے اصالت سوز اطوار کی تنقیص کی گئی ہے۔

" مسلمانانِ سرحد اور اہمسا " [3] ایک فکر انگیز تاریخی اور سیاسی نظم ہے ۔ سرحد کے بہادر، شجیع مسلمانوں میں خان عبدالغفار خان نے گاندھی جی کی تقلید میں اہمسا کی تحریک چلائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ انگریز سامراج کے خلاف عملی جہاد کا انداز ترک کر کے پُرامن ذرائع (برت وغیرہ) سے آزادی کی تحریک چلائی جائے گی ۔ ماہر نے اس نظم میں اس روش پر سخت گرفت کی ہے اور اہمسا کے فلسفے کو دراصل مسلمانوں کے خلاف ایک ہندو سازش سے تعبیر کیا ہے۔ اس نظم سے ماہر کی سیاسی بصیرت اور فکری پختگی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہ ایک کامیاب نظم ہے جس پر اقبال کی لفظیات کا خاصا اثر ہے ۔۔۔

اس کو کہتے ہیں اہمسا مکر کی تہذیب میں
شیر کو بکری بنا سکتا ہے جو سحرِ حلال

۱۔ محسوساتِ ماہر ۔ ص ۷۳
۲۔ ایضاً ۔ ص ۸۵
۳۔ ایضاً ۔ ص ۸۹

روحِ ملت قتل ہوتی ہے وطن کے نام پر،
کفر کی جھوٹی روا داری نے پھیلایا ہے جال

جس جبین پر خون کی سرخی سے آتی ہے بہار
اس جبین پر مل رہے ہیں لوگ ہولی کا گلال

اخیر میں اقبال اور شبلی کے اسلوب میں ماہر اپنا فیصلہ سناتے ہیں اور ملت اسلامیہ کے لئے گاندھی کو نہیں بلکہ محمد رسول اللہؐ اور ان کے اصحابؓ کو تقلید و پیروی کا نمونہ قرار دیتے ہیں ـــ

فاتحِ کون و مکان ہے جذبۂ عشقِ رسولؐ
کچھ نہیں ہوتا یہاں بے گرمیٔ سوزِ بلال

۱
"جدید ہندوستان" برصغیر کے اُس سیاسی و تاریخی تناظر میں لکھی گئی ہے جب یہاں آزادی کا جذبہ بھرپور کروٹ لے کر بیدار ہو گیا تھا - نظم ترکیب بند ہے، پانچ بندوں پر مشتمل ہے اور اس میں سامراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جادۂ حرّیت پر گامزن نوجوانوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور برطانوی استعمار کی ذلت و شکست کی پیش گوئی کی گئی ہے - نظم کا لہجہ رجزیہ اور اسلوب استعارے کا ہے - شاید اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر ان دنوں حیدر آباد دکن میں مقیم تھا جہاں مثبت معاشرتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ سیاسی گھٹن بہرحال عام تھی -

----

۲
"دنیا کا مستقبل" میں تقسیمِ برصغیر سے بہت پہلے، شاید پاکستان کی صورت میں، شاعر ایک مثالی اسلامی دور کا خواب دیکھتا ہے ـــ

سارے عالم کو دیا جائے گا درسِ حرّیت،
ساری دُنیا ایک ہی مرکز پہ لائی جائے گی

۱- محسوسات ماہر - ص ۱۰۰
۲- ایضاً - ص ۱۲۰

تاہم اس نظم میں " خونیں انقلاب " کی بات کچھ جچتی نہیں ہے - اسلام کا " خونیں انقلاب " سے کیا تعلق ؟

آنے والا ہے جہاں میں ایک خونیں انقلاب
آگ ہر عشرت کسی محفل کو لگائی جائے گی

ماہر نے شبلی کی تاریخی نظموں پر خاصا اضافہ کیا ہے - ان کا ذہن وقتاً فوقتاً اسلام کے شاندار ماضی کا احاطہ کر لیتا ہے اور وہ شوکتِ اسلامی کی داستانیں قلم بند کرنے لگتے ہیں - انہوں نے یہ واقعات اختصار کے ساتھ اور دلنشیں پیرایے میں اس طرح بیان کئے ہیں کہ اسلام کی سادگی ، سچائی اور معاشرتی انصاف کے جوہر اور مسلمانوں کی حریت و جذبۂ شہادت نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں اور ان کا مثالی اخلاق و کردار قاری کے لئے سرمۂ بصیرت بن جاتا ہے -

" مجاہدینِ اسلام "[1] گیارہ الگ الگ حصوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے اس کے ۵۵ اشعار ہیں اور اس میں سیّدنا عمر فاروقؓ ، حضرت خالد سیف اللہؓ ، طارق بن زیادؒ ، محمد بن قاسمؒ ، محمود غزنویؒ ، صلاح الدین ایوبیؒ ، سلطان ٹیپو شہیدؒ ، غازی انور پاشاؒ ، سعد زاغولؒ ، علامہ جمال الدین افغانیؒ اور مولانا محمد علیؒ جوہر کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے - ساری نظم تاثراتی ہے - شاعر سب مشاہیر کے حالات اور کردار سے بخوبی آگاہ ہے اور اس نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ ان کے عظیم کارناموں کی تحسین کی ہے - اسلوب رجزیہ اور بلند آہنگ ہے جو روح پرور ہے اور یقین افروز بھی ، مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ کہیں مبالغے کی رمق نظر نہیں آتی ، نہ کہیں تصنع یا آورد کا شبہ ہوتا ہے - شاعر قدرتِ کلام رکھتا ہے - تلمیحات کے برمحل استعمال اور زورِ کلام نے نظم میں خاص تاثیر پیدا کر دی ہے - شاعر عصری شعور بھی رکھتا ہے اور حالات کی موجودہ نہج کے تناظر میں متذکرہ شخصیات کے کردار کی ضرورت کا

۱- نغمات ماہر - ص ۲۱

اظہار کرتا چلا جاتا ہے ۔

" مسلمان سے " [1] تیس اشعار پر مشتمل ایک ولولہ انگیز مثنوی ہے جو بھرپور تاثر کی حامل ہے ۔ اس میں دینی تعلیمات خصوصاً " نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں مسلمان کو اس کی زندگی کا اصل مقصد بتایا گیا ہے جو شاعر کے الفاظ میں یوں ہے ؎

کفر ہے مذہب میں تیرے عشرتِ دُنیائے دوں
وقت ہونا چاہئے حق کے لئے مسلم کا خون

تلمیحات کے حوالے سے شاعر نے تاریخِ اسلام اور سیرت النبیؐ سے فقر و استغنا ، عدل و مساوات اور حریت و شہادت کی مثالیں دی ہیں جو خاصی متاثر کرتی ہیں ۔ شاعر برملا غلامی کی مذّمت کرتا ہے اور اس سے گلو خلاصی پر ابھارتا ہے ؎

اُنؐ کے بستر کا ذرا کلفت فزا عالم بھی دیکھ
حضرت فاروق کی پھر اس پہ چشمِ نم بھی دیکھ
مسجد نبوی میں آ انبارِ مال و زر بھی دیکھ
اور پھر جا مادرِ حسنینؓ کی چادر بھی دیکھ

محکومیت کی مذمت کے ساتھ ساتھ شاعر مسلمان کو جادۂ آزادی پر گامزن ہونے کی دعوت یوں دیتا ہے ؎

دورِ محکومی بنا دیتا ہے ایمان کو ضعیف
حریّت سے ہے عبارت عظمتِ دینِ حنیف
خانقاہوں کے سکونِ راحت افزا سے گزر
یعنی پھر لبیّک کہہ تلوار کی جھنکار پر
خاکِ آزادی سے محکومی کے دریا پاٹ دے
یعنی تو نخلِ غلامی کی جڑوں کو کاٹ دے

۱۔ نغمات ماہر ۔ ص ۶۵

" منکرِ وحی سے خطاب " [۱] میں ماہر نے ایک ایسے شخص کے خیالات کی تردید کی ہے جو وحی اور کلامِ الہٰی کا منکر ہے اور یورپی مصنفین کی کورانہ تقلید میں رسالت کی نام نہاد تحلیل نفسی کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ماہر اس کے خیالات کے پھسپھسے پن پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور صنعتِ تضاد سے کام لیتے ہوئے معروف نوعیت کے مثبت عقاید اور مخاطب کے منفی نظریات کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں ۔ اخیر میں کہتے ہیں :۔

تری خرد نے یقیناً فریب کھایا ہے
کلامِ حق کو کلامِ بشر سمجھتا ہے
تیرے ضمیر کو لذّت نہیں یقین کی ہے
نگاہِ غیر سے قرآن کو تو نے دیکھا ہے

تاریخی اور ملّی نظموں کی ذیل میں ان نظموں کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے جو ماہر نے صحابہ کرامؓ اور خاندانِ نبوت کی منقبت اور مختلف شاہیر کی تعریف میں رقم کیں ۔ ان میں جو شخصیات شامل ہیں وہ یہ ہیں :

منقبت حضرت ابو بکر صدیقؓ (فاران فروری ۶۶ء ص ۳۱) منقبت حضرت عمر فاروقؓ (فاران جون ۶۵ء ص ۱۳ و فروری ۷۷ء ص ۳۰) منقبت حضرت عثمان غنیؓ (فاران جون ۶۵ء ص ۱۴) منقبت حضرت علیؓ (فاران اپریل ۵۶ء ص ۳۱ و جون ۷۵ء ص ۲۷) منقبت حضرت حسینؓ (فاران اکتوبر ۵۶ء ص ۳۳ و نومبر ۵۷ء ص ۲۳ و اکتوبر ۵۹ء ص ۳۵) شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (فاران نومبر ۴۲ء ص ۳۵) قائد ملت نواب بہادر یار جنگ (فردوس ص ۸۳) امام حسن البنا شہید (فردوس ص ۲۰) سید ابو الاعلیٰ مودودی (فردوس ص ۵۳) شاہ فیصل شہید (فاران اکتوبر ۷۷ء ص ۳۳) عبدالمالک شہید (فاران دسمبر ۶۹ء ص ۶۲) امیر مینائی (جذباتِ ماہر ص ۱۸) علامہ اقبال پر تین نظمیں ان کے علاوہ ہیں ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا ۔

۱۔ نغمات ماہر ۔ ص ۶۵

یہ امر خاص طور پر قابلِ قدر ہے کہ ماہر کو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خاندانِ نبوت سے بے حد عقیدت اور محبت ہے۔[1] مثال کے طور پر سیدنا امام حسینؓ کے بارے میں موصوف نے مختلف وقتوں میں تین اور سیدنا عمر فاروقؓ اور علی مرتضےؓ کی منقبت میں دو دو نظمیں لکھیں اور بڑے ہی والہانہ انداز میں ان کے حضور نذرانۂ محبت پیش کیا ہے۔

ظاہر ہے یہ سب نظمیں ان شخصیات پر ہیں جن سے ماہر خصوصی عقیدت رکھتے تھے، اس لئے ان نظموں میں محبت اور احترام کی خاص فضا دکھائی دیتی ہے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماہر نے اپنے جذبات کے اظہار میں کہیں غلو یا مبالغے سے کام نہیں لیا۔ ماہر ان سب بزرگوں اور افراد کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں اور اپنے تاثر کو بڑی جامعیت، سلیقے اور فنی چابکدستی سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ عقیدت اور مقصدیت نے فنی تقاضوں کو مجروح نہیں کیا اور شعریت کے تقاضے کہیں پامال نہیں ہوئے۔ اس اعتبار سے یہ نظمیں فن اور مقصدیت کا خوبصورت امتزاج ہیں:

مثال کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

حضرت ابو بکر صدیق :-

وہ ایمان سراپا یقین مجسّم۔ نبی کی رسالت کی پہلی شہادت —،
خدا ان سے راضی، وہ راضی خدا سے ، نبی نے بھی جنت کی دی تھی بشارت
سیاست مگر عین منشاءِ یزداں، دماغوں پہ قبضہ، دلوں پہ حکومت [2]

۱- ایک نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو — یہ صدیق ہوں، فاروق کہ عثمان و علی ہوں
یہ لوگ تو اللہ کی آیاتِ جلی ہیں
(فاران جون ۶۵ء ص ۱۲)
ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں — اسلام کو ہے ناز شہیدوں کے لہو پر —،
کھیتی اسی پانی سے یہ سیراب ہوئی ہے
(محسوسات ماہر ص ۹۱)

۲- فاران فروری ۶۶ء ص ۳۱

حضرت فاروق اعظم :-

الله رے فراستِ مومن کا ارتقاء ، — رائے عمر مطابقِ وحی و کتاب ہے
خادم سوار اور خلیفہ پیادہ پا ، — اس حُسنِ سادگی کا بھلا کیا جواب ہے
وہ زندگی کہ جس پہ فرشتوں کو رشک آئے — اور اس پر آخرت کا غم بےحساب ہے [1]

حضرت عثمان غنی :-

یہ جامعِ قرآن ہیں ، عثمانِ غنی ہیں — اللہ کے مقبول ہیں ، محبوبِ نبی ہیں
اے جانِ وفا یثرب و حبشہ کے مہاجر — راہیں تری قدموں کے نشاں ڈھونڈھ رہی ہیں
امت کے امین ، خویشِ نبی ،صاحبِ نورین — یہ نسبتیں ، یہ عزتیں اللہ نے دی ہیں [2]

سیدنا علی مرتضیٰؓ شیرِ خداؓ

وہ عبادت ہو ، شجاعت ہو فصاحت ہو کہ علم — واقعہ یہ ہے کہ ہر وصف میں یکتا ہیں علیؓ
ذکر سے ان کے طبیعت کو سکون ملتا ہے — آنکھ کا نور علیؓ ، دل کا اجالا ہیں علیؓ [3]

سیدنا امام حسینؓ :

ہجومِ غم میں بھی توفیق مسکرانے کی — حسینؓ ہی کی طرف تھی نظر زمانے کی
یہ منزلت ہے ، یہ توقیر اس گھرانے کی — بنی ہے خاکِ شفا خاک اس آستانے کی
مرے حسینؓ جہاں کے حسینؓ سب کے حسینؓ — رضائے دوست ہے سرخی ترے فسانے کی - [4]

السلام اے سکونِ دلِ فاطمہؓ — السلام اے محمدؐ کے نورِ نظر
ہے سعادت کی منزل ترا نقشِ پا — ہے ہدایت کا رشتہ تری رہگذر

۱- فاران جون ۱۹۶۵ء ، ص ۱۲
۲- ایضاً - ، ص ۱۲
۳- ایضاً - جون ۱۹۷۵ء ، ص ۲۷
۴- ایضاً - نومبر ۱۹۵۷ء ، ص ۳۳

اک غریب و تہی دست کی عذر کیا — بس یہی اشک ہیں میرے لعل و گہر
اے قتیلِ جفا ، اے شہیدِ وفا — فتحمندی کا سہرا رہا تیرے سَر ۔ [1]

مجاہد کبیر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے حضور بھی ماہر نے بڑے پُرجوش انداز میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے ۔ یہ نظم خاص زورِ بیان رکھتی ہے اور مندرجات کے اعتبار سے بڑی روح پرور ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :۔

ترے اوصاف کیا کہنا مجدد بھی ، مجاہد بھی ،
امامِ وقت بھی اور جیشِ اسلامی کا قائد بھی
مفسّر بھی ، مبلّغ بھی، خدا آگاہ زاہد بھی
کہ تو آمر بھی تھا ، مامور بھی، مشہود و شاہد بھی،
ترا وہ عزمِ محکم جو چٹانوں کے مقابل تھا
عزیمت سے تری جھیلے مصائب بھی شدائد بھی
تقاضا ہے عقیدت کا کہ تجھ کو محترم کہئے
شہیدِ راہِ حق اور صاحبِ سیف و قلم کہئے ۔ [2]

نواب بہادر یار جنگ ایک جامع الصفات دینی و سیاسی رہنما تھے ۔ ان کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا اور ماہر کے ان سے گہرے تعلقات تھے ۔ مجلسِ اتحاد المسلمین کے جلسوں میں نواب صاحب کی تقریر کے ساتھ ماہر کی نظم جزوِ لازم کی حیثیت اختیار کر گئی تھی ۔ نواب صاحب کی ناگہانی وفات (۱۹۴۴ء) کے بعد ماہر صورت حالات سے بد دل ہو کر حیدر آباد سے نکل آئے ۔ ذیل کی نظم میں نواب صاحب مرحوم کی عظمتوں کو سلام بھی کیا گیا ہے اور ان کی وفات پر رنج و الم کا اظہار بھی ہے ۔ آٹھ آٹھ اشعار پر مشتمل تین بند کی یہ نہایت پُرتاثیر اور درد انگیز نظم

۱۔ فاران اکتوبر ۱۹۵۹ء ، ص ۳۸

۲۔ ایضاً ۔ نومبر ۱۹۷۳ء ، ص ۳۵

اردو کے جدید مرثیوں میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے ۔ طوالت کے خوف سے صرف پانچ اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

جس کے نغموں نے خزاں میں پھونک دی روحِ بہار
باغ سے وہ بلبلِ شیریں نوا جاتا رہا ،

نبضِ ملت پر رکھے گا کون اپنی انگلیاں
درد باقی رہ گیا درد آشنا جاتا رہا ،

کس کی باتیں اب ہماری محفلیں گرمائیں گی
وعظ و تفسیر و خطابت کا مزا جاتا رہا

ہائے وہ رکعت کہ جو پوری نہ ہو کر رہ سکی
مقتدی سجدے میں تھے اور مقتدا جاتا رہا

اک مجاہد ، اک قلندر ، اک مسلماں اٹھ گیا
ایک شیدائے محمد مصطفےٰؐ جاتا رہا [1]

ماہر نے مصر کے مجاہد کبیر امام حسن البنّا شہید (سن شہادت ۱۹۴۹ء) کے حضور میں بھی ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے ۔ امامِ موصوف نے دعوت و عزیمت کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ، وہ عہد حاضر کی تاریخ کا ایک روح پرور باب ہے [2] ان کے بے مثل کردار اور شہادت کے حوالے سے ماہر اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

کبھی خارا شگافی کی ، کبھی آئینہ سازی کی ،
کہ تو میدان کا غازی بھی تھا مسجد کا نمازی بھی

۱۔ " فردوس " ص ۸۵
۲۔ دیکھئے دیباچہ حسن البنّا شہید کی ڈائری از (مترجم) خلیل احمد حامدی ، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ، اشاعت اول اپریل ۱۹۷۴ء ۔

تری کردار میں تھا امتزاجِ شعلہ و شبنم
سراپا سعئ پیہم بھی، مجسم پاکبازی بھی
یقین کی آتشِ خاموش کو بھڑکا دیا تو نے
کہ سوئی نوجوانوں کا لہو گرما دیا تو نے
خرد کہتی رہی ٹھہرو بہت نازک زمانہ ہے
سفینہ کو مگر طوفان سے ٹکرا دیا تو نے ۔[1]

سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فیصل شہید بھی عہدِ حاضر کی تاریخ میں اپنی درویشی، متقی، خدا خوفی اور عوام پروری کے اعتبار سے خاص قدر و منزلت رکھتے ہیں ۔ موصوف نے خصوصاً اتحادِ عالمِ اسلامی کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں ، وہ ہمیشہ یاد رہیں گی ۔[2] ماہر شاہ فیصل شہید سے بھی گہری عقیدت رکھتے تھے ۔[3] چنانچہ ان کی شہادت (۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء) کے حوالے سے انہوں نے شہید بادشاہ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ یہ نظم مثنوی کی چھوٹی بحر (ساقی نامہ کے اسلوب) میں ہے اور بلا کا تاثر رکھتی ہے :۔

وہ مردِ حق آگاہ روح سعید ، وہ ملت کا غم خوار فیصل شہید
وہ انسان جو خیرِ مسلسل بھی تھا ، وہ فیصل بھی تھا ، قولِ فیصل بھی تھا
وہ شعلہ بھی تھا اور شبنم بھی تھا ، وہ اپنی جگہ عزمِ محکم بھی تھا ۔[4]

ماہر القادری کو عہدِ حاضر کے عبقری ، ستارِ عالمِ دین ، مفکّر اور مفسّرِ قرآن مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی سے بھی بے حد عقیدت تھی انہوں نے موصوف محترم کے کردار اور اوصاف کی روشنی میں انہیں بھی ہدیۂ تحسین پیش کیا ہے ۔ سولہ اشعار کی اس نظم کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں :۔

۱۔ فردوس ۔ ص ، ۲۰
۲۔ دیکھئے ہفت روزہ "ادا کار" لاہور ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء فیصل اعظم نمبر مدیر مجیب الرحمن شامی ۔
۳۔ اداریہ فاران مئی ۱۹۷۵ء ، ص ۳
۴۔ فاران اکتوبر ۷۷ء ص ۳۳

تیری فکرِ رسا نے خاک کے ذرّوں کو چمکایا
کہ تُو سچ مچ فلک سے چاند تارے توڑ کر لایا

تری فطرت میں ہے سنجیدگی بھی ، استقامت بھی
مسرت میں نہ اترایا ، مصائب میں نہ گھبرایا

تیری تحریر کا ہر لفظ خود روشن شہادت ہے
کہ تو نے کس قدر دشوار تر عُقدوں کو سُلجھایا

تری تقریر پیر اردو زبان صد آفرین بولی
نگارش پر تیری حسنِ ادب نے ناز فرمایا

تیری سود و زیاں کا ہے رضائے دوست پیمانہ
کہ تو نے ہر قدم پر شوکتِ باطل کو ٹھکرایا ۱ -

سقوط بیت المقدس پر بھی ماہر کی نظم ایک اہم ملّی مرثیہ ہے جس میں شاعر گویا خون کے آنسو رویا ہے - رقت ، درد ، سوز اور فریاد میں ڈوبی ہوئی یہ نظم اثر آفرینی اور حقیقت بیانی کے اعتبار سے بڑی کامیاب ہے ، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں - آخری شعر میں ایک حقیقت پسند سچے مسلمان کی سوچ خصوصاً قابل ذکر ہے -

یہ قبلۂ اول یہ عجب وقت پڑا ہے
تکبیر کے نغمے ، نہ موذّن کی صدا ہے

تجوید ، نہ تسبیح ، نہ منبر ، نہ وہ خطبے
خاموش در و بام ہیں ، سنسان فضا ہے

ہیں ارضِ مقدس پہ یہودی متصرف ـــ ،
اے غیرتِ حق ! حشر میں اب دیر ہی کیا ہے

۱- فردوس - ص ۵۳ ، ۵۴

هم آج ہیں تاریخ کے خسود رحم و کسرم پسر
هم وہ تھے کہ تاریخ کا رخ مسوڑ دیا ہسے
بے عیب ہے اللہ کا قانسونِ مسکافات
جو کچھ بھی ہوا اپنے گناہوں کی سزا ہے - [1]

ماہر اور بدسدہ مزدور :
===============

ماہر کی نظموں کا ایک اہم موضوع بندۂ مزدور بھی ہے - ماہر بنیادی طور پر انسان دوست ہیں - وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کا شدید احساس رکھتے ہیں اور حریت و اخوت کے ساتھ ساتھ وہ مساوات اور عدل کو عزیز رکھتے ہیں - وہ انسانی معاشرے سے ظلم و زیادتی ، مفاد پرستی اور بدعنوانی کو دور کرنا چاہتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں کمزور ، مفلس اور مظلوم کی ہمدردی کا احساس نمایاں ہے اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ انسان دوستی کا یہ مطمحِ نظر انہوں نے اسلام سے حاصل کیا ہے - وہ ہمعصر ترقی پسند شعراء کے اس منفی احساس سے محفوظ رہے ہیں جو انہوں نے غربت و افلاس کی حمایت میں بالکل بے جا طور پر مذہب اور اخلاقی اقدار کے خلاف روا رکھا ۔ وہ شعوری طور پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر نوع کا ظلم و ستم صرف اس لئے ہو رہا ہے کہ دنیا میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی نافذ نہیں ہے بالفاظ دیگر مذہب غربت و افلاس کا سبب نہیں ہے بلکہ مذہب سے دوری نے ظلم و ستم اور بھوک و ننگ کی فضا عام کسر رکھی ہے - [2]

طبقاتی تفاوت اور مزدور کی حالتِ زار پر ماہر کی پہلی نظم " پھول اور انگارے " ہے - تین حصوں اور ۲۲ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ماہر کا شاہکار ہے جس میں طبقاتی اونچ نیچ پر بڑے ہی دکھ بھرے انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے اور جس میں تاثیر کا یہ عالم ہے کہ نظم کے دوسرے اور تیسرے حصے میں قاری کا دل رقت کی خاص کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اور یہ تاثر نظم کی کامیابی کی

۱- ہمدرد صحت ڈائجسٹ کراچی اکتوبر ۱۹۶۹ء ، ص ۱۷
۲- نغمات ماہر - ص ۳۲

دلیل ہے -

نظم کے پہلے حصے کا عنوان ہے " امیر کا مکان " - اس میں کسی امیر ابن امیر کے دیوان خانے کی آرائش و زیبائش کی تصویر کشی کی گئی ہے - ۲۸ شعروں کے اس حصے میں منظر نگاری اور جزئیات نویسی کا حق ادا کر دیا گیا ہے - ریشمیں پردے ، مخملی قالین ، شربتی فانوس ، جگمگاتے قمقمے ، مرمریں میز اور آرائش کے دیگر بےشمار لوازمات ، پھر نوکروں کی جگمگاتی وردیاں ، کمربستہ غلام ، ندیموں اور مصاحبوں کا حد درجہ مودبانہ اسلوب اور امیر کا پُرنخوت اندازِ نشست و برخاست - غرض اس مکان کے طمطراق اور شان و شوکت کی گویا تصویر کھینچ دی گئی ہے -

اس کے برعکس ، نظم کے دوسرے حصے میں ، ایک غریب مفلوک الحال کسان کے جھونپڑے کا مرقع پیش کیا گیا ہے جو انتہائی بے ترتیبی اور بےچارگی کا مظہر ہے اور جہاں کی ہر چیز سے شکست و ریخت ، کہنگی اور فرسودگی ہویدا ہے - اس کچے گھروندے کے در و دیوار دھوئیں سے سیاہ ہو گئے ہیں اور اسی نسبت سے یہاں کے مکینوں کو بھی سیاہ بختی نے گھیر رکھا ہے - ایک بیمار نحیف بوڑھا کھاٹ پر بیٹھا ہے - بنیے کے قرض اور بیٹیوں کی شادی کے تصور سے ہلکان، وہ نیم جان ہے - بڑھاپے اور بیماری کے باوجود اسے آرام نصیب نہیں اور وہ محنت مشقت کرنے پر مجبور ہے اور اس کی جوان بیٹیاں ہر طرح کی مسرت سے محروم زندگی کی سختیاں جھیل رہی ہیں - پہلے دونوں حصوں میں مشاہدے کی وسعت اور گہرائی قابل داد ہے -

تیسرے اور آخری حصے کا عنوان ہے " خدائے ذوالجلال سے " اس میں شاعر نے اس طبقاتی تفاوت کا شکوہ کیا ہے اور خدا سے فریاد کی ہے کہ امیروں کی عشرت و نخوت اور غریبوں کی کسمپرسی اور بے چارگی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا - اس سے تو خود آپ کی (یعنی خدا کی) ذات معرضِ بحث میں آتی ہے اور نادان لوگ طرح طرح کی منفی باتیں بگھارتے ہیں - شاعر بڑے کرب سے استدعا کرتا ہے :-

ابرِ رحمت میں رہے گی تا بکے برقِ عتاب
نخوتِ دولت کو کب دے گی تری غیرت جواب

تیرا دیہاتی غضب ہوتا نہیں مزاج کیوں ؟
پرچم سرمایہ داری کیا نہ ہوگا سرنگوں ؟
تجھ کو کہتا ہے زمانہ مال داروں کا خدا
ہے تلاطم میں تیری امت خدائی کی فضا
لوگ کہتے ہیں خدا اب دخل دے سکتا نہیں ،
سرکشوں کے ظلم سے بدلہ بھی لے سکتا نہیں
قہر کے پُرشور طوفان کس لئے آتے نہیں ؟
میرے مولا ! مجھ سے یہ طعنے سنے جاتے نہیں ۔[1]

" کمسن مزدور " بھی " نغماتِ ماہر " میں شامل ہے ،[2] اور ۳۶ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی بھی ایک المیہ نظم ہے ۔ ایک کمسن لڑکا بوڑھے باپ کی معذوری اورغریبی کی وجہ سے مزدوری کرنے پر مجبور ہے اور زندگی کی ہر راحت سے محروم ہے ۔ وہ امیر لوگوں کی چہل پہل کے درمیان بازار میں سے گزر رہا ہے ، مگر کوئی اسے التفات کے قابل نہیں سمجھتا ۔ ایک جگہ وہ ہم عمر امیر بچوں کو بےفکری سے کھیلتے ہوئے دیکھتا ہے ، اس کا جی بھی کھیلنے کو چاہتا ہے ۔ وہ وہاں رکتا بھی ہے مگر بوڑھے باپ کے فاقے کو یاد کر کے وہ مزدوری کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا ہے ۔ پھر ایک چوراہے میں لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ کر وہ رکتا ہے جہاں سینما کے اشتہار تقسیم ہو رہے تھے ۔ وہ بھی ایک اشتہار لیتا ہے ، مگر پھر آہ بھر کر اشتہار پھینک دیتا ہے ۔ نو عمر مزدور کی معصوم تمنائیں سینے میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں ۔

یہ مناظر شاعر کو تڑپا دیتے ہیں اور وہ رائج الوقت ظالمانہ نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیتا ہے وہ پیش گوئی کرتا ہے کہ یہ اہانت کش نظام ختم ہوکر رہے گا اور ایک

۱- نغماتِ ماہر - ص ۵۱ ، ۵۲
۲- ایضاً - ص ۶۰

ایسا انقلاب آئے گا جس میں امراء کی عیش و عشرت بھسم ہو کر رہ جائے گی اور مزدوروں اور غریبوں کے دن بھی بدلیں گے - نظم بڑی دردناک اور تاثیر سے بھرپور ہے اور جس مقصد کی خاطر لکھی گئی ہے اسے باحسن پورا کرتی ہے -

ماہر کو موجودہ طبقاتی نظام سے شدید نفرت ہے اور وہ اس کے خلاف تند و تیز جذبات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتے - اس کا سبب شاید یہ ہے کہ اونچ نیچ کا مصنوعی ظالمانہ نظام نہ صرف انسانیت کے لئے نہ در تہ مصیبتوں اور دکھوں کا باعث بنتا ہے ، بلکہ عیّار اور بے عمل لوگ اس حوالے سے خدا و رسول اور ان کی تعلیمات کو بدنام کرتے ہیں - اس لئے ماہر کا خیال ہے کہ اس نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دینا چاہیئے اور اس کی جگہ مکمل اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیئے تاکہ غریبوں کے دلدّر دور ہوں اور دنیا میں ایک پاکیزہ صالح انقلاب آ جائے - ایک مثنوی (ساقی نامہ) میں اپنے ان خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں :-

پلا ساقیا بادۂ تند و تیز ، عطا کر مرے دل کو عزمِ ستیز
نگاہوں سے آتش فشانی کروں ، غریبوں کی میں ترجمانی کروں -،
الٹ دوں امارت کی رنگِ بساط زمانہ پہ کھل جائے رازِ نشاط
غریبوں کو جینے کا پیغام دوں امیروں سے ذوقِ طرب چھین لوں
امیری رہے اور نہ شاہی رہے نہ یہ عظمتِ خانقاہی رہے
جہاں میں مساوات کا دور ہو زمانہ کی آب و ہوا اور ہو
غلامی کے جنجال سے چھوٹ جائیں بنائی ہوئی سب حدیں ٹوٹ جائیں

زمانہ کی ہر مشکل آسان ہو
خدا کی حکومت کا اعلان ہو -[1]

فنی اعتبار سے بھی یہ نظم یوں کامیاب ہے کہ موضوع اور جذبات کی نسبت سے بحر میں اختصار

۱- " فردوس " ص ۲۷

کے ساتھ ساتھ تندی اور روانی ھے اور رجز اور انقلابیت کی گونج اشعار میں صاف سنائی دیتی ھے جو قاری کی رگوں میں بھی خون کو تیز کر دیتی ھے۔

ماھر نے اپنی ایک نظم " انقلاب زندہ باد "[1] میں جس انقلاب کا خواب دیکھا ھے اس میں بھی انہیں اس طرح کے مناظر دکھائی دیتے ھیں ؎

کشتیٔ زر ، سفینۂ دولت — ، آ کے ساحل پہ ھو گئے غرقاب
دستِ مزدور میں ھے دامنِ شاہ جیسے سچ مچ ھے گرم روزِ حساب

اور ایک دوسری " نظم ادھی بھکارن "[2] میں طبقۂ امراء کی عیاشیوں پر غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد اپنی بےحد پاکیزہ اور مقدس حسرت کا اظہار کرتے ھیں ؎

ھم کو وہ قانون اور ایسی حکومت چاھیئے
جس میں اک بڑھیا خلیفہ کا گریبان تھام لے

یہاں اس نظم کا ذکر بھی بےجا نہ ھوگا جس میں براہِ راست مزدور سے خطاب کیا گیا ھے اور اسے الحاد و دھریت کے علمبردار کمیونسٹوں کی چالوں سے محتاط رھنے کا مشورہ دیا گیا ھے ۔ ماھر کی یہ نظم زورِ بیان ، شعریت ، دینی قدروں پر بےپناہ اعتماد اور کمیونزم کے کھوکھلے پن کے اعتبار سے بڑی اھم ھے ۔ تیرہ اشعار کی اس نظم کے چند اشعار دیکھئے ؎

تجھ کو کچھ لوگ ملیں گے جو کہیں گے تجھ سے
آ ادھر آ کہ تیرے غم کا مداوا کر دیں
تیری قسمت کے ستاروں کو تجلّی دے کر
تیری راتوں میں اجالا ھی اجالا کر دیں
تیری کشتی ھے بہت روز سے طوفانوں میں
اس کو ھم عشرتِ ساحل سے شناسا کر دیں

۱۔ " فردوس " ص ٦٦ ۲۔ فردوس ۔ ص ۲۹

روس سے بھوک کی ہم لے کے دوا آئے ہیں ،
اے مریضو ! ادھر آؤ تمہیں اچھا کر دیں
ان کی باتوں میں نہ آنا کہ بنامِ تریاق
زہر کے جام مریضوں کو پلا دیتے ہیں ،
ان کی محفل میں نہ ایمان ملے گا نہ یقین
ان چراغوں کو تو پہلے ہی بجھا دیتے ہیں
صرف روٹی کے مسائل کو نمایاں کر کے
چشمِ انسان سے حقیقت کو چھپا دیتے ہیں
قدرِ اخلاق بدلتے ہیں کبھی قدرِ جمال
زندگانی کو فقط کھیل بنا دیتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں جو سرخ سویرے کے لئے
خونِ مزدور شرابوں میں ملا دیتے ہیں ۔ [1]

ماہر اور تقلید اقبال :

ماہر القادری کو علامہ اقبال سے بے حد عقیدت تھی ۔ وہ لکھتے ہیں کہ " بد وِ شعور ہی سے راقم الحروف علامہ اقبال کے کلام کا مداح رہا ہے ۔[2] اور اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ ماہر اقبال کی شاگردی کی تمنا رکھتے تھے جس کا اظہار انہوں نے اقبال کو ایک خط لکھ کر کیا ،

١۔ " فردوس " نظم " مزدور سے " ص ٣٣ ۔
٢۔ ماہر القادری " رگِ سنگ " قائد اعظم و اقبال نمبر مجلہ گورنمنٹ کالج لورا لائی دسمبر ١٩٧٧ء نگران ڈاکٹر انعام الحق کوثر " مضمون اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات " ۔ ص ٤٣

مگر اقبال نے جواب میں لکھا کہ شاعری کے لئے کسی تلمّذ کی ضرورت نہیں ، اس کے لئے زبان کسی صحت بنیادی چیز ہوتی ہے اور آپ تو خود یوپی کے رہنے والے ہیں [1] - ماہر کو ۱۹۳۲ء میں مولانا عبدالقدیر بدایونی کی معیت میں علامہ اقبال سے اس وقت ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا اور گفتگو بھی ہوئی جب علامہ مرحوم مسلم لیگ کے ایک کوشش میں شمولیت کے لئے دہلی تشریف لے گئے تھے -- ماہر کو اس اعزاز پر اتنا فخر تھا کہ انہوں نے اس کی روداد " فاران " میں بھی شائع کی [2] - اور مجلہ " رگِ سنگ " لورالائی میں بھی اشاعت کے لئے دی -

علامہ اقبال سے ماہر کی عقیدت کا اظہار مختلف انداز سے ہوا ہے - ان کی غزلیات اور نظموں کا خاصا بڑا حصہ اقبال کی تقلید اور انہی کے رنگ میں لکھا گیا ہے (جس کا تفصیلی ذکر اس باب کا موضوع ہے) اور نثر میں بھی انہوں نے مختلف وقتوں میں " فاران " اور اقبال ریویو کراچی میں متعدد مضامین قلم بند کئے - ایک مضمون مجلہ " رگ سنگ " لورالائی میں اشاعت پذیر ہوا [3] -

ان مضامین میں ماہر نے مختلف زاویوں سے اقبال کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے اور ان کی عظمت کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے وہ اقبال کو ایک عظیم فلسفی اور ایک عظیم شاعر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- ماہر القادری " رگ سنگ " شاعر اعظم و اقبال نمبر مجلہ گورنمنٹ کالج لورالائی دسمبر ۱۹۷۷ء نگران ڈاکٹر انعام الحق کوثر " مضمون اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات " - ص ۷۳ -

۲- دیکھئے " فاران " اگست ۱۹٦۸ء ، ص ۳۰

۳- ان مضامین کی ضروری تفصیل : " اقبال کے قصیدہ گو " فاران جولائی ۵۰ء " منظوم اقبال " جون ۵۵ء اقبال کی انفرادیت " اپریل ٦۰ء " اقبال کی شاعری میں کردار نگاری " اقبال ریویو کراچی جولائی ٦۰ء " اقبال کی اردو شاعری " اقبال ریویو جولائی ٦۱ء " اقبال کا پیام " فاران جون ٦۸ء " علامہ اقبال سے میری پہلی اور آخری ملاقات " فاران اگست ٦۸ء " اقبال کی شاعری " اقبال ریویو جولائی ۷۳ء " اقبال کی شاعری " فاران دسمبر ۷۷ء -

۴- اقبال ریویو مجلہ اقبال اکادمی پاکستان کراچی جولائی ۱۹۷۳ء مضمون اقبال کی شاعری از ماہر القادری - ص ۱

" اقبال کی شخصیت شعر و فلسفہ کا سنگم بن گئی ۔ تعقل و تفکر کے ساتھ ذوقِ جمال کی آمیزش نے اقبال کی شاعری کو بلندی کے ساتھ گہرائی بھی دی ۔ شعر و فلسفہ کا یہی حسین امتزاج کلامِ اقبال کی خصوصیت ہے ۔ اقبال دیدہ ور بھی ہیں اور خوش نگاہ بھی۔ دنیا میں کسی فلسفی کو شاعری کا وہ بلند منصب نہیں ملا جسے " جز و یست از پیغمبری" کہا گیا ہے ۔ اقبال نے فلسفیانہ افکار کو جس سلیقہ اور فن کاری کے ساتھ شاعری کے حسین قالب میں ڈھالا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ یہ اقبال کی خوش ذوقی تھی کہ انہوں نے فلسفہ کی خشکی کو رعنائی اور رنگینی عطا کی ۔ یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ عظیم کارنامہ وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو شعر و سخن کی پھول پتیاں بنانے کا فن جانتا ہو ۔ فلسفہ کے مطالب اور شعر کے تقاضوں کو ایک دوسرے میں سمو دینا یہ ایک طرح کی جادو گری ہے " ۔[۱]

اور ماہر ہی کے الفاظ میں " وہ محاسن اور صفات جو عظیم شاعری میں پائی جانی چاہئیں وہ تمام کی تمام اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہیں " ۔[۲] ایک دوسرے مقام پر اقبال کی فارسی نعت کے اشعار درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں " عشقِ رسول اور مقصدی شاعری کا یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال کا کوئی حریف نہیں "۔[۳]

اقبال سے ماہر کی عقیدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے موصوف محترم کی تعریف میں تین نظمیں لکھی ہیں جو اقبال کے عنوان سے محسوساتِ ماہر (ص ۲۲۱) ، نغماتِ ماہر (ص ۵۲) اور " فردوس " (ص ۱۰۱) پر دیکھی جا سکتی ہیں ۔ یوں تو یہ تینوں نظمیں ہی حسنِ عقیدت ، زورِ بیان اور شعریت کی خوبصورت مثالیں ہیں ، مگر " نغماتِ ماہر " والی اٹھارہ اشعار کی نظم تاثر ، دلکشی اور حسنِ ادا کے اعتبار سے قابل ذکر ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :-

---

۱- اقبال ریویو مجلہ اقبال اکادمی پاکستان کراچی ، جولائی ۱۹۷۳ء مضمون اقبال کی شاعری از ماہر القادری ۔ ص ۲ ۔

۲- ایضاً ۔

۳- کاروان حجاز ۔ ص ۲۲

دلوں کی وادیوں میں پھول برساتا ہوا آیا
حجازی لے میں نغمۂ ہند کا گاتا ہوا آیا
شگفتِ لالہ و گل اس کی فطرت کا تھا آئینہ
وہ بوئے گل سے ہر وادی کو مہکاتا ہوا آیا
وہ شاعر جس کے خلقِ شعر کا احسان ہے اردو پر
ادب کی زُلفِ ژولیدہ کو سلجھاتا ہوا آیا
ہوا نازل زمینِ ہند پر " بانگ درا " بن کر
وہ آیا اور ہر سوتے کو چونکاتا ہوا آیا
قلندر کی زبان میں اس نے دی تعلیمِ آزادی
مجاہد کی طرح تلوار چمکاتا ہوا آیا
خرد کی مصلحت اندیشیوں کو اس نے ٹھکرایا
جنونِ عشق کے اسرار سمجھاتا ہوا آیا
دیا تھا جو پیامِ زندگی خلقِ محمّد نے
اُسی پیغام کو اقبال دہراتا ہوا آیا

" فردوس " میں اقبال کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں - (یہ نظم مثنوی میں ہے اور اس کے پندرہ اشعار ہیں) :-

کاروان خواب میں تھا بانگِ درا سے پہلے
ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے
اس قدر خوفِ خدا ، سوزِ دروں ، جذبۂ حق
بھیگ جاتے تھے تیرے اشک سے قرآن کے ورق
علم و حکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ
کس نزاکت سے ہم آغوش کئے شیشہ و سنگ
فکرِ افسردہ کو پروازِ عطا کی تو نے
لبِ خاموش کو آواز عطا کی تو نے

اقبال سے ماہر کو جو غایت درجے کی عقیدت تھی ، اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ماہر کو اقبال کے ان نظریات سے مکمل اتفاق تھا ، جس کی تبلیغ و اشاعت اقبال عمر بھر کرتے رہے ۔ ماہر اسلام کو محض نماز روزے کا مذہب نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ شرحِ صدر کے ساتھ اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات اور دنیا کا عظیم ترین انقلابی دین جانتے تھے ۔ اور اقبال بھی اسی نقطۂ نظر کی دعوت دیتے رہے چنانچہ ماہر کو اقبال سے غیر معمولی قسم کی ذہنی وابستگی ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ذہن و تخیل پر اقبال کے خیالات و عقاید حاوی ہو گئے اور انہوں نے مختلف وقتوں میں پچاس سے زیادہ ایسی نظمیں لکھیں جو یا تو اقبال کی زمین میں کہی گئی ہیں یا جن پر اقبال کے رنگ کی گہری چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے ۔ ماہر خود اعتراف کرتے ہیں :-

بہ فیضِ حضرت رومی سفالِ ماہر میں
فروغِ بادۂ اقبال کے سوا کیا ہے ؟ [1]

ذیل کی سطور میں ان منظومات کا اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔

اقبال جُہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کے پرچارک ہیں ۔ ان کے نزدیک "جاودان ، پیہم رواں ، ہر دم جواں ہے زندگی" ۔ زندہ ضمیری اور حریت کیشی ان کا مسلک ہے اور بلند نظری اور اعلیٰ ظرفی کو وہ کامیابی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں ۔ ماہر بھی ان اصولوں کو دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں اور انہی کی دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ "محسوساتِ ماہر" میں "پیام" کے عنوان سے ایک نظم کے چند اشعار دیکھئے ۔ اقبال کا حقیقی رنگ جھلکتا ہوا صاف نظر آتا ہے :-

جینے کا قصد ہے تو سکوں کی نہ کر تلاش
یہ زندگی حوادثِ پیہم کا نام ہے
وہ حرّیت کہ جس میں نہ آزاد ہو ضمیر
اس حرّیت کو دور سے میرا سلام ہے

١- محسوساتِ ماہر - ص ٣٣

نظریں بلند ہوں تو زمین بھی ہے آسمان

سمعِ قبول ہو تو خموشی پیام ہے [1] -

اسی طرح " جذب و یقین " کے عنوان سے ایک غزل میں اقبال کے خیالات و تصورات اور اسلوب کی ہو بہو تقلید نظر آتی ہے - وہی تدبیر و عمل کی فوقیت ، وطنیت پرستی کی وہی مذمت ، اور یقینِ محکم کی توصیف کا وہی انداز ---

تدبیر کے دامن میں ہے تقدیر کا مقصود

کرتا ہے عمل دہر میں نابود کو موجود

آزاد بھی ہو جائے تو آزاد نہ ہوگا --،

ہے خاکِ وطن جس کی تمناؤں کا مقصود

جب تک کہ براہیمؑ کی فطرت نہ ہو پیدا ،

وجدان بھی آذر ہے ، تخیّل بھی ہے نمرود

ایمان کے سایہ میں خطائیں بھی ہیں مقبول

بے جذبِ یقین نیکیٔ اعمال بھی مردود ، [2] -

" فکر و عمل " اور فریب نظر " [3] میں بھی حیرت انگیز طور پر اقبال کا اسلوب اور اس کے عقاید و تصورات رواں دواں نظر آتے ہیں ۔ تعجب ہے کہ ماہر نے کس کامیابی سے اقبال کے اسٹائل کا تتبّع کیا ہے ۔ شاہین اور زاغ و زغن کی اصطلاحات تک اقبال کی ہیں ---

جب تیرا اختیار ہے پابند غیر کا

قبضہ میں تیرے ملکِ سلیمان ہوا تو کیا

جب تک کہ آندھیوں سے بغاوت کرے نہ تو

امید کا چراغ فروزاں ہوا تو کیا ،

۱- محسوسات ماہر - ص ۳۴ ، ۳۵

۲- ایضاً - ص ۷۵

جب تک ترا ضمیر نہ ہو واقفِ جنون
پھولوں کی طرح چاک گریباں ہوا تو کیا
توبہ ہے نام دھر میں ترکِ گناہ کا ،
تو دل ہی دل میں اپنے پشیمان ہوا تو کیا
شاہین کے بازوؤں کی حرارت ہے اور چیز
زاغ و زغن کی طرح پر افشاں ہو تو کیا ، [1] ۔

" فریبِ نظر " میں ماہر نے عین اقبال کے اسلوب میں ان مغرب پرست دانشوروں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے جو یورپین فلسفیوں اور مستشرقین کی اندھی نقالی میں اپنی دانش کی معراج سمجھتے ہیں ۔۔

بایں شعور و تکبّر جہان پہ طاری ہے
جمودِ بے بصری یا سکوتِ بے خبری ،
ہے اشتباہ کے سایہ میں یوں یقین کی نمود
گھٹا میں جیسے طلوعِ سپیدۂ سحری
ہزار حیف کہ دیوانگی کی باتوں کو
سمجھ رہا ہے زمانہ حقائقِ نظری [2] ۔

اقبال دینِ اسلام پر جو غیر معمولی اعتقاد رکھتے ہیں اور مادیت پرستی کی جس طرح تنقیص کرتے ہیں ، بالکل وہی فضا ہمیں ماہر کے ہاں نظر آتی ہے ۔ ماہر بھی اقبال کی تقلید میں اللہ کی عبودیت کو زندگی کی معراج سمجھتے ہیں ۔۔

مجھ کو قرآن کی حکمت نے بتایا ہے یہ راز
علم سرتا بقدم جہل ہے بے دانشِ دین

۱۔ محسوسات ماہر " نظم فکر و عمل " ۔ ص ۱۱۳
۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۱۷

اس کی تعظیم کو جھکتے ہین زمین و افلاک ،

سجدۂ حق مین جو ہوتی ہے مسلمان کی جبین ۔ [1]

" نغماتِ ماہر " مین " جذبِ دورن " کے عنوان سے سولہ اشعار کی ایک غزل ہے جس پر بالِ جبریل کے اسلوب اور فضا کی گہری چھاپ بڑی نمایان نظر آتی ہے ۔ لب و لہجہ بھی فکری و فلسفیانہ ہے جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے ؎

میری ہستی کے ظاہر پر نہ جائین دیکھنے والے ،

مین قطرہ ہون مگر دریا سے رکھتا ہون شناسائی

اسی نقطہ سے جذبِ عشق کا آغاز ہوتا ہے

جہان پر ختم ہو جاتی حدِ ادراکِ دانائی

زمانہ مین کبھی صبر و سکون بھی ہاتھ آتا ہے

بس اپنا رخ بدل دیتا ہے دردِ ناشکیبائی

محبت مصلحت اندیشیون سے پاک ہوتی ہے

دلیلِ خام کاری ہے خیال و فکرِ رسوائی

یہی آئین فطرت ہے یہی قانون قدرت ہے

کہ موجِ آب سے ہے برق کے شعلون کی پیدائی ۔ [2]

اس حقیقت مین کوئی شبہ نہین کہ ماہر کو اقبال کے اسلوب پر حیرت انگیز طور پر قدرت و کمال حاصل ہے جسے نظریات و تصورات کی مکمل ہم آہنگی بیان و اظہار کی عجیب رعنائی اور تاثیر عطا کر دیتی ہے ۔ چنانچہ " نغماتِ ماہر " مین " یقین و عمل " کے عنوان سے ایک غزل غیر معمولی حد تک اقبال کے فکر و فن سے مماثلت رکھتی ہے ۔ یقین کا اثبات ، فقر کی عظمت ،

۱۔ محسوسات ماہر ۔ ص ۲٦۷

۲۔ نغمات ماہر ۔ ص ۳٦ ، ۳۷

خرد کی عیاری ، تقدیر پرستی کی مذمت اور حریت و جہاد کی ستائش غرض سارے دعاوی اقبال کے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ تراکیب و اصطلاحات تک اقبال سے مستعار نظر آتی ہیں یعنی پردۂ اسرار ، قلب و نظر کی آگاہی ، جذبِ یقین ، فقر ، شہنشاہی ، خرد ، طریقِ روباہی ، فکر و عمل کی کوتاہی ، فغانِ نیم شبی ، نالۂ سحرگاہی اور فکرِ سود و زیاں ۔ چودہ اشعار پر مشتمل اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

یقین پردۂ اسرار چاک کرتا ہے ، یقین کا نام ہے قلب و نظر کی آگاہی ۔
وہ فلسفہ ہو کہ علم کلام یا منطق ، بغیر جذبِ یقین ہے تمام گمراہی ،
اُسی کے واسطے گردش میں ہیں مہ و افلاک وہ فقر جس سے لرزنے لگے شہنشاہی
یہ دل ازل سے جری ہے اسکو کیا کہئے سکھا دیئے ہیں خرد نے طریقِ روباہی
مجھے پسند نہیں ہے یہ مسلکِ تقدیر اسی کا نام ہے فکر و عمل کی کوتاہی
یہ مجھ سے سن میری روداد اس میں شامل ہے فغانِ نیم شبی ، نالۂ سحرگاہی ، ۔ ۱

" مرد مومن " میں بھی بالکل یہی نقشہ نظر آتا ہے ۔ یہاں بھی اقبال کی فکر مکمل طور پر حاوی ہے اور بڑی خوبی اور مہارت سے ماہر نے اقبال کے اسلوب اور اسی کی لفظیات میں " مرد مومن " کی خصوصیات بیان کی ہیں ؎

کھل جاتی ہے اک آن میں مومن کی نظر سے
تدبیر کی گتھی ہو کہ تقدیر کی پیچاک
ہر سانس کی آواز ہے اک نعرۂ تکبیر
تلوار کا جوہر ہے مسلمان کا ادراک ،
اُس آگ کے شعلے دلِ مسلم میں ہیں پنہاں
وہ آگ جو بجلی بھی ہے اور سوجۂ نمناک ۔ ۲

۱۔ نغمات ماہر ۔ ص ۲۰ ، ۲۱

۲۔ ایضاً ۔ ص ۵۵

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ماہر کی کم و بیش چار درجن منظومات اقبال کے رنگ اور تقلید میں ہیں ۔ ان میں سے " دعوتِ عمل " ، " افکارِ جلیل " ، " نوائے سروش " (نغمات ماہر) ، " سوزِ تمام " ، " جبر " ، " آوازِ جرس " (جذباتِ ماہر) ، " بالِ جبریل " کی غزلیات کے رنگ میں ہیں اور اپنی فکر ، تراکیب و استعارات اور لب و لہجہ کے اعتبار سے اقبال کی بہترین عکاس ہیں ۔ ان غزلیات کے متفرق اشعار اس دعوے کا عملی ثبوت ہیں :۔

ہے اسی کی جستجو میں یہ کشاکشِ زمانہ
وہی فقرِ مردِ مومن کہ ہے سرمدی خزانہ

ترا کام تن کی پوجا ، مرا کام من کی سیوا ،
مجھے جستجو یقین کی تجھے فکرِ آب و دانہ

ترا خار و خس پہ تکیہ ، مرا عشق پر بھروسہ
مجھے برق سے محبت ، تجھے خوفِ آشیانہ ۔، ۱ ۔

وحدت کا تصور ہے بہت خوب مگر دوست
اللہ کے انصاف کی محکم ہے ترازو

جب تک نہ گلستاں میں ہوں پھولوں کے جگر چاک
اربابِ چمن رہتے ہیں بیگانۂ خوشبو ،

محکومیٔ و درماندگی ہے سب سے بڑا شرک
اس نکتۂ توحید سے آگاہ نہیں تو

او بندۂ خواہش ! یہ کوئی زیست نہیں ہے
جذبات پہ قدرت نہ تمنّوں پہ قابو ۔، ۲ ۔

۱۔ نغماتِ ماہر ۔ ص ۶۷ ، ۶۸

۲۔ ایضاً ۔ ص ۶۸ ، ۶۹

میری دل کی دھڑکنوں سے وہ قریب ہو رہے ہیں
مرے شوق کو مبارک شبِ ہجر کی درازی
تری دل کی سادگی سے مجھے ڈر لگا ہوا ہے
کہ سیاست زمانہ ہے فقط قمار بازی ۔ [1]

لکھی ہے سرِ صبح ستاروں کے لہو سے
شب نے کسی ناکام تمنّا کی کہانی
دریا کے دھڑکتے ہوئے دل کا ہے فسانہ
موجوں کی کشاکش میں حبابوں کی روانی
اک کیفیتِ غم ہی کو کہتے ہیں مسرت
احساس کا دھوکا ہے غمِ عشرتِ فانی ۔ [2]

ان کے علاوہ " فردوس " میں " برق پارے " کے عنوان سے غزلیات کا جو حصّہ ہے (ص ۱۰۵ - ۱۲۱ تک) وہ اقبال ہی کے رنگ میں ہے - چند مثالیں ملاحظہ کیجئے --

یہ علم و حکمت و دانش کی جلوہ آرائی
یقین کی شمعِ فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد تراش رہی ہے نئے نئے دستور ،
جو اس میں حکمتِ قرآن نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔ [3]

۱- جذبات ماہر - ص ۱۵
۲- ایضاً - ص ۱۶ ، ۱۷
۳- فردوس ص ۱۰۹

یہ کون پچھلے پہر رات کو ہے محوِ سجود
دعا کو ڈھونڈھ رہی ہیں ابھی سے تاثیریں

حدیثِ عشق کی تشریح کوئی کھیل نہیں
جگر کے خون سے لکھی گئی ہیں تفسیریں

ہر احتیاط پہ ذوقِ طلب نے چٹکی لی
جنوں کو راس نہ آئیں خرد کی تدبیریں - ۱

مری نگاہ میں ہے حُسنِ جوہرِ شمشیر
تری نگاہ میں آرائشِ غلافِ نیام

یقین مرکزِ توحید پر رہا لیکن
تصورات کے سانچے میں ڈھل گئے اصنام

وہ زہد جو کہ رضا مند ہو غلامی پر ،
ہے ایسے زہد پہ آب و ہوائے خُلد حرام

تمام مشرق و مغرب خراب ہیں اے دوست
سیاسیات کے فتنے ، فریبِ علمِ کلام

سکون و عیش تو اہلِ ہوس کی قسمت ہے
ازل کے دن سے محبت رہی ہے بے آرام - ۲

ہوس ہے مصلحت انگیز اور عشق غیور ،
جنوں کا ایک طریقہ ، خرد کے لاکھ رسوم

۱- فردوس - ص ۱۱۳
۲- ایضاً - ص ۱۱۴

میں تجربہ کی بنا پر یہ بات کہتا ہوں
نہ عشق سادہ طبیعت نہ حسن ہے معصوم ۔ [1]

یہ مصلحت کی زباں میں پیامِ بیداری ،
اسی کا نام ہے اے دل ! خرد کی عیاری
وہ بو الہوس ستمِ حسن کیا اٹھائے گا
جو کر سکا نہ محبت کی ناز برداری
وہ زندگی کہ نہیں جس میں جذب و مستی و سوز
وہ زندگی تو حقیقت میں خود ہے بیماری
ہے تیرے واسطے اک کھیل سعی و طوفِ حرم
کہ تو ہے دل سے دظر تک تمام زناری
خدا کے واسطے اُس روزِ احتساب سے ڈر
کہ جب ہوں دیدہ و دل مجرمانِ اقراری
کہاں کی محفلِ نغمہ ، کہاں کے قصر و چمن
ترا مقام تو ہے بوذری و کراری ۔ [2]

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں
بغیر سوزِ دروں زندگی میں کچھ بھی نہیں ،
جو یہ نہیں ہے تو پھر آدمی میں کچھ بھی نہیں

۱- فردوس - ص ۱۱۵
۲- ایضاً - ص ۱۱۶

نہ ولولے نہ تمنّا نہ اضطراب نہ شوق ،
گل و سمن کی شگفتہ ہنسی میں کچھ بھی نہیں
حیات سعی مسلسل کا نام ہے اے دوست
دل و نگاہ کی آسودگی میں کچھ بھی نہیں ،
لبوں پہ حرفِ محبت ، دلوں میں بُغض و نفاق ،
یہ دوستی ہے تو پھر دشمنی میں کچھ بھی نہیں ۔[1]

اگر یہ کہا جائے کہ غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن یعنی مثنوی ، مسدّس اور قطعہ میں بھی ماہر نے اقبال کی مکمل اور کامیاب تقلید کی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا ۔ مثال کے طور پر " محسوساتِ ماہر " میں " مسلم سے خطاب " نو بندوں پر مشتمل ایک مسدس ہے جس کا اسلوب اور لب و لہجہ " جواب شکوہ" سے ملتا جلتا ہے ۔ موضوع بھی تقریباً وہی ہے ۔ شاعر مسلمان کو اس کے اصل مقام و مرتبہ کا احساس دلاتا ہے اور اس حوالے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ پر ابھارتا ہے ۔ شاعر کو اپنے نظریات و عقاید پر محکم یقین ہے اور وہ کامل اعتماد کے ساتھ پُرجوش رجزیہ انداز میں امت مسلمہ کو بیداری کا پیغام دیتا اور عمل پر آمادہ کرتا ہے بلاشبہ محسناتِ شعر کے اعتبار سے ماہر کی یہ نظم قدرے کمزور ہے اور ماہر کی غزلیات کے مقابلے میں یہ مسدّس " جواب شکوہ " کی قابل رشک نقل نہیں ہے ، تاہم موضوع اور جوشِ بیان کے اعتبار سے اس کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے۔مثال کے طور پر دو بند ملاحظہ ہوں :—

سرمایۂ عظمت ہے تری ذاتِ گرامی ، تو خالق و مخلوق کے مابین پیامی
طوفان کی شورش ہے، تری مست خرامی اے تجھ کو سزا وار محمد کی غلامی
ایمان کی دولت تجھے اللّٰہ نے دی ہے ،
دُنیا ترے قدموں کی طرف دیکھ رہی ہے

---

[1] فردوس ص ۱۲۰ ، ۱۲۱

تو فوجِ محمّد کا سپاهی هے سپاهی　　　دیتا هے جهاں تیری شجاعت کی گواهی
اللہ نے دی هے تجھے کونین کی شاهی　　　کرتا هے خدا آپ تری پشت پناهی

تو مهرِ وفا ، ابرِ سخا، بحرِ کرم هے ،
سچ یہ هے کہ تو مالکِ تقدیرِ امم هے -[1]

[2] " خفتگان خاک سے استفسار " بانگ درا کی مشہور نظم هے - ماهر کی نظم " والد مرحوم کی قبر پر " اقبال کی متذکرہ نظم کا گهرا تاثر لئے هوئے هے - ۳۶ اشعار پر مبنی اس مثنوی کا آغاز جهٹ پٹے کے وقت قبرستان کی منظر کشی سے هوتا هے (" خفتگان خاک " والی نظم کا پس منظر بھی غروب آفتاب کے فوراً بعد کا هے) منظر نگاری اور جزئیات کا بیان متاثر کرتا هے۔پھر شاعر اپنے والد کی قبر پر جا کھڑا هوتا هے اور رقت انگیز لب و لہجے میں اپنی اور خاندان کی حالتِ زار بیان کرتا هے - والد کی محبت اور طریقِ تربیت کو یاد کرتا هے اور پھر والد کی روح سے مخاطب هو کر نظم کے آخر میں کچھ سوالات کرتا هے - سوالات کے لب و لہجے سے صاف اندازہ هوتا هے کہ اقبال کی نظم هی اس کی محرک بنی هے۔مثال کے طور پر چند اشعار دیکھئے :-

کیا وهاں بھی کوڑیوں کے مول بکتا هے کمال
کیا وهاں بھی هو چکا هے آدمیت کا زوال

کیا وهاں بھی هے اسی صورت غلامی کو فروغ
کیا وهاں بھی کام کرتا هے سیاست کا دروغ

کیا وهاں بھی سیم و زر کے سامنے جھکتے هیں سر ،
کیا وهاں بھی آگ سے بچتے نهیں کرتے حذر -[3]

۱- " محسوساتِ ماهر - ص ۱۲۰ ، ۱۲۲
۲- ایضاً - ص ۵۵
۳- ایضاً - ص ۵۸ ، ۵۹

ماہر نے اقبال کی مشہور نظم " ساقی نامہ " کے تتبع میں بھی دو نظمیں لکھی ہیں - جن میں سے ایک " فردوس "[1] میں شامل ہے اور دوسری " فاران " (جون ۶۲ء ص ۳۹) میں شائع ہوئی - پہلے " ساقی نامہ " میں طبقاتی اونچ نیچ پر شاعر نے اپنے کرب کا اظہار کیا ہے اور دوسرے میں " جدید جاہلیت " کے حوالے سے اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی فکر کو عام کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے -

بقول مولانا عبدالسلام ندوی " بالِ جبریل کی سب سے پُرجوش نظم " ساقی نامہ " ہے "[2] اور مولوی شمس تبریز خان کے الفاظ میں یہ نظم ادبی اور فنی لحاظ سے بھی اردو میں ایک منفرد شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے " -[3] اس لئے اس نظم کی تقلید خاصا دشوار کام تھا ، مگر ماہر القادری نے یہ مشکل مرحلہ خاصی کامیابی سے طے کیا اور بڑی ہنرمندی سے اقبال ہی کی چھوٹی بحر میں " ساقی نامہ " مکمل کر لیا - مغرب پرستی ، غلامانہ ذہنیت اور تہذیبی احساس کمتری نے ہمارے معاشرے میں جو المیے پیدا کئے ہیں ، شاعر ان پر بڑے دکھ اور کرب کا اظہار کرتا ہے - وہ اس کھوکھلے پن پر ماتم کرتا ہے جو پورے ماحول پر حاوی ہو گیا ہے - یہ نظم " یومِ اقبال " (۲۱ اپریل ۶۲ء) کے حوالے سے لکھی گئی تھی اور اقبال ہی کے ذہن و فکر اور لب و لہجے کی ترجمانی کرتی ہے - ۳۱ اشعار کی اس پرجوش اور فکر انگیز نظم کے چند اشعار :-

پلا ساقیا بادۂ لا الٰہ ، کہ ہے بے یقینی سے دنیا تباہ ،
خرد گرچہ پہلے سے باریک ہے ، مگر اس کا ماحول تاریک ہے ،
توانا بدن روح جھلسی ہوئی ، دل و سر خار و خس میں ہے الجھی ہوئی
کتابوں کے ہر سَمت انبار ہیں ، مگر علم کے سرد بازار ہیں

۱- محسوسات ماہر - ص ۳۷
۲- اقبال کامل از مولانا عبدالسلام ندوی ، دار المصنفین اعظم گڑھ ، طبع چہارم ۱۹۷۸ء ، ص ۱۳۱
۳- نقوشِ اقبال از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، ادارۂ نشریاتِ اسلام کراچی ص ۲۱۶

ادب بے ادب ھے ، زبان بے لگام
نہ لطفِ سخن ھے، نہ ربطِ کلام

محبت ھوس ، حسن ھے خود فروش
نوا سنج کرگس ھین ، بلبل خموش

شعور کا مرکز ھین نان و شکم
اسی پھیر مین ھین زبان و قلم

عہد حاضر کے مختلف العیوب کا ذکر کرنے کے بعد ماھر اقبال کو یون خراج عقیدت پیش کرتے ھین ---ہ

مجاھد کا سوزِ نوا چاھیئے ،
اب ایسے مین " بانگِ درا " چاھیئے

نئے ولولے ھون نئی زندگی ،
ضرورت ھے پھر " بالِ جبریل " کی

ھو جسکی نگاھون مین "ضربِ کلیم"
وہ شاعر ھے " روح القدس " کا ندیم

خدا کے لئے ساقی" دلنواز ،
عطا ھو مئے " ارمغان حجاز " ۱

" بال جبریل " مین دو دو اشعار پر مشتمل اقبال کے قطعات اپنی جامعیت ، معنی آفرینی اور کاٹ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ھین۔ ماھر نے ان قطعات کی نقل مین چند قطعات لکھے ھین جو مضامین کی سنجیدگی مگر طنز اور کرب کے اعتبار سے اور دوسری جانب جامعیت اور معنی آفرینی کے لحاظ سے قابل قدر ھین - نمونہ مشتے از خروارے ---ہ

دلِ مسلم کو پھر خوفِ اجل ھے
غمِ دنیا مین حالت متبذل ھے

پرستش خوف و غم کی ھو رھی ھے
حرم پھر مسکن لات و ھبل ھے

اذان بے کیف اور تکبیر بے سوز
تڑپ اٹھنے کو ھے روح بلالی

براھیمی معابد بن رھے ھین
پرستش گاہِ اصنامِ خیالی ،

جوانون کی زبون حالی نہ پوچھو
نظر ویران اور سینے ھین خالی

ڈرامون کی پرستش ھو رھی ھے
" گلستان " ھے نہ " اخلاقِ جلالی "

۱۔ فاران جون ۶۲ء ص ۳۹ ، ۴۰

ماہر القادری کی درج بالا منظومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف محض اسلوب اور لہجے کے اعتبار سے ہی اقبال کے متبع نہ تھے ، بلکہ خیالات و نظریات اور تصورات میں بھی وہ اقبال کے سچے مقلد تھے - چنانچہ انہوں نے اپنی منظومات میں نظریات اور لفظیات سمیت اقبال کی تقلید کی ہے - اقبال توحید کے پرجوش مبلغ ہیں اور ماہر نے جس شد و مد سے توحید کا پرچم بلند کیا ، وہ ساری دینی اور صحافتی حلقوں میں گویا ضرب المثل ہے اور " فاران " کا ضخیم اور دقیع " توحید نمبر" (جون ۱۹۵۷ء) اس پر شاہدِ عادل ہے - اسی طرح اقبال کا عشقِ رسول کسی وضاحت کا محتاج نہیں اور ماہر کی نعت گوئی اردو شاعری میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے - اس کا تفصیلی جائزہ ایک الگ باب میں لیا جا چکا ہے - یہاں ان کی ایک فارسی نعت کا صرف ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ---

مردِ مومن را محمد ابتدا است

مردِ مومن را محمد انتہا است

اقبال کو عہدِ حاضر میں اس اعتبار سے اولیت کا شرف حاصل ہے کہ انہوں نے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات اور ایک انقلابی دین کی حیثیت سے متعارف کرایا - وہ حرکت و عمل کو اسلام کا ایک بنیادی اور ضروری جزو سمجھتے تھے اور اس کی تواتر سے تبلیغ کرتے رہے - ماہر نے بھی اپنی شاعری میں اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا ، خود بھی ایک انقلابی دینی جماعت سے بھرپور معاونت کرتے رہے اور حرکت و عمل پر عمر بھر زور دیتے رہے - اشعار ملاحظہ ہوں ---

توحید کا اقرار زبان سے یہ کہاں تک -

دے اپنے عمل سے بھی تو اے دوست گواہی

خدا جمود کی ہرگز مدد نہیں کرتا

ترے لبوں پہ یہ ہنگامۂ دعا کیا ہے

یہ حادثات کی دنیا یہ کارزارِ حیات

عمل کے جذبۂ سرگرم کے سوا کیا ہے

تدبیر کے دامن میں ہے تقدیر کا مقصود

کرتا ہے عمل دھر میں ناپید کو موجود [1]

پھر "اقبال کی تصویروں میں حرکت اور جلال کی کیفیات غالب ہیں " اور ماہر نے بھی جن شاہیر کی کردار نگاری کی ہے ، ان میں بھی صفت کارفرما ہے ۔

یہ امر بھی محتاجِ وضاحت نہیں کہ اقبال مغربی تہذیب کے مخالف تھے اور ماہر بھی جگہ جگہ مغربی تہذیب پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں ۔ اقبال مغربی استعمار اور اشتراکی سامراج دونوں کو اصابت کے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہیں اور ماہر کا احساس بھی اس معاملے میں بڑا شدید ہے ۔ چنانچہ " مغربی تہذیب " کے عنوان سے ایک نظم میں انہوں نے اس تمدن کی زہرناکیوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور مغربی اقوام کی منافقت ، انسان کشی ، مادہ پرستی اور عیش پسندی کے حوالے سے اقبال ہی کے لہجے میں غم و غصے کا اظہار کیا ہے ۔۔۔

بناوٹ کا بیوپار دھوکے کا مول

کہ پیتل کے پتر پہ چاندی کا جھول

تبسم کے بہروپ میں زہرخند ،

درندہ مگر صورتِ گوسفند ۔،

مروت سے نفرت ، حیا سے گریز ،

ہوس ہر قدم پر محبت ستیز ،

خلوصِ عمل اور نہ سوزِ یقین ۔،

درون تیرہ سامان بظاہر حسین ۔، ۔ [2]

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند دسویں جلد ، اردو ادب پنجم ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔ ص ۸۲

۲۔ فردوس ۔ ص ۳۶

ایک دوسرے مقام پر مغربی اور اشتراکی تہذیب پر یوں تبصرہ کیا ہے ؎

اس دور کی تہذیب تو اک شیشہ گری ہے،
یہ صبح وہ ہے جس میں اندھیرا ہی اندھیرا
اخلاق و یقین کے لئے پیغامِ اجل ہیں
افرنگ کی وہ شام ہو یا سرخ سویرا ۔[1]

ہو روس کی تہذیب کہ لندن کا تمدّن ؎
یہ نقشہ مردود ہے وہ مکرِ عزازیل

دوسری جنگ عظیم کے تناظر میں تہذیب مغرب پر یوں تنقید کرتے ہیں ؎

خونِ انساں سے تری تاریخ لکھی جائے گی ،
ہر کھنڈر مغرب کا ہے تیری جنوں کی یادگار

ماہر اقبال ہی کی طرح آزادی کے پرستار ہیں اور غلامی کی ہر صورت کو مذموم قرار دیتے ہیں محکوم اور آزاد کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

پیشانیٔ محکوم پہ افلاس کا سایہ	آزاد کی ٹھوکر میں ہے گنجینۂ دولت ،
محکوم کا اندازِ تبسم بھی ہے ماتم ،	آزاد کے آنسو میں جھلکتی ہوئی عشرت
محکوم کو ہے صلح و خوشامد سے سروکار	آزاد کو ہر جور سے ٹکرانے کی عادت
محکوم کو محرومیٔ تقدیر کا شکوہ	آزاد کی کوشش سے بدل جاتی ہے قسمت [2]

علامہ اقبال ہی کی طرح ماہر نے بھی مغربی جمہوریت کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کی سخت مذمت کی ہے ۔ وہ مغربی جمہوری نظام کو ایک فریب اور ڈھونگ قرار دیتے ہیں ؎

۱۔ فاران اپریل ۶۰ء ص ۲۸

۲۔ فردوس ۔ ص ۳۴

تہذیبِ نو کا یہ بھی ہے اک خوشنما فریب
جمہوریت کی آگ سے دامن ذرا بچا،

اور اشتراکیت کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ایک فارسی نظم میں یوں کرتے ہیں ــــ

بے یقین و بے ضمیر و کم نگاہ　　منکرِ اخلاق و آیاتِ الٰہ
عصمتِ کردار در راہش غبار　　مذہبِ او را شکم پروردگار
آتشین سیلاب لرزان بر زمین　　فتنۂ دنیا و ہم آشوبِ دین ۔ [1]

اس کے علاوہ ماہر القادری نے ، جیسا کہ بعض منظومات کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے ، اقبال کی مخصوص اصطلاحات و لفظیات کو بھی اختیار کیا ہے ۔ خودی ، فقر ، درویشی ، شاہین ، مردِ مومن وغیرہ کا استعمال ماہر کے کلام میں عام نظر آتا ہے ۔

اس گفتگو سے ایک بات عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ اقبال کو اگر ایک دبستان سمجھ لیا جائے تو ماہر اس دبستان کے یقیناً سب سے بڑے ترجمان ہیں ۔ فکر کے اعتبار سے بھی اور فن کے لحاظ سے بھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ماہر نے بڑی ہی کامیابی سے اقبال کا تتبع کیا ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ ماہر کے ہاں اسلوب کی جو بلند آہنگی اور انداز بیان کا جو شکوہ دکھائی دیتا ہے اور صوتی انداز اور لب و لہجہ میں جو شانِ جلال جھلکتی ہے ، اور ملّی و دینی منظومات میں جو جوش و جذبہ اور ایمانیات کا پُر اعتماد اظہار ہے ، وہ سب اقبال کے اثرات کا نتیجہ ہے ۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماہر نے محض نقل کی ہے ۔ فی الحقیقت اس ضمن میں ماہر کا وسیع ذاتی مطالعہ ، اس کی صاف ستھری تخلیقی فکر ، اس کی بے پناہ سلامتِ طبع ، داخلی توانائی اور جذبہ و اخلاص کا عمل دخل بنیادی حیثیت رکھتا ہے ، اور یہ سب خصوصیات اقبال کے لب و لہجے اور فکر کے ساتھ مل کر ایک منفرد چیز بن گئی ہے اور ماہر کے اس دعوے میں بظاہر کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا کہ ــــ

۱ـ فردوس ـ ص ۹۷

بسوزِ رومی و اقبال و خسرو

ملا ہے مجھ کو جذبِ عارفانہ ١ -

ماہر کی کمزور منظومات :

فکری اور فنی اعتبار سے بہت سی خوبیوں کے باوجود ماہر کے کلام میں متعدد ایسی نظمیں ملتی ہیں ، جو خاصی کمزور ہیں اور جن میں شعریت کی شدید کمی ہے - اسلوبِ بیان سپاٹ اور بے رنگ ہے اور خیالات میں خاصا کچا پن نظر آتا ہے -

" ایک اشتراکی دوست سے " اس سلسلے کی پہلی نظم ہے جس میں محض جذبہ و احساس کا اظہار ہے - شعریت کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے - اور غصّے کا عُنصر غالب دکھائی دیتا ہے - مثلاً یہ شعر دیکھئے --

تجھ کو فطرت کے توازن کی خبر ہی نہ رہی

ہو گیا جب سے مساوات کا تجھ کو سرسام ٢ -

" تصویر دیکھ کر " میں شاعر وقار اور سنجیدگی کی عمومی سطح سے نیچے اتر آیا ہے - خیالات میں چھچھورا پن غالب ہے اور شعریت کی کمی بھی کھلتی ہے --

میری للچائی ہوئی نگاہوں کو پریشان دیکھ کر

مجھ کو یہ ڈر ہے تری تصویر بھی شرما نہ جائے

میری آہِ گرم سے موجِ ہوا ہے بیقرار ،

تیرے فوٹو کی جبین پر بھی پسینہ آنہ جائے ٣ -

" قسم " کے اشعار میں بھی خاصا کچا پن نظر آتا ہے - بالکل فلمی قسم کی نظم معلوم ہوتی ہے ٤ -

---

١- محسوساتِ ماہر - ص ٢٦٣ ٢- محسوسات ماہر ، ص ٦٥

٣- ایضاً - ص ٦٧ ، ٦٨ ٤- ایضاً - ص ٧٧

" احترامِ خودی " [1] مین اقبال کا رنگ جھلکتا ھے ، مگر یہان خلافِ معمول ماہر یہ رنگ برقرار رکھنے مین ناکام رھے ھین - خیالات مین ابہام اور تعقید پیدا ھو گئی ھے --

سمجھ بہار کو پھولون کا احترام نہ کر
نگاہِ خاص ودیعت ھے اس کو عام نہ کر

کمی ھے ذوق کی یہ امتیاز ساحل و موج
جو ڈوبنا ھے سفینہ کا اہتمام نہ کر

ماہر ھی کے لب و لہجہ مین کہا جا سکتا ھے کہ شاعر اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے مین ناکام رھا ھے -

اسی سے ملتی جلتی کیفیت " تہذیب و سیاست " [2] مین نظر آتی ھے - یہ نظم بھی اقبال کی تقلید مین ھے اور اس مین مغربی تہذیب کو ھدف تنقید بنایا گیا ھے ، خیالات قابل قدر ھین ، مگر نظم مین شعریت کم ھے اور وعظ زیادہ ھے - پھر لفظ سائنس کی تکرار بھی اکتاھٹ پیدا کرتی ھے -

" پیام " [3] مین بھی جذبات کا غلبہ ھے اور شعریت خاصی مجروح ھوئی ھے - اس نظم مین انہون نے اقبال کے لب و لہجہ مین اپنے قاری کو " پیام " دینے کی کوشش کی ھے ، مگر اہل کا جذباتی اور کچا انداز اسے بے اثر بنا دیتا ھے - پھر ماہر کی یہ کمزوری بعض دیگر مقامات پر بھی نظر آتی ھے کہ وہ تہذیب جدید کے لئے صرف لفظ " تہذیب " استعمال کرتے ھین ، حالانکہ علامہ اقبال نے جہان بھی مغربی تہذیب کا ذکر کیا ھے وھان " تہذیب نو " یا " تہذیب حاضر " (بمعنی مرکب توصیفی کے انداز مین) کی ترکیب استعمال کی ھے - ماہر شاید اقبال کی پوری ترکیب نہین لینا چاھتے ، جس سے بیان واضح بھی نہین ھوتا اور زور اور تاثیر سے بھی عاری ھو جاتا ھے -

---

۱- ملفوسات ماہر - ص ۱۰۵

۲- ایضاً - ص ۱۲۲

۳- نغمات ماہر - ص ۵۸

" ۹ سے " [1] ایک عشقیہ نظم ہے جو یقیناً " بھونڈے اسلوبِ بیان کی ایک مثال ہے اور اس پر سراسر فلمی ماحول چھایا ہوا نظر آتا ہے - شاعر کسی " شمع محفل " سے مخاطب ہے اور بڑی سطحی فرمائشیں کرتا ہے -

دیکھ کر پھر گھڑی کلائی کی　　　طاقتِ ضبط آزمائے جا ،
اہلِ محفل کے واسطے بیڑے　　　مسکراتے ہوئے بنائے جا ،
دوسروں سے بڑھا کے ہاتھ ملا　　　جاتے جاتے بھی دل دکھائے جا
" اب ملاقات تم سے کب ہوگی "　　　اتنا کہہ کے قدم بڑھائے جا

" چلے گئے " [2] میں بھی اسی نوعیت کی صورت حال تھوڑے سے وقار کے ساتھ نظر آتی ہے - فلمی فضا یہاں بھی غالب ہے -

" کچھ بھی نہیں " [3] بھی ماہر کی بہت کمزور نظم ہے جس میں قنوطیت ، جھنجھلاہٹ اور ہر چیز سے مکمل انکار چھایا ہوا نظر آتا ہے -

یہ جہانِ رنگ و بو کچھ بھی نہیں　　　آبشار و آبِ جو کچھ بھی نہیں
حسن و خوبی ہے تصوّر کی نمود ،　　　شاہدانِ لالہ رو کچھ بھی نہیں
آدمی بس آرزو کا نام ہے ،　　　اور اصلِ آرزو کچھ بھی نہیں
یہ جہاں کیا ہے نگاہوں کا فریب -　　　منظرِ شام و سحر کچھ بھی نہیں
روشنی بھی چلتی پھرتی چھاؤں ہے ،　　　ظلمت شام و سحر کچھ بھی نہیں

چار بندوں پر مشتمل یہ ساری نظم اسی نوعیت کے اِنکارِ کُلّی پر مشتمل ہے - حیرت کی بات ہے کہ ماہر جو ہمہ اوست یا وحدت الوجود کے قائل نہ تھے ، انہوں نے اس طرح کی بے سر و پا باتیں کیسے لکھ دیں -

---

۱- نغمات ماہر - ص ۱۰۸　　　۲- نغمات ماہر - ص ۱۱۲
۳- جذبات ماہر - ص ۳۲

ماہر اپنی منظومات کی خامیوں سے بخوبی آگاہ تھے ، اور وہ اپنے سارے کلام پر نظر ثانی کر کے اور کمزور اشعار کو حذف کر کے اپنا کلیات مرتب کرنا چاہتے تھے -[1] قیام پاکستان کے بعد محسوساتِ ماہر ، نغماتِ ماہر اور جذباتِ ماہر کا کوئی بھی ایڈیشن اسی لئے شائع نہ ہو سکا کہ وہ نظر ثانی کا پروگرام رکھتے تھے جس کا انہوں نے اعلان بھی کیا تھا[2] ، مگر افسوس کہ عملاً وہ اس ارادے کو بروئے کار نہ لا سکے - ورنہ یقین ہے کہ جن نظموں کی اوپر نشاندھی کی گئی ہے ، ماہر انہیں اپنے کلام سے خارج کر دیتے -

دعوتی اور مقصدی منظومات

" فردوس " اور بعد کی شاعری :

پاکستان بننے کے بعد ماہر کی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی اور ان کی منظومات پر دینی ، تبلیغی ، دعوتی اور سیاسی رنگ غالب آتا چلا گیا - اگرچہ قیام پاکستان سے قبل بھی ان کے ہاں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو خالص دینی سوچ کے حامل ہیں -[3] مگر وطنِ عزیز میں سیاسی حالات جو افسوس ناک صورت اختیار کرتے چلے گئے ، حکمرانوں نے ملکی و ملی اور عوامی تقاضوں کو قطعی فراموش کر کے محض ذاتی اور گروہی مقاصد کی خاطر جو " کارنامے " سرانجام دیئے اور اس تناظر میں پاکستان کی جو بعد ازاں اور ملّی اور دینی مفادات کو جو زک پہنچی ، ماہر اس سے فطری طور پر بہت

۱- فاران اکتوبر ۶۵ء ص ۳۷ ۲- فاران فروری ۶۵ء ص ٦

۳- مثال کے طور پر " نغماتِ ماہر " کی ایک نظم میں دیکھئے ان کے یہ اشعار ---:

شعر ، نغمہ ، فلسفہ اور صنعتِ صورت گری
صرف ہوتے ہیں جہاں میں خود نمائی کے لیے
دانش و علم و ہنر کی سعیٔ پیہم کا مآل
یا بڑائی کے لئے ہے یا کمائی کے لیے
صرف تقویٰ ہے ترازو عظمت کردار کی ،
ہے یہی معیار انسان کی بڑائی کے لیے (ص ۱۵)

متاثر ہوئے اور اس کا اظہار انہوں نے متعدد نظموں میں کیا -

قیامِ پاکستان کے بعد حکمرانوں نے مختلف شعبہ ہائے حیات میں جہاں ظلم اور ناانصافی کا انداز اختیار کیا وہاں سب سے المناک سلوک انہوں نے اسلام کے ساتھ روا رکھا - قائد اعظم اور تحریک پاکستان کے دیگر سنجیدہ رہنماؤں کے بیسیوں اقوال اس کے شاہد ہیں اور تحریک پاکستان کی پوری اُٹھان اس حقیقت پر گواہی دیتی ہے کہ قیامِ پاکستان کا اول و آخر مقصد یہاں اسلامی نظام کا قیام تھا -[1] مگر افسوس کہ حکمرانوں نے نہ صرف اس مقصدِ اولیٰ سے صریحاً انحراف کیا اور ملک کو مغربیت و مادہ پرستی کے راستے پر ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں ، بلکہ جن مخلص علماء اور سیاست دانوں نے انہیں اس امر کی یاد دہانی کرانے کی کوشش کی ، وہ زیرِ عتاب آ گئے انہیں طرح طرح سے پریشان کیا گیا اور انہیں قید و بند میں ڈالنے بلکہ تختۂ دار تک پہنچانے سے بھی دریغ نہ کیا گیا - اس صورت حال نے ماہر کو تڑپا دیا اور انہوں نے شری و شعری صلاحیتوں کا بیشتر حصہ حکمرانوں کی تنقید و تربیت اور اسلامی نظام کے اثبات و نفاذ کے لئے وقف کر دیا -

" صبحِ آزادی " کے عنوان سے ایک نظم میں یاد دلاتے ہیں کہ یہ صبح کتنی گھمبیر تاریکیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد نصیب ہوئی ہے --

کتنے دشوار مقاموں سے گزر کر آئے -،
کس قدر چشمِ فسوں ساز کے دھوکے کھائے ،
مرکز دید رہے کتنے اچھتے سائے ،
ہم مگر حرفِ شکایت نہ زباں پر لائے
جاں اور مال ہی کیا عصمت و عزت دی ہے
ہم نے مٹی کے گھروندوں کی بھی قیمت دی ہے [2]

۱- دیکھئے " چراغِ راہ " کراچی - نظریۂ پاکستان نمبر - دسمبر ۱۹۶۰ء

۲- فردوس - ص ۳۲

مگر جب حکمرانوں نے بالخصوص اور عوام نے بالعموم آزادی کے لئے دی جانے والی قربانیوں کی قدر نہ کی اور ظلم و جہالت کے راستوں پر گامزن رہے ، تو ماہر نے بڑے کرب سے کہا ---

فتنے اُسی طرح سے ہیں بیدار آج بھی
میں دیکھتا ہوں حشر کے آثار آج بھی
سرمایہ خود پسند ہے افلاس خود فروش
باقی نہیں ہے عظمتِ کردار آج بھی
اہلِ ہوس کی سازشیں ہیں بروئے کار ہیں
رسوا ہیں اہلِ دل سرِ بازار آج بھی
کچھ پاسِ احتیاط ہے کچھ خوفِ دار و گیر
ہیں بند بند سے لبِ اظہار آج بھی - ۱

ایک دوسری نظم میں حکمرانوں کی مجموعی روش پر یوں تبصرہ کرتے ہیں ۔ دیکھئے ایک عارضی اور ہنگامی موضوع کو شعریت کا کتنا خوبصورت لبادہ پہنایا ہے ---

اُن کی بوتل قوسِ قزح ،   اُن کے ساغر ماہِ تمام ،
روح کہاں بس ڈھانچے ہیں   تیغیں کیسی صرف نیام ،
راج محل میں ناچ اور رنگ   ہر جا کسے گھر میں کہرام
جام و سبو اور قوم کا غم   پھول کی سیج اور فکرِ عوام
جشنِ آزادی کسی قسم   فکر و نظر ہیں اب بھی غلام - ۲

اسی نوعیت کے کرب کا اظہار اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ایک روشن صبح کی آرزو یوں کرتے ہیں -

سنگ و آہن کے بھی سینوں میں شرر جاگ اٹھے
چشم انسان ہے کہ محروم بصارت ہے ابھی

۱- فردوس - ص ۵۲
۲- ایضاً - ص ٦۱

قصر و ایوان کی بہاروں کا وہی عالم ہے

جھونپڑوں کی وہی اجڑی ہوئی حالت ہے ابھی

آنکھ پھر منتظر صبح قیادت ہے ابھی ،

ایک فاروق کی دنیا کو ضرورت ہے ابھی [1] ۔

وطنِ عزیز میں مادہ پرستی نے آگے بڑھ کر جس طرح خدا بیزاری اور انسانیت کشی کا بھیانک روپ اختیار کر لیا ، اس پر ماہر نے بڑے ہی رنج و غم کا اظہار کیا ۔ " علمائے کرام سے " ۲۶ اشعار پر مشتمل ایک بھرپور نظم ہے ، اس میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں :۔

مال و زر جاہ و تعیش منزلِ مقصود ہے

آدمی کا اس جہان میں آدمی معبود ہے

زندگی نان و شکم کے سوا کچھ بھی نہیں ----- ؎

دل میں سب کا خوف ہے ، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں

اپنی منزل سے ہیں ابتک ناشناس و بے خبر

مطمئن ہیں آج تک ہم کفر کے دستور پر

ہائے وہ اسلام جو مسجد میں گھر کر رہ گیا

خانقاہوں کی بھی تنہائی کے صدمے سہہ گیا [2] ۔

حکمرانوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے عامۃ الناس نے بھی اسلام اور قرآن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ۔ خصوصاً قرآن سے بے اعتنائی ہی ہمارے زوال کا بنیادی سبب ہے ۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں اس مظلوم کتاب کے ساتھ ہمارا طرز عمل بڑا ہی سطحی نوعیت کا ہے اور عام مسلمانوں نے اسے محض

۱۔ فردوس ۔ ص ۶۲

۲ ایضاً ۔ ص ۶۳

چومنے ، آنکھوں سے لگانے اور بغیر سمجھے پڑھنے کے سوا اس سے کوئی فیض حاصل نہیں کیا۔ ماہر اس المناک صورت حال کو بڑی تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار "قرآن کی فریاد" میں کرتے ہیں ۔ یہ نظم ماہر کی دینی اور دعوتی منظومات میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور ایک درد مند ، راست فکر اور خدا خوف مسلمان کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے ----

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں ، آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویز بنایا جاتا ہوں ، دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں ،
جز دان حریر و ریشم کے اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے ، خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جیسے کسی طوطے مینا کو کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں ، اس طرح سکھایا جاتا ہوں ،
دل سوز سے خالی رہتے ہیں ، آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اک اک جلسہ میں پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لئے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں
نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے ، سچائی سے بڑھ کر دھوکا ہے
اک بار ہنسایا جاتا ہوں ، سو بار رلایا جاتا ہوں ،
یہ میری عقیدت کے دعوے ، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں ، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں
کس بزم میں میرا ذکر نہیں کس عُرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں ، مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں 1

۱- " فردوس " ص ۳۹

اور جب عملی طور پر کوئی مثبت تبدیلی آتی ہوئی نظر نہیں آتی تو ماہر ایک خوبصورت خواب دیکھتے ہیں - وطنِ عزیز میں اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ کا روح پرور اور جانفزا خواب --

اب زیست محفل ہے نہ مطرب نہ مغنی — گونجے ہوئے ہر سمت ہیں قرآن کے نغمات
سرمایہ مسلمان ، تجارت بھی مسلمان — مزدور کو شکوہ ہے نہ مالک کو شکایات
محمود و ایاز ایک ہی منزل کے ہیں راہی — ہے گرم سفر قافلۂ عدل و مساوات ۱ -

اور اس خواب کی تعبیر کے لئے وہ راہِ حق میں مسلسل محنت اور انقلابی طریقِ کار کو ضروری سمجھتے ہیں اور جو لوگ اپنے دلوں میں اسلامی نظام کی محبت اور اس کے نفاذ کی آرزو رکھتے ہیں ، ماہر انہیں اِس راستے پر گامزن ہونے اور قربانیاں دینے پر آمادہ کرتے ہیں - انہیں یقین ہے کہ یہ عظیم مقصد جان و مال کی غیر معمولی قربانی چاہتا ہے اور انقلابی طریقِ کار ہی اس منزل کو سر کر سکتا ہے - رجز کے پُر جلال لب و لہجے میں کہتے ہیں --

حنین و بدر کے افسانے پھر دہرائے جائیں گے
زمین کو سرخئ خونِ شہیدان کی ضرورت ہے
سکوں کیسا ، کہاں کی عافیت کوشی ، ارے نادان !
تری کشتی کو اک پُرشور طوفان کی ضرورت ہے
حسینی قافلہ میں آنے والے جلد آ جائیں ،
کہ پھر اسلام کو خونِ رگِ جاں کی ضرورت ہے
ادب کب تک رہے گا جاہلیت کے شکنجے میں ،
گرفتارِ قفس کو اب گلستان کی ضرورت ہے
وہ مشرق ہو کہ مغرب،ہر طرف ہے فتنہ سامانی
نظامِ زیست کو منشورِ قرآن کی ضرورت ہے

۱- فردوس ، ص ۸۲

زمانہ آ گیا جھوٹے خداوں سے بغاوت کا ،
مکمل اتباعِ حکمِ یزداں کی ضرورت ہے
خدا کا دین کفر و جاہلیت کے ہے نرغے میں ،
غزل خواں کی نہیں ہے اب رجز خواں کی ضرورت ہے [1] ۔

اس سلسلے میں وہ رہروانِ شوق کو مزید تلقین کرتے ہیں ۔۔

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے ہوئے چلو
ایقان کے چراغ جلاتے ہوئے چلو
جن کو مٹا سکے نہ کوئی دورِ انقلاب
کچھ ایسے نقش بھی تو بناتے ہوئے چلو
ضامن ہے عافیت کی سلامت روی کی چال
کہتا ہے کون ، حشر اٹھاتے ہوئے چلو
دل میں خدا کا خوف نہیں ہے تو کچھ نہیں
یہ بات ہر کسی کو بتاتے ہوئے چلو [2] ۔

ماہر کو زوال و ادبار سے نجات حاصل کرنے کا بس ایک ہی ذریعہ نظر آتا ہے ، اور وہ قرآن اور خلافتِ راشدہ کا نظام ہے ۔ دیکھئے کس یقین اور اعتماد سے کہتے ہیں ۔۔

تباہی ملِ اسلامی کی اب دیکھی نہیں جاتی
ضرورت ہے کہ پھر سے عام ہوں افکارِ قرآنی
جہاں کو پھر اُسی انداز سے ترتیب دینا ہے
عمرؓ کا جوش ہو ، بو ذرؓ کا ایمان ، فقرِ سلمانیؓ

۱۔ فردوس ۔ ص ۸۷
۲۔ ایضاً ۔ ص ۴۷

عمل صالح ، یقین محکم ، نظر پاکیزہ ، دل روشن
کیا جائے گا نافذ دھر میں منشورِ ربّانی -[1]

ماہر یقینِ کامل رکھتے ھیں کہ ھزار مخالفتوں اور ناسازگار حالات کے باوجود ایک دن آئے گا کہ پاکستان میں مکمل اسلامی نظام اپنی ساری برکات سمیت ضرور جلوہ گر ھوگا - ملاحظہ فرمائیے کس اعتماد سے کہتے ھیں --ہ

وہ لاکھ بگڑیں ، ھزار روٹھیں ، غضب میں آئیں کہ تلملائیں
خدا کی اس پاک سرزمین پر خدا کا قانون ھی چلے گا -[2]

جہاں تک ماہر کی مقصدی شاعری یعنی ملّی ، تبلیغی اور سیاسی منظومات کا تعلق ھے یہ جائزہ لینے کی ضرورت ھے کہ ادبی اعتبار سے ان کی کیا حیثیت ھے اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ان کا کیا مقام ھے ؟ یہ ضرورت اس لئے محسوس ھوتی ھے کہ عمومی طور پر ھمارے تنقیدی حلقوں میں مزھبی اور دینی حوالے کی تخلیقات کا جائزہ سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا اور اس نوعیت کی تحریروں کو " پروپیگنڈہ لٹریچر " کا لیبل لگا کر مسترد کر دیا جاتا ھے - بلاشبہ بہت سی مزھبی تحریریں ادبی قدر و قیمت نہیں رکھتیں اور محض وعظ و ثواب کی خاطر لکھی جاتی ھیں - مگر ماہر کی منظومات فنی اور تنقیدی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتی ھیں اور اس کے لئے میرے دلائل حسب ذیل ھیں :

مشہور نقاد ھنری ھڈسن نے اپنی کتاب Introduction to the study of Literature میں ادب کی ماھیت اور اجزائے ترکیبی پر بحث کرتے ھوئے لکھا ھے کہ ادب ان کتابوں کے مجموعے پر مشتمل ھوتا ھے جو اپنے موضوع اور ابلاغ کے اعتبار سے ھمہ گیر انسانی دلچسپی سے متعلق ھوں اور جن میں مسرت آفرینی اور حسنِ ادا دونوں کا سامان مہیا ھو[3] - پروفیسر اسرار احمد سہاوری کے الفاظ میں ادب درا‌صل صورتِ احساس کی نقش گری کا نام ھے یعنی جزبات و احساسات کو موزوں اور دلآویز

۱- " فاران " اپریل ۱۹۵۹ء ، ص ۳٦

۲- فردوس - ص ۸۸

3. Henry Hudson, Introduction to the Study of Literature 2nd ed. George G. Harrap & Co, London, 1930. Page, 10.

الفاظ میں بیان کر دینا ادب ہے ۔[1] اور اس کے لئے موضوع یا نظریات کی کوئی قید نہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو یونان کے ہومر ، جرمنی کے دانتے اور انگلینڈ کے ملٹن کی منظومات جو مذہبی مزاج اور پس منظر رکھتی ہیں ، ادب عالیہ میں شمار نہ کی جاتیں اور مولانا روم اور اقبال کی عظمت ادبی اعتبار سے مسلّم نہ ہوتی اور عہدِ حاضر کا نامور نقاد اور مفکر ٹی ایس ایلیٹ یہ نہ لکھتا کہ۔۔

" ادب کی عظمت صرف ادبی معیار پر ہی نہیں پرکھی جا سکتی بلکہ عظیم ادب کو اخلاقی اور مذہبی معیار پر بھی پورا اترنا چاہیئے " ۔[2]

یوں بھی مقصدیت کے بغیر ادب کا تصور کسی بھی حلقے میں قابلِ قبول نہیں رہا ۔ اختر انصاری کے نزدیک :

" کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے ہم دیکھیں گے کہ وہ ادبی کارنامہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے تحت عمل میں آئی ہے یا نہیں ۔ اگر اس میں یہ دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تو وہ صحیح و صالح اور زندہ و پائندہ ادب کا نمونہ ہے ورنہ نہیں " ۔[3]

مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر احتشام حسین کے نزدیک بھی اعلیٰ ادب کی صرف ایک پہچان ہے کہ[4] اس سے زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے اور عوامی جدوجہد کو تیز کرنے میں مدد ملتی ہے یا نہیں ؟ اسی لئے انہوں نے علی سردار جعفری کی شاعری کو " اعلیٰ پائے کی ترقی پسند " شاعری قرار دیا ہے کہ " اس سے پڑھنے والوں کے شعور کی حدیں متاثر ہوتیں اور عمل کی پر پیچ راہیں واضح ہوتی ہیں " ۔

۱۔ اعجاز بیان از پروفیسر اسرار احمد سہاوری ادارہ آئینہ ایام گوجرانوالہ ۔ س ۔ ن ۔ ص ۱۱

۲۔ ایلیٹ کے مضامین ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ۔ باب مذہب اور ادب ص ۱۹۵

۳۔ " آزادی ادب " از اختر انصاری ۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی طبع چہارم ۱۹۵۹ء ص ۵۷ ۔

۴۔ تنقیدی جائزے از احتشام حسین ۔ ص ۱۹۳

اسی طرح آلِ احمد سرور نے مولانا اقبال سہیل کی غزل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " یہ غزل کا اعجاز اور مولانا کی کرامت ہے کہ مولانا نے غزل کے بلیغ اشاروں میں ہماری قومی جد و جہد کی پوری داستان بیان کر دی اور غزل پھر بھی غزل رہی " ۔[1]

ظاہر ہے کہ جب کمونزم کی تبلیغ کے باوجود علی سردار جعفری کی شاعری پر کوئی حرف نہیں آیا اور مولانا اقبال سہیل کی غزل کو سیاست اور تاریخ نے مجروح نہیں کیا تو ماہر کی منظومات کی اسلامیت اور مقصدیت اسے نظم کے معروف معیارات سے دور کیسے لے جا سکتی ہے ؟ ماہر کا اپنا تصورِ فن اس سلسلے میں یہ ہے کہ :

" اللہ تعالی کی ذات پر یقین ہی کائنات کی حقیقت الحقائق ہے جس نے اس حقیقت کو نہ پایا ، وہ گمراہ ہو گیا اور اس کا فن اصلاحیت کے لئے وبال بن گیا " ۔[2]

اور ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ بھی اسی حقیقت کی نشاندھی کرتا ہے :

" میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سارا کا سارا جدید ادب لادینیت کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے اور وہ فطری زندگی کے مقابلے میں فوق الفطرت زندگی کی اہمیت و تقدیم سے ناواقف و بے خبر ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جسے میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں " ۔[3]

اصل بات یہ ہے کہ موضوع و خیالات سے قطع نظر بقول پروفیسر اسرار احمد سہاروی ؒ " اچھا کلام وہی ہے جس میں اچھاخیال اچھے پیرایے میں پیش کیا گیا ہو " ۔[4] اور ماہر نے اپنی مقصدی شاعری میں یہ تقاضا کماحقہ پورا کیا ہے ۔ انہوں نے ایک صالح انقلاب کی گن گائی ہیں ، ایک اصلاحیت پرور پاکیزہ دینی نظام کے نفاذ کی باتیں کی ہیں ، بے مثل کردار کے حامل اسلاف کے کارناموں کو دھرایا ہے اور تاریخ و مذہب سے بھی ایمان پرور اور عبرت آموز موضوعات تلاش کئے

۱۔ ادب اور نظریہ از آل احمد سرور مولانا اقبال سہیل کی شاعری ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء ، ص ۱۶۸

۲۔ فاران جنوری ۱۹۶۷ء ، ص ۳۷ ۔

۳۔ " ایلیٹ کے مضامین " (مذہب اور ادب) ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ ص ۲۳۵

۴۔ اعجاز بیان ۔ ص ۱۰۳

ھیں ، مگر ادب و فن کے تقاضوں کو بہرصورت ملحوظ رکھا ھے اور معاصر ترقی پسند شعراء کی طرح مقصدیت کی خاطر فن کا خون نہیں ھونے دیا ۔ شعری کیفیات اور حسن و لطافت میں کمی نہیں آنے دی اور قاری ان کے مطالعے سے روحانی مسرت کے علاوہ جمالیاتی حظ بھی حاصل کرتا ھے ۔ اس لئے مقصدیت کے باوجود ادبی اعتبار سے ماہر کی یہ منظومات " صحیح و صالح اور زندہ و پائندہ ادب " کا ایک نمونہ ھے اور ان کے اس اعزاز کو کسی کا تعصب ، انکار یا تنگ نظری کم نہیں کر سکتی ۔

ماہر کی نظم نگاری پر ایک طائرانہ نظر :

ماہر القادری اس اعتبار سے بڑے خوش نصیب ھیں کہ وہ غیر معمولی تنقیدی شعور اور خود احتسابی کی نعمتوں سے مالا مال ھیں ۔ وہ شعروں کی تراش خراش اور کاٹ چھانٹ کے معاملے میں مولانا حالی کے ہم خیال ھیں [1] ۔ چنانچہ اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ھیں :

" مجھے اس کا اعتراف ھے کہ میری شاعری میں غلطیاں بھی ھیں اور پست و کمزور اشعار بھی ھیں ۔ اسی احساس کے پیش نظر میں اپنے کلام کے چاروں مجموعوں کا انتخاب کر کے اسے یکجا کلیات کی صورت میں چھپواؤں گا اور دیباچہ میں بتاؤں گا کہ میری فلاں شعر میں کیا سقم تھا جس کے سبب میں نے اسے حذف کر دیا [2] " ۔

دوسری جگہ یوں لکھتے ھیں :

" میں اپنے چھپے ھوئے مجموعوں کو اب دیکھتا ھوں تو خدا جانتا ھے ندامت ھوتی ھے ۔ اگر مجھے ان کتابوں کے انتخاب کی فرصت ملی تو کلام کا خاصا حصہ چھانٹ دینا پڑے گا [3] " ۔

تنقیدی شعور اور خود احتسابی کا یہ عالم تھا کہ جن دنوں " فاران " ھا ھا نکلا تھا ان دنوں کراچی سے " گرد و پیش " نام کا ایک ماھنامہ شائع ھوتا تھا اس کے ایک خاص نمبر میں ماہر کی نظم بھی شائع ھوئی ۔ " فاران " میں اس خاص نمبر پر تبصرہ شائع ھوا اور ماہر نے خود اپنی نظم کی ایک خامی پر گرفت کرتے ھوئے لکھا کہ ماہر القادری کی نظم میں "نگاہ " کو " چشم " کے معنی میں استعمال

۱۔ دیکھئے مقدمہ شعر و شاعری/اور آمد اور آورد میں فرق مکتبہ جامعہ نئی دھلی اگست ۱۹۸۱ء ص ۵۹

۲۔ فاران اکتوبر ۱۹۵۶ء ص ۳۷ افسوس کہ ماہر کا یہ ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا ۔

۳۔ فاران مارچ ۱۹۷۳ء ، ص ۱۹

کیا گیا ھے جو قابلِ غور ھے -[1]

ماھر کی تنقیدی حس کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل تحریر سے بھی کیا جا سکتا ھے - اقبال پر اپنے ایک مضمون میں رومانی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ھوئے لکھتے ھیں :

" شاعری کی شوخی اور رنگینی کے ھم منکر نہیں ، وصل و اختلاط کی جھلکیاں بھی شعر میں آتی ھیں ، مگر یہ بڑا ھی نازک مقام ھے یہاں شاعر کو تلوار کی باڑ پر چلنا پڑتا ھے جس کے دونوں طرف نازک آبگینے چنے ھوتے ھیں - ذرا سی بے احتیاطی سے یہ آبگینے چور ھو جاتے ھیں - جن ھوس پرست شاعروں نے وصل و اختلاط کے عمل کو شاعری میں نظم کر دیا ، انہوں نے تہذیب و اصابت اور خود شعر و ادب کے ساتھ مذاق بلکہ ظلم کیا - شاعر کتنا ھی رنگین اور آوارہ مزاج کیوں نہ ھو ، وہ بہرحال انسان ھوتا ھے ، جانور نہیں ھوتا اور اصابت و حیوانیت میں سب سے نمایاں فرق امتیازِ حدود کا ھے " -[2]

ان گزارشات کے بعد میں ماھر کی منظومات کی عمومی خصوصیات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتا ھوں :

۱- ماھر کی منظومات کی پہلی بڑی خصوصیت یہ ھے کہ وہ واضح اور غیر مبہم ھیں - موضوعات کے اعتبار سے بھی اور زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی - ماھر حالی اور شبلی کے اسلوب کو جچا تلا ، واضح اور سلجھا ھوا قرار دیتے ھیں اور اسی کی تقلید کا مشورہ دیتے ھیں -[3] چنانچہ ان کی رومانی نظمیں ھوں یا منظریہ ، تاریخی ھوں یا تبلیغی و سیاسی ، یا کسی بھی ھیئت واسلوب میں ھوں ، ان میں کہیں ابہام ، الجھاؤ یا تعقید نہیں پائی جاتی - ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ھے کہ " جوش کی طویل نظمیں توازن اور تناسب سے عاری ھو جاتی ھیں " -[4] اور بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا جوش کی نظموں میں لفظوں کا ضیاع عام ھے -[5] مگر ماھر کے ھاں اس طرح کی مثالیں نہ ھونے کے برابر ھیں - ان کی نظموں میں غیر ضروری طوالت نہیں ، وہ غیر متوازن

۱- بحوالہ فاران اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۲۹ -

۲- اقبال ریویو کراچی جولائی ۱۹۶۰ء ، ص ۱۷

۳- فاران جنوری ۱۹۷۵ء ، ص ۲۵

۴- ماھنامہ "آجکل " دھلی اپریل ۱۹۵۸ء ، مضمون اردو نظم کا ارتقاء ، ص ۱۳

۵- نئے پرانے خیالات ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا - لاھور اکیڈمی لاھور - ۱۹۷۰ء ، ص ۱۳۰

نہیں ہوتیں اور وہاں لفظوں کا ضیاع نظر نہیں آتا - ان کے ہاں بعض معاصر خصوصاً ترقی پسند شعراء کا فکری الجھاؤ اور زبان و بیان کا ابہام بھی نہیں ہے -

۲- ماہر کی شاعری ہفت رنگ ہے - اس کے کئی زاویے ہیں - اس میں رومان بھی ہے اور قومی و ملی ترانے بھی - منظومہ شاعری بھی ہے اور دینی و تبلیغی و سیاسی منظومات بھی۔ پھر مسدس اور مثنوی میں حالی کا سا عجول انداز ہے ، مگر دھیما پن نہیں بلکہ باوقار رجزیہ اسلوب ہے - تاریخی اور سیاسی نظموں میں شبلی کا رنگ جھلکتا ہے جبکہ ملی اور فکری منظومات میں اقبال کا پرجلال آہنگ نمایاں ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں یکرنگی اور یکسانیت نہیں اور قاری اس کے مطالعے سے کسی اکتاہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا - اسی طرح انہوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں دادِ سخن دی ہے - یعنی قصیدے کی ہیئت بھی ہے اور مثنوی کی بھی - مسدس بھی ہے اور ترکیب بند بھی - مرثیہ بھی ہے اور قطعہ بھی - اور مخمس و ترجیع بند بھی - اور فنی اعتبار سے سب کے تقاضے پورے کئے گئے ہیں -

۳- دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ ماہر کی نظموں میں نہ طنز ہے نہ ہجو نہ مزاح ۔ سنجیدہ موضوعات ہیں ، مگر شگفتگی ، رعنائی اور بانکپن کا انداز ہر جگہ نمایاں ہے - حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے سچے جذبات کی کھلی اور بے خوف آواز ہے - ان کے لہجے میں باوقار مردانہ پن ہے اور ان کی شاعری ضعف یا سہل نگاری یا مرثیت کے بجائے حرکت و عمل اور بیداری و رجز کی نقیب بنی ہے - ماہر نے اپنی منظومات کو غم اور خوف کا ترجمان نہیں بننے دیا - دورِ غلامی اور قومی زندگی کے المیوں پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے جہاں انہوں نے کرب کا اظہار کیا ہے وہاں ساتھ ہی حوصلہ مندی اور عمل کا درس بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری نوحہ نہیں ہے ، البتہ کہیں کہیں الم کی صورت ہے جیسے مثلاً نواب بہادر یار جنگ والے مرثیہ میں ، مگر وہاں بھی قنوطیت حاوی نہیں ہوتی اور اسے پڑھ کر منفی احساسات کی بجائے گداز اور لذتِ غم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو شاعری کی جان ہے - ماہر کی یہ انفرادیت ہے کہ ان کے ہاں غم یا افسردگی

نظر نہیں آتی - راسخ العقیدہ باعمل مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ کسی منفی احساس میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری پر اس کی چھاپ دکھائی دیتی ہے - ان کے ہاں حوصلہ مندی اور مردانگی کا انداز غالب ہے اور غالباً اس کا سبب اقبال کا وہ گہرا اثر بھی ہے جو ماہر کے رگ و پے میں رچ بس گیا تھا اور جس کا پرتو ان کی شاعری پر خاصا گہرا ہے - ڈاکٹر احمد سجاد (شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی بھارت) کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ :

" اقبال کے بعد ماہر بیسویں صدی کی اردو شاعری میں دوسرے سب سے بڑے رجائی شاعر تھے جن کے نشاطیہ رنگ اور جمالیاتی طرز اظہار نے ہماری شاعری کو ایک نئی زندگی بخشی ہے - ان کے واضح فکر اور زندگی کے صحتمند نقطۂ نظر نے انہیں زیادہ دنوں تک یک رخا اور غیر متوازن نہ رہنے دیا - آگے چل کر روایت کے ساتھ جدّت اور مغربی نظریات کسی اندھی تقلید کے بجائے دینی و تعمیری مطمحِ نظر نے انہیں ہمیشہ اعتدال پر قائم رکھا " -[۱]

۲- ماہر کی منظومات کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فن یا خیال کی کسی سطح پر احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے - حالانکہ یہ وہ دور تھا جب مغرب کی تہذیبی یلغار اور اشتراکیت کی تبلیغ و ترویج بڑے عروج پر تھی اور ان کے ہم عصر ترقی پسند شعراء کا پورا گروہ اشتراکی اور مغربی فلسفیوں اور ادیبوں کی نقل میں بے سوچے سمجھے اسلام سے بدگمان ہو کر تشکیک اور الحاد کے چنگل میں پھنس گیا تھا اور دردناک لطیفہ یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ان مصنفین پر بعض ایسے مغربی مفکرین کا گہرا اثر نظر آتا ہے جن کا مسلک یورپ میں غیر مقبول ہو کر رد ہو چکا تھا گویا ہندوستان میں دنیا کی عام ادبی اور علمی لہر کوئی پچاس سال بعد پہنچی " -[۲] اور یہ وہ دور تھا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ ہی کے الفاظ میں " ہندوستان کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ہندوستان تو درکنار اسلام کی صداقت اور تاریخ اسلام کے شاندار ماضی کے متعلق بھی لاعلمی اور جہالت بلکہ تنقیص کے خیالات موجود تھے " -[۳] لیکن ماہر کی منظومات کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ وہ اسلام،

۱- ماہنامہ " نگار " حیدر آباد دکن مئی جون ۱۹۸۷ء ، ص ۳

۲- اردو ادب ۱۸۵۷ تا ۱۹۶۶ء از ڈاکٹر سید عبداللہ مکتبۂ خیابان ادب لاہور - ۱۹۶۷ء ، ص ۸۵ -

۳- ایضاً - ص ۱۲۲ ، ۱۱۵

تاریخِ اسلام ، برصغیر کی ملتِ اسلامیہ اور ایسے ہی دیگر مسائل کے بارے میں مکمل یکسوئی اور شرحِ صدر رکھتے ہیں اور شروع سے آخر تک ان کے خیالات و عقاید میں کمال درجے کی استقامت اور ہم آہنگی نظر آتی ہے - وہ توحید اور اسلامی نظریے کے پرجوش پرچارک ہیں اور ہر اس تصور کو رد کرتے ہیں جو اسلام سے ٹکراتا ہے - وہ حکیمانہ ذہن اور سنجیدہ سوچ کے حامل ہیں - چھچھورا پن ان کی کسی نظم میں دکھائی نہیں دیتا - ان کا باقاعدہ ایک نظامِ فکر ہے اور کچھ پاکیزہ معیارات ہیں جن پر حالات و معاملات کو پرکھ کر انہوں نے ایک قطعی موقف اختیار کیا ہے -

ماہر کی منظومات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی ذہین اور بہادر انسان تھے - انہوں نے جو موقف اختیار کئے ، ان کے لئے وہ محکم دلائل رکھتے تھے اور انہیں صحیح ثابت کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھے ان کے احساسات ناپختہ نہیں ہیں اور نہ سطحیت ، تضاد یا پراگندگی کا احساس ہوتا ہے - صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے بڑی متانت اور گہرائی کے ساتھ مختلف مسائل پر تفکر کیا ہے اور اپنے موضوعات کی تمام تہوں سے وہ بخوبی آگاہ ہے - لطف یہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں شاعرانہ حسن اور شہزادہ احساس جاری و ساری ہے اور انہیں پڑھ کر قاری کا ذہنی انبساط و آگہی اور اعتماد کے احساسات حاصل کرتا ہے - اچھے شاعر کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنی فکر سے جہاں ہدایت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے وہاں قاری کو تسکین ، مسرت اور احساس طمانیت بھی مہیا کرتا ہے - مشہور نقاد SCOTT JAMES اپنی کتاب The Making of Literature میں یونان کے فلسفی ڈرامہ نگار یوری پیڈیز (EURIPIDES) کے حوالے سے لکھتا ہے (ترجمہ)

" شاعر اگر صداقت کا علمبردار ہو ، وہ کسی فکرِ محکم سے احساس کو مملو کرے اور کار گاہِ زندگی میں رزم آرا ہونے کے لئے صحیح رہنمائی دے اور کسی لحاظ سے افراد کو بہتر بنا کر قوم کا معاون بنے تو اس کی ستائش کی جانی چاہیئے " -[2]

اور ماہر بلاشبہ اس معیار پر پورا اترتے ہیں -

2- Scott James R.A. The making of literature London, Scher & Warbury, 1962. Page 36.

٥- ماہر اردو زبان کے محاورہ اور روزمرّہ پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور صحتِ زبان کو وہ نظم و نثر میں بنیادی اہمیت دیتے ہیں - چنانچہ اُس زمانے میں جبکہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر زبان اور شاعری کو خاصا نقصان پہنچ رہا تھا ، ماہر نے اس رجحان کی نہ صرف شدت سے مخالفت کی بلکہ اپنے عمل سے زبان و بیان کی صحت اور متانت کا تحفّظ کیا - زبان کی درستی کے معاملے میں ماہر بڑے متشدّد تھے اور کسی سے رو و رعایت نہیں کرتے تھے (اس کا تجزیہ ایک الگ فصل میں آئے گا) ان کے اس طرزِ عمل کا یار لوگوں نے مذاق بھی اڑایا [1] - بہر حال یہ بات مسلّم ہے کہ ماہر نے فارسی و اردو شعر و ادب کا مطالعہ بڑی عرق ریزی سے کیا تھا - وہ زبان کی ساری نزاکتوں سے باخبر تھے اور ان کا شاعرانہ مزاج اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہو گیا تھا یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں میں ہمیں خیالات و نظریات کے ساتھ ساتھ زبان کا کچا پن کہیں نظر نہیں آتا -

٦- ماہر القادری کا شمار بلاشبہ ان شعراء میں ہوتا ہے جو آہنگ ، ترنم اور نغمے کے رازدار ہیں اور تمام متعلقہ تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں چنانچہ ماہر کی منظومات کی روحِ رواں اور تقریباً بنیادی خصوصیت ان کی موسیقیت اور غنائیت ہے - وہ خوب جانتے ہیں کہ شعر اور موسیقی میں کیا ربط ہے اور وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی باخبر ہیں کہ قاری سب سے پہلے شعر کی غنائیت سے متاثر ہوتا ہے -

دراصل ماہر نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا وہ مشاعروں کا دور تھا - وہی شاعر مقبولِ عام ٹھہرتا تھا جس کی آواز اور لہجہ سے موسیقی کو خاص نسبت ہوتی تھی چنانچہ فانی ، جگر اور اختر کی طرح ماہر نے بھی شعر پڑھنے کا ایک خاص انداز اپنایا اور وہ اس میں بہت کامیاب رہے اور انہیں کامیاب ہونا ہی چاہیئے تھا کہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ : " شاعری تو ایک لحاظ سے ہے ہی موسیقی اور موسیقی بھی اس نوع کی جسے کان کے علاوہ دل بھی سن سکتا ہے - شعر کی ایک داخلی موسیقی بھی ہوتی ہے جس کو گائے بغیر بھی گایا اور سنا جا سکتا ہے اور اگر شاعری کبھی اپنی اندرونی موسیقی کے علاوہ نغمہ و رباب کی بھی ہمقدم بن جائے تو اسے عیب نہ کہئے کیونکہ یہ

١- دیکھیے : مکاتیب خضر از محمد خالد اختر ، " افکار " کراچی دسمبر ١٩٧٢ء ، ص ١٢ تا ١٦

تو وہ ہنر ہے جو شعر کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔[1]

بہرحال موسیقی ماہر کی شاعری کا جزوِ لاینفک ہے اور غزلوں کی طرح انکی نظموں میں بھی حسن ، دلکشی اور جاذبیت جیسے عناصر اجاگر ہو گئے ہیں۔کہیں وہ مترنم قافیے اور ردیفیں استعمال کرتے ہیں اور کہیں موسیقی میں ڈوبی ہوئی بحروں سے روانی اور غنائیت پیدا کرتے ہیں - پھر الفاظ کی تکرار اور آہنگ سے وہ ایسا صوتی تاثر پیدا کرتے ہیں جس میں گداز ، بانکپن اور حسن ہوتا ہے اور یہ خصوصیات قاری کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں -

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ساری خصوصیات کے باوجود غزل اور خاکہ نگاری کی طرح اردو نظم نگاری میں بھی انہیں کیوں یکسر نظر انداز کیا گیا ہے اور تنقید کی کسی کتاب یا مقالہ میں ان کا نام ڈھونڈنے سے کیوں نہیں ملتا - اس کا سبب ایک تو یہ نظر آتا ہے کہ ان کے پہلے تین مجموعہ ہائے کلام ۱۹۲۱ ، ۱۹۲۳ء اور ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئے ، مقبول بھی ہوئے اور ان کے دو دو ایڈیشن منظرعام پر آئے ، مگر ۱۹۳۲ء کے بعد کسی کتاب کا بھی تیسرا ایڈیشن نہ چھپا جسکی وجہ سے خصوصاً قیام پاکستان کے بعد کسی نقاد کی ان کتابوں تک رسائی مشکل ہو گئی اور غیر جانبدار اصاف پسند نقاد بھی ان کے بارے میں کوئی رائے دینے سے معذور رہے -

مگر اصل سبب اس بے توجہی کا یہ ہے کہ ماہر القادری نے حیدر آباد سے بمبئی تک ادبی اور علمی جلسوں میں اور پھر کراچی آ کر اپنے ماہانہ رسالہ " فاران " کے ذریعے ترقی پسند ادباء شعراء اور نقاد حضرات کے خلاف باقاعدہ محاذِ جنگ کھولے رکھا اور ان کی وابستگیاں بھی جماعت اسلامی سے منسلک ہو گئیں اور یہ دونوں وجوہ اس امر کے لئے کافی تھیں کہ انہیں ہر شعبے میں کامل نظر انداز کیا جائے اور کبھی ناگزیر موقع آ جائے تو ان کا ذکر غیر سنجیدگی اور طنز و استہزا کے انداز میں کیا جائے اور جیساکہ ڈاکٹر عبدالغنی نے لکھا ہے کہ بالعموم اردو تنقید کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ شاعری اور دینداری کو یکجا دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے یہاں تک کہ

۱- سخن ور نئے اور پرانے - جلد اول - ص ۴۳

اقبال کی عظیم شاعری میں بھی بہتیرے نقادوں کو اسلام کھٹکتا ہے - اسی طرح کہنا چاہئیے کہ ماہر القادری کی اسلام پسندی ان کے اور نقادوں کے درمیان حجاب بن گئی "[1] - ورنہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ علامہ اقبال کے بعد مولانا ظفر علی خان کے سوا کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس کی نظموں میں اتنا تنوع ، رنگا رنگی ، حسن و دلکشی اور رعنائی ، مقصدیت اور زندگی اور فنی پختگی اور سنجیدگی پائی جاتی ہو جتنی ماہر کے ہاں موجود ہے -

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ماہر کی غزل کے حوالے سے حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اردو غزل کے اہم نقادوں میں سے کسی نے بھی ماہر کی غزل سے اب تک اعتنا نہیں کیا اور پھر سوال کیا ہے کہ کیا ماہر کی توانا روایتی غزل سے اعتنا نہ کر کے ہم اپنی تاریخِ غزل کی ایک اہم کڑی کو کھو بیٹھنے کے جرم کا ارتکاب تو نہیں کر رہے ؟ یہ سوال ہمارے آپ کے سبھی کے سوچنے کا ہے؟[2] -

غزل کی طرح نظم کے حوالے سے بھی بالکل یہی سوال نقادانِ فن کے سامنے رکھا جا سکتا ہے کاش ہمارے تنقید نگار ذاتی اختلافات ، تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے ماہر کی توانا اور زندہ نظم سے صرفِ نظر نہ کرتے -

---

۱- ماہنامہ " فنکار " حیدر آباد دکن مئی جون ۱۹۸۷ء ، (گوشہ ماہر) ص ۳۲

۲- سہ ماہی " سیارہ " لاہور - نمبر ۲۳ - سالنامہ ۱۹۸۶ء ، مضمون ماہر القادری کی غزل ، از ڈاکٹر تحسین فراقی - ص ۹۹

باب - ۵ .

==========

ماهر القادری کی ناول نگاری

========================

ماہر القادری نے مختلف وقتوں میں مندرجہ ذیل چار ناول لکھے :-

۱- جب میں جوان تھی ۱۹۳۲ء صت قلندر بکڈپو ، لاہور

۲- کردار ۱۹۴۴ء ادارۂ اشاعتِ اردو ، حیدر آباد دکن -

۳- کامجی ہاؤس مئی ۱۹۴۸ء کتب خانہ عابد روڈ ، حیدر آباد دکن -

۴- دُرِّ یتیم (سیرت رسول پر مبنی) ۱۹۴۹ء عالمگیر الیکٹرک پریس ، لاہور -

اور زیر نظر باب میں ان چاروں ناولوں کا فنی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے گا ، مگر اس سے پہلے ناول اور اردو ناول نگاروں کا ضروری تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ ماہر کی ناول نگاری کا مقام متعین کرنے میں آسانی ہو -

ناول کیا ہے ؟

============

ناول ــ داستان ، افسانہ اور ڈرامہ کی طرح ایک مستقل نثری صنفِ ادب ہے جو اپنے نام (NOVEL) ہی سے ظاہر ہے کہ اردو میں مغرب کے زیرِ اثر شروع ہوئی چنانچہ ہمیں مغرب ہی کے مستند ذرائع سے معلوم کرنا چاہئے کہ اس کی تعریف (Definition) کیا ہے - اس ضمن میں انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں ناول کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے :-

Novel: "A fictious prosenarrative or tale of considerable length (now usually one long enough in Full one or more volumes) In which characters and actions Representative of the real life of past or present times are portrayed in a plot of more or less complexity."[1]

ڈاکٹر سہیل بخاری کے بقول " ناول اس نثری قصے کوکہتے ھین جس مین کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی و واقعی عکاسی کی گئی ھو "[2] دوسرے لفظون مین ناول مین اِسی زمین اور اِس پر بسنے والے انسانون کے حقائق و واقعات کی عکاسی سادگی اور حقیقت پسندی سے مگر ادبی زبان مین کی جاتی ھے -

آلِ احمد سرور کے نزدیک " ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ھے "[3] وہ مزید لکھتے ھین " یہ زندگی کی تصویر بھی ھے اور تفسیر بھی - خوابِ جوانی کی تعبیر بھی ھے اور سب سے بڑھ کر تنقید بھی "[4]

یورپ مین ناول اٹھاروین صدی عیسوی مین اس وقت وجود مین آیا جب انقلابِ فرانس نے پورے یورپ کی تہذیبی و معاشرتی اور علمی دنیا کو ھلا کر رکھ دیا اور بعد ازان صنعتی انقلاب نے ایک نیا معاشرہ پیدا کیا - یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی تہذیب توھمات کے حصار سے نکل کر عقلیت پرستی اور مادّیت کے دور مین قدم رکھ رھی تھی اور سائنسی و مشینی زندگی نے داستانون کی تخییل آرائی ، مبالغہ آمیزی ، طول بیانی،

---

(1) Encyclopedia Britanica Neppkean Ozanalyols page 673, Vol. (16)

۲- " ناول کافن " از سہیل بخاری ، مکتبہ جدید ، لاھور ، بار اول ۱۹۶۰ء ، ص ۱۱

۳- " تنقیدی اشارے " از آل احمد سرور ، نذیر اینڈ سنز ، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ ۱۹۴۲ء ، ص ۲

۴- ایضاً

اور غیر فطری انداز کو مسترد کر دیا تھا ۔ چنانچہ ناول زمانے کی ضرورت بن کر منظرعام پر آیا اور یہ محض تفریح اور تفننِ طبع کا ذریعہ بننے کی بجائے معاصر تہذیبی اقدار اورحقیقی زندگی کا عکس بن گیا ۔

برصغیر پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب جملہ علوم و فنون اور اعمال و اطوار پر غالب انگریزی تہذیب اور مغربی علوم کے اثرات مرتب ہونے شروع ہوئے تو قدرتی طور پر اس صورتِ حال سے شعرو ادب بھی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے ۔ انگریزی ناول بھی ہندوستان میں آئے اور تعلیم یافتہ طبقہ اس سے متاثر ہونے لگا اور جیساکہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا بیان ہے " قدیم افسانوں کے ردعمل سے ، مگر زیادہ تر انگریزی ادب سے متاثر ہو کر اردو میں ناول نویسی کی بنیاد اسی دور میں ڈالی گئی ۔[۱]

ناول کے عناصر ترکیبی
==================

نقادان فن کے نزدیک ناول کے عناصر ترکیبی حسبِ ذیل ہیں :-

۱- پلاٹ ۲- کردار ۳- مکالمہ

۴- فلسفۂ حیات ۵- منظر نگاری یا ماحول کی پیشکش

۶- حقیقت نگاری ۔

۱- پلاٹ :-
========

علی عباس حسینی کے بقول "

" پلاٹ واقعات کے اس خاکے کو کہتے ہیں جو ناول نویس کے پیش نظر

۱- " ادب اور ادیب " از ڈاکٹر اعجاز حسین ادارہ انیس اردو الہ آباد ، ۱۹۶۰ء ص ۲۳

شروع ھی سے رھتاھے - قصہ کی ساری دلچسپیاں اسی کی ترتیب پر مبنی ھین - اسے جاننا چاھیئے کہ وہ کیونکر قصہ چھیڑے گا، ناظر کی دلچسپی کس طرح بڑھائے گا اوراس دلچسپی مین مدوجزر کہاں کہاں پیدا کرے گا - اسے قصہ اس طرح کہنا چاھیئے کہ وہ موثر ھو اور اس مقصد و غرض کے حاصل کرنے مین کامیاب ھو جس کے لیے وہ ناظر کو زحمت دینا چاھتا ھے " - [1]

پھر بعض پلاٹ سادہ ھوتے ھین - اور بعض مرکب ، سادہ پلاٹ مین پیچیدگی نہین ھوتی - اس کی کہانی ایک ھی تانے بانے سے تیار کی جاتی ھے - جبکہ مرکب پلاٹ مین کئی کہانیاں ایک دوسرے سے پیوست ھوتی ھین - مثال کے طور پر " امراؤ جان ادا " کاپلاٹ سادہ ھے اور شروع سے آخر تک ساری کہانی ایک طوائف کے گرد گھومتی ھے - جبکہ پریم چند کا " گئودان " مرکب پلاٹ کی ایک اچھی مثال ھے -

پلاٹ عموماً دو قسم کے ھوتے ھین - منظم اور غیر منظم ، منظم پلاٹ مین ڈاکٹر سلام سندیلوی کے الفاظ مین " کہانی کے ترکیبی اجزاء ایک دوسرے سے گتھے ھوتے ھین " - [2] جبکہ غیر منظم پلاٹ کے اجزائے ترکیبی مین منطقی ربط کی کمی ھوتی ھے- ڈاکٹر خورشید الاسلام کے نزدیک لازم ھے کہ کہانی مین کھانچے نہ ھون ، تضاد نہ ھو ، اجزا متوازن اور متناسب ھون، واقعات مین بے سا ختگی اور حالات کی رفتار مین منظم ھو - کہانی فطرت کے مطابق اور انجام منطقی ھو - [3]

ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نور الحسن ھاشمی کے خیال مین :

" پلاٹ کو کافی لچکدار ھونا چاھیئے ورنہ مکمل طور پر گتھا ھوا پلاٹ

۱- ناول کی تاریخ اور تنقید از علی عباس حسینی -لاھور اکیڈمی- لاھور ۱۹۶۳ء ص ۷۷، ۷۸
۲- ادب کا تنقیدی مطالعہ از سلام سندیلوی ، نسیم بکڈپو لکھنو ۱۹۵۹ء ص ۸۵
۳- تنقیدین ، از ڈاکٹر خورشید الاسلام ، انجمن ترقی اردو ھند علی گڑھ طبع اول ۱۹۵۷ء ص ۹۳

تو محض ریاضی کا فارمولا بن کر رہ جائے گا ۔ اس میں مکانیکیت پیدا ہو جائے گی اور آورد اور مصنوعی پن آ جائے گا ۔ اسی لیے بڑے ناول نگاروں کے پلاٹ تمام تر بے حد گٹھے ہوئے نہیں ہوتے ضروری بات یہ ہے کہ پلاٹ کا مجموعی اثر نہ بگڑنے پائے " ۔[1]

۲۔ کردار نگاری

بقول ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی :

" کردار نگاری کے سلسلہ میں پہلی شرط یہ ہے کہ کردار زندگی کے جیتے جاگتے نقشے ہوں اور ناول پڑھنے والا ان کو ویسا ہی سمجھے جیساکہ وہ اپنے ملنے والوں یا دوستوں کو سمجھتا ہے یا ان سے ہمدردی اور نفرت کر سکتا ہے ...... کسی ناول کا عمدہ کردار پڑھنے والے کی زندگی پر اس طرح حاوی ہو جاتا ہے جس طرح زندہ آدمی۔ عموماً ناول کے واقعات فراموش ہو جاتے ہیں ،مگر اس کے عمدہ کردار کی یاد ہمیشہ قائم رہتی ہے " ۔[2]

ناول میں کرداروں کی شمولیت دو طرح سے ہوتی ہے یعنی تشریحی اور ڈرامائی ۔ پہلے طریقے کی رو سے ناول نگار اپنے کردار کے جذبات و خیالات کو خود بیان کرتا ہے جبکہ دوسرے طریقے میں کردار اپنی حرکات و سکنات سے اپنے آپ کو روشناس کراتا ہے ۔[3]

کردار کی تعمیر خاصا دشوار کام ہے اور ناول نگار خاصی سوچ بچار سے

۱- ناول کیا ہے ؟ از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی و ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۱۹۳۸ء ، ص ۲۲-۲۵

۲- ایضاً ، ص ۲۶

۳- ایضاً ، ص ۲۸

کردار کو منزل بمنزل آگے بڑھاتا اور اس کے عیوب و محاسن کو سامنے لاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے حالات و خیالات میں تبدیلی کیوں پیدا ہوئی ؟ آیاماحول نے اسے متاثر کیا یا تجربات نے اس میں تبدیلی پیدا کر دی ۔ ناول نگار ان دونوں اثرات کو اپنے کردار میں نمایاں کرتا ہے ۔[1]

ناول میں پلاٹ اور کردار نگاری کا باھمی تعلق بڑا اہم ہے اور ناول نگار کو اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیت سے دونوں کو مطلوبہ معیار کے مطابق لانا چاھیئے کہ اسی پر ناول کی کامیابی کا انحصار ہے ۔

۳۔ مکالمہ نگاری

===========

مکالمہ بھی ناول کا اہم جزو ہے ۔ یہ قصہ کو آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے اور اس کے ذریعے ناول نگار کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے ۔ کامیاب مکالمہ وہ ہے جس میں آمد ہو ، آورد اور تکلف نہ ہو ، فطری ماحول کے مطابق ہو اور کرداروں کے جذبات و احساسات اورخیالات کا آئینہ دار ہو ۔ مکالمے کا پلاٹ سے گہرا تعلق ہونا چاھیئے ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کے نزدیک مکالموں میں سادگی اور برجستگی پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بالکل روز مرہ کی گفتگو پیش کی جائے تو اس کا خطرہ ہے کہ کہیں غیر ادبی زبان نہ ہو جائے اور اگر زبان میں خوبصورتی پیدا کی جائے تو خدشہ ہے کہ کہیں اس میں تصنع اور آورد نہ پیدا ہو جائے ۔ لیکن ایک ماہر ناول نگار ان دونوں اسلوبوں میں سمجھوتہ کر لیتا ہے اور درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے ۔[2]

۱۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ از سلام سندیلوی ، ص ۹۰

۲۔ ایضاً ، ص ۹۳

٢۔ ناول نگار کا فلسفۂ حیات

ناول نگار جس قسم کے ماحول کی عکاسی کر رہا ہو ۔ خواہ جس نوعیت کے کردار موضوعِ بحث ہوں ، مگر وہ اپنا مخصوص نقطۂ نظر پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور کرداروں کی حرکات ، ان کے مکالموں اور قصے کے تجزیے سے وہ اپنا فلسفۂ حیات پیش کرتا ہے ۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام اس سلسلے میں اپنا فیصلہ سناتے ہیں :۔

" ناول نگار کو حق حاصل ہے کہ وہ معاشرت ، سیاست اور مذہب کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے اور اپنے گرد و پیش کی زندگی پر تنقید کرے ۔ البتہ یہ تنقید کرداروں کے عمل سے ظاہر ہونی چاہیئے " ۔[1]

اور ڈاکٹر سلام سندیلوی ناول میں فلسفہ حیات پر یوں اظہار کرتے ہیں :۔

" دراصل ناول نگار مفکر بھی ہوتا ہے اور مفسر بھی ۔ پہلے وہ زندگی کے متعلق فکر کرتا ہے ، پھر اس کی تفسیر لکھتا ہے ۔ وہ ایک معلمِ اخلاق کی طرح اخلاقیات کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ایک داستان گو کی طرح زندگی کے واقعات اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس کا فلسفۂ حیات سمجھنے میں ہم کو دقت نہیں محسوس ہوتی ہے " ۔[2]

غرض ایک کامیاب ناول نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا نقطۂ نظر اخلاقیات کے درس کی طرح براہِ راست ہرگز پیش نہ کرے بلکہ کرداروں کی تعمیر اس انداز میں کرے کہ اس کا مطمعِ نظر قاری کے دل میں گھر کر جائے ۔

١۔ تنقیدیں ، ص ۔ ٩٢

٢۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ ، ص ٩٩

۵- منظر نگاری

بقول سید عابد علی عابد :

" ہر ناول کسی عہد کی ، معاشرت کی یا اس معاشرت کے کسی پہلو کی پوری جھلک دکھانے کا مدعی ہوتا ہے "[1] اور فنی نقطہ نظر سے اس زمانے کا طرزِ رہائش ، رسوم و رواج ، عقاید و توہمات ، ماحول اور کردارون کے عادات و خصائل سب منظر نگاری کے دائرہ مین آتے ہین - ناول نگار اسی ماحول کو پیش کرتا ہے جس کا اسے تجربہ ہوتا ہے یا جس کے بارے مین وہ مکمل ، ٹھوس معلومات رکھتا ہے - اسکے علاوہ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی " ہر ناول مین ایسے بیانات کا کافی حصہ ہونا چاہیئے جو مصوری اور فطرت نگاری کی اچھی مثال ہون "-[2]

۶- حقیقت نگاری

ایک ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ حقیقی واقعات کو ان کے صحیح تناظر مین پیش کرے اور مبالغے اور غلو سے پرہیز کرے ، مگر بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی ادب مین حقیقت نگاری بڑی حد تک ناممکن ہے کہ حقیقت نگاری تو صرف سائنس مین ممکن ہے[3] - اور ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے جیساکہ لکھا ہے تجربات و واقعات کے اظہار و بیان مین زیبِ داستان کے لیے تھوڑی بہت رنگ آمیزی کرنی پڑتی ہے - پھر بھی ناول نگار کو امکانی حد تک حقیقت نگاری مین احتیاط سے کام لے کر ناول کو صداقت کا آئینہ دار

۱- اصولِ انتقادِ ادبیات از عابد علی عابد مجلس ترقی ادب ، لاہور ۱۹۶۰ ء ، ص ۵۹۹
۲- ایضاً " ناول کیا ہے ؟" ، ص ۳۷
۳- ادب کا تنقیدی مطالعہ ، ص ۱۰۱

بنانے کو کوشش کرنی چاہئے ۔[1]

حقیقت نگاری ہی کے ضمن میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ :

" ناول میں سب سے زیادہ اہم چیز زندگی کی تخلیق ہوتی ہے ۔ زندگی ہر صنف اور جتنی قریب اکثر ناول زندگی کی تخلیق کرتی ہے، کیلیے ضروری ہے مگر جتنی مکمل طور پر اتنی کوئی صنفِ ادب نہیں کرتی ۔"[2]

ناول کے ان عناصرِ ترکیبی کے علاوہ بعض ایسی خصوصیات بھی ہیں جو نقادانِ فن ناول کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ۔ مثال کے طور پر آل احمد سرور اچھے ناول کے لئے " بصیرت ، رفعتِ خیال اور پروازِ مسلسل[3] " کو ضروری سمجھتے ہیں اور ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے میں " کامیاب ناول وہی ہے جس کا پہلا جملہ قصہ شروع کر دے ، توجہ کھینچ لے ، دل کو لگائے ، دلچسپی شروع ہو جائے ۔ پہلا باب اس واقعہ یا واقعات کو شروع کر دے جو تمام قصے کی بنیاد رہیں گے "[4] اور ڈاکٹر خورشید الاسلام ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

" فن‌کار کو انسان دوست (HUMANIST) ہونا چاہئے ۔ انسان کی فطرت سے بخوبی واقف ہونے کے لیے اور یہ جاننے کے لیے کہ کس قسم کے کرداروں کو اور کرداروں کی کن خصوصیات کو نمایاں کرنا چاہئیے ، یہ ضروری ہے کہ ناول نگار بنیادی طور پر انسان دوست ہو ۔"[5]

۱۔ اردو ناول میں طنز و مزاح از ڈاکٹر شمع افروز زیدی ناشر پروگریسو بکس ، لاہور ۱۹۸۸ء ، ص ۳۰

۲۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی سندھ ساگر اکادمی ، لاہور ، مئی ۱۹۶۸ء ص ۲۷۶ ۔

۳۔ تنقیدی اشارے ، ص ۹

۴۔ " ادبی تخلیق اور ناول " از ڈاکٹر احسن فاروقی مکتبہ اسلوب ناظم آباد کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۳۸

۵۔ تنقیدیں ، از ڈاکٹر خورشید الاسلام ، ص ۹۰

اردو کے اہم ناول نگار

بیشتر تنقید نگاروں نے مولوی نذیر احمد (١٨٣٦ - ١٩١٣ء) کو اردو کا پہلا ناول نگار قرار دیا ہے ۔ مراۃ العروس (١٨٧٢) ، توبۃ النصوح (١٨٧٧ء) ، فسانہ مبتلا (١٨٨٥ء) اور ابن الوقت (١٨٨٨ء) ان کے مشہور ناول ہیں ۔ جو دراصل تعلیمی ، اخلاقی اور مذہبی و تہذیبی نقطہ نظر سے لکھے گئے ۔ ان ناولوں میں بقول آلِ احمد سرور " پلاٹ مکمل اور واضح ہے۔ابتداء، وسط اور تکمیل کا احساس بھی ہوتا ہے "[1] البتہ آل احمد سرور ہی کے الفاظ میں نذیر احمد کردار نگاری کے گُر سے پوری طرح واقف نہیں ۔ ان کے کردار فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان ، نذیر احمد سب کچھ بھول سکتے ہیں ، مگر وہ مقصد نہیں بھول سکتے جس کے ماتحت قصہ لکھا گیا ہے ۔[2] تاہم بقول کے ۔ کے ۔ کھلر " مولوی نذیر احمد نے انیسویں صدی کے اواخر کی مسلم سوسائٹی کی حقیقی زندگی کی فنکارانہ عکاسی کی ہے ۔ خاص کر اس سوسائٹی کے متوسط درجے کی "۔[3]

اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی رائے بالکل درست ہے کہ " نذیر احمد کی عظمت اس لحاظ سے مسلّم ہے کہ وہ زندگی کے مصور بھی ہیں اور مبصر بھی ۔ انہوں نے ادب کو مقصدیت سے آشنا کیا۔ ناول کے فن سے ایک بہتر زندگی کی تشکیل و تعمیر کا کام لیا اور آج بھی یہی چیز فن کی معراج ہے"۔[4]

١- " تنقیدی اشارے " ، ص ٣

٢- ایضاً

٣- اردو ناول کا نگار خانہ از کے ۔ کے کھلر ، ناشر سیمانت پرکاش ، دھلی ١٩٨٣ء ، ص ١٣

٤- مولوی نذیر احمد دھلوی احوال و آثار ، ناشر مجلس ترقی ادب ، لاہور ١٩٧١ء ، ص ٣٣٦

٥ - ایضاً ص ٥٥

پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۷-۱۹۰۳ء) نے یوں تو متعدد ناول لکھے، مگر ان کی اصل شہرت فسانہ آزاد (۱۸۸۰ء) کی وجہ سے ہے ۔ چار ہزار صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ناول دراصل لکھنو کی زوال پذیر تہذیب کا عجیب وغریب نمونہ ہے اور سرشار نے اس تہذیب کو جزئیات سمیت محفوظ کر لیا ہے ۔ آل احمد سرور کے نزدیک فسانہ آزاد ناول کی تعریف پر پورا نہیں اترتا کہ اس میں پلاٹ ہے نہ تسلسل[1] مگر ساری خامیوں کے باوجود بقول ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی " پڑھنے والا دلچسپ واقعات، جاندار کرداروں ، مکالموں ، ھنسی مذاق ، لطیفوں ، چٹکلوں ، پھبتیوں اور فقرے بازیوں میں کھو جاتاھے اور اس طرح اپنی حقیقت نگاری ، واقعات کے بیان اور کرداروں کی تخلیق کے اعتبار سے ناولوں میں جگہ پاتا ھے"۔[2]

رتن ناتھ سرشار کے بارے میں ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کی یہ رائے خاصی مبالغہ آمیز ھے کہ " سرشار اتنے ھی وسیع ھیں جتنی یہ دنیا ، وہ کائنات پر چھائے ہوئے ھیں اور کائنات ان کے ناولوں میں بند ھے "۔[3] مگر چکبست کا نقطہ نظر بالکل درست ھے کہ " سرشار شاعر کا دماغ اور مصور کی آنکھ رکھتے ھیں "۔[4] اور ظرافت کے پیرائے میں انہوں نے لکھنوی سوسائٹی کی جو مرقع نگاری کی ھے اور خصوصاً محلات کے طرزِ معاشرت کی جو تصویر کشی کی ھے ، وہ اپنا جواب نہیں رکھتی[5] ۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری سرشار کے

۱۔ تنقیدی اشارے ، ص ۳

۲۔ آج کا اردو ادب از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی فیروز سنز ، لاھور ۱۹۷۰ء ، مضمون جدید اردو ناول ، ص ۲۰۷

۳۔ رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ، انجمن ترقی اردو کراچی اشاعت اول ۱۹۶۱ء ، ص ۳۰۱

۴۔ مضامین چکبست از پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی ، انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد ۱۹۳۰ء ص ۳۱ ،

۵ ۔ ایضاً ص ۵۵

ناول نگار ہیں جنہوں نے اردو ناول میں کردار نگاری کا اضافہ کیا ہے اور مکالمہ نگاری میں کمال حاصل کیا ہے[۱] ۔ زبان و بیان کی جملہ خوبیوں نے فسانۂ آزاد کو لازوال ادب پارہ بنا دیا ہے ۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ کتاب عبرت و موعظت کا بھی ایک پہلو رکھتی ہے کہ جو تو میں اعلیٰ مقصدیت ، سنجیدگی ، وقار ، عمل کی لگن اور علم کی پیاس کھو دیتی ہیں اور عیاشی ، چھچھورا پن اور مائش و منافقت کو اپنا شعار بنا لیتی ہیں ، وہ زوال اور رسوائی سے کبھی بچ نہیں سکتیں ۔

عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ - ۱۹۲۶ء) بقول ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو کے پہلے اور سب سے بڑے تاریخی ناول نگار کی حیثیت رکھتے ہیں[۲] ۔ اور آل احمد سرور کے الفاظ میں " جہاں تک پلاٹ کے ارتقاء کا تعلق ہے ، چستی اور حسنِ ترتیب دونوں موجود ہیں ۔ وہ سرشار سے بہتر صناع ہیں ، دلچسپی قائم رکھنا جانتے ہیں ۔ مگر کردار نگاری کے زیادہ قائل نہیں چنانچہ ان کے عربی سپاہی ہندوستانی جذبات کے حامل نظر آتے ہیں[۳] ۔

شرر نذیر احمد کی طرح ناول نگاری کا ایک مقصد رکھتے ہیں اور بقول وقار عظیم وہ عظمتِ ماضی کی داستانیں دھرا کر مسلمانوں کے دل میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے خواہش مند تھے جو افسردہ دلوں کی رہنمائی کرکے انہیں عمل کے راستے پر گامزن کر سکے[۴] ۔

علامہ راشد الخیری (۱۸۶۸ - ۱۹۳۶ء) نے بہت سے ناول لکھے ہیں جن

۱۔ اردو ناول نگاری مکتبہ جدید ، لاہور ۱۹۶۱ء ، ص ۶۳ - ۶۴

۲۔ شرر کے تاریخی ناول ، ص ۵ (پیش لفظ)

۳۔ تنقیدی اشارے ، ص ٦

۴۔ داستان سے افسانے تک از وقار عظیم ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ، ۱۹۶۶ء ، ص ۶۸

مین موصوف نے عورتون کے مسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور اس طرح وہ عورتون کی مظلومیت کے سب سے بڑے ترجمان بن گئے ہین ۔ بقول مولانا ابو الکلام آزاد " راشدالخیری اردو مین ایک ادائے خاص لائے تھے جو ان کے ساتھ ہی موت کی ہند ہو گئی "[۱] ۔ عبدالمجید سالک کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ علامہ کا اسلوب ایک بہتا دریا ہے جس مین تکلف ، اشکال ، ابہام یا پیچیدگی نام کو نہ تھی[۲] ۔ مقصدی ناول نگارون مین راشد الخیری کا نام بہت اونچا ہے ۔

آل احمد سرور کے نزدیک شرر تک ناول زیادہ تر قصہ کہانی کے چکر مین رہے ۔ ان سے نذیر احمد نے اصلاح ، سرشار نے طنز اور شرر نے تبلیغ کا کام لیا[۳] ۔ لیکن یہ مرزا محمد ہادی رسوا (۱۸۵۸ - ۱۹۳۱ء) تھے جن کے ناول "امراؤ جان ادا" نے اردو ناول کو ایک نئے لہجے اور اسلوب سے روشناس کرایا ۔ اور بالکل درست لکھا ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نےکہ " اردو مین ناول بہتون نے لکھے ، اچھے اچھون نے لکھے ، پر ان کا رنگ سب سے الگ ، ان کا انداز سب سے نرالا "[۴] ۔

آلِ احمد سرور منشی پریم چند (۱۸۸۰ - ۱۹۳۶ء) کی تعریف مین رطب اللسان ہین ۔ انہین " بہت بڑا ناول نگار "[۵] قرار دیتے ہین اور اس امر مین کوئی شبہ نہین کہ " میدانِ عمل " ، "بازارِ حسن" ، "گوشہ عافیت" اور خصوصاً "گئودان" اور "چوگانِ ہستی"

۱- ماہنامہ عصمت کراچی ، اگست ۱۹۶۴ء ، راشد الخیری نمبر ، ص ۵۸۱

۲- ایضاً ،

۳- تنقیدی اشارے ، ص ۷

۴- انشائے ماجد ، نسیم بکڈپو لکھنو ، مارچ ۱۹۶۱ء ، مضمون مرزا رسوا کے قصے ، ص ۱۰

۵- تنقیدی اشارے ، ص ۸

قابل قدر جزوی خوبیون کے حامل ھین ، مگر اختر حسین رائے پوری کی رائے درست ھے کہ پریم چند دراصل " افسانون کے بادشاہ تھے اور ان کے بل پر ان کی حیثیت دائم اور مسلم ھے ، ناول ان کے لیے مکڑی کے جالے کی طرح تھا - جس مین پھنس کر وہ نکل ھی نہ سکتے تھے اور اگر نکلتے تھے تو اس کے تارون کو توڑ کر"[1] - یہی سبب ھے کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے نزدیک " ان کا کوئی ناول فنی اسقام سے بری نہین "[2] - وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ھین :-

" ان مین غیر جانبدار حقیقت نگاری کم اور مثالیت زیادہ ھے - پورا ناول تو ایک بھی نہین البتہ ان کے بیشتر ناولون کے بہت سے حصے ایسے ھین - جنہین حقیقت نگاری کی عمدہ مثالون کے طور پر پیش کیا جا سکتا ھے "[3] -

اور فیض احمد فیض کا فیصلہ پریم چند کی ناول نگاری کے بارے مین یہ ھے :

" وہ ناول کی بناوٹ سے اچھی طرح واقف نہین - ان کے ناول مین کہانی تو ہوتی ھے مگر نہ تو اس مین توازن قائم رکھ سکتے ھین نہ ڈھنگ کا پلاٹ بنا سکتے ھین - محض کہانی کا بیان کر دینا تو ایسا کوئی کمال نہین جب تک اس مین ایک ارادی صنعت ، ایک جچاتلا ڈیزائن یا نقشہ موجود نہ ہو - چنانچہ پریم چند کے ناول اس لحاظ سے بہت ھی ڈھیلے اور بے ڈول دکھائی دیتے ھین "[4] -

---

۱- " روشن مینار " اردو اکیڈمی سندھ کراچی ، ۱۹۵۸ء ، ص ۹۹

۲- " نئے اور پرانے خیالات ، ص ۱۳۵

۳- ایضاً ، ص ۱۲۲

۴- " میزان " از فیض احمد فیض اردو سندھ اکیڈمی کراچی ، طبع سوم ۱۹۸۷ء ، ص ۲۵۰

پریم چند کے بعد اردو میں ناول نگاروں کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے - جن میں علی عباس حسینی ، مرزا عظیم بیگ چغتائی ، شوکت تھانوی ، ایم اسلم ، نسیم حجازی ، کرشن چندر ، عصمت چغتائی ، عزیز احمد ، ڈاکٹر احسن فاروقی اور قرۃ العین حیدر کے نام نمایاں حیثیت کے حامل ہیں - ان میں سے کرشن چندر ، عصمت چغتائی اور عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں جنسی ادار کی ، عریانی اور لذت پرستی کا پرچار کیا ہے اور اعلی اخلاقی اور روحانی قدروں کے خلاف مورچہ لگایا ہے - فنی اعتبار سے بھی خصوصاً کرشن چندر قطعی ناکام ناول نگار ہیں اور ثناء اللہ کے الفاظ میں :-

" تقسیمِ ہند کے بعد کرشن چندر نے اپنے ہر معقول پڑھنے والے کو جس طرح مایوس کیا ہے ، وہ کرشن چندر ہی کی نہیں ، اردو ادب کی بھی بدقسمتی ہے ..... کرشن چندر کی موجودہ تحریر یں کرشن چندر نہیں ، کرشن چندر کے بھوت کی ہیں[١] -

اسی طرح قرۃ العین حیدر (پیدائش ١٩٢٧ء) کے ناول ژولیدہ بیانی اور انتشار فکری کا شاہکار ہیں - نقادوں کے ایک مخصوص حلقے نے حسبِ روایت ان کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے ، مگر حقیقت یہ ہے کہ مصنفہ نے مسلم لیگ ، پاکستان اور دینی و اخلاقی اقدار کا برملا مضحکہ اڑایا ہے اور کانگرس ، نہرو ، گاندھی اور سیکولر اخلاقیات کی تحسین کی ہے[٢] - یہی سبب ہے کہ دین بیزار حلقوں ہی میں ان کی تحریریں مقبول ہیں -

---

١- بحوالہ اردو ناول بیسویں صدی میں از پروفیسر عبدالسلام ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ، ١٩٧٣ء ، ص ٢٧٨

٢- دیکھئے اردو ناول بیسویں صدی میں از پروفیسر عبدالسلام باب قرۃالعین حیدر اور ناول کا جدید فن ، ص ٥٦١ تا ٦٥٠ -

نسیم حجازی (پیدائش مئی ۱۹۱۴ ء) پاکستان کے سب سے مقبول ناول نگار ہیں ۔ انہوں نے تاریخِ اسلام کے مختلف ادوار کو اپنے ناولوں کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ ان کے ناول مقصدیت ، جوش ، تخیل اور رومانیت سے بھرپور ہیں اور بقول پروفیسر منور مرزا ، نسیم حجازی کا اسلوب بیان بڑا زور دار ہے ۔ ادبی شان یہاں وہاں جلوہ گر ہے [1] ۔ خاص بات یہ ہے جیساکہ ڈاکٹر شفیق احمد نے ثابت کیا ہے کہ نسیم حجازی نے اپنے تاریخی ناولوں میں تاریخی حقائق کو کہیں بھی مسخ نہیں ہونے دیا [2] ۔

اردو ناول کے اس مختصر جائزے کے بعد اب ہم ماہر القادری کے ناولوں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں :۔

" جب میں جوان تھی "

یہ ماہر القادری کا پہلا ناول ہے جو متحدہ ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ ہندو معاشرے کی عکاسی کرتا ہے ۔ خلاصہ اس کا یوں ہے کہ ایک پردہ دار مگر دمرد و دانش کے رسیا مسلمان خاندان کا ایک نوجوان بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن جاتا ہے ، واپس آتا ہے تو اس طبقے کی روایت کے مطابق مشرقی روایات سے بیزار اور مذہبی اقدار سے عاری ہو چکا ہوتا ہے اور اپنے خاندان کی ایک مسلمان لڑکی کا رشتہ ٹھکرا کر ایک ہندو خاندان کی دوشیزہ لکشمی سے سول میرج کر لیتا ہے ۔ لکشمی سے " شانتا جمیلہ " پیدا ہوتی ہے جو اس ناول کی ہیروئن ہے ۔ ناول کے سارے واقعات

---

۱ ۔ سہ ماہی " سیارہ " لاہور جنوری ۱۹۸۹ء ص ۲۰۲

۲ ۔ نسیم حجازی ، ایک مطالعہ از ڈاکٹر تصدق حسین راجا قومی کتب خانہ ، لاہور ۱۹۸۷ء باب نسیم حجازی بحیثیت تاریخی ناول نگار ، ص ۸۵

اسی کے گرد گھومتے ہین اور یہ ناول کا سب سے بڑا کردار ہے -

جیساکہ عنوان سے ظاہر ہے " جب مین جوان تھی" امراؤ جان ادا " کی طرح واحد متکلم مین ہے - شانتا دینی اور روحانی اقدار سے بےنیاز اور خالص مادہ پرست والدین کی آغوش مین پل کر جوان ہوتی ہے اور مخلوط محفلون مین آنے جانے لگتی ہے تو حسن و رعنائی اور دلکشی کی ساری صفات کی حامل ہونے کی وجہ سے ہر تقریب کی جان ٹھہرتی ہے - بےباکی اور آزادی کے معاملے مین خصوصاً ماں اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور اس کی دوستی شہر کی میونسپلٹی کے دولت مند چیئرمین کے بیٹے "پربھو" سے ہو جاتی ہے جو ان کے گھر مین آزادی سے آتا ہے اور شانتا کولے کر باغون اور پارکون کی سیر کو نکل جاتا ہے - ایک دن وہ دونون ایک بدنام ہوٹل مین جاتے ہین جہان شانتا کی ملاقات لاجونتی اور اس کے دوست کامتا سے ہوتی ہے - وہان وہ تلخ مشاہدات سے گزرتی ہے - اسے لوگون کے کڑوے کسیلے فقرے سننے پڑتے ہین - انہین وہان اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ وہ کہین رات کے گیارہ بجے واپس آتے ہین - نتیجۃً ساری آزاد خیالی کے بھاوجود شانتا کا مسلمان باپ اسے بُری طرح ڈانٹتا ہے ، اور پربھوکا داخلہ آئندہ کے لیے اپنے گھر مین بند کر دیتا ہے - شانتا کا ضمیر بھی قدرے بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرثانی کرتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگتی ہے وہ اپنے اوپر سنجیدگی طاری کر لیتی ہے اور مردون سے میل جول ختم کر دیتی ہے -

والدین شانتا کی شادی کے لیے ایک نوجوان پرشوتم کو منتخب کر لیتے ہین جو مقامی سول سرجن کا بیٹا ہے - دونون کو کورٹ شپ کی مکمل آزادی دی جاتی ہے - پرشوتم کے پاس گاڑی ہے ، چنانچہ دونون وقتاً فوقتاً سیر کے لیے دور تک نکل جاتے ہین - ایک مرتبہ قصبے سے بیس میل دور شام کے وقت گاڑی خراب ہو گئی اور انہون نے رات ایک گاؤن کے مکھیا کی حویلی مین بسر کی - اسی طرح ایک مرتبہ وہ پرشوتم

کی بہن سوسوتی اور اس کے دوست سریش کی ہمراہی مین پکنک کے لئے ایک جھیل کے کنارے پر جاتے ہین جو شہر سے خاصے فاصلے پر جنگل مین واقع ہے اور رات وہین گزارتے ہین ۔ واپسی پر کار الٹ جاتی ہے اور شانتا زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ جاتی ہے ۔

یہان سے شانتا کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے ۔ پرشوتم اس کی عیادت کے لئے پابندی سے آتا ہے اور ایک نرس جولیا مین گہری دلچسپی لینے لگتا ہے ۔ ردعمل کے طور پر شانتا ایک ڈاکٹر گھیش سے تعلقات بڑھا لیتی ہے ۔ نوبت یہان تک پہنچتی ہے کہ پرشوتم سے اس کا تعلق بالکل منقطع ہو جاتا ہے اور شادی کے وعدے پر وہ گھیش کے اتنا قریب ہوجاتی ہے کہ سب کچھ اس کے سپرد کر دیتی ہے ، حالانکہ ساری بےتکلفی اور سیرسپاٹے کے باوجود اب تک اس معاملے مین اس نے اپنے آپ کو محفوظ رکھا تھا ۔۔ مگر کچھ عرصے کے بعد گھیش کا دل اس سے اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ دوسری لڑکیون سے تعلقات بڑھا لیتا ہے اسی اثنا مین اس کا تبادلہ دوسرے شہر مین ہو جاتا ہے اور وہ شادی سے انکار کر دیتا ہے ۔

شانتا پے درپے ناکامیون سے سخت دلبرداشتہ ہوتی ہے اور وہ مردون کی طرف سے بدظن ہو جاتی ہے ۔ مگر کچھ عرصے کے بعد وہ والدین کے ساتھ نینی تال جاتی ہے اور وہان پونا شوگر ملز کے مینجر موہن لال سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ پونا منتقل ہو جاتی ہے ۔ خوش و خرم زندگی گزارنے لگتی ہے ۔ وہ ایک بچی کی ماں بھی بن‌جاتی ہے اور کئی سال اسی طرح گزر جاتے ہین ۔

لیکن بدقسمتی سے موہن لال کو ریس کا چسکا لگ جاتا ہے اور اس مین بھاری رقوم ہار دیتا ہے ۔ شوگر فیکٹری کا سب سے بڑا حصہ دار لالجی اسے جُوا کھیلنے

پر برابر آمادہ کرتا رہتا ہے اور مسترا تر قرض دیتا رہتا ہے ۔ لالجی موہن لال کا قریبی دوست بھی ہے ، اس کے گھر میں لالجی کی آمد و رفت تسلسل سے جاری رہتی ہے ۔ وہ شانتا میں گہری دلچسپی لینے لگتا ہے ، اس کے اصرار اور موہن لال کی تائید سے وہ شراب بھی پینے لگتی ہے ۔ اس اثنا میں موہن لال ایک ریلوے گارڈ کی بیٹی سے تعلقات پیدا کر لیتا ہے اور شانتا لالجی کی قربت میں بہت دور تک چلی جاتی ہے ۔ حتیٰ کہ موہن لال اسے طلاق دے دیتا ہے۔وہ لالجی کے گھر میں جا بیٹھتی ہے ۔ اس کی بیوی بن کر نہیں بلکہ داشتہ کی حیثیت سے ۔ وہ اپنی بیٹی پھول کنور کو بھی اپنے ساتھ لے آتی ہے ۔

لالجی شانتا کو بمبئی لے آتا ہے جہاں اس کا شاندار بنگلہ تھا۔وہ شانتا کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھتا ہے،مگر وہ اس کے گھر میں ایک بےاختیار تنخواہ دار عورت تھی جس سے اس کا چھ دھی سال میں جی بھر گیا اور ایک دن اس نے بےوفائی اور هرجائی پن کا الزام لگا کر اور دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیا ۔

اب وہ بالکل بےسہارا تھی ۔ مدت ہوئی اس کا باپ قتل کے ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر پھانسی چڑھ گیا تھا اور اس صدمے سے اس کی ماں بھی جانبر نہ ہو سکتی تھی ، مگر تقدیر نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ایک گرلز کالج میں ہوسٹل نگران کی حیثیت سے ملازم ہو گئی، تاہم وہ جلد ہی یہاں کے ماحول سے بددل ہو گئی کہ ہوسٹل کی تقریباً ہر لڑکی کسی نہ کسی سیکنڈل میں ملوث تھی ۔ حالات کے تھپیڑوں نے شانتا کی آنکھیں کھول دی تھیں اور اب وہ سنجیدگی سے باوقار زندگی گزارنا چاہتی تھی ۔خصوصاً وہ اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت بہتر انداز میں کرنا چاہتی

تھی ۔ چنانچہ اس نے یہ ملازمت ترک کرکے ایک سلجھے ہوئے گھرانے میں بچیوں کی ٹیوٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی ۔ " اس گھرانے کا ماحول بالکل مشرقی اور خالص ہندوستانی ماحول تھا ۔ یہاں تک کہ کسی ایک کمرے میں سینما کا تصویر دار اشتہار بھی نظر نہ آتا "[١] ۔ سادگی ، خلوص ، شرم وحیا ، ہمدردی اور پاکبازی "[٢] کا چلن عام تھا ۔ شانتا نے اس ماحول میں سات سال گزار دیئے ۔ اس گھرانے کی بچیوں کے ساتھ مل کر پھول کنور کی تربیت اور تعلیم اچھے انداز میں ہو گئی اور اسے کسی امیر گھرانے میں بیاہنے کی بجائے رمیش نامی ایک ایسے نوجوان سے اس کی شادی کر دی جو شریفانہ اطوار کا حامل تھا ، ایک ڈاک خانے میں ملازم تھا اور اسی روپے تنخواہ پاتا تھا ۔ رمیش نے اپنی بیوی کو محبت اور حسنِ سلوک سے مالا مال کر دیا ۔ بلکہ اپنی ساس کو بھی اپنے ہی گھر میں بلا لیا کہ وہ والدین سے محروم تھا ۔ اس گھر میں اگرچہ عیش و عشرت کے سامان نہ تھے ، مگر یہاں سچی خوشی اور سکون کی دولت عام تھی ۔ رمیش اور پھول کنور ایک دوسرے کا جی جان سے خیال رکھتے اور شانتا اپنے نواسے کنول کے ساتھ مگن رہتی ۔ اسے بڑھاپے میں سچا اطمینان اور سرور حاصل ہوا تھا ۔

یوں تو اس ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے اور واقعات فطری رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ " دستِ غیب " کی کارفرمائی بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی ، مگر فنی نقطۂ نظر سے بعض جھول اور سُقم بھی موجود ہیں ۔ مثال کے طور پر شانتا اپنے پہلے دوست " پربھو " کے ساتھ رات کئی گھنٹے ہوٹل میں گزارتی ہے اور کچھ وقت وہ تنہا ایک کمرے میں گزارتے ہیں ، مگر شانتا " پربھو " کی دست درازی سے محفوظ

١-٢- جب میں جوان تھی ص ٢٢٣

رہتی ہے ۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی نوجوان موقع پاتے ہی شانتا کا منہ چوم لیا کرتا تھا ۔ اسی طرح دوست نمبر ۲ یعنی پرشوتم بڑا سنجیدہ اور ٹھوس کردار کا حامل ہے اور بڑے نازک مقامات پر وہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھتا ہے ، مگر ہسپتال میں بھی جولیا سے فوراً ہی تعلقات استوار کر لیتا ہے ۔ پھر یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ شانتا پرشوتم کو چھوڑ کر فوراً ہی ڈاکٹر گھوش سے دوستی لگا لیتی ہے اور گھوش کھلے بندوں اس کے گھر میں آتا اور تنہائی میں گھنٹوں اس کے پاس ٹھہرتا ہے ، مگر والدین اس پر کوئی تعرض نہیں کرتے ۔

اسی طرح پونا شوگر ملز کا لائق فائق اور زیرک منیجر موہن لال ساری آسائشوں کے ہوتے ہوئے جُوا کھیلنے لگ جاتا ہے اور آنکھوں دیکھتے اپنی خوبرو بیوی کو اپنے دوست لالجی کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی اجازت دیتا ہے اور آخرکار قرض کے بدلے بیوی اور بیٹی کو اس کے حوالے کر دیتا ہے ۔

ان اعتراضات کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی میں یہ عجائب و غرائب بعید از قیاس نہیں ہیں ۔ اس طرح کے حادثات کا امکان موجود ہے ۔ خصوصاً بڑے سے بڑا امیر آدمی بھی قمار بازی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور اگر وہ شرابی اور مقروض بھی ہے ، تو اس سے بڑی سے بڑی بےحمیتی کی توقع کی جا سکتی ہے ۔

تاہم اس نوعیت کی جزوی خامیوں سے اردو کا شاید ہی کوئی ناول نگار محفوظ ہو گا حتٰی کہ پریم چند جو صفِ اوّل کے ناول نگار ہیں ، وہ بھی خامیوں سے پاک نہیں ۔[1]

۱۔ دیکھئے پریم چند کی ناول نگاری ڈاکٹر خواجہ زکریا نئے پرانے خیالات ، ص ۱۲۲-۱۲۵
۱۵۲

اور کرشن چندر نے حالانکہ تیس کے لگ بھگ ناول لکھے ھین ، مگر بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی " یہ ناول ایسے ھین کہ ان مین بعض کو صرف ناول نما تحریر کہہ سکتے ھین ۔ ناول کے فنی عناصر کا ان مین سراغ مشکل ھی سے ملتا ھے "[1] اور جیسا کہ پروفیسر عبدالسلام لکھتے ھین کرشن چندر نے " کئی ناول لکھے مگر یہ سب ناول کے نام پر تہمت ھین "[2]۔

چنانچہ متذکرہ نوعیت کی چند خامیاں اگر اس ناول مین بھی موجود ھین ، تو چنداں تعجب ناک نہین ۔ قابلِ ذکر امر یہ ھے کہ یہ ناول کئی خوبیون کا حامل ھے ۔ جن کی ضروری تفصیل ذیل مین دی جاتی ھے ۔

اس ناول کا پلاٹ سادہ ، مرتب اور مربوط ھے اور ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتا ھوا تکمیل کی طرف بڑھتا ھے ۔ واقعات کی رفتار مین کوئی مصنوعی پیچ و خم پیدا نہین کیا گیا ۔ دلچسپی اور تجسس کا عنصر برابر قائم رھتا ھے ۔ اسی طرح مختلف کردار بھی فطری ماحول مین سامنے آتے ھین اور ان کی حرکات و سکنات مین آورد اور تصنع نہ ھونے کے برابر ھے ۔ اور جس کردار کے رویے مین کوئی تغیر آتا ھے اس کا سبب بیان کیا گیا ھے ۔ مکالمے فطری ھین اور ان مین کہین وعظ کا انداز نہین ، حالانکہ مصنف نے ناول باقاعدہ ایک نقطۂ نظر اور مقصدیت کے پیش نظر لکھا ھے ، مگر مقصدیت کو فن پر حاوی نہین ھونے دیا اور بڑی خوبصورتی سے فنی تقاضون کو پورا کیا گیا ھے ۔ موقع محل کے مطابق منظرنگاری بھی لائقِ توجہ ھے ۔

میرے نزدیک اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ھے کہ اس مین ایک مغرب پرست

۱۔ آج کا اردو ادب " فیروز سنز ، لاھور ، ۱۹۷۰ء ، ص ۲۳۵

۲۔ "نگارِ پاکستان" اصناف ادب نمبر سالنامہ ۱۹۶۶ء ، مضمون تقسیم کے بعد اردو ناول ص ۶۸

ہندو معاشرے کی جنسی آزادی اور اخلاقی بےراہ روی کی تصویر کشی کی گئی ہے - قصے کا ایک سرا ایک آزاد منش ، مذہب بیزار مسلمان رئیس سے شروع ہوتا ہے اور اس کی ہندو بیوی کی وساطت سے ہندو سوسائٹی کی قباحتوں کا احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے - ہندو قوم اپنے مذہبی تناظر اور تاریخی پس منظر مین جنس کے معاملے مین خاصی آزاد رہی ہے - [1] اس آزادی اور بےباکی کو مغربی ماحول اور تعلیم نے دو آتشہ کر دیا اور جہان جہان اس کے اثرات مرتب ہوئے معاشرتی سطح پر جنسی انارکی نے افسوس ناک المیون کو جنم دیا اور بیچاری عورت تو ان دونون پاٹون کے درمیان بری طرح کچلی گئی - چنانچہ " جب مین جوان تھی " کی ہیروئن شانتا جمیلہ نوعمری سے لے کر ادھیڑ عمر تک جس طرح مختلف مردون کا شکار بنتی ہے اور گھر مین آکر پڑھانے والے بوڑھے استاد سے لے کر ڈاکٹر تک اور دیگر مختلف افراد اسے ہوس کا نشانہ بنانے کی ناکام یا کامیاب کوشش کرتے ہین ، وہ بڑا ہی اندوہناک معاملہ ہے -

ناول کا مصنف دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ مخلوط سوسائٹی اور آزادہ روی کا چلن بہر حال خطرناک ہے اور اس سے خیر کا کوئی پہلو برآمد نہین ہوتا - نام نہاد دولتمند طبقہ ساری اخلاقی خوبیون سے عاری ہوتا ہے ، وہان عورت کو عیاشی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور غریب اور سادگی پسند لوگ ہی رشتون کا احترام کرتے اور سچی مسرّت بخشتے ہیں - مگر قابل ذکر امر یہ ہے کہ متذکرہ مقصدیت کے باوجود ناول مین نہ تو وعظ کا انداز ہے نہ فن کے تقاضون کو مجروح کیا گیا ہے - مکالمے مختصر اور فطرت و ضرورت کے مطابق ہین - طویل قسم کی کوئی ایک تقریر بھی پورے ناول مین نظر نہین آتی بلکہ اس کے برعکس اختصار اور جامعیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے - ناول نگار

۱- دیکھئے " مسلم ثقافت ہندوستان مین " از عبدالمجید سالک - ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور طبع سوم ۱۹۸۲ء
ص ۰ ۱۸، ۱۸۱ - الباب جنسی آزادی اور مذہب و نفرت انگیز جنسیت -

ہیروئن کی زبان سے حسب موقع جگہ جگہ زندگی کے حقائق و معارف کا ذکر کرتا ہے ، مگر بڑی ہی باوقار انداز میں - جس سے نہ تو مصنوعی پن پیدا ہوتا ہے اور نہ قاری اکتاہٹ یا جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہوتا ہے - اس ضمن میں ، مثال کے طور پر ، چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:-

* " ساون کے اندھے کو جس طرح چاروں طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے - اسی طرح ہوسناک نگاہوں کو بھی جذبات و ہوس کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہیں دیتی - جذباتِ ہوس سے مغلوب مرد کو درختوں کی ڈالیوں میں عورتوں کی کپکپاتی ہوئی باہیں نظر آتی ہیں"[1] -
* " ہوس کی بناوٹ اور اصلیت میں امتیاز نہیں کر سکتی "[2]
* " جتنے تعلقات وسیع ہوتے ہیں اتنی ہی فکر میں بڑھ جاتی ہیں اور ہر شخص کی دلدھی اور خوشی کے لیے آدمی کی طبیعت کے خلاف بہت سی باتیں گوارا کرنی پڑتی ہیں"[3] -
* " الفاظ و عمل اور قول و فعل میں ایک خاص معنوی ربط پایا جاتا ہے جو شخص فحش اور بُرے الفاظ خوشی کے ساتھ سن سکتا ہے وہ بُرے کام بھی کر سکتا ہے - بُرے الفاظ سنتے سنتے برائی کا احساس جاتا رہتا ہے اور وہ جھجک جو پہلے برائی سے روکتی تھی ، اب جراتِ رندانہ میں تبدیل ہو جاتی ہے - رغبت اور شوق دلانے کےلیے لفظ و بیان ہی سے کام لیا جاتا ہے اور ہر زہر اور آبِ حیات کانوں کی راہ سے ہی دل تک پہونچتا ہے"[4] -

---

۱- جب میں جوان تھی ، ص ۲۰

۲- ایضاً ، ص ۸۲

۳- ایضاً ، ص ۸۳

۴- ایضاً ، ص ۱۱۷-۱۱۸

* • اس نئی روشنی کے زمانے مین حُسنِ صورت سے زیادہ لچھے دار باتون کا جادو چلتا ہے اور بہت ہی معمولی شکل و صورت کی عورت اگر چرب زبان اور دُنیا دیکھی ہوئی ہو ، تو سنجیدہ سے سنجیدہ نوجوان کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہے۔[1]

* • عورت اگر چاہے تو مرد ایک قدم بھی اس کی طرف بڑھنے کی جرات نہین کر سکتا ۔ عورتون کی توجہ ، ان کی باتون کی نرمی ، ہونٹون کی مسکراہٹ مردون کی ہمت بڑھاتی ہے ۔ یہان تک کہ انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچے کی نوبت آ جاتی ہے ۔ مرد عورت کی نگاہ اور اس کے انداز کو اچھی طرح پہچانتا ہے ۔[2]

* • خلش اور الجھن تو تمناؤن سے پیدا ہوتی ہے ۔ جتنی آرزوئین کم ہون گی اتنا ہی آدمی الجھنون سے دور رہے گا ۔ "دلِ بے مدعا" سے بڑی دنیا مین کوئی نعمت نہین ۔ تمناؤن اور آرزون کا سلسلہ شاخ در شاخ ہوتا ہے ۔ ایک تمنا سے دوسری تمنا پیدا ہوتی ہے۔ یہان تک کہ تمناؤن کے جال مین زندگی پھنس کر رہ جاتی ہے۔[3]

* • معصیت آلود تفریح مین مبتلا ہو کر کوئی آدمی حد ودِ اعتدال کا پابند ہو کر رہ ہی نہین سکتا ۔ بُری عادتین پہلے چھوٹی چھوٹی باتون ہی سے شروع ہوتی ہین یہان تک کہ آدمی گناہون کے جال مین پھنس جاتا ہے اور پھر نکلنا آسان نہین رہتا ۔ گناہ کتنا ہی چھوٹا اور معمولی کیون نہ ہو ، اس کی خاصیت ایک چنگاری کی سی ہے جو رفتہ رفتہ ہولناک شُعلون مین تبدیل ہو جاتی ہے۔[4]

* • ہوسنا کی کی گاڑی زیادہ دِنون تک چل نہین سکتی ۔ عیش پرست کسی ایک عورت کا ہو کر رہ ہی نہین سکتا ۔[5]

۱۔ جب مین جوان تھی ، ص ۱۳۶

۲۔ ایضاً ، ص ۱۷۹

۳۔ ایضاً ،

۴۔ ایضاً ، ص ۱۹۸

۵۔ ایضاً ، ص ۲۱۵

ماہر اضا نی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہین اور انکا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہے - وہ بات کرنے کا سلیقہ جانتے ہین اور ان کا قلم بعض ناول نگارون کی بے اعتدالیون اور عریانیون سے صاف بچ نکلا ہے - پروفیسر عبدالسلام نے لکھا ہے کہ "بعض اوقات کسی عریان منظر کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے - ایسے مواقع پر صحیح الدماغ ادیب اشاریت سے کام لیتے ہین اورعریانی کے الزام سے بچ نکلتے ہین "-[1] ماہر یقیناً اس معیار پر پورا اترے ہین اور بعض نازک مقامات سے وہ بڑی ذہانت اور دانش مندی کے ساتھ پہلو بچا کر نکل گئے ہین - سستی قسم کی لذت پرستی اور عریانی ان کے ہان ناپید ہے -

ناول چونکہ غیر منقسم ہندوستان کے دورِ آخر کی معاشرت کا عکاس ہے ، اس لئے ضمنی طور پر اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس زمانے مین ایک طرف دیہات مین زمیندارون کا کسانون پر ظلم و ستم عام تھا ، دیہاتی لوگ سادہ مزاج اور سادہ لوح تھے ، امن و امان کی صورت حال تسلی بخش تھی ، راستے محفوظ تھے اور لوگ جنگلون مین جھیلون کے کنارے پر بھی امن و چین سے راتین گزار سکتے تھے -- ناول مین منظر نگاری کے چند اچھے نمونے بھی موجود ہین-

ماہر کی زبان تکلف و تصنع سے پاک صاف اور سادہ ہے- ادبیت کا پہلو اگرچہ کمزور ہے مگر اس کا احساس بہت کم ہوتا ہے - سادگی اور بےتکلفی کا حسن تحریر پر چھایا ہوا ہے -

---

۱- اردو ناول بیسوین صدی مین ، ص ۳۶۴

"کــردار"

کردار ماہر القادری کا دوسرا ناول ہے جو فروری ۱۹۴۴ء مین حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ۔ دو سو صفحے کی ضخامت کے اس ناول کا خلاصہ یون ہے :-

قیصــر پــور کے قصبے مین توفیــق اور شمشاد دو ہم جماعت دوست ہــین ۔ دونــون مین گہری محبت ہے اور دونون قصبے کے بہت سے دیگر نوجوانــون کے ساتــھ فارغ وقت مین شہر تک آنے جانے والی سرکاری بس کے ڈرائیور اور کنــڈیکٹــر کے پاس بیٹھتے ہین اور بڑے شہرون کی معاشرت کے بارے مین ان کی حیرت انگیز باتین بــڑی دلچسپــی سے سنتے ہین ۔ ان باتون کی تان عمــوماً یہان آکر ٹوٹتــی کہ کلکتہ اور بمبئــی جیسے بــڑے شہرون مین بعــض غریب لوگ قسمت کے چکــر سے دیکھتے ہی دیکھتے لکھ پتــی ہو جاتے ہین اور امیر والدین کی حسین و جمیل اور تعلیم یافتہ لڑکیان غــریب نوجوانــون سے شادی کر لیتی ہین جس سے ان کے سارے دلدّر دور ہو جاتے ہین ۔

توفیــق بدقسمتی سے نوین جماعت مین فیل ہو جاتا ہے ۔ گھر کے سب لوگ اُسے خوب ڈانٹــے ہین اور والد تو بہت ہی برہم ہوتے ہین ۔ نتیجۃً توفیق گھر سے فــرار ہو کر کلکتہ چلا جاتا ہے اور ایک مخلص بنگالی نوجوان کلرک اسے ایک پارسی کی کوٹھہ ایجنسی مین ملازم کرا دیتا ہے ۔ مزدورون کی حاضری اور نگرانی اس کی ذمہ داری قــرار پاتــی ہے ۔

پارسی سیٹھ کی نوجوان بیٹــی زمرد بھی باپ کے ساتھ دفتــر اور کاروبار کی نگرانــی کرتی تھی ۔ توفیــق نے اسے دیکھا تو اُسے بس کے عملے کی باتین یاد آگئــین اور اس نے فرض کر لیا کہ زمــرد اس پر جلد ہی عاشق ہو جائے گی اور اس طرح وہ اس کا خاونــد بن کر لکھ پتــی بن جائے گا ۔ اس موقع پر ماہر نے ایک خیالی پلاؤ پکانے والــے

تلاش نوجوان کی نفسیات اور عمل کا بڑا موثر نقشہ کھینچا ہے ۔

لیکن حسبِ توقع توفیق اس مشن مین سخت ناکام رہتا ہے اور اسے ذلیل ہو کر یہان سے بھاگنا پڑتا ہے ۔

اب توفیق بدقماش لوگون کے ہتھے چڑھ جاتا ہے ۔ بےمقصد شاعری اور شراب مین مبتلا ہوکر وہ طوائفون تک پہنچ جاتا ہے اور بدکاری مین بہت دور تک نکل جاتا ہے ۔ بےکاری ، قرض اور عیش کوشی اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے جس کے نتیجے مین اس کی صحت تباہ ہو جاتی ہے اور وہ ایک سال کے اندر اندر گُردون کی بیماری کی وجہ سے ہسپتال مین دم توڑ دیتا ہے ۔ موت سے چند روز قبل وہ قیصر پور مین اپنے والد کو خط لکھتا ہے اور شمشاد اور اس کا والد اُس وقت کلکتہ پہنچتے ہین جب وہ موت و حیات کی کشمکش مین مبتلا ہوتا ہے ، اور دوسرے ہی دن دم توڑ دیتا ہے ۔

اِس وقت تک شمشاد میٹرک پاس کرکے کلکٹری مین کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو جاتا ہے ، مگر دفتر کےغیرمعمولی غلامانہ اور خوشامدانہ ماحول سے تنگ آکر وہ نوکری سے استعفیٰ دے دیتا ہے اور ایک پرائیویٹ رفاہی ادارے مین ملازمت کر لیتا ہے ، مگر جب سالانہ جلسے مین ادارے کے منتظمین ایک امیر خان بہادر کو محض چندے کے لالچ مین صدارت کے لیے مدعو کرتے ہین ، تو وہ اس ادارے کو بھی چھوڑ دیتا ہے ۔ وہ ایک اخبار مین اپنا کلام چھپواتا تھا اور مضامین لکھتا تھا جو قارئین مین پسند کئے جاتے تھے ، مگر اخبار کے ایڈیٹر کی منافقت اور خوشامد اور زبردستی کی عادت سے بددل ہو کر وہ اخبار مین بھی لکھنا ترک کر دیتا ہے اور شہر کے ماحول سے دلبرداشتہ ہو کر وہ اپنے قصبے مین واپس آ جاتا ہے۔ وہ عزم کر لیتا ہے کہ اب وہ اپنے کھیتون مین کام کرے گا اور قیصر پور کے عوام کی ذہنی ، اخلاقی اور

رفاہی امور میں رہنمائی بھی انجام دے گا ۔

شمشاد کا اب تک کا کردار ایک خوددار ، باہمت اور حریت نواز نوجوان کاکردار ہے جسے خوشامد اور منافقت سے سخت نفرت ہے اور جو اپنی عزتِ نفس اور انا کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس کا یہ طرزِ عمل بصیرت افروز اور سبق آموز ہے ۔

ناول کے اس حصے میں سرکاری دفاتر کے اس ماحول سے بھی ہمارا تعارف ہوتا ہے جو انگریزی استعمار کے دوران کارفرما تھا اور جو آزادی کے باوجود کم و بیش اب تک جاری و ساری ہے ۔

قیصر پور ایک روایتی قصبہ تھا جہاں جہالت اور تعلیم کی کمی نے شرافت و رذالت کے معیار مسخ کر ڈالے تھے اور جہاں عام لوگ راجوں ، نوابوں اور جاگیرداروں کی عیاشی ، فضول خرچی اور ظالمانہ کارروائیوں کو ان کی عظمت و جلالت اور شان و شوکت سے تعبیر کیا کرتے اور نذونیاز اور پیروں فقیروں اور قبروں سے ان کی عقیدت کو خوش عقیدگی سمجھ کر دادِ تحسین دیا کرتے ۔ شمشاد نے حکمت ، وقار اور جرأت سے عوام الناس کے ان خیالات و عقاید کی تصحیح کی اور اپنے اخلاص اور خدمت سے قصبے کے لوگوں کے دل جیت لئے ۔

اس قصبے میں ایک سرکاری ضلعدار تبدیل ہو کر آیا اور کرایے کے مکان میں رہنے لگا ۔ اس نے اپنی جوان بیٹی شریفہ کو موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے ایک اسکول ماسٹر ۔ محمود ۔ کی خدمات حاصل کیں . جو اس مقصد کی خاطر ہر اتوار کو شہر سے آتا تھا ۔ ضلعدار نے شمشاد سے گہرا تعلق قائم کر لیا تھا اور شمشاد کا اس کے گھر پر آنا جانا تھا ۔ چنانچہ شمشاد نے ضلعدار کو بہت سمجھایا ، قائل کیا کہ مسلمان لڑکی کا موسیقی سیکھنا اور وہ بھی تنہائی میں ایک غیر مرد سے سخت قابلِ اعتراض

ھے اور اس کے نتائج اچھے برآمد نہیں ہونگے ، مگر ضلعدار نہ مانا۔ دوسری طرف ماسٹر محمود اور شریفہ کی بےتکلفی بڑھتی چلی گئی ۔ حتٰی کہ ایک رات وہ دونوں فرار ہو گئے ، مگر اُس وقت جبکہ وہ عظیم گنج جنکشن پر بمبئی کی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے ، وہیں شمشاد اور ضلعدار بھی آ گئے ۔ شمشاد کسی مقدمہ کی پیروی کے لیے عظیم گنج آیاہوا تھا ۔ جبکہ ضلعدار بھی کئی دن کے دورے سے فارغ ہو کر قیصر پور جا رہا تھا ۔ اغوا کی یہ کاروائی ناکام ہو گئی ، ماسٹر بھاگ گیا اور شریفہ کو اس کا باپ اپنے ساتھ سرائے میں لے گیا ۔ شمشاد نے قیصر پور جاکر ضلعدار کی بیوی کو عظیم گنج بھیج دیا اور چند دنوں میں شریفہ کی شادی اپنے ایک بےتکلف دوست افضل سے کرا دی جو عظیم گنج میں کپڑا فروش تھا ۔ افضل نے شریفہ کا نام بدل کر نادرہ رکھ دیا ۔

قیصر پور میں جہاں شمشاد کو بےپناہ عزت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی ، وہاں کچھ سرمایہ دار اور سُود خور لوگ اس کے مخالف بھی تھے ، چنانچہ مقدمات کے سلسلے میں شمشاد کوایک مرتبہ کئی ہفتوں تک عظیم گنج میں ٹھہرنا پڑا۔ اس نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا ، مگر افضل اصرار کرکے اس کاسامان اپنے گھر لے گیا ۔ شمشاد سے اس کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اس نے شمشاد کے انکار اور منع کرنے کے باوجود اپنے گھر والوں سے اس کا پردہختم کرا دیا ۔ اور اس کی بیوی نادرہ ، اس کی سولہ سالہ بہن نُور جہان اور بیوہ پھوپھی اس کے سامنے آ گئیں اور اس کا سامان زنانہ حصے کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا ۔

یہاں سے حالات نے ایک نیا رخ بدلا اور نور جہان کا شمشاد سے گہرا قلبی تعلق قائم ہو گیا ۔ شمشاد نے وقار اور تمکنت کا مظاہرہ کیا ، مگر نور جہان کی بےقراریاں اور شمشاد کے لئے اس کی محبت چھپی نہ رہی اور نادرہ نے افضل کے اس

طرح کان بھرے کہ اس نے یکلخت اپنا رویہ اور لہجہ تبدیل کر لیا اور شمشاد اس کے گھر سے قیصر پور آگیا ۔

نور جہان نے شمشاد کی جدائی کو بہت محسوس کیا اور اسے خط لکھتی رہی شمشاد نے جواب مین اسے سمجھانے کی کوشش کی اور کسی جذباتیت کا مظاہرہ نہ کیا ، مگر نور جہان اسے محبت بھرے خط لکھتی رہی ۔ ایک ایسا ھی خط افضل کے ہاتھ آ گیا اور وہ اتنا غضب ناک ھوا کہ اس نے اسی شام شمشاد پر اس وقت گولی چلا دی جب وہ عظیم گنج آیا ھوا تھا۔ پھر اِسی ذہنی حالت مین وہ گھر گیا اور نورجہان پر فائر کر دیا ، مگر بھائی کی للکار کی آواز سنتے ھی نور جہان بھاگ کر اندر گئی اور شمشاد کے خطوط پر مبنی لفافہ لاکر افضل کے آگے پھینک دیا ۔ افضل نے جلدی سے وہ خطوط پڑھے اور جب اسے اندازہ ھوا کہ شمشاد بالکل بےگناہ ھے تو احساسِ ندامت کی شدت سے اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی اور ماما کی مداخلت کے باوجود گولی اس کے پاؤن کو چھیدتی ھوئی نکل گئی ۔

ناول نگار کی "کوشش" سے شمشاد ، نورجہان اور افضل تینون کی جان بچ گئی ، مگر تینون زخمی ھو کر ایک ھی ھسپتال مین داخل ھوئے ۔ جب شمشاد کو اس واقع کا علم ھوا تو " اس نے ھسپتال کے ایک ملازم کے ھاتھ نورجہان کے پاس ایک پرچہ بھیج دیا جس مین لکھا تھا ۔

" ایک ھی نشانہ کے دو زخمی اب ایک دوسرے سے جدا نہین ھو سکتے "

نورجہان کا زرد چہرہ ، اس پرچہ کو پڑھ کر گلاب کی طرح سرخ ھو گیا وہ آج سے زیادہ اپنی زندگی مین کبھی خوش نہین ھوئی تھی ۔" اور اسی فقرے پر ناول ختم ھوتا ھے ۔

فنی و تنقیدی جائزہ

پریم چند کے ناولوں کی طرح انجام کے اعتبار سے " کردار " ایک طربیہ ناول ہے جس کا پلاٹ سادہ مگر گتھا ہوا ہے اور چند جزوی خامیوں کے سوا واقعات فطری رفتار سے آگے بڑھتے اور دلچسپی اور تجسس کا عنصر برابر قائم رہتا ہے ۔

" کردار " میں بیک وقت مولوی نذیر احمد اور منشی پریم چند کے ناولوں کا پرتو نظر آتا ہے ۔ یعنی یہ گہری مقصدیت کا حامل ہے اور ناول نگار دکھانا چاہتا ہے کہ برائی کا نتیجہ لازماً رسوائی اور تباہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے ۔ جیساکہ توفیق ، ضلعدار ، شریفہ اور ماسٹر محمود کے کرداروں سے ظاہر ہے اور نیکی اور اخلاص آخر کار عزت و سربلندی اور کامیابی پر منتج ہوتا ہے جیساکہ شمشاد کا پورا رویہ اس پر شاہد ہے ۔ ماہر اس بات کا سختی سے قائل ہے کہ عورت اور مرد کا میدانِ کار الگ الگ ہے ۔ اور جب بھی عورت گھر سے نکل کر مخلوط سوسائٹی میں آئے گی اس سے خرابیوں کے سوا کچھ نہ ملے گا ۔[1]

مولوی نذیر احمد ہی کی طرح اس ناول میں بعض کردار مثلاً سرکاری دفتر کا منتظم (سپرنٹنڈنٹ) قیصر پور کا مہاجن ، سادھو اور ماسٹر محمود کے خاکے جہاں دلچسپ ہیں وہاں ناول نگار کی ان سے نفرت و کراہت کا اظہار بھی واضح ہے اور استہزائیہ اسلوب غالب ہے ۔ جبکہ پریم چند کے ناولوں کی مانند " کردار " میں دیہاتی لوگوں کی سادہ دلی ، سطحیت پرستی ، کو تاہ نظری اور عزت و شرف کا پچ معیار سامنے آتا ہے ۔ اس میں شکاریوں کے توہمات اور دیہاتی عورتوں کی سادہ لوحی کی مثالیں

۱- کردار ، ص ۹۳-۹۷-۹۸-۱۰۰

بھی موجود ہین مثال کے طور پر ایک دیہاتی عورت شریفہ کے ہونٹون پر لپ سٹک دیکھ کر کہتی ہے -

" تم نے ہونٹون پر جو مرہم لگا رکھا ہے ، تو کیا تمہارے ہونٹون مین کوئی تکلیف ہے " -[1]

یہ ناول غیر منقسم ہندوستان مین یو پی کے مسلمان معاشرہ کی ایک سچی ، خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ وہان کے امراء کی عیاشیون کا کیا عالم تھا اور اخلاقی طور پر وہ کس قدر پستیون مین گرے ہوئے تھے- دوسری جانب اس ناول مین شہرون کی زندگی کے بعض مرقع بھی قابل توجہ ہین - خصوصاً دفتری زندگی کے مخفی گوشے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہین -

" کردار " کا سب سے بھرپور اور جاندار کردار اس کا ہیرو شمشاد ہے - جو ذہین ، ہوشمند اور باوقار ہے - حریت نواز اور خود دار وغیور ہے اور حساس و دردمند ہے اور معاشرے کی قباحتون کی اصلاح کا عزم رکھتا ہے اور اپنے خلوص اور محنت کی وجہ سے اپنے ارادون مین کامیاب ٹھہرتا ہے - شریفہ یا نادرہ کا کردار بھی فطری انداز سے تغیرات کے مراحل سے گزرتا ہے- وہ آزاد منش ہے ، موسیقی کی تعلیم حاصل کرتی ہے ، مگر اغوا کے حادثے سے گزر کر سنبھل جاتی ہے اور اپنے خاوند اور سسرال سے اس کا رویہ خوشگوار ہوتا ہے ، لیکن اپنی نند نور جہان کو شمشاد سے بے تکلف ہوتا ہوا دیکھ کر وہ بدک جاتی ہے اور اپنے خاوند افضل کو شمشاد کے خلاف بھڑکاتی ہے -

ماہر انسانی نفسیات سے بھی خوب آگاہ ہین اور وہ اپنے قاری تک یہ تاثر

۱- " کردار " ص ۱۲۸

منتقل کرنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں کہ ایک ہوس پرست آدمی ایک سادہ دل نوجوان لڑکی کو کس تدریج کے ساتھ اپنی عیاری کے جال میں پھانستا ہے اور اُسے فرار پر آمادہ کر لیتا ہے ۔ یہاں عورت کی فطرت میں مستور اِس داعیے کا بھی پتہ چلتا ہے جس کے تحت وہ اچھے سے اچھے اور بُرے سے بُرے اسلوبِ حیات کو چند دنوں میں اختیار کر لیتی ہے اور اپنے آپ کو ہر ماحول میں ڈھال لیتی ہے ۔ شریفہ ایک بدصورت شخص کے ہر مطالبے پر پہلے تو بدکتی ہے ، مگر اس کی لچھے دار ، پوچ گفتگو کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے ۔ ماہر نے فرار کے وقت شریفہ کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر کشی بھی کامیابی سے کی ہے ۔

ناول نگار کی ایک خوبی یہ بھی ہے جو ترقی پسند نقادوں کے نزدیک خامی قرار دی جائے گی کہ وہ عریانی سے صاف بچ نکلا ہے ۔ کم از کم دو مقامات پر آسانی سے اس کا قلم بہک سکتا تھا ، مگر وہ بڑی ذہانت سے خوبصورت موڑ دے کر نازک مقامات سے بعافیت گزر گیا ۔

" کردار " کے مکالمے فطرت اور ماحول کے مطابق ہیں اور آورد و تصنّع سے پاک ہیں ۔ ناول اگرچہ مقصدی ہے ، مگر مکالموں میں نہ تو طوالت ہے اور نہ کہیں وعظ کا انداز نظر آتا ہے ۔ ماہر نے اپنے کرداروں کی زبان سے اپنے خیالات و نظریات کا اظہار بڑی فنی مہارت سے کیا ہے ۔ اس ضمن میں چند مثالیں دی جا رہی ہیں جو حکمت و تفکّر کا مرقع بھی ہیں اور اشائے لطیف کا خوبصورت پیکر بھی :-

* " زندگی کھانے پینے ، پہننے اور لکھنے پڑھنے کا نام نہیں ہے زندگی صرف عظمتِ کردار اور آزادیٔ ضمیر کا نام ہے ۔ یہ چیز چلی گئی ، تو بس سمجھ لو کہ آدمی مر گیا ۔ اب اس کی مثال پتھر

کی غلطی کی ھے کہ ھر چلنے والا اپنی ٹھوکر سے اسے جہان چاھے پھینک دیتا ھو"۔[1]

★ " دنیا نے بڑائی کا معیار مقرر کرنے میں بڑی غلطی کی ھے ۔ بڑائی روپیہ پیسہ ، جائیداد اور عہدے کا نام نہیں ھے ۔ بڑا اور عزت والا وہ ھے جو کیریکٹر رکھتا ھے ، کسی کمال کا حامل ھے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ بھلائی ، ھمدردی اور عزت کے ساتھ پیش آتا ھے ۔ بہت سے چور ، ڈاکو ، اور جواری آپ کو ملیں گے ، جو بہترین کھانے کھاتے ، اچھے سے اچھا کپڑا پہنتے اور بڑی عیش کی زندگی بسر کرتے ھیں ، تو کیا صرف عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سبب ان کو بڑا آدمی کہا جائے گا"۔[2]

★ " انسانی نفس میں ھزاروں چوریاں اور برائیاں چھپی ھوئی ھیں ۔ اگر ایک فرشتہ صفت انسان کو ڈھیل دیدی جائے یا اس کو مواقع حاصل ھوں ، تو اس کی لغزش کا ھر وقت امکان ھے اور اس بات کا فیصلہ ھر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے کر خود ھی کر سکتا ھے"۔[3]

★ " آپ جس تمدّن کو روشن اور آزاد سمجھتے ھیں ، وہ عیاشی اور مادی دماغوں کی پیداوار ھے ۔ جو تمدّن عورتوں کے رقصِ عریاں ، شراب، قمار بازی اور اس قسم کے بہت سے فواحش پر فخر کرتا ھو ، کیا اس تمدّن سے انسانیت کی کوئی خدمت ممکن ھے؟"[4]

★ " عورت کے قویٰ مرد کے قویٰ کے مقابلہ میں نازک اور لطیف اور ذکی الحِس

١۔ کردار ، ص ٤٧

٢۔ ایضاً ، ص ٧٥

٣۔ ایضاً ، ص ٩٢

٤۔ ایضاً ، ص ٩٣

ہیں ۔ وہ سخت کام جن کو مرد انجام دیتا ہے انکو اگر عورت ہاتھ لگائے تو اس کی جسمانی ساخت کو صدمہ پہنچے گا اور دوسرے معنی میں وہ ان حدود سے تجاوز کرے گی جو اس کے لیے مقرر کی گئی ہیں ۔ پھول کی ڈالی کی اہمیت اور لطافت سے کون انکار کر سکتا ہے ، لیکن اگر آپ اس سے چھڑی کا کام لینگے تو آپ کا یہ فعل پھول کی نازک ڈالی پر بڑا ظلم ہو گا"۔[1]

* "گھاس کے تنکے کتنے معصوم ہوتے ہیں ، لیکن آگ کی سر گرمی پاتے ہی جل اٹھتے ہیں ۔ ساز کے پردوں کو چھیڑا جائے گا ، تو وہ مترنم ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے ۔ عورت اور مرد میں جو جنسی اور صنفی کشش پائی جاتی ہے ، وہ جب کبھی ایک دوسرے سے ٹکرائے گی ، اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے گی "۔[2]

* "ہوس نا کی اور بےصبری ملی جلی کیفیتوں کا نام ہے ۔ ہو س پرست انسان بڑا ہی جلدباز ہوتا ہے اور یہی بےصبری اس کے بہت سے بھیدوں کو طشت ازبام اور بہت سی اسکیموں کو تباہ کر دیتی ہے"۔[3]

* "مسخ فطرتیں اور مکروہ خبیث ذہنیتیں اصلاح اور نیکی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں ۔ وہ کسی خرابی کے درست ہو جانے اور برائی کو اچھائی سے بدل جانے میں اپنی شکست اور نقصان محسوس کرتی ہیں ، اس لیے وہ ہر اصلاح اور بھلائی کے خلاف قدم اٹھاتی ہیں اور مخالفت کے جوش میں وہ ہر خوفناک سے خوفناک گناہ اور شرمناک سے شرمناک جرم کا ارتکاب کر سکتی ہیں ۔ دنیا کی تاریخ کے بہت سے

۱- کردار ، ص ۹۷

۲- ایضاً ، ص ۱۱۲

۳- ایضاً ، ص ۱۲۷

ابواب ان ھی سیاہ کاریوں کی داستانوں سے سیاہ ھین "۔[1]

* " بُری لوگ شکست کھا کر اور زیادہ شقی القلب اور مکروہ باطن ھو جاتے ھین" ۔[2]

* " بھاوج ، ساس اور نند کی لڑائی ھندوستان کی معاشرت مین اس طرح گھل مل گئی ھے کہ اسے علیحدہ نہین کیا جا سکتا ۔ جہان کسی شوھر نے بیوی کی ناز برداری کی یا کسی مسئلہ مین بیوی کی رائے سے اتفاق کیایا ھمدردی ظاھر کی تو اس کی مان اور بہنین خفا ھو گئین کہ لڑکا جورو کا غلام ھو گیا ھے،مان اور بہنون کو کچھ نہین سمجھتا۔ مان اور بہنون کی کسی بات مین تائید کی جاتی ھے تو بیوی ناک بھون چڑھانے لگتی ھے کہ سجھے باندی اور ماما سمجھ رکھا ھے ، میری کوئی بات نہین چلتی ۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتین مل کر ایک مستقل عداوت اور مخاصمت بن جاتی ھین اور یہ جنگ کبھی ختم نہین ھوتی ۔ مرد کو دو تیرون کا نشانہ بنا پڑتا ھے ۔ وہ ایک کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ھے جبکہ دوسرا فریق اس سے ناراض ھو جاتا ھے ۔ ھوتا یہ ھے کہ آج بیوی ناراض ھے تو مان اور بہنین خوش ھین اور اگر مان اور بہنین ناراض ھین تو بیوی کا چہرہ خوشی سے چمک رھا ھے ۔ ھر گھر ان معاشرتی جنگون کا میدان بنا ھوا ھے اور بڑے بڑے عقلمند اس چکر مین پھنسے ھوئے ھین"۔[3]

* " مشکوک نگاہ بعض وقت پھول کی پتی کی کور کو تلوار کی دھار سمجھنے لگتی ھے ۔ ھماری معاشرت کے بہت سے خُرخشے افسانون کا موضوع یہی بدگمانی ھے ۔ بدگمانی ایک ایسا پودا ھے جو آبیاری کے بغیر ھی پھولتا

۱- کردار ، ص ۱۶۰

۲- ایضاً ، ص ۱۶۱

۳- ایضاً ، ص ۱۷۵-۱۷۶

پھلتا ھے ، یہاں تک کہ اس کی گھنی ڈالیاں تخیلات پر چھا جاتی ھین "۔ [1]

ناول کا اختتام خاصا فلمی نوعیت کا ھے ۔ نادرہ کی زبانی نورجہان اور شمشاد کی بےتکلفی کاسن کر اور پھر نورجہان کا شمشاد کے نام خط پڑھ کر افضل یکایک مشتعل ھو جاتا ھے اور شمشاد اور نورجہان پر قاتلانہ حملہ تک کر دیتا ھے اور پھر خودکشی کی کوشش کرتا ھے ۔ تینوں مین سے ھر ایک کا زندہ سلامت رھنا بھی فلمی اسلوب کا حاصل ھے ۔

" کانجی ھاؤس "

٢٧٠ صفحات پر مشتمل "کانجی ھاؤس" ماھر القادری کا تیسرا ناول ھے جو مئی ١٩٤٨ء مین کتب خانہ عابد روڈ ، حیدر آباد دکن سے شائع ھوا ۔ یہ ایک معاشرتی ناول ھے ۔ جس مین معاشرے کے مختلف اور متعدد طبقات کی نفسیات اور عادات کی تصویر کشی کی گئی ھے ۔

اکرم کانپور مین سیٹھ ھردے ناتھ کے کارخانہ مین اسسٹنٹ مینجر ھے ۔ وہ بڑا ھی فرض شناس ، دیانت دار ، خود دار ، اور جرات مند و بےباک آدمی ھے ۔ بدعنوان ملازمین کی گرفت کرتا ھے تو وہ مخالفت اور سازشون پر اتر آتے ھین ۔ ، دوسری طرف اکرم کے حسنِ سلوک اور خوش اخلاقی کی وجہ سے سب مزدور اس کی خاص عزت کرتے ھین اور جب وہ مزدورن کے معاملے مین سیٹھ کو نرمی اختیار کرنے پر اصرار کرتا اور دوٹوک مشورے دیتا ھے ، تو سیٹھ اس

---

١ ۔ کردار ، ص ١٨٩

سے بدظن ہو جاتا ہے اور خصوصاً جب ہڑتال کسی طرح سے فرو نہیں ہوتی اور آخرکار اکرم کی مداخلت پر مزدور کارخانے میں کام پر آ جاتے ہیں ، تو دشمن سیٹھ کو باور کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ دراصل ہڑتال اکرم کے کہنے پر ہی ہوئی تھی -

اکرم بیمار ہو جاتا ہے اور کئی ہفتوں کی علالت اسے بہت کمزور کر دیتی ہے - وہ دو ماہ کی چھٹی لیتا ہے اور ڈاکٹروں کے مشورے پر تبدیلئ آب و ہوا کے لیے بمبئی چلا جاتا ہے - دورانِ سفر ریل گاڑی میں اور بمبئی میں اسے قسم قسم کے لوگوں سے ملنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے -

اکرم چھٹی گزار کر واپس آتا ہے تو دشمنوں کی سازش کامیاب ہو چکی ہوتی ہے - سیٹھ اس کے عہدے اور تنخواہ میں تو کمی نہیں کرتا ، مگر اس کا دفتر ایک دوسرے ہندو ملازم کو دے دیتا ہے اور توہین آمیز رویے کا مظاہرہ کرتا ہے اور اکرم سے جان چھڑانے کی خاطر مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک خلافِ قانون کام کرے - اکرم صاف انکار کرتا ہے اور کھری کھری سناتا اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیتا ہے -

اس کے جواب میں سیٹھ انتقامی کاروائی کرتا ہے اور اس پر غبن کا جھوٹا مقدمہ دائر کر دیتا ہے - پریشانی کی حالت میں اکرم کی بیوی دفعِ بلا کے لئے ایک پیر صاحب کی درگاہ پر جاتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ اکرم بھی ان کی خدمت میں حاضری دیا کرے - وہ بادلِ نخواستہ وہاں جاتا ہے ، مگر پیر صاحب کی فریب کاریوں اور عیاشیوں سے بدظن ہو کر گھر آ جاتا ہے - خوش قسمتی سے عدالت میں ثابت ہو جاتا ہے کہ سیٹھ نے اکرم کے خلاف جھوٹا مقدمہ دائر کر رکھا تھا - چنانچہ وہ صاف بری ہو جاتا ہے -

فنی اور تجزیاتی مطالعہ

================

" کانچ ہاؤس " کا پلاٹ غیر منظم ہے - ڈاکٹر سہیل بخاری کے الفاظ میں

اس قسم کا پلاٹ کتنے ہی واقعات کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جس میں ایک مرکزی شخص محورِ قصہ کا کام دیتا ہے ۔[1] چنانچہ " کانجی ہاؤس " میں سارے واقعات کسی نہ کسی طرح اکرم سے تعلق رکھتے ہیں ۔ بلکہ واقعات سے کہیں زیادہ متعدد کردار ہیں جو یکے بعد دیگرے سامنے آتے ہیں اور اپنی ایک بھرپور جھلک دکھا جاتے ہیں ۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو " کانجی ہاؤس " دراصل ایک کرداری ناول ہے جس کے سارے کردار اگرچہ قبلِ تقسیم کی مخلوط ہندو مسلم سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں ، مگر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یہ زندہ اور ترو تازہ ہیں کہ آج بھی ہمارے اردگرد اس قسم کے کردار متحرک اور برسرکارِ نظر آتے ہیں۔

چنانچہ " کانجی ہاؤس " میں ایک کارخانہ دار ، ایک کلرک ، ایک فلمی اداکار ، ایک ڈاکٹر ، ایک حکیم ، ایک مولوی ، ایک دست شناس ، ایک وکیل ، ایک سابق فوجی ، ایک پیر ، ایک طوائف ، ایک نائکہ ، ایک صحافی اور ایک شاعر کی نفسیات بیان کی گئی ہیں ۔ انسانوں کی مختلف اقسام کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور ان کے کردار کے مضحک پہلوؤں کو ابھار کر انہیں بالواسطہ طور پر طنز و مزاح کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ یہ سب کردار عین فطری انداز میں اپنے اپنے مقام پر سامنے آتے ہیں اور ان کی آمد پر کہیں بھی آورد کا احساس نہیں ہوتا ۔

اس سلسلے میں مصنف کی باریک بینی اور جزئیات نگاری قابلِ ذکر ہے ۔ سید وقار عظیم نے ادب میں مشاہدے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " ادب اسی دولتِ بیدار کے سہارے جیتا اور اسی سے اپنی ادبی تخلیق کو زندگی کا ہمسر اور ہم نوا بناتا ہے اور ادب اسی کی مدد اور سہارے سے زندگی کا ترجمان ، عکاس اور مفسر بنتا ہے"۔[2]

١۔ " اردو ناول نگاری " ص ١٨

٢۔ ہفت روزہ " لیل و نہار " لاہور ٣٠ اکتوبر ١٩٦٠ء ، مضمون ادب میں مشاہدے کی اہمیت از وقار عظیم ، ص ٨٠

چنانچہ اس ناول میں مصنف کے ہمہ جہت مشاہدہ کی مثالیں عام ہیں اور خصوصاً مختلف لوگوں کی ذہنی سطح اور نفسیات سے بھی وہ خوب آگاہ ہے اور امیر اور معروف طبقات کے ساتھ ساتھ وہ غریب لوگوں کی نفسیات سے بھی باخبر ہے ۔ چنانچہ ایک ان پڑھ غریب مزدور کی دکھ بھری داستان کو سن کر جب اکرم اسے آٹھ آنے کی بجائے پانچ روپے دے دیتا ہے تو وہ شکریہ ادا کئے بغیر جلدی سے کھسک جاتا ہے وہ ڈرتا ہے کہ مبادا اکرم کا خیال بدل جائے اور وہ اتنی بڑی رقم واپس نہ لے لے۔[1]

مصنف بخوبی جانتا ہے کہ جب ایک پاکباز شریف آدمی ماحول سے متاثر ہو کر پہلے پہل گناہ کی وادی میں داخل ہوتا ہے تو وہ کس نوعیت کی اضطراری کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے ۔[2] مصنف نام نہاد خانقاہوں سے لے کر کچہریوں کے ماحول تک سے آگاہ ہے اور اس نے معاشرے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ۔

مختلف اقتصادی طبقات کے بارے میں مصنف کی معلومات بے پناہ ہیں اور انہیں فطری اور موثر انداز میں بیان کرنے کا اسے ملکہ حاصل ہے ۔ خصوصاً وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی منافقت ، خودغرضی ، زر پرستی اور عائش پسندی کو بے نقاب کرتا ہے ۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ مصنف خود ایک معروف شاعر ہے، صحافی اور دینی تشخص کا حامل عالمِ دین بھی ، مگر اس نے ان تینوں طبقوں کے مضحکہ خیز رویوں اور کمزوریوں کو واشگاف کرنے میں کسی دریغ سے کام نہیں لیا ۔ اس سے مصنف کی اخلاقی جرأت اور انصاف پسندی کا خوشگوار تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے ۔

" کانجی ہاؤس " میں دو بڑے کردار ہیں ۔ اکرم کا اور سیٹھ پورے ناتھ

١۔ کانجی ہاؤس " ص ٩٠

٢۔ ایضاً ، ص ٩٢

کا ۔ ان میں اکرم نیکی ، شرافت ، خود داری ، بہادری اور انسانی احترام کی علامت ہے ۔ جبکہ سیٹھ پربھو ناتھ زر اندوزی ، دانش پسندی ، جاہ پرستی اور ابن الوقتی اور ہوس کاری کا نمائندہ ہے ۔ مگر خوشگوار امر یہ ہے کہ دونوں کردار جمود سے محفوظ رہے ہیں ۔ وہ حالات اور واقعات سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے رویے میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔ اکرم بمبئی جاتا ہے تو نیکی اور نماز کی پابندی کے باوجود ایک خوبصورت طوائف کے چنگل کے قریب پہنچ جاتا ہے ، مگر اس کی خوش بختی اسے بال بال بچا لیتی ہے ، اسی طرح مقدمے کی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اضطراری حالت میں بیوی کے اصرار پر ایک عیّار پیر کی خانقاہ تک جاپہنچتا ہے ، لیکن یہاں بھی اس کی سلامتِ طبع اُسے بچا لیتی ہے ۔ پریم چند کے ناولوں کی طرح " کانچ ہاؤس " میں بھی کامیابی اور سرخروئی نیکی اور شرافت کے حصے میں آتی ہے ۔

زبان و اسلوب
===========

" کانچ ہاؤس " کی زبان سلیس اور رواں ہے ۔ اور اگرچہ سرورق پر ناول کے نام کے نیچے " ایک پاکیزہ ، نفسیاتی ، اخلاقی اور سبق آموز سرگزشت شاعرانہ طرزِ بیان میں " کے الفاظ درج ہیں ، مگر ناول کی زبان ہرگز شاعرانہ نہیں ہے ۔ اس کا بہاؤ فطری ہے اور مسجع و مقفیٰ اسلوب یا تصنع کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ کتاب کے ناشر نے اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں ۔ جیسا کہ روایتی اشاعتی اداروں میں رواج تھا ۔ ناول میں انشائے لطیف کی متعدد مثالیں موجود ہیں اور اسلوب شگفتگی اور حُسن کا حامل ہے ۔

مکالمے

" کانچی هاؤس " کے مکالمے دو مقامات کے سوا موقع محل کے اور کرداروں کے مزاج و نفسیات کے عین مطابق هین اور مصنف کی ژرف نگاهی پر شاهد هین ۔ مکالمون کی زبان کرداروں کی سماجی حیثیت سے مطابقت رکھتی هے البته اکرم قیامِ بمبئی کے دوران مین جب ایک فلمی اداکارہ سے متعارف هوتا هے اور گفتگو کرتا هے تو اس کی بےتکلفانه باتین غیر فطری اورغیر واقعی لگتی هین ۔ ایسا نوجوان جو شریفانه خیالات رکھتا هے، پہلی هی مرتبه ایک اجنبی اداکارہ کے پاس جاکر یون بے حجابانه گفتگو نهین کرسکتا۔ اس طرح کی باتین گھاگ قسم کے گرگِ باران دیده لوگ هی کر سکتے هین۔[۱]

اسی نوعیت کا غیر فطری اندازِ گفتگو اکرم مسز فیروز کے ساتھ روا رکھتا هے جو کارخانے کے پارسی افسر کی بیوی هے ، سیٹھ پورن ناتھ کے ساتھ آتی هے اور اکرم نے بمبئی سے واپس آکر اسے پہلی مرتبه دیکھا هے ۔ اکرم بالکل فلمی انداز مین،یعنی فلمی لب و لہجے مین،اس سے مخاطب هوتا هے اور کسی وقار یا متانت کا مظاهرہ نهین کرتا ۔[۲]

اس ناول کے کچھ مزید کمزور پہلو بھی هین ۔ مثلاً یه بات سمجھ مین نهین آتی که اکرم چھٹی گزار کر اور بمبئی سے واپس آکر سیٹھ سے ملاقات کے لیے کیون نهین گیا ۔ وضع داری اور لحاظ کا تقاضا یه تها که وہ سیٹھ کے پاس جاتا اور اصلاحِ احوال کی کوشش کرتا ۔ ثانیاً ایک هندو سیٹھ کی خسّت ، احتیاط اور بزدلی سے یه بات بعید لگتی هے که وہ اکرم کی مسز فیروز سے "گستاخی" اور استعفے کو انا کا مسئله بنا لے ، اور اس کے خلاف عدالت مین مقدمه دائر کر دے ۔ لیکن اگر قصے کو یه موڑ نه دیا جاتا تو همین

۱- کانچی هاؤس ، ص ۹۸-۹۹

۲- ایضاً ، ص ۲۱۵-۲۱۶

مصنف کی زبانی ایک صحافی ، وکیل ، مولوی ، پیر ، اور طوائف کے خوبصورت خاکے پڑھنے کو نہ ملتے ۔ نہ کچہری ، بازارِ حسن اور خانقاہ کا ماحول سامنے آتا اور نہ توہم پرست عقیدت مندوں کی خوش عقیدگیوں اور عیار مجاوروں کی فریب کاریوں کے مناظر دکھائی دیتے ۔

فلسفۂ حیات
==========

" کانچی ہاؤس " میں مصنف کا باقاعدہ ایک " فلسفۂ حیات " نظر آتا ہے ۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار اپنے سامنے گہری مقصدیت رکھتا ہے اور زندگی کے بارے میں اسکا نقطۂ نظر صاف ، واضح اور دوٹوک ہے ۔ وہ غیرت کو عقلِ سلیم کی ایک علامت قرار دیتا ہے ۔[۱] عزت و سربلندی کو انسان کے لیے ایک آزمائش سمجھتا ہے ۔[۲] وہ سرمایہ داریت کا سخت مخالف ہے ۔[۳] عورتوں کی آزادی اور بیباکی کو معاشرے کے لئے مضر جانتا ہے ۔[۴] غیر ملکی استعمار سے سخت بیزار اور متنفر ہے ۔[۵] منافقت کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ بےاختیار اس سے کراہت ہونے لگتی ہے اور اس کی سچ ایک سچے خدا پرست کی سچ ہے ۔ مثال کے طور پر بمبئی کے ایک پارک میں اکرم کے حوالے سے یہ عبارت بڑی ایمان پرور ہے ۔

" پارکوں اور باغوں میں جاکر روشوں پر ٹہلتا ، کچی کلیوں ، نیم باز غنچوں ، شگفتہ پھولوں اور مہکتے ہوئے سبزے کے نظارے سے لطف اندوز ہوتا .... یہ نظارے اس کا جی بہلاتے تھے اور اسکی عقیدت کو بھی مستحکم بناتے تھے ۔ اس کا دل گواہی دیتا کہ رنگ و بو

۱۔ کانچی ہاؤس " ، ص ۳

۲۔ ایضاً ، ص ۴

۳۔ ایضاً ، ص ۹ ، ۲۱

۴۔ ایضاً ، ۷۹ ، ۸۰

۵۔ ایضاً ، ص ۶۷ ، ۶۸

کی یہ تنظیم ، انجم و کواکب کا یہ نظام ، شام و سحر کی یہ ترتیب خود بخود ظہور میں نہیں آئی - ان کا ضرور کوئی خالق ہے - بےشعور مادہ خود کچھ نہیں کر سکتا - یہ کائنات جس کی بنیاد حکمتوں پر ہے ، یقیناً اس کی تخلیق میں بہت بڑے حکیم و صانع کی حکمت شامل ہے "- ۱

" کانچی ہاؤس " میں " کردار " کی مانند جابجا حکمت و بصائر کے خوبصورت نمونے ہیں جو مصنف کے تفکر اور زندگی کے بارے میں گہرے مشاہدے کی نشاندہی کرتے ہیں -

" دُرِّ یتیمؐ "

========

دُرِّ یتیمؐ ماہر القادری کا تاریخی ناول ہے جو پیغمبرِ اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ کے حالات پر مشتمل ہے -

ڈاکٹر ممتاز منگلوری کے بقول " تاریخی ناول ، ناول نگاری کی مشکل ترین صنف ہے - اس میں ناول نگار کی ذمے داریاں اور مشکلات عام معاشرتی یا سماجی ناول نگار کی نسبت بدرجہا زیادہ ہوتی ہیں"۲- دراصل تاریخی ناول نگار تاریخ کے بیان کردہ واقعات کو پس منظر کے طور پر استعمال کرتا ہے اور تخیل کی رنگ آمیزی سے خشک تاریخی حقائق میں ایسی جان ڈال دیتا ہے کہ واقعات اور کردار زندہ و متحرک ہو کر سامنے آ جاتے ہیں- اس طرح تاریخی ناول ماضی کو از سرِنو زندہ کرتا اور کسی دَور کی یوں بھر پور

۱- کانچی ہاؤس " ، ص ۷۴، ۷۵

۲- شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ " از ڈاکٹر ممتاز منگلوری مکتبہ خیابان ادب ، لاہور ۱۹۷۸ء ص ۲۸

اور مکمل عکاسی کرتا ہے کہ وہ تاریخ کے مقابلے میں کہیں زیادہ دلچسپ اور جاذبِ نظر بن جاتا ہے ۔ ڈاکٹر منگلوری ہی کے الفاظ میں :

" تاریخی ناول نگار حقائق تو تاریخ سے لیتا ہے مگر تخیل کی مدد سے ان کے ساتھ ایسی جزئیات بھی مرتب کرکے شامل کر دیتا ہے جو تاریخی صداقتوں پراثر انداز ہوئے بغیر تصویر میں زندگی کا رنگ پیدا کر دیں اور ماضی کے متعلقہ عہد کا نقش مکمل ہو جائے"۔[۱]

سید وقار عظیم کے نزدیک معروف اور پُرشکوہ زمانے پر ناول لکھنا اور بھی مشکل فن ہے کہ روایت اور درایت ایسے زمانے کو غیر معمولی درخشاں اور تابندہ بنا دیتی ہیں اور مورخین اتنا مواد فراہم کر دیتے ہیں کہ اس زمانے سے تعلق رکھنے والی کہانیوں میں تخیل کو پرواز کرنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔[۲]

تاریخی ناول نگار کے لیے بےحد ضروری ہے کہ وہ ناول کے لیے تاریخ کے جس عہد کا انتخاب کرے ، اس سے گہرا جذباتی میلان رکھتا ہو کہ کسی والہانہ اُنس کی بِنا پر وہ صحیح محاکاتی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے ۔[۳]

ثانیاً کہانی موثر اور دلنشین ہو اور قاری کی ساری توجہات کو کچھ دیر کے لیے اس طرح جذب کرے کہ اس پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو موجودہ ماحول اور فضا کے بجائے ایک نئے ماحول اور فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس کرے ۔[۴]

الفریڈ ٹریسڈر شیپرڈ تاریخی ناول نگاری کے سلسلے میں مطالعہ کی اہمیت پر بےپناہ زور دیتا ہے ۔ اس کا مشورہ ہے کہ تاریخی ناول نگار اپنے آپ کو متعلقہ

۱۔ شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ " از ڈاکٹر ممتاز منگلوری ، مکتبہ خیابان ادب ، لاہور ۱۹۷۸ء ، ص ۳۰
۲۔ فن اور فنکار ، از سید وقار عظیم اردو مرکز لاہور ۱۹۶۶ ء ، ص ۱۳ مضمون تاریخی ناول اور اس کا فن ،
۳۔ ایضاً، ص ۱۱
۴۔ ایضاً ، ص

عہد کے مطالعے میں غرق کر دے ، چھوٹی سے چھوٹی بات کا دقتِ نظر سے جائزہ لے اور جس ملک یا علاقے کے بارے میں لکھنا مطلوب ہو اس کے جغرافیے اور نقشے کا بغور مطالعہ کرے[1] ۔ چنانچہ سر والٹر اسکاٹ کی رائے میں تاریخی ناول نگار کا علم جس حد تک مکمل اور پختہ ہو گا ، جس حد تک اسے اپنے موضوع اور عہد سے واقفیت ہو گی ، اُسی حد تک اس کا ناول دلچسپ اور موثر ہو گا ۔[2] الفریڈ شیپرڈ تاریخی ناول کی صفات کو سمیٹتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس میں وقار ہو ، فضا سازی ہو ، اس میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہو اور جزئیات کا تناسب اور ڈرامائیت ہو ۔[3]

" دُرِّ یتیمؐ " کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ

ماہر " دُرِّ یتیمؐ " کے پیش لفظ میں لکھتے ہوں :۔

" دُرِّ یتیمؐ " بھی ناول کے انداز پر لکھا گیا ہے ، لیکن اس ناول کا ہیرو وہ انسانِ کامل ہے جس سے بہتر انسان پر آج تک سورج طلوع نہیں ہوا۔ یہی ذاتِ گرامی خلاصۂ کائنات،فخرِ موجودات اور شرفِ انسانیت ہے ، اس لیے" در یتیمؐ " میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملے گا جو اس زبان حق ترجمان سے کہ ومایـنطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یّوحیٰ کی مصداق ہے ، نہ ادا ہوا ہو اور اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہو ۔ اس ناول کے واقعات تاریخی اساس اور روایتی شہادتیں رکھتے ہیں درایت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ۔[4]

۱۔ بحوالہ شرر کے تاریخی ناول " از ڈاکٹر ممتاز منگلوری ، ص ۳٦

۲۔ بحوالہ فن اور فن کار از سید وقار عظیم ، ص ۱۰

۳۔ بحوالہ شرر کے تاریخی ناول ، ص ۳۰

۴۔ " در یتیم " از ماہر القادری ، گوشۂ ادب ، لاہور بار سوم ۱۹۸۰ء ، ص ۳

چنانچہ جیساکہ ناول کے موضوع اور مندرجہ بالا دعوی سے اندازہ ہوتا ہے ، مصنف کا کام بیحد مشکل تھا ۔ نبی اکرمؐ کی حیاتِ مقدسہ کا کوئی ورق زمانے کی نظروں سے اوجھل نہیں اور آپ کا عہد تاریخ کا روشن ترین دور تھا اور جیساکہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں " کسی معروف اور پرشکوہ عہد کو موضوع بنانا فنکار کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ ایسے ادوار کے بارے میں مورخین نے اس قدر کثرت سے مواد فراہم کیا ہوا ہوتا ہے کہ فنکار کے لیے تخیل کی جولانی دکھانے کا کوئی موقع نہیں ہوتا "۔[1]

لیکن مقامِ مسرت ہے کہ ماہر نے نازک اور مشکل مرحلہ خاصی حد تک کامیابی سے طے کر لیا ہے۔اس کا طریقہ انہوں نے یہ اختیار کیا ہے کہ بعض کیفیات اور تفصیلات " زبانِ حال " سے بیان ہوئی ہیں جہاں ناول نگار کا تخیل بھی شامل ہو گیا ہے ۔ مثال کے طور پر ناول کا آغاز اس مشہور واقع سے ہوتا ہے جب جناب عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ میرے دس بیٹے ہو جائیں گے ، تو ایک بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر دوں گا ۔ اس منت کے مطابق جب موصوف محترم نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے عبداللہ کو ذبح کرنا چاہا ، تو عبداللہ کے ننھیال اور خاندان کے دیگر افراد نے مزاحمت کی ۔ ماہر کے اعتراف کے مطابق اس موقع پر جو مکالمہ ہوا اور واقعہ کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ تخیلی ہے "۔[2]

اسی طرح بقول مصنف :

" دودھ پلانے والیوں کامکالمہ ، حلیمہ سعدیہ کی گفتگو اور ان کے سفر

۱۔ " شرر کے تاریخی ناول " ، ص ۳۲

۲۔ " دُرِّ یتیم " پیش لفظ ، ص ۳

کے واقعات بھی زبانِ حال سے ادا ہوئے ہیں ۔ اس" زبانِ حال " کی بنیاد تاریخی روایتیں ہیں ، مگر تفصیل میں تخیل نے پیدا کی ہے ۔ اس انداز کی تفصیلات سے گریز کرتا تو پھر یہ ناول خالص تاریخی کتاب بن کر رہ جاتا ۔"[1]

تخّیل کی یہی کارفرمائی اور دلچسپ اور حیرت انگیز مگر سچے تاریخی واقعات کے انتخاب کا اعجاز ہے کہ ڈاکٹر انور محمود خالد کے نزدیک ناول کے انداز میں لکھی ہوئی سیرت کی اس کتاب میں "جاذبیت اور دلچسپی کا عنصر غالب ہے اور مطالعے کے دوران بہت کم احساس ہوتا ہے کہ ہم محض سیرت اور سوانح کی ایک کتاب پڑھ رہے ہیں"[2] چنانچہ حضرت عبداللہؓ کی قربانی ، حضرت حلیمہ کی گفتگو اور ان کے خاندان کی معاشی کایا پلٹ پر خاندان کے افراد کا تبصرہ ہی اس سلسلے کی خوبصورت مثالیں نہیں ہیں بلکہ حضرت عبد اللہؓ کی بارات کا منظر ، حضرت عبد المطلب کے گھر میں حضرت عبداللہؓ کے ولیمے کی تقریب ، حضرت عبداللہؓ کا سفرِ شام اور حضرت سیدہ آمنہ کے جذبات کی عکاسی ، اپنے خاوند کا انتظار ، ان کی وفات پر حضرت آمنہ اور عبدالمطلب کے احساسات ، حضرت محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بچپن کی تصویر ، آپ کا لڑکپن اور جوانی اور اہلِ مکہ کے اس پر تبصرے غرض اس ناول میں اخیر تک بےشمار ایسے مقامات ہیں کہ جہاں تاریخیت کو مجروح کئے بغیر مصنف نے تخیل کی آمیزش کی ہے اور واقعات کو دلچسپ بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے تاثر میں اضافہ کر دیا ہے ۔ مصنف جذبات نگاری اور فضا بندی کے فن سے خوب واقف ہے اور واقعات کی تصویر کاری پر دسترس رکھتا ہے ۔ چنانچہ حضرت سیدہ آمنہ کے جذبات کی عکاسی اتنی بھرپور اور مکمل ہے کہ قاری اس میں جذب

۱۔ " در یتیم " پیش لفظ ، ص ۲

۲۔ اردو نثر میں سیرتِ رسولؐ از ڈاکٹر انور محمود خالد ۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۹ء ص ۷۰۳ ، ۷۰۴ ۔

ہو کر رہ جاتا ہے[1] ۔ فضا بندی اور تصویر کاری کی مثالیں بھی بہت سی ہیں ۔ اور نبی اکرم ؐ کی حیاتِ مقدسہ سے پہلے کا زمانہ، پس منظر اور زمان و مکان کے بُعد کے باوجود قارئین کو اجنبی معلوم نہیں ہوتا ۔ اسی طرح جنگ بدر میں نوعمر عُمیر بن ابی وقاص رضؓ کا شوقِ جہاد[2] ۔ قاتل غلام بن گیا[3] ۔ اور مدینہ میں نبی اکرمؐ کی آمد کے موقع پر اہلِ مدینہ کے جذبات کی تصویر کشی اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں ۔

ماہر قبلِ اسلام کے عرب معاشرے سے متعلق ضروری معلومات بھی رکھتے ہیں اور مختلف مقامات پر عربوں کی معاشرت ، ان کی نفسیات اور پسند و نا پسند کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں ۔ تلوار ، اونٹ ، شراب اور بتوں کے گرد گھومتی ہوئی مختلف کرداروں کی گفتگو کے دلچسپ اور معلومات افزا مرقّع بھی سامنے آتے ہیں ۔ چنانچہ ناول نگار نے واقعات اور کرداروں کے ایسے نقش ابھارے ہیں جن میں اصلیت کا پورا رنگ نظر آتا ہے ۔ پلاٹ اور کردار ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ اس ضمن میں منظر نگاری اور مکالموں کا فطری انداز خاص قابل ذکر ہیں اور فورڈ میڈ اکس فورڈ نے تاریخی ناول نگاری میں عہد رفتہ کی از سرِ نو تخلیق کو اس فن کا جو بنیادی فریضہ قرار دیا ہے[5] ۔ تو ماہر اس فریضے میں کامیاب و کامران دکھائی دیتے ہیں اوران کے ناول میں قبلِ اسلام اور عہدِ نبویؐ کا عرب معاشرہ زندہ و متحرک ہو کر سامنے آ جاتا ہے اور قاری اپنے آپ کو اُسی عہد میں اُنہیں لوگوں کے ساتھ سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے ۔

" در یتیم " میں ناول نگار نے نبی اکرمؐ کی شانِ رحمت کو زیادہ نمایاں کیا ہے ۔ مختلف وقتوں میں کتنے ہی لوگ آپ کے قتل کا پروگرام بنا کر آئے[6] ۔ آپ کو

١۔ " دریتیم " ص ٢٣ ، ٢٣ ، ٢٩

٢۔ ایضاً ، ص ٢٦٠

٣۔ ایضاً ، ٢٢٥

٤۔ ایضاً ، ٢٣١ ، ٢٣٢

٥۔ بحوالہ شرر کے تاریخی ناول ، ص ٣٩

٦۔ مثلاً عمیر بن وہب ، ص ٢٢٥ اور فضالہ بن عمیر ، ص ٣٢٥

ان کے اداروں کا علم بھی ہو گیا ، مگر آپ نے انہیں معاف کر دیا اور محبت و کرم کا وہ سلوک فرمایا کہ وہ آپ کا کلمہ پڑھنے لگے ۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی اصول پسندی ، ایفائے عہد ، عفو و درگزر ، انسانی احترام ، اللہ پر محکم یقین ، اور شجاعت و بہادری کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے ۔

اس ناول کا دوسرا خاص پہلو اصحابِ رسول کی جانثاری ، عزیمت ، شوقِ شہادت ، آخرت پر محکم یقین اور فقر و استغنا کی مثالوں پر مبنی ہے ۔ یہ دونوں خصوصیات تربیتِ نفس کا کام کرتیں اور ضمیرِ انسانی میں اعلٰی اخلاقی اقدار کی تعمیر کا کام کرتی ہیں ۔ اس اعتبار سے " دُرِّ یتیم " بہترین مقصدیت کا حامل ہے اور مصنف کو یہ سہولت مل گئی ہے کہ نبی اکرمؐ کی حیاتِ مقدسہ ایک تو بذاتِ خود بےحد انقلابی خصوصیات کی حامل ہے اور پھر جابجا ایسے واقعات موجود تھے جو محیر العقول ، دلچسپ اور روح پرور بھی تھے ۔ مصنف نے اس مسالے سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے اور ناول کو دلچسپ اور فرحت انگیز بنا دیا ہے ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں مبالغے کا عنصر کہیں نظر نہیں آتا اور حقیقت نگاری کا پہلو جاری و ساری دکھائی دیتا ہے ۔

ماہر نے حالات و واقعات کے تناظر میں جگہ جگہ تبصرے بھی کئے ہیں اور حکیمانہ اسلوب بھی اختیار کیا ہے جو قاری کے خیالات میں ترفع پیدا کرتا اور اس کی تربیت میں معاون ثابت ہوتا ہے ۔ ناول میں اس سلسلے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ۔ محض چند پر اکتفا کیا جا رہا ہے ۔

نبی اکرمؐ کے مراحلِ حیات پر تبصروں کا انداز یوں ہے :۔

★ " ہر قوم اور ملک کے بچے شوخ و شریر ہوتے ہیں اور یہ تو ان عربوں کے بچے تھے جن کے گھر کے لوگ بات بات پر کٹ مرتے تھے ۔ کسی کا اونٹ دوسرے کی چراگاہ میں آگیا اور اتنی سی بات پر تلواریں چلنے لگیں ۔ ایسے والدین کی اولاد کو لڑاکا اور جھگڑالو ہونا ہی چاہئے

تھا ، مگر محمد کی سرشت سب سے جدا اور اندازِ طبیعت سب سے منفرد تھا ۔ اس اندھیرے میں بھی ایک چراغ اور اس خارزار میں بھی ایک گلِ صد برگ تھا ۔ بچوں کے ساتھ کھیلنے سے محمد کی طبیعت نفرت کرتی ، کوئی فحش کلامی کرتا ہوتا تو آپ دور چلے جاتے ۔ بُرے لفظ سننا تک گوارا نہ تھے ۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کرتے کہ ساتھی چرواہوں کے ساتھ خود رو جھڑبیریاں توڑ کر کھالیں اور اس میں بھی متانت اور وقار کا خیال رکھتے" ۔[1]

* " عربوں کے میلوں ٹھیلوں میں کھیل کود ، تفریح ، فحش کلامی اور عریاں شعر و شاعری کا مظاہرہ ہوتا ۔ ان کی شاعری گویا اس زمانہ کا " ادبِ لطیف " اور " ترقی پسند ادب " تھا ۔ جنسی نفسیات کی شرمناک تفسیر ، ہوسناکی کو ابھارنے والے خیالات ، فحاشی اور عریانی کی ترجمانی ، خلوت و تنہائی کی ان باتوں کا ذکر جو واقعیت کے باوجود اظہار کے قابل نہیں ہوتیں اور شرافت ایک لمحہ کے لیے اسے برداشت نہیں کر سکتی " ۔[2]

* " وطن کی محبت اپنے اندر بہت کشش رکھتی ہے ۔ ایک ایک ذرہ سے آدمی کی نگاہیں مانوس ہوتی ہیں ۔ وطن کے کانٹے پر دیس کے پھولوں سے بڑھ کر دلکش ہوتے ہیں ، مگر حق کی سربلندی ، خدا کے حکم کی تعمیل اور سچائی کی تبلیغ و اشاعت کی راہ میں " ہجرت " کا نازک مقام بھی آتا ہے ، جہاں وطن کی محبت پر فرض کو ترجیح دی جاتی ہے ۔ وطن کے تعلقات اور محبت آمیز روابط دامن پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو ، پردیس میں تمہاری کون غمخواری کرے گا ۔ اجنبی ماحول تمہیں راس نہ آئے گا ۔

۱۔ در یتیم " ، ص ۷۸ ، ۷۷

۲۔ ایضاً ، ص ۹۶

یہین پڑے رہو ، اپنون کی گالیان دوسرون کی دعاؤں سے اچھی ہوتی ہین -- مگر خدا کے مجاہد اس آواز پر کان نہین دھرتے - وہ ایک ہی جھٹکے مین ، تعلقات کے ان تمام دھاگون کو توڑ ڈالتے ہین اور خدا کا نام لے کر وطن سے چل پڑتے ہین"۔ [1]

★ " گردشِ ماہ و سال یہ منظر دیکھنے کے لیے رک رک جاتی کہ جس کے سرِ اقدس پر اللّٰہ تعالٰی نے عزت و بزرگی کا سب سے قیمتی تاج رکھا تھا ، وہ مزدورون کے لباس مین پتھر ڈھو رہا تھا - جبینِ سعادت نشان عرق آلود ہو ہو جاتی -آقا اپنے غلامون کا ہاتھ بٹا رہا تھا - صولت قوتِ بازو کی زبان سے بول رہی تھی - دیکھنے مین یہ ایک مسجد کی تعمیر تھی ، مگر حقیقت مین یہ ایک درس تھا جہان بانون ، فرمانرواؤں ، کشورکشاؤں اور حاکمون کے لیے " - [2]

★ " مسجدِ نبوی بن چکی تو اس کے آس پاس ازواجِ مطہرات کے رہنے کے لیے حجرے تعمیر ہوئے - کچے اور انتہائی سادہ حجرے،کسی کسی کی چھت تو اتنی نیچی تھی کہ آدمی کھڑا ہوتا تو اس کا سر چھت سے لگ جاتا - یہ محمد ﷺ رسول اللّٰہ کے اہلِ بیت کے مکانات تھے - قیصر و کسریٰ کے ایوان ، ہر قل کی شبستانِ عیش اور ملوکِ ہند کے عشرت کدے اور حریم ناز نہ تھے - انسانیت کی تاریخِ تمدن کا یہ سب سے زیادہ روشن نقش تھا - انہین آثار کو دنیا والون کے لئے چراغِ راہ بننا تھا - یہی سادگی ، مختصر گیری ، بےنفسی اور دھوم دھڑاک سے بےنیازی انسانیت کے لیے شمعِ ہدایت اور آثارِ سعادت تھی "- [3]

حکمت آموزی کی چند مثالین بھی ملاحظہ فرمائیے :-

١- در یتیم " ، ص ١٦٥ ، ١٦٢

٢- ایضاً ، ص ٢٢١ ، ٢٢٠

٣- ایضاً ، ص ٢٢٢

* " قدرت جس کو بڑا بنانا چاھتی ھے ، اسے آزمائش کی بھٹیون مین تپاتی اور غم و الم کے خار زارون سے گزارتی ھے - غمون سے قلب مین گداز پیدا کیا جاتا ھے کہ اس گداز کو دوسرون کی غمخواری کے کام آتا ھے اور سانحے طبیعت مین نکھار پیدا کرتے ھین - عیش و مسرت سے دنیا کی بڑی شخصیتون کو جان بوجھ کر دور رکھا جاتا ھے - آلام و مصائب کے افق ھی سے عظمتون اور بلندیون کے آفتاب طلوع ھوا کرتے ھین - قدرت کی یہی سنت ، اس کا یہی دستور اور یہی مصلحت ھے "۔[1]

* " انسان کی سب سے بڑی بد نصیبی اور گراوٹ خدانا شناسی اور اپنے خالق و معبود سے دوری اور بیگانگی ھے "۔[2]

* " باطل کا خاصہ ھے کہ حق کو کامیاب دیکھ کر وہ ظلم و زیادتی پر اتر آتا ھے - محکم دلیلین سن کر اور واضح نشانیان دیکھ کر جہالت مین اور شدت پیدا ھو جاتی ھے "۔[3]

" در یتیم " مین بقول ڈاکٹر انور محمود خالد بعثت نبوی سے بعد کے واقعات تخیلی کم اور واقعاتی زیادہ ھین - اس لئے یہ حصہ ناول سے زیادہ سوانح معلوم ھوتا ھے - یہان مصنف نے اخبار و سیر کی کتابون کو اپنا ماخذ بنایا ھے - اسی لیے یہ جزو زیادہ مستند اور معتبر ھے -[4]

ماھر کو " در یتیم " کی تصنیف پر خود بھی بہت ناز تھا - چنانچہ وہ لکھتے ھین :"-

---

۱- در یتیم ، ص۷۳

۲- ایضاً ، ۹۳

۳- ایضاً ، ۱۹۸

۴- اردو نثر میں سیرت رسولؐ ص ۵۰۷

" یہ ناول (در یتیمؐ) میرے لیے ذخیرۂ عقبیٰ اور توشہ آخرت ہے۔جانے کتنی بار خود ہی لکھتے لکھتے بےاختیار رودیا ہوں۔یہی آنسو میری زندگی کا سرمایہ اور میری خوشیوں کی گرانقدر متاع ہیں - " در یتیم " کی غایتِ نگارش تفریحِ طبع نہیں توفیقِ عمل ہے " - [1]

نال کی کمزوریاں اور خامیاں

=====================

بہت سی خوبیوں کے باوصف زیر مطالعہ ناول میں فنی اعتبار سے چند خامیاں بھی ہیں - جو مندرجہ ذیل ہیں :-

واقعات کی ترتیب کے ضمن میں ماہر سے ایک چوک یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے پہلے سفرِ طائف کا ذکر کیا ہے - پھر شعبِ ابی طالب میں محصوری کا پھر حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کا اور اس کے بعد ہجرتِ حبشہ کے واقعات کی طرف اشارے کئے ہیں - حالانکہ ہجرت حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی - شعبِ ابی طالب کا زمانہ ۷ نبوی سے ۱۰ نبوی تک ہے اس کے بعد ۱۰ نبوی ہی میں جناب ابو طالب اور حضرت سیدہ خدیجہؓ کی وفات ہوئی اور اسی سنہ کے آخیر میں حضورؐ طائف تشریف لے گئے - [2]

" دُرِّ یتیم " سے ایسا تاثر ابھرتا ہے گویا ہجرت کا پروگرام ایکا ایکی بن گیا اور نبی اکرمؐ کفّار کا محاصرہ توڑ کر اچانک مدینہ کی طرف چل پڑے - [3] حالانکہ شبلی نے بخاری کی روایت نقل کی ہے کہ نبوت کے تیرھویں سال تک اکثر صحابہ مدینہ ہجرت کر گئے تھے

۱- پیش لفظ " در یتیم " ص ۳

۲- دیکھئے سیرت النبی جلد اوّل از علامہ شبلی نعمانی مطبوعہ نیشنل بک فاونڈیشن پاکستان طبع سلام ۱۹۸۵ء ، ص ۲۲۰ ، ص ۲۳۱ ، ص ۲۳۳ ، ص ۲۳۶

۳- " در یتیم " ص ۲۱۳ ، ۲۱۲

اور حکمِ خداوندی کے مطابق خود نبی اکرمؐ نے بھی مدینہ کا عزم فرما لیا تھا اور اسی خدشے کے پیش نظر کفار نے آپ کے قتل کا منصوبہ تیار کیا تھا۔[۱] " دریتیم " میں یہ ضروری تفصیل نہیں ہے۔

اسی طرح نبی اکرمؐ کی ہدایت پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سفر کی تیاری پہلے سے مکمل کر لی تھی۔[۲] مگر " درِّ یتیم " میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اور یہ خلافِ واقعہ فقرے نظر آتے ہیں:-

" حضور دولت کدے سے چل کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے اور اپنے ارادے اور حالات کی نوعیت سے مطلع فرمایا۔ ابو بکرؓ نے کسی پس و پیش، کسی تامل اور ذرا سی ہچکچاہٹ کے بغیر رفاقت کی حامی بھر لی "۔[۳]

" دُرِّ یتیم " میں بعض فقرے خلافِ قیاس ہیں اور کسی قدر مبالغے پر مبنی بھی۔ مثال کے طور پر حلیمہ سعدیہ جب ننھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر اپنے قبیلے کی طرف جا رہی ہوتی ہے تو زبانِ حال سے اس کی گفتگو نقل کی گئی ہے جو بڑی موثر اور دلآویز ہے اور موقع محل کے مطابق بھی، مگر اس میں یہ فقرہ بھی ہے جو قرینِ قیاس نہیں ہے، بلکہ مبالغے پر مبنی ہے:-

" مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے محمدؐ تمہارے کاندھے دنیا جہان کی غمگساری کا بار اٹھائے ہوئے ہیں "۔[۴]

بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے، مگر ایک دایہ کا ایک ننھے بچے سے پہلی

۱- سیرت النبیؐ جلد اول، ص ۲۵۳

۲- ایضاً، ص ۲۵٦

۳- " در یتیم " ص ۲۱۵

۴- ایضاً، ص ۵۵

حالانکہ مشکوٰۃ کے حوالے سے قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور مولانا سید ابوالاعلیٰ[1] مودودی نے حضرت خدیجہؓ کی مکمل بات نقل کی ہے ۔ جو زیادہ موثر ، زیادہ بامعنی اور ایمان پرور ہے ۔ اور وہ یوں ہے :۔

" ہرگز نہیں ۔ خدا کی قسم ، اللہ آپ کو کبھی رنج نہیں دے گا ۔ آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں ، سچ بولتے ہیں ، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں ، نادار کی دستگیری فرماتے ہیں ،مہمان کی تواضع کرتے ہیں اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں"۔[1]

خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو کے موقع پر حجرِاسود کی تنصیب کا مرحلہ آیا اور قبائل میں باہم جھگڑا پیدا ہوا ، تو حضورؐ نے اسے بڑی ہی حکمت کے ساتھ حل فرما دیا ۔ شبلی لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ایک چادر بچھا کر حجرِاسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر اٹھائیں ۔ جب چادر موقع کے برابر آ گئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا"۔[2] مگر ماہر نے اسے غیر دلچسپ اور نامکمل انداز میں بیان کیا ہے ۔ لکھتے ہیں " ہر قبیلہ کے ایک ایک آدمی نے چادر تھام کر اوپر اٹھائی اور اس طرح سب نے مل/کر (جل) کعبہ کی دیوار میں حجرِاسود نصب کر دیا "۔[3]

حضرت عمر فاروقؓ قبول اسلام کے لیے جب دارِ ارقم کی طرف آئے ہیں تو یہ تاریخ ساز منظر مورخین نے مستند حوالوں سے محفوظ کر دیا ہے ، شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں :۔

" حضرت عمر نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی چونکہ شمشیر بکف

۱۔ رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوری جلد اول شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سن ن ، ص ۴۷ و سیرت سرور عالم جلد دوم از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ادارہ ترجمان القرآن لاہور اشاعت اول اکتوبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۳۷

۲۔ سیرت النبیؐ جلد اوّل ، ص ۱۷۵

۳۔ " در یتیم " ص ۱۰۶

ہی ملاقات میں اس قسم کے تاثر کا اظہار خلافِ واقعہ ہے ۔

اسی طرح جب حضورؐ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مالِ تجارت لے کر شام جاتے ہیں ، تو موصوفہ محترمہ کے ملازم خزیمہ اور میسرہ سفر سے واپسی پر حضورؐ کے حوالے سے سفر کے عجیب و غریب واقعات اور حضور کے حسن سلوک اور بےمثال کردار سے آگاہ کرتے ہیں ۔ ان تفصیلات میں نہ مبالغہ ہے نہ کوئی خلافِ واقعہ بات ، مگر اخیر میں دو فقرے ان ملازموں کی زبان سے ایسے لکھ دیئے گئے ہیں ، جو خلافِ قیاس اور موقع کے مطابق نہیں ہیں :-

" یہ عرب کے جاہل لوگ اپنی شاعری ، بہادری اور حسب ناموں پر فخر کرتے مرے جاتے ہیں ۔ حالانکہ ان کے لیے سب سے بڑا فخر محمد قریشی الہاشمی کی ذات ہے "۔[۱]

" دُرِّ یتیم " میں متعدد ایسے مقامات ہیں کہ جہاں مکالمے اور گفتگوئیں ناممکمل اور تشنہ رہ گئی ہیں اور احادیث و سیر کی مستند کتابوں میں ایسی تفصیلات ملتی ہیں جن کی مدد سے انہیں زیادہ موثر اور دلچسپ بنایا جا سکتا تھا ، مگر ماہر نے اس معاملے میں زیادہ محنت اور جستجو سے کام نہیں لیا ۔ اس نوعیت کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں :-

" غارِ حرا میں پہلی وحی کے اثرات سے نبی اکرمؐ کانپتے لرزتے ہوئے گھر پہنچے اور حضرت خدیجہ سے کہا " مجھے چادر اوڑھاؤ ، مجھے چادر اوڑھاؤ " اور پھر سارا واقعہ سن کر حضرت خدیجہ نے ماہر کے الفاظ میں آپ کو یوں تسلی دی ۔

" آپ کی ذات بھلائیوں کا سرچشمہ ہے ۔ خدا آپ کو ضائع نہیں کر سکتا "۔[۲]

۱۔ در یتیم ، ص ۱۱۲

۲۔ ایضاً ، ص ۱۱۹

حالانکہ مشکوٰۃ کے حوالے سے قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری اور مولانا سید ابوالاعلیٰ[۱] مودودی نے حضرت خدیجہؓ کی مکمل بات نقل کی ہے ۔ جو زیادہ موثر ، زیادہ بامعنی اور ایمان پرور ہے ۔ اور وہ یوں ہے :۔

" ہر گز نہیں ۔ خدا کی قسم ، اللہ آپ کو کبھی رنج نہیں دے گا ۔ آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں ، سچ بولتے ہیں ، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں ، نادار کی دستگیری فرماتے ہیں ، مہمان کی تواضع کرتے ہیں اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں"۔[۱]

خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو کے موقع پر حجرِاسود کی تنصیب کا مرحلہ آیا اور قبائل میں باہم جھگڑا پیدا ہوا ، تو حضورؐ نے اسے بڑی ہی حکمت کے ساتھ حل فرما دیا ۔ شبلی لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ایک چادر بچھا کر حجرِاسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تمام لیں اور اوپر اٹھائیں ۔ جب چادر موقع کے برابر آ گئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا"[۲] ۔ مگر ماہر نے اسے غیر دلچسپ اور نامکمل انداز میں بیان کیا ہے ۔ لکھتے ہیں " ہر قبیلہ کے ایک ایک آدمی نے چادر تمام کر اوپر اٹھائی اور اس طرح سب نے مل جل کر کعبہ کی دیوار میں حجرِاسود نصب کر دیا "۔[۳]

حضرت عمر فاروقؓ قبل اسلام کے لیے جب دارِ ارقم کی طرف آئے ہیں تو یہ تاریخ ساز منظر مورخین نے مستند حوالوں سے محفوظ کر دیا ہے ، شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں :۔

" حضرت عمر نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی چونکہ شمشیر بکف

۱۔ رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوری جلد اول شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سن ن ، ص ۴۷ و سیرت سرور عالم جلد دوم از مولانا سید ابوالاعلی مودودی ادارہ ترجمان القرآن لاہور اشاعت اول اکتوبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۳۷

۲۔ سیرت النبیؐ جلد اولؒ ، ص ۱۷۵

۳۔ " در یتیم " ص ۱۰۶

تھے ، صحابہؓ کو تردد ہوا ، لیکن حضرت حمزہؓ نے کہا آنے دو ، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اُسی کی تلوار سے اُس کا سرقلم کردوں گا ۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا کیوں عمر کس ارادے سے آئے ہو " نبوت کی پُر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا ۔ نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا " ایمان لانے کے لیے " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے بیساختہ اللہ اکبر کا نعرہ اس زور سے مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں"۔[١]

مگر دُرِّ یتیم " میں اس روح پرور واقعہ کو بیان نہیں کیا گیا ۔ صرف اسی بات پر اکتفا کیا گیا ہے کہ " حضرت محمد رسول اللہ کی خدمت میں عمرؓ تیزی کے ساتھ پہنچے ۔ حضور عمر کا گریبان پکڑ کر مسکرائے ۔ عمر نے کلمہ شہادت پڑھا اور صحابہ کرام نے اس جوش کے ساتھ نعرہ تکبیر بلند کیا کہ ...."[٢] فنِ ناول نگاری میں فضا بندی کی اہمیت مسلم ہے اور فضا بھی جزئیات نگاری کے مناسب استعمال سے پیدا ہوتی ہے ۔ حیرت ہے کہ ماہر ایک مستند تاریخی واقع کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے میں ناکام رہے ۔ حضور رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں کے سردارانِ قبائل کو اسلام کی دعوت دی ۔ قاضی سلمان منصور پوری اور شبلی نعمانی نے تین سردار بھائیوں کی گفتگو نقل کی ہے[٣] ۔ جو " در یتیم " میں بھی محفوظ ہوئی چاہیئے تھی ، مگر ماہر نے اس مکالمے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔[٤]

١۔ خلفائے راشدین از شاہ معین الدین احمد ندوی ، دارالمصنفین اعظم گڑھ ١٩٥٢ء ص ٩٦ ، ٩٧

٢۔ " در یتیم " ص ١٢٣

٣۔ رحمۃ للعالمین جلد اوّل ص ٦٦ ، و سیرت النبی جلد اول ص ٢٣٦

٤۔ " در یتیم " ص ١٥٠

طائف میں شدید قسم کی اذیت سہنے کے بعد اس بستی سے باہر آکر آپ نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا فرمائی وہ الحاح وزاری ، صبر و عزیمت ، یقین افروزی اور سپردگی کی ایک روح پرور مثال ہے ۔ قاضی سلمان منصورپوری نے اسے رحمۃ للعالمین میں تحریر کیا ہے [۱]۔ مگر ماہر کی نظروں سے یہ اہم واقعہ بھی اوجھل رہا ہے [۲]۔ " در یتیم " میں غزوہ حنین کا ذکر بہت سرسری اور تشنہ ہے ، حالانکہ شبلی نے " سیرت النبی " میں قبیلہ ہوازن کی جنگی تیاریوں کے حوالے سے دو عرب سرداروں کا جو مکالمہ نقل کیا ہے ، وہ دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی [۳]۔

اس ناول کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں جگہ جگہ اشعار کا استعمال کیا گیا ہے اور اس طرح فنِ ناول نگاری کی خلاف ورزی کی گئی ہے ۔ تین مقامات پر وارین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔

صاف نظر آتا ہے کہ ماہر نے " دُرِّیتیم " پر اتنی محنت اور جستجو سے کام نہیں لیا ، جتنا ایک تاریخی ناول تقاضا کرتا تھا ۔ روا روی کا انداز غالب ہے ۔ غیر معمولی اہمیت کے حامل واقعات اور غزوات کے سنین تک نہیں دیئے گئے ۔ چنانچہ " در یتیم " سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ جنگِ احد، جنگِ خندق، اور صلح حدیبیہ کس سنہ میں ظہور پذیر ہوئیں ۔

لیکن ان خامیوں کے باوجود " دُرِّ یتیم " اردو کا ایک اہم تاریخی ناول ہے جو قبلِ ظہورِ اسلام اور عہدِ صحابہ کی معاشرت کا ایک خوبصورت مرقع پیش کرتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ ایک صالح مقصدیت کا حامل ہے ۔ یہی سبب ہے کہ طالب ہاشمی نے "دُرِّیتیم" کو پاکیزگی فکر اور وضعِ احتیاط کی وجہ سے سدابہار پھولوں کا ایک گلدستہ قرار دیا ہے [۴]۔

۱۔ رحمۃ اللعالمین جلد اول ص ۶۷

۲۔ در یتیم ، ص ۱۵۱

۳۔ سیرت النبیؐ جلد اول ، ص ۵۰۲-۵۰۳

۴۔ فاران کراچی ، ماہر القادری نمبر دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۳۳۵ ۔

اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی رائے میں ماہر القادری کی کتاب " در یتیم " میں تاریخ کے اہم ترین دور کی ایسی تصویر نظر آتی ہے جس کے کردار ہم سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی ہماری شہ رگ کے آس پاس ہی موجود ہیں"۔[1] رہی خامیاں تو اردو کا کوئی ناول اس سے مبرّا نہیں ہے ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد کو اردو کا مکمل ترین ناول قرار دیتے ہیں[2] ۔ جبکہ سید وقار عظیم کی رائے " فسانہ آزاد " کے بارے میں یہ ہے :

" پریشان خیالی اور ژولیدہ بیانی کے اس مجموعے میں نہ ربط ہے نہ تسلسل ، نہ آغاز ہے ، نہ انجام ، بے سَرپیر کے اس فسانہ میں بس دھڑ ہی دھڑ ہے ..... سرشار کا یہ شاہکار ان تمام اوصاف سے خالی ہے جن سے قصہ ، قصہ بنتا ہے"۔[3]

جہاں تک تاریخی ناول کا تعلق ہے ، یہ اس قدر مشکل فن ہے کہ الفریڈ ٹرسیڈر شیپرڈ کے الفاظ میں " ابھی تک صحیح معنوں میں کوئی تاریخی ناول نہیں لکھا گیا اور شاید کبھی نہ لکھا جا سکے "۔[4]

چنانچہ زیر نظر ناول کی خوبیوں کی بنا پر اس کے بارے میں عابد علی عابد کی وہی رائے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ قبول کرنی پڑتی ہے جو انہوں نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے لئے تحریر کی ہے یعنی :

" شرر کی تمام کمزوریاں تسلیم کر لینے کے بعد بھی شرر کو ایک بلند مقام دیئے بغیر چارہ نہیں کہ ان کے ہاں متفرق معاشرتی مسائل

۱- نقش سیرت " مرتبہ نثار احمد ادارہ نقش سیرت ، کراچی ، ۱۹۶۸ء ص ۷۷

۲- نگار پاکستان اصناف ادب نمبر سالنامہ ۱۹۶۶ء ، مضمون ناول کی ہیئت از ڈاکٹر احسن فاروقی ، ص ۵۸ -

۳- " فن اور فن کار " از وقار عظیم ، ص ۱۲۹

۴- بحوالہ شرر کے تاریخی ناول میں ، ص ۲۸

کی بھرپور تصویر کشی نظر آتی ہے ۔ اور مخصوص ماحول مین بعض کردار بڑے جاندار ہین"۔[1]

ناول نگاری مین ماہر کا مقام

گزشتہ صفحات مین ماہر کے ناولون کا جو محاکمہ پیش کیاگیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند جزوی خامیون کے باوجود ان کے ناول متعدد خوبیون کے حامل ہین ۔ ان مین کردار نگاری کے بہت اچھے نمونے ہین منظر نگاری اور فضا بندی مین بھی وہ کامیاب نظر آتے ہین اور چند ایک مقامات کے سوا مکالمہ نگاری بھی فطرت اور ماحول کے عین مطابق ہے ۔ پھر ان ناولون مین مختلف انسانی طبقات اور معاشرت کے بصیرت افروز اور عبرت آموز مرقع سامنے آتے ہین " جب مین جوان تھی " مین اعلٰی تعلیم یافتہ اور جدت پسند امیر ہندو خاندانون کی معاشرت اور وہان عورت کی حالتِ زار کابڑا دردناک نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ " کردار " مین خیالی پکاؤ پکانے والے ایک نالائق نوجوان کی آوارہ مزاجی اور ایک باکردار لائق ، محنتی اور حریت کیش نوجوان کی مثبت سرگرمیون کی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے ۔ اور " کانچی ہاؤس " مین ایک محنتی و ایمان دار نوجوان اور ایک مفاد پرست ہندو سیٹھ کے حوالے سے ہندو مسلم معاشرت کے بہت سے کردارون کی مرقع کشی کی گئی ہے جو معلومات آفرینی اور بصیرت افروزی کے اعتبار سے لائقِ توجہ ہے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ زبان

۱۔ اصول انتقاد ادبیات ، ص ۵۷۹

و بیان کے اعتبار سے ماہر کی نثر سادہ و پُرکار ہے اور دلچسپی کا عنصر برابر قائم و برقرار رکھا گیا ہے ۔ مگر یہ امر تعجب ناک ہے کہ جہاں ماہر کی غزل ، نظم اور خاکہ نگاری کو مکمل طور پر نظر انداز کیاگیا ۔ وہاں نقادانِ ادب نے ماہر کے ناولوں کو بھی کسی اہمیت کے لائق نہ سمجھا ۔ حالانکہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے " اردو ناول نگاری " میں ایسے ناولوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں تحریصِ شہوت اور ترغیبِ لذتِ جنسی کے سوا کچھ نہیں ۔ مثال کے طور پر انہوں نے فضل حق قریشی کے " سگِ لیلیٰ کا بھی تنقیدی جائزہ شامل گیا ہے جس میں ایک کتا اپنی آپ بیتی سناتا ہے ۔[1]

یہی طرزِ عمل ماہر کے تاریخی ناول " در یتیم " کے ساتھ روا رکھا گیا ۔ سید وقار عظیم نے " فن اور فن کار " میں " تاریخی ناول اور اس کا فن " میں والٹر سکاٹ سمیت یورپ کے ہر تاریخی ناول نگار کا ذکر کیا ، مگر اردو کے کسی ناول نگار کو قابل اعتنا نہ جانا اور عبدالحلیم شرر یا نسیم حجازی کا ذکر تک کرنا گوارا نہ کیا ۔ بلکہ ناول میں اصلاح و تبلیغ کے جذبہ کو مریضانہ طلب قرار دے کر مذاق اڑانے اور " طفلانہ حماقت" سے تعبیر کرتے ہیں ۔[2] حالانکہ وہ متذکرہ مضمون میں سروالٹر سکاٹ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور والٹر سکاٹ ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی رائے میں ایک متعصب صلیبی ناول نگار ہے اور اس نے مسلمانوں اور تاریخ اسلام کے خلاف جس تنگ نظری اور نا انصافی کا مظاہرہ کیا ہے ، اس پر خود یورپ کے بعض مورخ پریشان نظر آتے ہیں۔[3]

۱۔ اردو ناول نگاری ، ص ۲۰۵

۲۔ فن اور فن کار ، ص ۳۲

۳۔ دیکھیئے پیش لفظ" شرر کے تاریخی ناول' از ڈاکٹر سید عبداللہ و ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

دراصل ہمارے بیشتر نقاد اسلام اور تاریخِ اسلام کے معاملے مین احساسِ کمتری مین مبتلا ہین اور اسی منفی احساس کے پیش نظر انہون نے عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی کے خلاف مضحکہ خیز رویہ اختیار کیا ہے اور ظاہر ہے جن لوگون کے نزدیک شرر اور نسیم حجازی کسی شمار قطار مین نہین ہین ، وہ ماہر کو کیا اہمیت دیتے -- وہ ماہر جو ان حضرات کے خلاف آخر وقت تک بوسرِ پیکار رہا ۔

....

باب - ۶

ماہر القادری کی افسانہ نگاری

اردو افسانہ نگاری پر ایک نظر :

پیشتر اس کے کہ ماہر القادری کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کیا جائے ، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں افسانہ نگاری کا ایک مختصر اور جامع جائزہ پیش کر دیا جائے ، تاکہ موصوف کے فکر اور فن کا مقام متعین کرنے میں آسانی رہے -

بقول ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی " ناول کی طرح افسانہ بھی اردو میں مغربی بلکہ یوں کہئے کہ انگریزی کے اثر سے آیا - انگریزی کے علاوہ اور زبانوں بالخصوص روسی اور فرانسیسی افسانوں نے بھی اردو کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا ، لیکن یہ افسانے بھی انگریزی ترجموں کے وسیلے سے اردو میں آئے " -[1]

ناول اور افسانے میں فرق صرف طوالت اور اختصار کا نہیں بلکہ دونوں کے فن اور تکنیک میں بھی بنیادی فرق ہے - ناول میں زندگی کا کینوس مکمل یا پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس کے مختلف گوشوں کو سامنے رکھ کر زندگی کا ایک مکمل اور مربوط نقشہ ابھرتا ہے جبکہ افسانہ نگار زندگی کی ان بوقلمونی میں سے کسی ایک پہلو پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور ایک زاویہ سے اس پہلو کا بھرپور اور مکمل تجزیہ کرتا ہے -[2]

مختصر افسانے کی ایک بنیادی خصوصیت بقول سیّد عابد علی عابد " وحدت ، یکرنگی یا یک آہنگی (UNITY) ہے جیسے وحدتِ معانی ، وحدتِ عمل اور وحدتِ تاثر بھی کہہ سکتے ہیں " -[3] اسی لئے ایجاز و اختصار افسانے کے لئے بے حد ضروری ہے - یعنی اس میں زندگی کے کسی ایک گوشے کی عکاسی ہوتی ہے یا سوچ کی کسی ایک لہر کسی

۱- " آج کا اردو ادب " از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی - فیروز سنز لاہور ، ۱۹۷۰ء ، ص ۲۳۵ -

۲- ایضاً - ص ۲۳۵ ، ۲۳۶

۳- اصولِ انتقادِ ادبیات - ص ۶۱۳

تصویر کشی کی جاتی ہے ۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ قاری کی توجہ ایک ہی محور پر مرکوز رکھتا ہے ۔

اردو میں افسانہ نگاری کی بلوغت کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں کم و بیش پہلی عالمی جنگ کے بعد ہوا ۔ جنگِ عظیم نے جہاں دنیا بھر کے حالات و افکار کو متاثر کیا ، وہاں اردو فنِ افسانہ نگاری پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے ۔ یہی زمانہ ہندوستان میں برطانوی استعمار کے عروج کا تھا ، مگر اسی دور میں برصغیر کے عوام میں آزادی کی لہر بھی بیدار ہو رہی تھی ۔ ان میں اپنی ہمہ پہلو ذلت و نکبت کا احساس انگڑائی لینے لگا تھا اور وہ بڑی سنجیدگی سے آزادی کی تحریکوں کو منظم کرنے کا سوچنے لگے تھے ۔

اس تناظر میں دیگر اصنافِ ادب کی طرح افسانے نے بھی سسکتے کراہتے عوام کی نمائندگی اور ترجمانی کو اپنا نصب العین بنا لیا اور ادب کا یہ حسّاس شعبہ اس حوالے سے عامة الناس کا ترجمان بن گیا ۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کے مطابق اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند نہیں بلکہ سجاد حیدر یلدرم ہیں کہ یلدرم کا پہلا افسانہ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں معارف علی گڑھ میں چھپا تھا جبکہ خود پریم چند کے بیان کے مطابق ان کا پہلا افسانہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا ۔[۱]

مگر جیسا کہ احتشام حسین نے لکھا ہے پریم چند پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو افسانے میں سماجی حقیقت پسندی کا آغاز انہیں کے افسانوں سے ہوتا ہے ۔[۲] اور ڈاکٹر قمر رئیس کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ پریم چند کی روایت اردو کے افسانوی ادب میں بنیادی روایت کا درجہ رکھتی ہے ۔[۳]

۱۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگار از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۔ جنوری ۱۹۸۲ء ، ص ۱۲ ۔

۲۔ احتشام حسین دیباچہ " پریم چند " از ہنس راج رہبر ۔ مکتبہ جامعہ دہلی ، ۵۸ء ص ۱۱،۱۲

۳۔ ڈاکٹر قمر رئیس دیباچہ پریم چند کے بہترین افسانے ۔ چودھری اکیڈمی اردو بازار ، لاہور ۔ جون ۱۹۸۸ء ، ص ۶

پریم چند کے افسانوں کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے دیہاتی زندگی کی تفصیلات بڑی مہارت اور خوبی سے پیش کی ہیں اور قابل قدر حقیقت نگاری کا مظاہرہ کیا ہے ۔ تاہم ڈاکٹر ابو اللیث کی رائے میں ان کے اکثر و بیشتر افسانوں کا انجام طربیہ ہوتا ہے ، حالانکہ زندگی میں ناکامی و کامیابی کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اسی لئے بعض اوقات پریم چند کے افسانوں کا انجام غیر متوقع ہوتا ہے اور بعض افسانوں کے کردار حقیقی سے زیادہ مثالی معلوم ہوتے ہیں ۔[1]

اردو افسانے کے ارتقاء میں پریم چند نے تاریخی کردار ادا کیا ۔ ان کے افسانوں میں کردار نگاری کے بہت اچھے نمونے نظر آتے ہیں ۔ ان کی زبان بھی سادہ و سلیس ہے ۔ بلاشبہ پریم چند سے اردو میں مختصر افسانے کی روایت کو استحکام اور فروغ حاصل ہوا ۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ خاصی دلچسپ ہے کہ پریم چند کی متذکرہ خوبیوں کے باوصف ١٩٣٠ء تک اردو افسانے پر سجاد حیدر یلدرم ، نیاز فتح پوری ، حکیم احمد شجاع پاشا ، مجنوں گورکھپوری اور سلطان حیدر جوش جیسے رومانوی ادیب چھائے رہے اور بقول ڈاکٹر محمد حسن " رومانوی ادیبوں کے دوہری زندگی وفسورِ حُسن کے سوا کچھ نہ تھی " ۔[2] اور پروفیسر ہارون الرشید کے الفاظ میں " انہیں عورت کے حُسن اور جوانی کے علاوہ دنیا کی کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں رہی تھی " ۔[3] یہی سبب ہے کہ رشید احمد صدیقی رومانوی ادیبوں کے " ادبِ لطیف " اور " جنسِ لطیف کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں " ۔[4]

١٩٣٠ء سے ١٩٣٧ء تک کا دَور اردو افسانہ نگاری میں خاصا ہنگامہ خیز اور انقلابی نوعیت کا ہے ۔ اس زمانے میں برصغیر میں تحریکِ آزادی نے خاصا زور پکڑا ۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے پورے ہندوستان میں بیداری کی زبردست لہر پیدا کر دی ۔ غیر ملکی استعمار کے خلاف نفرت نقطۂ کمال تک پہنچ گئی اور ملک کا ہر طبقہ اس سے متاثر ہوا ۔ اس کے ساتھ ہی یہ المیہ رونما ہوا

١- آج کا اردو ادب ۔ ص ٢٣٨

٢- اردو میں رومانوی تحریک از ڈاکٹر محمد حسن ۔ کاروان ادب ملتان ، ١٩٨٦ء ، ص ٣٢

٣- اردو ادب اور اسلام حصہ دوم از پروفیسر ہارون الرشید ۔ اسلامک پبلیکیشنز لاہور ، ١٩٧٠ء ، ص ٢٠١

٤- سہیل کی سرگزشت ۔ نفیس اکیڈمی ، حیدر آباد دکن ، ١٩٤٧ء ، ص ٥٠

کہ غلامی کی نفسیات کے مطابق تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک خاصا بڑا طبقہ اپنی تاریخ ، مذہب اور تہذیب کے معاملے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا اور مغرب سے درآمد شدہ ہر نظریے اور فلسفے کا والا و شیدا بن گیا ۔ چنانچہ افسانہ نگاروں کی ایک تعداد نے اشتراکیت کے بانی کارل مارکس اور جنسیت پرست ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کو اندھا دھند اختیار کر لیا ۔ اس طرح بعضوں نے اشتراکیت کی تبلیغ و تشہیر ہی کو افسانہ نگاری کا مقصد بنا لیا ، بعض نے جنسی مسائل اور فحش نگاری کو اپنا شعار بنا لیا ۔ اور بعض نے مذہب کی توہین و تضحیک اور لادینیت کے پرچار کو ادب کی خدمت سمجھ لیا ۔ اس قماش کے افسانہ نگاروں میں احمد علی ، سجاد ظہیر ، ڈاکٹر رشید جہاں ، عزیز احمد ، منٹو ، عصمت چغتائی مجنوں گورکھپوری اور ان کے متعدد ہم فکروں کے نام آتے ہیں ۔

تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افسانہ نگاروں کی اکثریت اس فن کو حقیقی زندگی کے قریب لے آئی اور پرانے مثالی رومانوں کی جگہ اب مزدوروں اور کسانوں کی دکھ بھری زندگی اور اس کے مسائل افسانوں کا موضوع بن گئے ۔ لاریب ان لوگوں نے فکر و فن کے اعتبار سے اردو افسانہ کو ترقی و عروج سے ہمکنار کیا ، مگر جہاں تک دینی و اخلاقی اقدار و تہذیب کے خلاف اور اشتراکیت اور جنسی انارکی کے حق میں پروپیگنڈے کا تعلق ہے ، اس میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی غالب اکثریت شامل ہو گئی ۔ چنانچہ اس امر میں کوئی مبالغہ نہیں کہ نئی نسلوں میں بے یقینی ، تشکیک اور خدا بیزاری کے احساسات پیدا کرنے میں ہمارے مذکورہ افسانہ نگاروں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں تعلیم یافتہ حضرات کا بہت بڑا طبقہ اسی نوع کے منفی اور سلبی رجحانات کا شکار ہو گیا جس میں یہ افسانہ نگار خود مبتلا تھے ۔

تاہم یہ امر خوشگوار ہے کہ ان انتہا پسندانہ رجحانات کے شاید رد عمل میں افسانہ نگاروں کی ایک ایسی تعداد بھی منظر عام پر آ گئی جنہوں نے توازن ، اعتدال اور وقار کا رویہ اپنایا اور منفیت اور ژولیدہ فکری کے بجائے راست روی کا اسلوب اختیار کیا ۔ ایسے افسانہ نگاروں میں غلام عباس ، احمد ندیم قاسمی ، راجندر سنگھ بیدی ، ممتاز مفتی ، ہاجرہ مسرور ، خدیجہ مستور ، شفیق الرحمن ، ممتاز شیریں اور قدرت اللہ شہاب کے نام لئے جا سکتے ہیں ۔

قیام پاکستان کے وقت مسلمانوں کے خلاف تنگ نظر ہندوؤں اور سکھوں نے تباہی اور بربریت کا جو خونیں ڈرامہ کھیلا اور جاہل اور بے عمل مسلمانوں نے اس کے رد عمل میں بعض مقامات پر غیر مسلموں کے ساتھ جو زیادتیاں کیں ، افسانہ نگاروں نے اسے بھی موضوع بنایا - ان میں سے جولوگ مزہب دشمن تھے اور قیامِ پاکستان کے مخالف تھے ، انہوں نے اپنے افسانوں میں منفی نتائج کا اظہار کیا اور مزہب کو اس المیے کا ذمہ دار قرار دیا --- مگر معتدل فکر کے افسانہ نگاروں نے اس کا تجزیہ دوسرے پیرائے میں کیا اور بے عملی ، جہالت اور ظلم و شقاوت میں اس کے اسباب تلاش کئے - بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات نے ہر حساس افسانہ نگار کو متاثر کیا -

قیامِ پاکستان کے بعد ملک میں جو سیاسی ، سماجی اور اقتصادی رویے کارفرما رہے ہیں ، اردو افسانہ نگاروں نے ان سب کو موضوع بنایا ہے اور اس حوالے سے ان کے ہاں عصری زندگی اور اس کے مسائل کا سچا شعور اور عرفان ملتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پرانے اور نئے بےشمار افسانہ نگار ہیں جو اس شعبے میں فکر و فن کی آبیاری میں مصروف ہیں چنانچہ افکار و نظریات سے قطع نظر جن لوگوں نے پیہم جہد کے بعد اردو افسانہ نگاری کو ترقی و مقبولیت سے ہمکنار کیا ، ان کے نام اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ اس مختصر جائزے میں ان کا شمار کرنا امرِ محال ہے -

ماہر القادری کی افسانہ نگاری کا جائزہ :

ماہر القادری نے خاصی بڑی تعداد میں افسانے لکھے جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہوئے جبکہ ایک مجموعہ ان کی وفات کے بعد یعنی ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آیا جسے طالب ہاشمی صاحب نے مرتب کیا - ان مجموعوں کے سنینِ اشاعت ، مقامِ اشاعت اور افسانوں کی تعداد یوں ہے :

۱- انگڑائی ۱۹۳۶ء ، ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور - افسانے (تعداد) ۶

۲- طلسمِ حیات ۱۹۳۷ء ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور - افسانے (") ۱۲

۳- حسن و شباب ۱۹۳۵ء کتب خانہ تاج آفس بمبئی افسانے (تعداد) ۱۱

۴- بہاندے ۱۹۳۶ء ، مشہور پبلشنگ ہاؤس دہلی " " ۱۰

۵- مے خانے ۱۹۳۷ء " " " " " " ۸

۶- نگینے ۱۹۵۲ء مکتبہ ادب نواز کشمیری بازار لاہور " " ۱۳

۷- اندھیرے اجالے تک ۱۹۸۶ء ، حسنات اکیڈمی منصورہ لاہور " " ۲۲

متذکرہ بالا مجموعوں کے افسانوں کی کل تعداد ۸۳ ہے ، مگر آخری مجموعے کے گیارہ افسانے " نگینے " میں بھی شامل ہیں ، انہیں منہا کریں ، تو اصل افسانوں کی تعداد ۷۲ بنتی ہے -

******

ماہر نے ایسے دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا جب برصغیر غیر معمولی بحران سے گزر رہا تھا - غلامی کے اثرات ہند و مسلم معاشرے میں راسخ ہو گئے تھے اور تہذیبی غلامی نے ہر طبقے کو ایک عجیب و غریب قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا - بعض شعراء ، ادباء ، سیاست دان اور تعلیم یافتہ امیر گھرانے مغربیت کے سیلاب میں بہ کر غیرت ، حیا ، خود داری اور اخلاقِ عالیہ کی خصوصیات سے تہی دامن ہو چلے تھے خصوصاً پڑھا لکھا متوسط طبقہ غیر ملکی حکمرانوں کی نقالی میں عیاشی ، مستی تفریح اور عورت ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھا تھا -

اس تہذیبی المیے کا رنگ ادباء و شعراء اور خصوصاً افسانہ نگاروں نے مزید گہرا کر دیا تھا اور رومانی تحریک سے وابستہ ادیبوں اور اشتراکیت نواز مصنفین نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت ہر دینی قدر کو مسخ کرنے اور لادینیت و اباحیت اور فحاشی و عریانی کا پرچار کرنے کا گویا تہیہ کر لیا تھا -

اس پس منظر میں جب ہم ماہر کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ جہاں دیگر علمی و ادبی شعبوں میں ماہر نے ایک منفرد اسلوبِ فکر

اختیار کیا ، وہاں اپنے افسانوں میں بھی معاصر ادیبوں سے مختلف انداز اپنایا - دراصل ماہر ان خوش بخت ادیبوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں جو زندگی کو بے مقصد نہیں سمجھتے - وہ حیات و کائنات کے بارے میں ایک سنجیدہ ، بے داغ اور قطعی نقطۂ نظر رکھتے تھے اور بہت سے معاصر ادیبوں کی طرح کسی منفی احساس (COMPLEX) میں مبتلا نہ تھے اس لئے فکری اعتبار سے ان کا ذہن ہموار اور صحا ہے -

چنانچہ ماہر مولوی نذیر احمد اور منشی پریم چند کی طرح ادب میں تعمیری اور پاکیزہ مقصدیت کے قائل ہیں - وہ مشرقی اور دینی قدروں کے علمبردار ہیں اور مغربیت کی تہذیبی ، فکری اور ادبی یلغار کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں - اشتراکیت ہو یا مذہبی طبقوں کی منافقت یا یورپ کے پرستار امیر لوگوں کی اخلاقی و جنسی آزاد روی ، وہ ان سب کے بے رحم ناقد ہیں اور ان کے افسانوں میں متذکرہ موضوعات کے علاوہ متعدد دیگر معاشرتی پہلو بھی زیرِ بحث آئے ہیں - چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ ماہر کی کہانیاں ایک تصویر خانہ ہے جس میں معاشرے کے تقریباً ہر طبقے کی تصویر نظر آتی ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا -

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ، ماہر مغربی تہذیب کے شدید مخالف ہیں اور بے پردگی اور مخلوط محافل کو اسلامی معاشرت کے لئے سخت خطرناک سمجھتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ عورت کی بے راہروی میں اس کے والدین ، خاوند اور تعلیمی ادارے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور پھر وہ اس راستے پر دور تک نکل جاتی ہے - کشتۂ تہذیب[1] ، رقیب[2] ، خندق[3] سے بھی دیمے ، لاش[4] ، تیزاب[5] ، فریبِ تفریح[6] ، کورٹ مارشل[7] اور کانفرنس[8] میں ماہر نے یہی نظریہ (Thesis) پیش کیا ہے - ان کے خیال میں برائی کا آغاز بڑے بے ضرر انداز میں ہوتا ہے مگر اس کا تناسب بڑھتا چلا جاتا ہے اور انسان اس کے ساتھ سمجھوتا کرتا چلا جاتا ہے اور آخرکار برائی کا انجام کسی بھیانک صورت میں ظاہر ہوتا ہے - چنانچہ اس سلسلے میں " لاش "

---

(۱) انگڑائی ، ص ۱۰ (۲) اندھیرے سے اجالے تک - ص ۱۲۵ -
(۳) گہنے - ص ۳۵ (۴) اندھیرے سے اجالے تک - ص ۱۹ -
(۵) اندھیرے سے اجالے تک - ص ۳۵ (۶) طلسم حیات ص ۳۱۱ (۷) گہنے - ص ۱۳۱
(۸) بے خانے - ص ۱۲۶

کی فسریدہ ، " تیزاب " کی فردوسی " ، ایک بندوق تین خون " کی اہسا ، " خندق سے بھی نیچے " کی دجمہ اور " کورٹ مارشل " کی شاہ بانو اپنی آزاد روی اور مردوں سے آزادانہ اختلاط کے نتیجے میں افسوس ناک انجام سے دو چار ہوتی ہیں - ان افسانوں میں مخلوط تعلیم کی قباحتوں کی عکاسی ہے ، ہسپتالوں کے سکینڈل نظر آتے ہیں اور سیاسی جلسوں کے انتظام میں شامل مرد و زن کے تعلقات کا انکشاف ہے - ان میں سے بعض افسانوں پر مولوی نذیر احمد کا انداز چھایا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں کہیں مقصدیت فن پر غالب دکھائی دیتی ہے - تاہم ماہر کی خوبی یہ ہے کہ خوبصورت اشارے ، ڈرامائیت اور چست مکالموں سے وہ افسانے میں دلچسپی اور تجسس کا عنصر کامیابی سے پیدا کرتے ہیں - مختلف طبقوں کے بارے میں ان کی معلومات بھی وسیع ہیں اور انسانی نفسیات سے بھی آگاہ ہیں - یہ الگ بات ہے کہ ماہر کے بعض افسانوں کا انجام کہانی کی فطری رفتار سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اور افسانہ فنی اعتبار سے کمزور ہو جاتا ہے -

مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ ماہر اشتراکیت کے بھی سخت مخالف تھے -[1] چنانچہ انہوں نے کم از کم تین افسانوں میں اشتراکی رہنماؤں اور کارکنوں کا اصل چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے - اور یہ تاثر دیا ہے کہ یہ تحریک انسانی ہمدردی اور معاشی مساوات کے لبادے میں دراصل مادر پدر آزادی کی علمبردار ہے اور اس کے پیروکار اقتصادی ہمواری نہیں چاہتے بلکہ ایسا ماحول پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں کہ جس عورت کو جہاں چاہیں برہنہ کر سکیں[۴] - چنانچہ اس طبقے کی منافقت کا پردہ کرفیو کی رات میں[۲] ، بھکارن[۳] اور اندھیرے سے اجالے تک " میں چاک کیا گیا ہے - تاہم اس میں شبہ نہیں کہ " کرفیو کی رات میں " کا انجام غیر فطری ہے اور فلمی قسم کی ڈرامائیت کا حامل ہے - قاری کو یہ بات اپیل نہیں کرتی کہ نصف شب کو جب مزدور لیڈر کلیمی اور اس کا ساتھی پناہ حاصل کرنے والی مظلوم لڑکی کی طرف بڑھتے ہیں تو عین اُسی وقت کمرے کے اندر پولیس کے سپاہی کی

۱- یاد رفتگاں جلد اول مرتبہ طالب ہاشمی مطبوعہ البدر پبلی کیشنز ، لاہور ۱۹۸۳ء ، ص ۲٦٧ -

۲- " اندھیرے سے اجالے تک " ص ۹

۳- ایضاً - ص ٧٨

۴- ایضاً - ص ۲۸٦

گولی کلیجی کو کیسے لگ جاتی ھے - یہ امر افسوس ناک ھے کہ فلمی دنیا بعض اوقات ماھر پر حاوی ھو جاتی ھے اور وہ تجسس (Suspense) پیدا کرنے کے شوق میں فن کو زخمی کر دیتے ھیں -

اس کے برعکس " اندھیرے سے اجالے تک " بلاشبہ اس موضوع پر ایک مکمل افسانہ ھے جو اشتراکی حضرات کا رخِ کردار بھی دکھاتا ھے اور جس میں فن کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ھے - افسانہ اپنے آغاز ، ارتقاء اور انجام کے اعتبار سے فنی لوازمات پورے کرتا ھے اور دلچسپی و تفکر کے عناصر سے مملو ھے -

ماھر القادری نے جہاں مغربی تہذیب اور اشتراکیت کو ھدفِ تنقید بنایا ھے ، وھاں دنیا دار اور مادہ پرست مولویوں اور پنڈتوں کی بھی خبر لی ھے اور اس طبقے کی منافقت اور تضادات کو فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ھے " - گاؤں کی دنیا "[1] ، " فریب کا انجام "[2] اور " واپسی "[3] اس سلسلے کی خوبصورت مثالیں ھیں - " گاؤں کی دنیا " میں مندر کا ایک پجاری گاؤں والوں کو بیوقوف بناتا ھے ، اس کی فریب کاریاں ایک عرصے تک ان کے ھم مذھبوں کو پریشان کرتی ھیں ، مگر آخرکار وہ اپنے ھی جال میں پھنس جاتا اور رسوا ھو کر گاؤں سے بھاگ جاتا ھے - یہ افسانہ ھندوؤں کی توھم پرستی ، سادگی اور تقسیم سے قبل دیہاتی زندگی کے دردناک مناظر کی تصویر کشی کرتا ھے - دلچسپی اور تجسس کا عنصر آخر وقت تک قائم رھتا ھے اور انجام غیر فطری نہیں ھے -

" فریب کا انجام " میں بتایا گیا ھے کہ ایک بدکردار ، جرائم پیشہ مگر عیار آدمی دوسرے علاقے میں جا کر پیر بن جاتا ھے اور لوگوں کی جہالت اور توھم پرستی سے فائدہ اٹھا کر انہیں لوٹتا بلکہ عصمتوں سے کھیلنے کی کوشش کرتا ھے ، مگر آخرکار اس کی عیاری کا پردہ چاک ھو جاتا ھے ، اور وہ پاگل ھو کر مر جاتا ھے - ماھر جعلی پیروں کے سخت خلاف تھے اور یہ افسانہ اسی مقصدیت کی عکاسی کرتا ھے -

---

۱- طلسم حیات - ص ۸۱

۲- پیمانے - ص ۲۲

۳- اندھیرے سے اجالے تک - ص ۹۲

" واپسی " فن اور تاثر کے اعتبار سے ماہر کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے - اس میں بھی پیر پرستی کی قباحتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس کا قدرے تفصیلی تجزیہ آئندہ سطور میں آئے گا -

یہ امرِ قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ماہر مغربی تہذیب ، اشتراکیت اور جعلی مزہبی رہنماوٴں کا شدید مخالف ہے ، مگر اس سلسلے میں ماہر کے ہاں ہیجان یا مغلوب الغضبی کی صورت کہیں نظر نہیں آتی - انہوں نے بڑے وقار اور ٹھنڈے انداز میں معاشرے کے ان پہلووٴں کی تصویر کشی کی ہے اور کمزوریوں اور خامیوں کو فنکارانہ مہارت سے آشکارا کیا ہے - یہ کہانیاں اپنے انجام کے اعتبار سے ایک حسّاس قاری کو خاص صدمے اور کرب کی کیفیت سے دوچار کرتی ہیں اور طنز کے کچوکے لگاتی ہیں -

ماہر نے اپنی زندگی کا خاصا بڑا حصّہ ہندو مسلم مخلوط معاشرے میں بسر کیا اور ہندو سوسائٹی کو بہت قریب سے دیکھا - چنانچہ چند افسانوں میں انہوں نے پریم چند کے اسٹائل میں ہندو معاشرت کو موضوع بنایا ہے اور جہاں "گاوٴں کی زندگی"[1] میں ہندووٴں کی سماجی خامیوں کو نشانہ بنایا ہے وہاں " پاکباز طوائف "[2] اور " ہوشیار دیوانہ "[3] میں ہندو کرداروں کی بعض خوبیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے - اسی طرح " شہیدِ محبّت "[4] میں ہندو عورت کی وفا شعاری اور شوہر پرستی کا ایک دلآویز مرقع سامنے آتا ہے اور " سوگوار سہاگ "[5] میں ہندو بیوہ کی دائمی بدنصیبی کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے - ان دونوں افسانوں میں ہندو سماج کے تضادات ، توہمات ، مندروں کی پراسراریت اور پجاریوں کی عیاریاں بھی سامنے آتی ہیں - ماہر نے کمال بے تعصبی کے ساتھ ایک مخالف طبقے کی انفرادی خوبیوں کو بھی سراہا ہے اور بتایا ہے

۱- طلسم حیات - ص ۸۱

۲- انگڑائی ص ۳

۳- ایضاً - ص ۲۹

۴- طلسم حیات - ص ۲۲۷

۵- حسن و شباب ص ۳۷

کہ " پاکباز طوائف " میں ایک مظلوم لڑکی شانتی جس ظالم شخص کے ڈر سے گھر سے بھاگتی اور ایک طوائف کے ڈیرے پر پہنچتی ہے ، وہ اس ظالم کے کچھ احسانات کو یاد رکھتی ہے اور ایک مشکل وقت میں اس کی مدد کرتی اور اسے رسوائی سے بچاتی ہے - افسانے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا ماحول پیدا کیا گیا ہے - کتنا اچھا سبق ہے جو شانتی دیتی ہے "سنسار کی پگڈنڈی میں منش کو ٹھوکر ضرور لگتی ہے - جو ٹھوکر کھا کر سنبھل جاتا ہے ، اس کے جیون کی پوترتا کا کیا کہنا" -[1]

اسی طرح " ہوشیار دیوانہ " میں ایک ہندو نوجوان کی پاکباز زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جو ایک امیر عورت کی ساری جنسی ترغیبات کو ردّ کر دیتا ہے ، ملازمت ترک کر دیتا ہے ، مگر عصمت و طہارت پر قائم رہتا ہے -

ان افسانوں کے حوالے سے غالباً ماہر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نیکی ، پاکبازی اور عصمت شعاری انسانی فطرت میں داخل ہے اور دوسرے مذاہب میں بھی اکا دکا ایسے لوگ موجود ہیں ، جو اخلاقِ فاضلہ کے ان فطری تقاضوں کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں -

اخلاق فاضلہ ہی کے حوالے سے ماہر کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ موصوف نے متذکرہ خصائل کو اجاگر کرنے کی بھی کوشش کی ہے - انہوں نے اخلاق ، ایثار ، مروّت ، سچی ہمدردی ، غمگساری اور عفو و درگزر جیسے شریفانہ اخلاقی تقاضوں کو موضوع بنایا ہے اور ان کے مطالعے سے روح میں بالیدگی اور قلب میں تزکیہ کا احساس پیدا ہوتا ہے - "بہن بھائی"[2] "پہلی آزمائش"[3] اور بدکاری[4] اس سلسلے کی خوبصورت مثالیں ہیں جن کے مختلف کردار اخلاقِ فاضلہ کی قابل قدر مثالیں پیش کرتے ہیں - یہ افسانے فنی اعتبار سے بھی مطلوبہ معیار کو پورا کرتے ہیں -

ماہر نے افسانہ نگاروں کی معاصر روایت کے مطابق طوائف کو بھی موضوع بنایا ہے چنانچہ " پاکباز طوائف " کے علاوہ " دھڑکن " کی کہانی بھی طوائف کے گرد گھومتی ہے -[5]

۱- انگڑائی - ص ۲۷ ۲- پیمانے - ص ۱۲۲

۳- اندھیرے سے اجالے تک - ص ۲۵۲ ۴ - اندھیرے سے اجالے تک - ص ۲۷۰

۵- حسن و شباب - ص ۱۷

مگر " دھڑکن " فنی اعتبار سے ناکمل افسانہ ہے ۔ مصنف چونکہ دینی قدروں کا حامل ہے اور شرم و حیا کے تقاضوں کو خاص اہمیت دیتا ہے ، اس لئے وہ موضوع سے انصاف نہیں کر سکا ۔ طوائف کسے موضوع کے لئے تو مرزا رسوا کا قلم درکار تھا اور ظاہر ہے یہ "مولانا" ماہر القادری کے بس کی بات نہ تھی ۔ تاہم اس افسانے سے لکھنوی معاشرت کی ایک جھلک نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے ۔ طوائفیں اور ان کے دلال بھی بات بات پر خدا کا نام لیتے ہیں اور کوئی ناسمجھ لڑکی ان کے جال میں پھنس جاتی ہے تو اسے خدا کی نعمت قرار دیتے ہیں ۔ لکھنوی معاشرت میں دین کا تصور جس طرح مسخ ہوا ، اس کا ایک نمونہ اس افسانے میں نظر آتا ہے ۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ ماہر کی زبان لکھنوی روزمرہ و محاورہ سے مطابقت رکھتی نظر آتی ہے ۔ یوں " ایک بندوق ، تین خون "[1] میں بھی نوابی کے روساں کی زندگیوں کی جھلک بڑی خوبی سے پیش کی گئی ہے ۔

*****

ماہر القادری کے ہاں تقریباً ایک درجن ایسے افسانے ہیں جو فکر و فن اور موضوع کے اعتبار سے معیاری قرار دیئے جا سکتے ہیں ۔ ان میں کانفرنس[2] ، فساد[3] ، خسون[4] ، بہن بھائی[5] ، آنسو اور مسکراہٹ[6] ، ایکھ کے کھیت میں[7] ، گھبراہٹ[8] ، واپسی[9] ، آنسو[10] ، توبہ[11] ، پہلی آزمائش[12] ، بھکاری[13] اور اندھیرے سے اجالے تک[14] شامل ہیں ۔ یہ سب افسانے بلاشبہ فکر و فن کے اعتبار سے کامیاب افسانے ہیں اور آغاز ، ارتقاء اور انجام کے لحاظ سے یہ نہ صرف فنی تقاضوں کو پورا کرتے اور دلچسپی و تجسس کے عناصر قائم رکھتے ہیں بلکہ ان افسانوں کی تمہید دلکش اور موثر ہوتی ہے یعنی

۱۔ اندھیرے سے اجالے تک ۔ ص ۲۰
۲۔ بے خانمے ۔ ص ۱۲۳
۳۔ بے خانمے ۔ ص ۱۳۹
۴۔ بے خانمے ۔ ص ۱۹۵
۵۔ بیمانسے ۔ ص ۱۲۲
۶۔ حسن و شباب ۔ ص ۱۴۷
۷۔ حسن و شباب ۔ ص ۱۶۱
۸۔ طلسم حیات ۔ ص ۵۳
۹۔ اندھیرے سے اجالے تک ۔ ص ۹۲
۱۰۔ اندھیرے سے اجالے تک ۔ ص ۱۹۰
۱۱۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۱
۱۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۵۲
۱۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۷۰
۱۴۔ ایضاً ۔ ص ۲۸۶

آغاز میں کبھی وہ فلسفیانہ و فکری انداز اختیار کرتے ہیں اور کبھی ڈرامائی اسلوب سے کام لیتے ہیں - ان کے ہاں واقعہ نگاری ، منظر کشی اور جذبات نگاری کی بھی خوبصورت مثالیں ہیں اور کرداروں اور واقعات کے حوالے سے تنقیدِ حیات کا گہرا شعور نظر آتا ہے -

پریم چند نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ :

" ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو ، آزادی کا جذبہ ہو ، حسن کا جوہر ہو ، تعمیر کی روح ہو - زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو - جو ہم میں حرکت ، ہنگامہ اور بےچینی پیدا کرے سلائے نہیں " -[۱]

ماہر کے متذکرہ بالا افسانوں کا گہری نظر سے مطالعہ کریں ، تو وہ پریم چند کے اس معیار پر بھی پورے اترتے ہیں - ان میں تفکر اور عصری شعور کارفرما ہے - ان میں مغربی تہذیب اور اشتراکی فکر سے آزادی کی دعوت ہے - سلیس ، رواں دواں اور دل و دماغ کو متاثر کرنے والی زبان ہے ، کرداروں کا حُسن ہے اور تعمیر و اصلاح کا قابلِ قدر جذبہ ہے - اس دعوے کے ثبوت میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں -

" واپسی " فن اور تاثر کے اعتبار سے ایک مکمل اور بھرپور افسانہ ہے - روایتی پیروں اور دنیا دار جاہل صوفیوں کی جعلسازیوں اور سیہ کاریوں پر بھرپور طنز ہے - ایک ہندو نوجوان ماتا دین اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتا ہے ، مگر اس کے گاؤں کے مسلمان اسے یہ کہہ کر ایک پیر صاحب کا مرید بننے پر مجبور کرتے ہیں کہ اس کے بغیر دین کی تکمیل نہیں ہوتی - ماتا دین پیر اور اس کے جوا باز بدکردار لڑکے کی حرکتوں کو دیکھتا ہے اور پیر صاحب کے حکم پر " شاہ ولایت " کے عرس میں بھی حاضری دیتا ہے اور وہاں وہی مناظر، بادلی تنفّسر، دیکھتا ہے جو اسے مندروں میں نظر آیا کرتے تھے - اس پر وہ اسلام سے بد ظن ہو کر دوبارہ ہندو ہو جاتا ہے -

ماہر کا یہ افسانہ ایک زندہ افسانہ ہے اور پوری فضا پر دلچسپی اور تجسّس کا عنصر اس طرح برقرار رہتا ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے - اس کا انجام المیاتی ہے ،

۱- پریم چند کے مضامین مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس - علی گڑھ یونیورسٹی پبلشرز - علی گڑھ ، (س - ن) ، ص ۲۵۳

مگر غیر فطری اور غیر منطقی دین ایک باشعور ، ذہین آدمی کے لئے اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا ۔

برصغیر میں شرقِ وسطیٰ ، شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک کے برعکس اسلام ایک غالب قوت اس لئے نہ بن سکا اور غیر مسلم اخیر تک اس لئے اکثریت میں رہے کہ عام ہندو مسلمانوں کی قبر پرستی اور شرک و بدعات کو دیکھ کر کہتے تھے کہ ہم میں اور تم میں فرق ہی کیا ہے ۔ ہم کھڑے بتوں کو پوجتے ہیں ، تم لیٹے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے ہو ۔ یہ افسانہ ایسی روش پر زہر خند کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ———————— ۔ " بھکاری " میں ایک پیشہ ور گداگر " وفاقی " بھیک بھی مانگتا ہے اور نظر کی آوارگی میں بھی مبتلا ہے ۔ وہ کالج کی ایک امیر کبیر لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ لڑکی بھی اس کی طرف مائل ہے ۔ وہ اپنے دوست جمعہ خان کو اپنا رازدان بنا لیتا ہے اور دونوں وقتاً فوقتاً کالج کے دروازے پر آ کر لڑکی کو تاڑتے ہیں ۔

ایک روز وہ دوپہر کو ہاتھ منہ دھونے کالج سے ملحق مسجد میں جاتے ہیں اور شرماً حضوری نماز پڑھنے لگتے ہیں اور وقت گزارنے کے لئے مسجد کے خطیب کی تقریر سننے لگتے ہیں جو اتنی مؤثر اور دلنشین ہوتی ہے کہ وفاقی کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے ۔ چند روز کے بعد انہیں پھر اسی عالمِ دین کی گفتگو سننے کا اتفاق ہوتا ہے اور وفاقی اس سے متاثر ہو کر اپنے اندر تبدیلی پیدا کرتا ہے ۔ وہ نظر بازی سے تائب ہو جاتا ہے اور بھیک مانگنا چھوڑ کر ریلوے سٹیشن پر پان بیچنے لگتا ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دین کا سچا ادراک ہو جانے پر جمعہ خان وفاقی کو " وہابی " ہونے کا طعنہ دیتا ہے ۔

یہ افسانہ انسانی نفسیات کے بعض خاص پہلوؤں کی بڑی خوبصورت عکاسی کرتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ نیکی بدی کو کسطرح شکست دیتی اور کیسے زندگی میں صالح انقلاب لاتی ہے ۔ " بہن بھائی " میں بھی انسانی نفسیات کے بارے میں معلومات اور گہرا شعور حاصل ہوتا ہے ۔ بدگمانی کیسے آگے بڑھتی ہے اور ایک آوارہ منش انسان سادہ دل عورت کی ہنگامی ضرورت

سے کیا کیا غلط فہمیاں پالتا ہے اور اپنے بے تکلف آوارہ فکر دوستوں میں کیا کیا لن ترانیاں بھگارتا ہے - اس افسانے میں اسی نوعیت کی نفسیات کارفرما نظر آتی ہیں -

یہ افسانہ اعلی انسانی قدروں ، اخلاقِ فاضلہ ، ایثار ، اخلاص اور ہمدردی کا خوبصورت مرقع ہے - مکالمے برجستہ اور انشا سلاست اور سادگی مگر پرکاری کا قابلِ قدر نمونہ ہے کہانی فطری رفتار سے آگے بڑھتی اور منطقی انجام تک پہنچتی ہے -

" کانفرنس " اور " فساد " بھی کامیاب اور تاثر سے بھرپور کہانیاں ہیں - " کانفرنس " میں مصنف اس موقف کا اظہار کرتا ہے کہ مرد و زن کا اختلاط خواہ کس قدر نیک مقاصد کے لئے کیوں نہ ہو ، منفی اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا - تحریکِ آزادی کے دوران ایک کانفرنس کے انتظامات میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل ہیں اور مرد رضاکار نہ صرف ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے ، بلکہ تین لڑکیاں اپنے آشناؤں کے ساتھ فرار ہو گئیں -

افسانہ بیانیہ ہئیت میں ہے ، مگر تاثر اور دلچسپی کا عنصر برابر قائم رہتا ہے - انشا خوبصورت و دلکش ہے - افسانہ نگار جگہ جگہ تبصرے کا انداز بھی اختیار کرتا ہے جو موضوع کے پس منظر میں بُرا محسوس نہیں ہوتا -

" فساد " بھی ایک کامیاب و مکمل افسانہ ہے جو دو ہوس کار دوستوں کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے - ایک ہندو ہے دوسرا مسلمان - انہوں نے ایک خوبرو بھکارن کو خاص مقاصد کے لئے گھر میں نوکرانی کی حیثیت سے ملازم رکھا - اختر اس نوکرانی سے ملنے پرتاپ کے گھر آیا کرتا اور چھیڑ چھاڑ بھی کرتا - ایک روز اختر پرتاپ کی غیر موجودگی میں اس کے گھر آیا ، کوئی "خصوصی پروگرام" تھا مگر وقت سے ذرا پہلے نوکرانی کو بازار جانا پڑا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق جب اختر دوسرے کمرے میں گیا تو اس نے نیم تاریک کمرے میں نوکرانی کی بجائے پرتاپ کی بیوی پر ہاتھ ڈال دیا - جس کی زور دار چیخ پر پورا محلہ جو ہندوؤں پر مشتمل تھا ، جمع ہو گیا - اختر کو پکڑ لیا گیا اور ہندو مسلم فساد ہو گیا -

ہندو مسلم فسادات کے ایک پہلو پر ماہر کی یہ طنز بڑی عبرت ناک ہے -

" آنسو " فن اور فکر کے اعتبار سے مکمل، تاثر سے بھرپور، پاکیزہ مقصدیت پر مبنی افسانہ ہے - ایک نیک سرشت ، عفت شعار پاپردہ بیوی ہے - اس کا خاوند بھی پارسا شخص ہے - ان کا ایک پڑوسی جو بظاہر صوم و صلوۃ کا پابند ہے ، ایک روز مذکورہ خاتون کو پردے کے پیچھے سے اتفاقاً دیکھ لیتا اور اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور طرح طرح سے اسے رام کرنے کی کوشش کرتا ہے ، مگر عورت کے پختہ کردار کے سامنے اس کی ہر کوشش ناکام رہتی ہے - بالآخر اس کا ضمیر اسے اتنی ملامت کرتا ہے کہ وہ اپنی حرکت سے رجوع کرتا اور میاں بیوی سے معافی مانگ لیتا ہے -

یہ افسانہ انسان کی اخلاقی عظمت پر ایک دلآویز تبصرہ ہے -

" پہلی آزمائش " زندگی کے صالح انقلاب اور تزکیۂ پر مبنی ایک پاکیزہ افسانہ ہے۔ حکمتِ تبلیغ اور اخلاص کے نتیجے میں ایک بے عمل انسان میں تبدیلی کیسے آتی ہے - اس کی روح پرور تفصیل اس افسانے میں نظر آتی ہے -

ماہر عصری شعور سے بہرہ ور ہیں ، قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرے میں بگاڑ کی کیا کیا صورتیں پیدا ہوئیں اور کم علم دنیا دار " علماء " نے دین کے نام پر لوگوں کو کیسے بیوقوف بنایا ، اس کی جھلکیاں بھی اس افسانے میں موجود ہیں -

مذکورہ افسانوں میں مقصدیت اور فنی پختگی کے ساتھ ساتھ خوبصورت و دلنشین اور سادہ و رواں زبان بھی ماہر کی ایک خاص خصوصیت ہے - اس ضمن میں بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں -

ماہر کی اِن مذکورہ کہانیوں کے برعکس ان کے ہاں ایسے متعدد افسانے بھی ہیں جو[1] فنی اعتبار سے کمزور اور پھسپھسے ہیں اور واقعات اور انجام کے اعتبار سے فلمی مزاج رکھتے ہیں-

---

۱- مثلاً بدگمانی (حسن و شباب) گم شدہ خط ، دلہن ، سازش (پیمانے) رقیب (اندھیرے سے اجالے تک)

بعض مقامات پر مبالغہ حاوی ہے اور معلومات کی کمی کا اندازہ بھی ہوتا ہے - بعض افسانوں میں غیر ضروری تفصیلات بھی کھٹکتی ہیں اور جذباتی اندازِ تحریر انہیں رومانی مصنّفین کے قریب تک لے جاتا ہے -[1] اس دوہت کے افسانوں کی اٹھان خوب ہوتی ہے - تجسّس کا پہلو برقرار رہتا ہے - قاری زبان کی روانی اور لہجے کی دلکشی کا اسیر ہو جاتا ہے ، واقعات بھی اکثر و بیشتر فطری انداز میں آگے بڑھتے ہیں ، مگر انجام پر آ کر ماہر مار کھا جاتے ہیں - یا تو مقصدیت حاوی ہو جاتی ہے یا پھر فلمی لائن سے سابق وابستگی آڑے آ جاتی ہے -

اسی طرح ماہر کے افسانوں میں اس وقت جھول پیدا ہوتا ہے جب کوشش کر کے ماہر افسانہ کو طربیہ رنگ دیتے ہیں - اس کے لئے وہ واقعات کو ایسا موڑ دیتے ہیں جو فطرت اور منطق کے منافی ہو جاتا ہے اور عقلِ عام (Common Sense) اسے تسلیم نہیں کرتی -

ماہر کے افسانوں کی ایک اور خامی یہ ہے کہ ان کے ہاں ظرافت نہ ہونے کے برابر ہے - البتہ طنز کے نشتر خاصے گہرے ہیں - موصوف کے افسانوں میں ہر طرف سنجیدگی چھائی ہوئی نظر آتی ہے - اس معاملے میں وہ پریم چند کے زیادہ قریب ہیں اور مولوی نذیر احمد سے بہت ہی دور- البتہ وہ موخر الذکر کی طرح اپنے ناپسندیدہ کرداروں سے سخت بیزار اور متنفر رہتے ہیں اور انہیں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتے - خصوصاً مغرب زدہ اور اشتراکیت نواز کرداروں کو وہ خوب رسوا کرتے ہیں -

****

متذکرہ جزوی خامیوں اور کمزوریوں کے باوصف مجموعی اعتبار سے ماہر کے افسانوں میں بہت سی خوبیاں ہیں اور کوئی منصف مزاج نقاد انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا - ہندوستان کے ایک نقاد سید عبدالباری نے ایک افسانہ نگار کے لئے چند شرائط ضروری قرار دی ہیں - وہ لکھتے ہیں:

" ایک اچھے افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ اس کا معاشرتی شعور پختہ اور ماحول کا مطالعہ وسیع ہو - وہ جس طبقہ کے احوال پر روشنی ڈالے ، اس سے اچھی طرح واقف

۱- شرافت (طلسم حیات) انگڑائی (انگڑائی)

ہو ۔ معاشرہ میں مقبول و معروف اقدارِ حیات اور تہذیبی آداب سے بھی واقف ہو"[1] ۔

اس معیار کو سامنے رکھ کر ماہر کا مطالعہ کریں ، تو اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت افسانہ نگار ماہر میں یہ بیشتر خوبیاں موجود ہیں ۔ انہیں فن کا پورا شعور حاصل ہے اور انسانی نفسیات کی نزاکتوں سے بخوبی آگاہ ہیں ۔ مشاہدہ کی گہرائی ، جذبہ کا خلوص ، احساس کی نزاکت اور فن کی پختگی اور اظہار و بیان کی دلکشی ماہر کے ہاں موجود ہیں ۔ ماہر کے سینے میں ایک درد مند دل ہے،وہ انسان دوست ضمیر رکھتے ہیں ۔ ان کی نظر حقیقت شناس ہے اور ان کے قلم میں محسوسات کو ہنر مندی سے بیان کرنے کی وافر قوت موجود ہے ۔ ماہر کا ذہن منٹو اور عصمت چغتائی کی طرح مریض نہیں ۔ وہ کرشن چندر کی مانند رومانیت کا بھی شکار نہیں ۔ نہ بعض دیگر افسانہ نگاروں کی طرح مغرب اور مغربی افکار سے مرعوب ہو کر کسی احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں ۔ ان کی فکر صاف ستھری اور نکھری ہوئی ہے ۔ انہیں اپنے دین ، تاریخ اور تہذیب پر گہرا اعتقاد حاصل ہے اور زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر واضح اور غیر مبہم ہے ۔ چنانچہ ان کا دل مغرب زدہ خاندانوں کی بے حمیتی پر روتا ہے اور وہ شرقی اقدار کی تخریب پر نوحہ کناں ہیں ۔ مغربی طرزِ زندگی سے جو قباحتیں پیدا ہوئی ہیں ، ماہر ان کا جابجا ماتم کرتے نظر آتے ہیں اور چونکہ ان کے اسلوب میں زور اور جوش ہے ، اس لئے یہ قاری کی توجہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتا اور متاثر کرتا ہے ۔

ماہر انسان دوستی کا جذبۂ فراواں رکھتے ہیں۔وہ عورت کو مخلوط ماحول میں مظلوم محض سمجھتے ہیں اور اپنی کہانیوں میں اس کا تکرار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ۔ ماہر اپنے دَور کے معاشرتی اور سماجی حقائق کا گہرا شعور و ادراک رکھتے ہیں اور ساتھ ہی زندگی کی معنویت سے بھی آگاہ ہیں ۔ انہوں نے اپنے شاہدات اور تجربات کی بنیاد اِسی سماجی علم اور انسانی خیرخواہی پر استوار کی ہے ۔ انہوں نے اپنے معاشرے کی خامیوں کو کُھلی آنکھوں سے دیکھا ہے ، بڑی کامیابی

١۔ سید عبدالباری ، نیا افسانہ منظر و پس منظر ۔ سہ ماہی " سیارہ " لاہور ۔ اکتوبر ۔ نومبر ١٩٨٣ء ، ص ٣٣ ۔

سے ان کا تجزیہ کیا ہے اور ہنرمندی سے ان پر تنقید کی ہے۔

ماہر اپنی شاعری کی طرح افسانوں میں بھی رجائیت کے علمبردار ہیں اور مایوسی اور قنوطیت کا پہلو ان کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ ماہر شاعر ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ ان کے پاس ایک مصوّر کا موئے قلم بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے افسانوں میں جگہ جگہ ایسے خوبصورت مرقعے تخلیق کئے ہیں اور فضا بندی اور منظر نگاری کا وہ کمال دکھایا ہے کہ یہ تصویریں نظر میں کھب کے رہ جاتی ہیں۔ یہ امر قابل ذکر اور دلچسپ ہے کہ ماہر کے افسانوں کی خواتین بے حد خوبصورت ہیں اور ماہر نے ان کی تصویرکاری خاص ذوق و شوق سے کی ہے۔ ایسے مواقع پر وہ نثر میں شاعری کرنے لگتے ہیں[1] ۔ مگر خوبی یہ ہے کہ یہ مرقّعے کہیں مبالغے کا شکار نہیں ہوتے اور نظریں ان کی دید سے تھکتی نہیں ہیں۔

ماہر کے کردار اپنے عہد کی سچی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کرداروں کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا ہے اور ان کے تمدنی، سماجی اور معاشی مسائل کا شعور حاصل کیا ہے۔ اس شعور مندی کے ساتھ ماہر کا ادبی خلوص اور جذبۂ صادق افسانے میں خاص تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔

ماہر کا مزاج فلسفیانہ ہے، مگر اس حوالے سے انہوں نے افسانوں کی فضا کو بوجھل نہیں بننے دیا۔ اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ انہیں عبرت اندوزی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ وہ کہانی کی روانی میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں انہوں نے ایسا سلیقہ اختیار کیا ہے کہ یہ انداز نامانوس یا اجنبی محسوس نہیں ہوتا بلکہ عبارت کے پس منظر میں یہ باتیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور ذہن پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔

ماہر بنیادی طور پر مبلّغِ اخلاق ہیں۔ اُنہیں دینی، اخلاقی، تہذیبی اور سماجی قدریں بڑی عزیز ہیں اور وہ ان کی پامالی برداشت نہیں کرتے ——— مگر خوشگوار امر یہ ہے

۱۔ مثال کے طور پر دیکھئے " پرواز " (نسے خانے) ص ۲۷

کہ لیں کے اظہار کے لئے وہ وعظ کا اسلوب اختیار کرتے ہیں نہ تبلیغ کا بلکہ بڑی فنی مہارت اور فطری انداز میں کرداروں کی زبان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی انگلی نہیں پکڑتے ، بلکہ وہ فطری رفتار سے آگے بڑھتے ہیں ۔

ماہر نے اگرچہ بالعموم دورِ غلامی کو اپنا موضوع بنایا ہے ، مگر بدقسمتی سے چونکہ ہم سیاسی آزادی کے باوجود تہذیبی اور فکری اعتبار سے اب تک یورپ کے مقلّد و نقال ہیں اور مشرقین اور خواتین کے حلقے میں مغربی تہذیب کے اثرات اور بےپردگی اور آزاد روی کا چلن فروغ پذیر ہے ، اس لئے ماہر کے افسانے آج بھی بڑی حد تک اپنے اندر تازگی لئے ہوئے ہیں اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

******

مگر ماہر القادری کے ایک قاری کی حیثیت سے یہ دیکھ کر دکھ اور تعجب ہوتا ہے کہ ان کی دوسری ادبی حیثیتوں کی طرح انہیں افسانہ نگاری کے شعبے میں بھی مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا اور افسانہ کے فکر و فن یا تاریخ کے ضمن میں کہیں بھولے سے بھی ان کا نام نہیں آنے دیا گیا اور ان کی ذات اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کا ادب بھی مذہبی ، سیاسی اور گروہی تعصبات کا شکار ہو گیا ۔ مانا کہ ان کی افسانہ نگاری میں خامیاں ہیں ، مگر سوال یہ ہے کہ اردو کا وہ کونسا افسانہ نگار ہے جس میں خامیاں نہیں اور ان کی نشاندہی نہیں کی گئی ۔ بقول آل احمد سرور " افسانے کی دنیا میں پریم چند کے بعد سب سے بڑی شخصیت کرشن چندر کی ہے " ۔[1] مگر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان پر بعض اعتراضات کئے گئے ہیں یعنی یہ کہ بعض اوقات وہ افسانہ نہیں مضمون لکھنے لگتے ہیں ۔ انہیں کردار نگاری کا پورا سلیقہ نہیں ۔ ان کی رومانیت ان کی حقیقت نگاری پر غالب رہتی ہے ۔ وہ جن لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں ان سے گہری واقفیت نہیں

۱۔ تنقیدی اشارے از آل احمد سرور ۔ ادارۂ فروغ اردو ، لکھنئو ۱۹۵۵ء ، ص ۳۱

رکھتے اور وہ اشخاص سے زیادہ حالات پر نظر رکھتے ھیں ۔ چنانچہ وارث علوی کے نزدیک " کرشن چندر کے بعض افسانے کمزور ھی نہیں ، احتیاطی بھی ھیں "[1] ۔ موصوف نے ٧٢ صفحے کے ایک طویل مضمون میں کرشن چندر کے افسانوں کی بہت سی فنی اغلاط کی نشاندھی کی ھے ۔ وہ لکھتے ھیں :

" ان کی چند کہانیوں کے متعلق بہترین کا لفظ استعمال ھو سکتا ھے ۔ شاھکار کا شاید کسی کے لئے بھی نہیں ۔ البتہ پُرلطف دلچسپ بہت اچھی نہ ھونے کے باوصف قابل مطالعہ ، کمزور ھونے کے باوجود اسلوب کی خاطر دیکھے جانے کے قابل ، بے معنی لیکن شوخ و طرار ، جذباتی لیکن بذلہ سنج ، رقت انگیز لیکن تاثر سے بھرپور وغیرہ قسم کے توصیفی بیانات ان کی اکثر و بیشتر کہانیوں کے لئے استعمال کئے بغیر چارہ نہیں "[2] ۔

اسی طرح افسانے کی دنیا میں عصمت چغتائی کا ایک نام ھے اور کتنے ھی نقاد ان کی تعریف کرتے نہیں تھکتے لیکن ، ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نزدیک :

" عصمت چغتائی میں سستی قسم کی رومانیت ھے اور ان کی شدت ، تیزی ، جارحانہ کیفیت اور بیباکی کہیں کہیں حد سے گزر جاتی ھے اور متوازن قسم کے انسان پر اچھا اثر نہیں کرتی "[3] ۔

ان بیانات اور مثالوں کی روشنی میں جب یہ مسلمہ حقیقت ھے کہ صف اوّل کے معروف افسانہ نگار بھی فکر و فن کے اعتبار سے فاش قسم کی خامیوں اور کمزوریوں کے مرتکب ھوئے ھیں ، تو پھر چند جزوی خامیوں کی بنا پر کسی شخص کے پورے ذخیرۂ ادب کو نظر انداز کر دینا یا بالفاظِ دیگر اس کے فن ھی سے انکار کرنا آخر کہاں کا انصاف ھے ؟ اور یہ دیکھ کر بڑا دکھ ھوتا ھے کہ بیشتر نقاد حضرات نے ماھر کے معاملے میں ظلمِ صریح کا رویّہ اپنایا ھے ۔ ان کی غزل کو قطعی نظر انداز کیا گیا ، ان کی منظومات سے آنکھیں بند کر لی گئیں ، خاکہ نگاری کے ضمن میں ڈھونڈنے سے ان کا نام نظر

١۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل مرتبہ گوپی چند نارنگ ۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاھور ۔ ١٩٨٦ء ، ص ٢٦٩ ۔

٢۔ ایضاً ۔ ص ٣٣٢

٣۔ نقوش افسانہ نمبر جلد دوم ، ص ١٠٣٨ ، ١٠٣٩

نہیں آتا ۔ ناول نگاری کے حوالے سے بھی یہی روش اختیار کی گئی اور افسانہ نگاری میں بھی انہیں کسی بھی توجہ کے قابل نہ سمجھا گیا ۔ غور کریں تو یہ محض اتفاق نہیں ہے بلکہ انتقامی جذبے کا شاخسانہ ہے اور تعصب اور تنگ نظری کی شہادت گری ہے ۔ ماہر نے آغاز سے لے کر آخر تک ترقی پسندوں کا جو تعاقب کیا اور انہیں تنقید کی سان پر چڑھائے رکھا ، اس کی سزا انہیں یہ ملی کہ ہر شعبہ ادب میں انہیں قطعی نظر انداز کیا گیا ۔ ادب و انشا کی دنیا میں ان کا نام کبھی بھولے سے نہ آنے دیا گیا ۔

سوال یہ ہے کہ کیا ادب ، تنقید اور دانشوری اسی چیز کا نام ہے ؟ اور اگر نقاد ،ادیب اور دانشور ہی تنگ نظر ،متعصب اور جانبدار ہوں گے ، تو دُنیا انصاف ، اعتدال اور توازن کہاں سے تلاش کرے گی؟ ۔

باب - ۷

ماہر القادری کی خاکہ نگاری

ماہر القادری نے اپریل ۱۹۴۹ء سے ماہنامہ " فاران " کا اجراء کیا اور اس کے ٹھیک دو سال بعد یعنی اپریل ۱۹۵۱ء کے پرچے سے انہوں نے " یادِ رفتگان " کا سلسلہ شروع کیا جو ان کی وفات تک جاری رہا - قاعدہ یہ تھا کہ جب بھی کسی ایسی علمی ، ادبی ،سیاسی یا دینی شخصیت کی وفات ہوتی جس سے ماہر کا کسی حوالے سے ذاتی تعارف ہوتا ، تو موصوف تقریباً اسی ماہ " فاران " میں اس کے بارے میں ، اپنی یادوں کے تناظر میں ، اپنے تاثرات قلم بند کر دیتے[1] - اس طرح اگست ۱۹۷۸ء تک کم و بیش ۱۹۰ مختلف حضرات کے بارے میں ماہر کے تاثرات شائع ہوئے جنہیں معروف مورخ اور سوانح نگار جناب طالب ہاشمی نے دو ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع کر دیا[2] -

اردو میں خاکہ نگاری :

قبل اس کے کہ ہم ماہر القادری کی خاکہ نگاری کا محاکمہ کریں ، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اردو زبان میں خاکہ نگاری کے فن اور اس کے لوازمات کی روشنی میں معروف خاکہ نگاروں کی نگارشات کا جائزہ لیا جائے تاکہ اس حوالے سے اردو خاکہ نگاری میں ماہر کے مقام کا تعین کیا جاسکے-

---

۱- ماہر القادری کی وفات ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کو ہوئی - موصوف کی عادت تھی کہ جب کسی طویل سفر پر نکلتے ، تو دو تین شماروں کے لئے پیشگی مضامین اور اداریے لکھ دیتے ، تاکہ پرچے کی اشاعت میں کوئی فرق یا ناغہ نہ آئے - اس طرح " یادِ رفتگان " کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد یعنی اگست ۱۹۷۸ء تک شائع ہوتا رہا -

۲- " یادِ رفتگان " حصہ اول و دوم - مطبوعہ البدر پبلیکیشنز ، لاہور - ضخامت ۳۱۰ و ۳۸۶ صفحات سن اشاعت مارچ ۸۳ و فروری ۸۶ء - یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کسی بھی دوسرے شخصیت نگار یا خاکہ نویس نے اتنی بڑی تعداد کو موضوعِ قلم نہیں بنایا -

اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے بقول ڈاکٹر انور سدید [1]
فرحت اللہ بیگ سے پہلے کوئی ایسی بڑی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے کوئی مکمل خاکہ لکھا ہو ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے " آبِ حیات " میں کچھ شاعروں کے مرقعے جمع کئے ہیں اور یہ دلچسپ اور جاندار بھی ہیں ، لیکن موصوف کے زمانے میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا ۔ بلا شبہ ان کے ہاں ایک اچھے خاکہ نگار کی تمام خوبیاں موجود ہیں ، مگر آبِ حیات میں یہ تمام خوبیاں مرتب صورت میں سامنے نہیں آ سکیں اور جیسا کہ ابجد کمدیانی نے لکھا ہے " مصنف نے شاعروں کو چلایا پھرایا تو خوب ہے ، لیکن ان کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے اور ان کی نفسی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی طرف واقعی کوئی توجہ نہیں کی اور کہیں نفسیاتی تجزیہ کسی قدر ہے بھی ، تو اس پر اپنی پسند کا رنگ چڑھا ہوا ہے جس کی وجہ سے تصویر یک رخی ہو کر رہ گئی ہے ۔ اس سلسلے میں میر ، مصحفی اور غالب سے تو زیادتی کی گئی ہے ، مگر اپنے استاد کے علاوہ سودا ، انشا اور جراتؔ پر خاصی نظر کرم ہے "۔[2]

آزاد کے بعد ۱۹۲۷ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے " نذیر احمد کی کہانی " لکھی اور خاکہ نگاری کی ابتدا دراصل یہیں سے ہوتی ہے ۔ فرحت اللہ بیگ نے اس کے علاوہ وحید الدین سلیم کا خاکہ اور دلی کا آخری مشاعرہ لکھ کر خاکہ نگاری کو ایک الگ صنفِ ادب کا درجہ دے دیا جس کے بعد اردو میں خاکہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے جنہوں نے خاکہ نگاری کی صنف کو رنگا رنگ کے سدا بہار پھولوں سے مالا مال کر دیا ۔

خاکہ نگاری کیا ہے ؟:

خاکہ نگاری کے بارے میں اہلِ علم کی آراء مختلف ہیں۔بقول ڈاکٹر سیّد شاہ علی :

۱۔ اردو میں خاکہ نگاری ، ڈاکٹر انور سدید ۔ نقوش دسمبر ۱۹۷۰ء ، ص ۲۶۶
۲۔ نگار پاکستان ۔ سالنامہ ۱۹۶۶ء ، اصناف ادب نمبر ۔ ص ۲۲۵

• شخصیت نگار کو سنِ ولادت سے وفات تک کے حالاتِ زندگی کا سلسلہ وار (اور تاریخی)
بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ اس کے حالات کی تلاش و تحقیق یا اس کے حیات اور
خیالات کے مشاہدے اور مطالعے کے لئے اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہنے کی ضرورت
ہے اور نہ اہم واقعات ہی کو پیش کرنا لازمی ہے، بلکہ حیات پر ایک چھچھلتی ہوئی
سی نظر ڈالنا اور غیر اہم واقعات سے اہم کی طرف رجوع کرنا ہی اس کا طریقِ کار
ہے ۔ وہ ایک واقعہ سے بھی اس کی زندگی اور شخصیت کا پورا تصور پیش کر سکتا ہے •[1]

بالفاظِ دیگر سوانح نگاری اور خاکہ نگاری میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں زیادہ سے زیادہ معلومات ہوتی ہیں اور انسان کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر ربط اور تسلسل کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے ، لیکن شخصی مرقع یا خاکہ اس تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ گویا سوانح نگاری ناول کی طرح کسی فرد کے خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں کا بھرپور محاکمہ کرتی ہے جبکہ خاکہ نگاری مختصر افسانے کی طرح محدود پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے ۔ یوں بھی سوانح نگاری ہمارے ہاں مدلل مداحی کی روایت کی حامل ہے جبکہ خاکہ نگار خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں پر بھی نگاہ ڈالتا ہے اور انسانوں کو بطور انسان ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔ عربی ادب میں اسماء الرجال کا فن اس کی خوبصورت مثال ہے جس میں نجی اور سماجی خوبیوں کے ساتھ ساتھ موضوعِ بحث فرد کی ایک ایک خامی بھی بیان کی جاتی تھی ۔ چنانچہ یہ عمومی تاثر غلط ہے کہ شخصیت کا مثبت و منفی محاکمہ صرف یورپ کی دین ہے ۔ اسلامی علوم میں یہ انداز صدیوں سے چلا آ رہا ہے ۔

بہرحال نگہت افزا بخاری کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ شخصیت نگاری کیمرے کی تصویر اور آئینے کے عکس کی طرح واضح اور بے داغ ہونی چاہیئے ۔ اس میں لکھنے والے کے ذاتی تعصبات کا بالکل دخل نہیں ہونا چاہیئے ۔ تاہم صاف گوئی کے ساتھ ساتھ یہ امر ضروری ہے کہ

١- اردو میں سوانح نگاری از ڈاکٹر سید شاہ علی ، گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی ، ١٩٦١ء ،
ص ٨٧ ۔

شخصیت نگار کو اپنے موضوع کا ہمدردانہ ادراک ہونا چاہیئے اور اگر وہ شخصیت زیر بحث کی کمزوریوں ہی کا اعلان کرتا ہے تو یہ خاکہ نگاری نہیں بلکہ نثری ہجو بن جائے گی - یہ انداز علمی دیانت کے خلاف ہے کہ اس سے قارئین کسی شخص کے بارے میں غلط اور منفی تاثر قبول کریں گے - کسی شخص سے ہمدردی کے بغیر اس کی شخصیت کے بارے میں صحیح طور پر واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی-[۱] شاید اسی لئے علی عباس حسینی شخصیت نگاری کو سوانح نگاری کی مشکل ترین قسم تصور کرتے ہیں - ان کے نزدیک کسی عظیم ہستی کے واقعاتِ حیات کو بیان کر دینا اور اس کے کارناموں ، شاہکاروں اور تصنیفوں پر تنقیدی نظر ڈال لینا نسبتاً آسان کام ہے ، لیکن شخصیت نگاری کے فن میں کامیابی کے لئے مردم شناس نظر کے ساتھ ساتھ عام انسانی نفسیات سے واقفیت بھی ضروری ہے -[۲] نثار احمد فاروقی خاکہ نگاری کو تنقید یا تنقیص کے برعکس شخصیت کی عکاسی کا نام دیتے ہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول خاکہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا خام مواد کسی دوسری شخصیت کے اخذ و مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن ایک عمدہ خاکہ اس خام مواد کو من و عن پیش نہیں کرتا بلکہ مختلف واقعات کو مشاہدہ بین کے تاثر اور تجزیے کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہی وہ مشکل مرحلہ ہے جہاں صنف کے تخلیقی جوہر سے مسِ خام یا تو کندن بن جاتا ہے یا راکھ -[۳]

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھیں اور جائزہ لیں تو اردو ادب میں ایسے خاکہ نگار بہت کم ہیں جنہوں نے خاکہ نگاری کی ان ساری شرائط کو پورا کیا ہو - یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا اس فن کو " کارگہِ شیشہ گراں " سے موسوم کرتے ہیں اور نقوش کے مرحوم ایڈیٹر محمد طفیل ایسی تلوار کا جس سے خود لکھنے والا بھی زخمی ہو جاتا ہے -[۴]

اردو کے خاکہ نگاروں پر ایک نظر :

خاکہ نگاری میں فرحت اللہ ، مولوی عبدالحق ، مولانا عبدالرزاق کانپوری ، رشید احمد صدیقی ،

۱- اردو ادب میں شخصیت نگاری - مقالہ ایم اے ۱۹۶۲ء ، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری - ص ۵

۲- علی عباس حسینی / نقوش دسمبر ۱۹۷۰ء ، ص ۲۶۷

۳- نثار احمد فاروقی / ایضاً - ص ۲۶۷

۴- ڈاکٹر وزیر آغا / ایضاً - ص ۲۶۷

چراغ حسن حسرت ، رئیس احمد جعفری ، اور شاہد احمد دہلوی ماہر القادری کے پیش رو قرار دیئے جا سکتے ہیں ۔ فرحت اللّٰہ بیگ سے تو وہ بہت متاثر بھی ہیں ۔[1]

ان کے معاصر خاکہ نگاروں میں عصمت چغتائی ، سعادت حسن منٹو ، عبد الماجد دریابادی، مولانا ابو الحسن علی ندوی ، ڈاکٹر محی الدین زور ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن ، ضیاء الدین برنی شوکت تھانوی ، آغا شورش کاشمیری اور محمد طفیل کے نام قابل ذکر ہیں ۔

حال کے خاکہ نگاروں میں نصراللّٰہ خان ، ممتاز مفتی ، قرۃ العین حیدر ، اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام شامل ہیں ۔ بیشتر نقاد اور تجزیہ نگار اس رائے پر متفق ہیں کہ فرحت اللّٰہ بیگ (۱۸۸۳-۱۹۴۷ء) اردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے مکمل خاکے لکھے ہیں اور خاکہ نگاری کی ابتدا بھی دراصل مرزا فرحت اللّٰہ بیگ سے ہوتی ہے ۔ چنانچہ ان کا خاکہ " نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی " ایک گرانقدر ادبی کارنامہ ہے اور اسی سے فرحت اللّٰہ بیگ نے اپنی خاکہ نگاری کی ابتدا کی ہے ۔ دلی کا ایک یادگار مشاعرہ ، وحید الدین سلیم کا خاکہ اور پھول والوں کی سیر جیسی نگارشات منظر عام پر آئیں ۔ اس طرح انہوں نے خاکہ نگاری کو ایک الگ صنفِ ادب کا درجہ دے دیا اور نہ صرف اس فن کی حدود متعین کر دیں بلکہ اس نو خیز صنف کو ابتدا ہی میں پختگی کی ڈگر پر ڈال دیا ۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد سے عقیدت رکھنے کے باوجود اور ان کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوصف فرحت اللّٰہ بیگ نے ان کی بشری کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالا اور موصوف کی شخصیت کو اس فنی پختگی سے بیان کیا ہے کہ وہ ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت زندۂ جاوید ہو گئے ہیں ۔

اسی طرح " ایک وصیت کی تعمیل " میں وحید الدین سلیم اپنی ساری علمی بلندیوں اور انسانی کمزوریوں کے ساتھ متحرک و فعال دکھائی دیتے ہیں ۔ غرض فرحت اللّٰہ بیگ نے مختلف حضرات کو جیسے دیکھا ویسے ہی پیش کر دیا ۔ انہیں فرشتہ بنایا نہ شیطان بلکہ پورے خلوص ، ہمدردی

۱- دیکھئے ماہر القادری کا مضمون " فرحت اللّٰہ بیگ " مطبوعہ علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر ۱۹۵۳ء ، ص ۱۶۳-۱۷۱

اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ایک انسان کے روپ میں پیش کر دیا ہے ۔ اسی لئے ان خاکوں میں زندگی بھی ہے اور جان بھی ۔ مجموعی لحاظ سے انہوں نے اپنے سارے خاکوں میں بقول ڈاکٹر انور سدید ایک زوال پذیر معاشرے کی کامیابی سے تصویر کشی کی ہے ، مگر ان کا اسلوب بڑا ہی نرم اور برجستہ ہے اور کہیں بھی بوجھل پن یا تکلف کا احساس نہیں ہوتا ۔[1] ماہر القادری کے الفاظ میں " فرحت اللہ اپنے کو محتسب ، کوتوال اور ریفارمر نہیں سمجھتے وہ ایک بے تکلف راہگیر کی طرح کرداروں اور شخصیتوں کے بازاروں سے گزرتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں ، انہیں مسکرا مسکرا کر بیان کرتے چلے جاتے ہیں ۔ یہی ان کی ظرافت اور یہی ان کا آرٹ ہے ۔[2]

اردو کے ابتدائی خاکہ نگاروں میں دوسرا اہم نام مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ - ۱۹۶۲) کا ہے اور ان کی کتاب " چند ہم عصر " اپنی نوعیت کی بڑی اہم کتاب ہے جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔اس میں چوبیس مختلف شخصیات پر مضامین شامل ہیں ۔ جن میں سرسیّد ، مولانا حالی ، علامہ اقبال محسن الملک ، مولانا محمد علی جوہر اور سر راس مسعود اور وحید الدین سلیم کے ساتھ ساتھ نام دیو مالی اور نور خان کے خاکے شامل ہیں ۔ اس طرح انہوں نے جواہر ریزوں کے ساتھ ساتھ خزف ریزوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا لیکن چونکہ ان کا تعلق بنیادی طور پر عہدِ سرسیّد سے تھا ، اس لئے انہوں نے ہر جگہ خیر کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور انسانوں کی غلطیوں ، کوتاہیوں اور کمزوریوں سے عموماً صرف نظر کیا ہے ۔ چنانچہ مجموعی طور پر ان کی شخصیت نگاری پر مدح سرائی کا رنگ غالب ہے اور انہوں نے مختلف کرداروں کے وہی اوصاف اجاگر کئے ہیں جو انہیں پسند ہیں۔اس طرح مولوی صاحب کے اکثر کردار مثالی نظر آتے ہیں ۔ تاہم مولانا محمد علی جوہر اور وحید الدین سلیم کی صورت میں کم از کم دو ایسے خاکے ضرور ہیں جن میں انہوں نے خوبیاں ہی بیان نہیں کیں بلکہ دونوں بزرگوں کی بشری کمزوریوں کی طرف اشارے بھی کئے ہیں ۔ مثال کے طور پر وحید الدین سلیم کے بارے میں لکھتے ہیں :

۱۔ نقوش دسمبر ۱۹۷۰ء ، ص ۲۶۸

۲۔ علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر ۱۹۵۳ء ، ص ۱۷۰ ،

" مولانا سلیم کے انتقال سے اردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں - ان جیسا ادیب سارے ملک میں کوئی نظر نہیں آتا "
" مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے ...... جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے ..... اور جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے ..... باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے " -[1]

مولوی عبدالحق ہی کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر اپنی بے مثال خوبیوں اور عدیم النظیر مجاہدانہ کارناموں کے باوصف بڑے زود رنج اور غصّہ ور انسان تھے - معمولی باتوں سے ناراض ہو جاتے اور پھر کسی تعلق کی پروا نہ کرتے تھے -[2]

فرحت اللّٰہ بیگ کے بعد رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ - ۱۹۷۷) پہلے خاکہ نگار ہیں جن کے خاکوں میں اشخاص چلتے پھرتے اور زندہ و متحرک نظر آتے ہیں - یقیناً انہوں نے شخصی خاکے کے فن کو خاص امتیاز بخشا ہے -

رشید احمد صدیقی کا خاکوں پر مبنی سب سے پہلا مجموعہ " گنجہائے گرانمایہ " ۱۹۳۷ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا - ڈاکٹر ذاکر حسین کا طویل خاکہ " ذاکر صاحب " ۱۹۶۲ء میں چھپا جبکہ " ہم نفسان رفتہ " ۱۹۶۶ء میں منصۂ شہود پر آیا - ان کے علاوہ مضامینِ رشید " خنداں " میں بھی متفرق خاکے موجود ہیں - خصوصاً " گنج ہائے گرانمایہ " اور " ہمنفسان رفتہ " ان کے زندۂ جاوید کارنامے کی حیثیت سے تاریخِ ادبِ اردو میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی - بقول ڈاکٹر تحسین فراقی :

" وہ ہر جگہ شرافت اور شائستگی کی قدریں اجاگر کرتے ہیں جزئیات پر ان کی نگاہ گہری ہوتی ہے - ان کے خاکے ان کے دلِ دردمند اور نگاہِ پُرسوز کے غماز ہیں لیکن اوّل تا آخر شگفتہ اور ظرافت کے چھینٹوں سے تروتازہ ہیں اردو خاکہ نگاری میں ان کا درجہ مجتہد کا ہے - وہ اپنی شخصیتوں میں کردار نگاری کا جادو جگاتے ہیں اور ان اعلیٰ فضائل

۱- مولوی عبدالحق ، چند ہم عصر ، اردو اکیڈمی سندھ - ۱۹۸۳ء ، ص ۱۱۹
۲- ایضاً ص ۱۵۱ ، ۱۵۲

کو اجاگر کرتے ھین جن سے زندگی بنتی ھے۔ شخصیات کے ضمن مین ان کا رویّہ ھمدردانہ ھے "۔[1]

شاید ادبی خصوصیات کے پیش نظر ڈاکٹر انور سدید کی رائے مین رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری پر مثالیت پسندی کا زیادہ غلبہ ھے۔ وہ اپنے موضوع کی انفرادیت کو بڑی طرح منظر عام پر لادینے کے لیے کردار کا ھمہ پہلو مشاھدہ کرتے ھین اور اس مشاھدے مین ان کے ذاتی نظریات کو زیادہ دخل ھوتا ھے۔[2] اور اسی مثالیت پسندی کی طرف اشارہ کرتے ھوئے آلِ احمد سرور " ذاکر صاحب " پر یون تبصرہ کرتے ھین کہ " یہ ایک عاشق کا کارنامہ ھے، ایک عارف کا نہین "۔[3]

رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری کی ایک اور خصوصیت ان کا گہرا جذباتی احساس ھے جو ھر شخصیت کے حوالے سے ان کی تحریر سے پھوٹا پڑتا ھے بقول ڈاکٹر الطاف فاطمہ:

> " طنز و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ھنسانے کے علاوہ رلانے کا سلیقہ بھی آتا ھے۔ انسانی رشتون کی اٹوٹ سچائی اور گہرے پن کا احساس دلانا ھو تو گنجہائے گرانمایہ کا حوالہ ناگزیر معلوم ھوتا ھے "۔[4]

اور شاید اسی گہرے جذباتی احساس نے صدیقی صاحب کی تحریر مین وہ اثر پیدا کر دیا ھے کہ ان کا قاری مسحور ھو کر رہ جاتا ھے اور وہ اپنے بلیغ اسلوب کے سہارے معائب کو بھی اس طرح بیان کر جاتے ھین کہ شخصیت ابھر کر سامنے آ جاتی ھے اور اس کی قدر و منزلت مین کچھ اور اضافہ ھو جاتا ھے۔[5] مولانا محمد علی جوھر کے بارے مین لکھتے ھین " محمد علی مین کمزوریان بھی تھین، لیکن ان کی کمزوریان ایک شعر کی کمزوریان تھین جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی مین کوئی فرق نہین آتا " اسی طرح مولانا موصوف کی شاہ خرچی کی طرف اشارہ کرتے ھوئے لکھتے ھین " محمد علی پر دولت و شہرت کی بارش ھوئی ۔ محمد علی نے ان دونون کو سیلاب بنا کر بہا دیا "۔[6]

۱۔ " عبدالماجد دریابادی ۔ احوال و آثار " مقالہ پی ایچ ڈی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ص ۲۶۶

۲۔ نقوش دسمبر ۱۹۷۰ء، مضمون اردو مین خاکہ نگاری ۔ ص ۲۶۸

۳۔ بحوالہ اردو ادب مین شخصیت نگاری، ایم اے کا تحقیقی مقالہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، از نگہت افزا بخاری ۔ ص ۵

۴۔ اردو سوانح نگاری ۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند دسوین جلد اردو ادب (پنجم) ص ۲۱۴ ۔ ۵ ۔ اردو خاکہ نگاری ایک مطالعہ فہمیدہ شیخ ۔ مجلہ " تحقیق نمبر ۲ " سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۸۷ء ص ۱۶۹-۱۶۸

۶۔ گنج ھائے گران مایہ ۔ آئینہ ادب، لاہور ۱۹۷۶ء ص ۱۰، ۱۱۔

ان تین بڑے خاکہ نگاروں کے بعد جن لوگوں نے اردو خاکہ نگاری میں قابل قدر اضافے کئے ان میں چراغ حسن حسرت ، عبدالمجید سالک ، رئیس احمد جعفری اور شورش کاشمیری کے نام لائقِ ذکر ہیں - حسرت کی کتاب "مردم دیدہ "[۱] اردو خاکہ نگاری کی ایک اہم کتاب ہے جس میں مولانا ظفر علی خان ، آغا حشر کاشمیری اور بعض دیگر نامور حضرات کے خاکے شامل ہیں جو ذاتی تعلقات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں - انہوں نے کسی کی تعریف کی ہے نہ تنقیص بلکہ مکمل غیر جانبداری سے مختلف شخصیات کا مشاہدہ کیا ہے - انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ بشری کمزوریاں اور خامیاں بھی نظر آتی ہیں - چراغ حسن حسرت کا اسلوب شوخی ، بے تکلفی ، اور برجستگی کا حامل ہے بقول ڈاکٹر انور سدید " وہ بات سے بات اور نکتے سے نکتہ پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور تیکھی چٹکیوں سے شخصیت کے بارے میں ہمہ گیر تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں "[۲]

عبدالمجید سالک (۱۸۹۴-۱۹۵۹) کی کتاب " یاران کہن "[۳] بھی خاکہ نگاری میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے اگرچہ اس میں بھی تقریباً تمام شخصیات کا ذکر ذاتی تعلقات کے حوالے سے کیا گیا ہے ، مگر سالک اپنے مخصوص طنزیہ و مزاحیہ پیرایے میں متعلقہ شخصیات کی کمزوریوں اور خامیوں کا پردہ چاک کرتے اور شخصیت کے خد و خال واضح کرتے جاتے ہیں - سالک چونکہ روزنامہ اخبار میں فکاہیہ کالم نویس تھے اس لئے ان کے خاکوں میں بذلہ سنجی ، صحافتی تبصرہ اور نوکیلے لطیفوں کا کھلا چھینٹا نظر آتا ہے -[۴]

رئیس احمد جعفری نے " دید و شنید " میں ایک سو آٹھ شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں جو طویل بھی ہیں اور مختصر بھی اور متنوع بھی - ان میں ہر شعبۂ حیات اور ہر مکتب فکر کے ایسے لوگ شامل ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے نمایاں اور ممتاز حیثیت کے حامل تھے یا قابلِ اعتبار سیرت و شخصیت کے مالک تھے - اس طرح ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول " مصنف کے پیش نظر محض

۱- دارالاشاعت پنجاب ، لاہور ۱۹۳۹ء

۲- ڈاکٹر انور سدید ، اردو میں خاکہ نگاری - نقوش دسمبر ۱۹۷۰ء ، ص ۲٦۹

۳- مطبوعات چٹان ، لاہور ۱۹۵۵ء

۴- ڈاکٹر انور سدید - نقوش دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۲٦۹

چند شخصیات کو ایک مخصوص شگفتہ یا مزاحیہ لہجے میں پیش کر کے گرمیٔ محفل کا سامان کرنا مقصود نہ تھا بلکہ ان شخصیات کے حوالے سے اعلیٰ انسانی اقدار اور فضائل و فیوض کو عام کرنا مقصود تھا ۔[1] اور جعفری صاحب اپنے اس مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں اور مختلف خاکوں میں متعلقہ شخصیات کا ایسا بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں جو قاری کو دیر تک اپنی گرفت میں لئے رہتا ہے ۔ خصوصاً منظر کشی اور سراپا نگاری اس خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کے قلم پر کسی ماہرِ فن مصوّر کا گمان ہوتا ہے اور اوّل سے آخر تک تحریر پر شگفتگی اور بے تکلفی کی فضا نظر آتی ہے ۔ رئیس احمد جعفری کی خاکہ نگاری میں غیر جانبداری اور انصاف پسندی جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتی ہے اور ان سب خصوصیات نے مل کر ان کے خاکوں کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے ۔

آغا شورش کاشمیری (۱۹۱۷-۱۹۷۵ء) کی کتاب " چہرے[2] " جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی اس میں ترانوے اشخاص کے خاکے ہیں ۔ سراپا نگاری کے موثر اور کامیاب نمونے جا بجا ملتے ہیں ، مگر شخصیت اور کردار کے بارے میں آراء عجلت اور رواروی کی عکاس ہیں جیسے حالتِ اضطرار میں " رنگ کمنٹری " کی گئی ہو ۔ آغا صاحب کے مزاج کے عین مطابق ان کی تحریر پر جزبات غالب ہیں ۔ اندازِ بیان شاعرانہ ، صنائع بدائع کا استعمال خوب ہے ۔ سنجیدگی کم ، مگر حقیقت نگاری کی کمی نہیں ہے ۔

آغا شورش بہرحال بہادر انسان تھے ، اس لئے ان کے خاکوں میں جراتِ رندانہ کا سا انداز ہے لگی لپٹی رکھے بغیر بات بے باکی سے کہہ دیتے ہیں ۔ البتہ کہیں کہیں دشنام کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے (مثلاً نعیم صدیقی اور حفیظ جالندھری کے خاکوں میں) ۔

" دلی کی چند عجیب ہستیاں " اشرف صبوحی کی کتاب ہے جو پندرہ دلچسپ خاکوں پر مشتمل ہے ۔ جیسا کہ نام سے اندازہ ہوتا ہے ، اشرف صبوحی نے جن لوگوں کو خاکہ نگاری کے لئے منتخب کیا ہے وہ سب غیر معروف ہیں اور دراصل انہی غیر معروف اشخاص کے حوالے سے اس عہد کی

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی ۔ دیباچہ دید و شنید ۔ مصنف رئیس احمد جعفری ۔ رئیس احمد جعفری اکیڈمی کراچی ، اشاعت ثانی ۔ ۱۹۸۷ء ، ص ۲۱

۲۔ مکتبہ ماحول ، کراچی ۱۹۶۵ء

تہذیب کے مختلف نقوش کو محفوظ کیا گیا ہے - اُس زمانے کی روا داری ، پاسِ وضع ، شرافت اور اس کے ساتھ ساتھ لہو و لعب ، پتنگ بازی ، بٹیر بازی ، مرغ بازی ، تفریح پسندی اور عیش پرستی کے مختلف مظاہر ، کھانوں میں نئی نئی اختراعیں اور مہارتیں ، لباس کے نئے نئے ڈھنگ ، قلعۂ معلیٰ کا عیش پرستانہ ماحول ، شہزادوں کے لچھن ، غرض ایک زوال آمادہ ماحول کی ساری خصوصیات اس میں عُریاں نظر آتی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ ساری صلاحیتیں تفریح پسندی اور انواع واقسام کے کھانے پکانے میں استعمال ہوتی تھیں -

اشرف صبوحی کی زبان دلی کی روزمرہ بول چال کے بہت قریب ہے - روانی بلا کی ہے - فقرے تیز ، چست اور برمحل ہیں اور مکالموں کی برجستگی بے مثال - خاکہ نگاری میں اشرف صبوحی دیر تک یاد رکھے جائیں گے -

شوکت تھانوی (۱۹۰۲-۱۹۶۳ء) بُنیادی طور پر مزاح نگار تھے چنانچہ ان کی خاکہ نگاری پر بھی ان کا مخصوص اسلوب چھایا ہوا ہے " شیش محل " اور " قاعدہ بے قاعدہ " ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئے جن میں صنف نے متعدد ادبی ہستیوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان میں بڑی مہارت اور ذہانت کے ساتھ لطف لے لے کر ان کی خوبیاں اور خامیاں بے نقاب کی ہیں - یہ خاکے دلچسپ ضرور ہیں لیکن شخصیتیں ظرافت میں دب کر رہ گئی ہیں -

عصمت چغتائی (۱۹۱۵ - ۱۹۸۸ء) معروف افسانہ نگار ہیں ، مگر انہوں نے چند بہت کامیاب خاکے بھی لکھے ہیں جن میں پہلا اسرار الحق مجاز کا اور دوسرا ان کے سگے بھائی اور نامور ادیب عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ " دوزخی " ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دوزخی کا شمار اردو کے چند بہترین اور منفرد خاکوں میں ہوتا ہے اور بہت سے نقاد اس خاکے کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اردو ادب میں اس کی وجہ سے عصمت چغتائی کو وہ مقام عطا کرتے ہیں جو " نذیر احمد کی کہانی " کی وجہ سے فرحت اللہ بیگ کو حاصل ہوا - اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں حقیقت نگاری اور دلچسپی کا عنصر غالب ہے تکنیک بہت عمدہ ہے اور اندازِ بیان بڑا دلکش ہے مگر مجھے جناب امجد کمدیانی کے اس تجزیے[۱] سے اتفاق ہے کہ "دراصل " دوزخی " کا خاکہ اعلیٰ فن

۱- اردو میں خاکہ نگاری - نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء - ص ۲۳۳

کا نمونہ نہیں ہے - اور اس کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں دریدہ اصابت کے منافی اقدار کی تحسین کی گئی ہے - عصمت نے اپنے بھائی میں دنیا جہان کی برائیاں شمار کر دی ہیں جن کی وجہ سے گھر کا ہر فرد ان سے نفرت کرتا تھا ماں کہتی تھی " میں نے سانپ جنا " اور عصمت بہن ہو کر چاہتی تھیں کہ " یہ جلد مر چکیں " - اور بھائی کے مرنے کے بعد اسے " دوزخی " سے موسوم کیا ، مگر یہ ساری بھیانک برائیاں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ قاری عظیم بیگ پر ترس کھائیں ، اس سے ہمدردی کا اظہار کریں اور قابلِ رحم سمجھیں[1] - لیکن بقول امجد کندیانی " سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کی ہر کمزوری کو یوں ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا جائے ، تو اس سے فن کی توشاید خدمت ہو جائے ، مگر اصابت کے چہرے پر تو کالک پھر جاتی ہے - میں نے بار بار اس خاکے کو پڑھا اور عظیم بیگ صاحب کی تمام مفسدانہ کارروائیوں حتیٰ کہ آخری دنوں میں گھر والوں کو لڑانے بھڑانے اور اس پر خوش ہونے کی صرف ایک وجہِ جواز کا سراغ لگا سکا اور وہ یہ کہ وہ کمزور جسم لے کر پیدا ہوئے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اگر فطرت کسی شخص کو جسمانی صحت اور حسنِ صورت کی دولت دینے میں فیاضی سے کام نہ لے تو وہ خیر کی ہر قدر کا منکر ہو جائے اور نیکی کے تمام اصولوں سے بغاوت کر دے بلا شبہ خاکہ نگار کسی شخصیت کے عیوب کو بھی ہمدردانہ نظروں سے دیکھتا ہے مگر ہمدردی ایسی تو نہ ہو کہ شخصیت کا تاثر ہی معکوس و مجروح ہو جائے"[2] -

مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲-۱۹۵۵ء) کے شخصی خاکوں کے تین مجموعے گنجے فرشتے (۱۹۵۲) ، لاوڈ اسپیکر (۱۹۵۵ء) اور فلمی شخصیتیں (۱۹۵۶ء) یکے بعد دیگرے شائع ہوئے جن میں مصنف نے ادبی ، فلمی اور سیاسی دنیا کی مشہور شخصیات کو موضوع بنایا ہے بلکہ بقول منٹو " گنجے فرشتے " میں " جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے "[3] -

---

۱-۲- امجد کندیانی ، اردو میں خاکہ نگاری - نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء ، ص ۲۳۲

۳- دیباچہ گنجے فرشتے - البیان لاہور - ۱۹۷۶ء

منٹو بدنامی کی حد تک منہ پھٹ اور بے باک افسانہ نگار ہے - اس کے ہاں کھردری قسم کی صدق بیانی عام ہے اور اس خصوصیت نے خاکہ نگاری کو بھی بے رحم حقیقت نگاری کی روش پر ڈال دیا ہے - وہ کسی کا لحاظ کرتا ہے نہ بڑی سے بڑی بُرائی کی پردہ پوشی کی کوشش کرتا ہے نتیجہ یہ کہ اس کے ہاں تصویری خاکے شوخ اور عریاں ہیں بقول ڈاکٹر انور سدید منٹو شاید واحد خاکہ نگار ہے جو شخصیت کے سحر کو قبول نہیں کرتے بلکہ شخصیت خود ان کے سامنے سہمی سہمی اور زبان بستہ نظر آتی ہے -[۱] چنانچہ اس کا یہ اسلوب اپنی حدوں کو پھلانگتا ہوا نظر آتا ہے اور وہ قائد اعظم محمد علی جناح تک کو نہیں بخشتا - ان کے خاکے میں بھی منفی انداز صاف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے -

۱۹۶۲ء میں شاہد احمد دہلوی (۱۹۰۶ - ۱۹۶۷) کے خاکوں کا مجموعہ " گنجینۂ گوہر" منظر عام پر آیا - اس میں سترہ خاکے ہیں جن میں شاہد کی انفرادیت صاف نظر آتی ہے - خصوصاً ان کا اسلوب انہیں دوسرے خاکہ نگاروں سے الگ کر دیتا ہے - موصوف ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے ہیں اور اس حوالے سے انہوں نے کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی وہ زبان لکھی ہے جو روزمرہ کی بول چال کے قریب ہے ، جس میں محاوروں کا استعمال بڑا برمحل ہے اور فقرے غیر معمولی دلکش روانی کے حامل ہیں - متانت اور وقار ان کے اسلوب کا ایک لازمی جزو ہے اور ہر سُو بے تکلفی کی ایک خوشگوار فضا نظر آتی ہے -

شاہد احمد دہلوی کی خاص خوبی فنِ چہرہ نویسی پر ان کی قدرت ہے - انہوں نے کم سے کم الفاظ میں تمامتر جزئیات سمیت اتنی مہارت سے چہرہ نویسی کی ہے کہ ایک زندہ و متحرک شخصیت سامنے آ جاتی ہے - چنانچہ جگر مراد آبادی، میر ناصر علی ، بیخود دہلوی ، خواجہ حسن نظامی ، میراجی ، مرزا محمد سعید اور جمیل جالبی کے خاکوں میں یہ خصوصیت عام دکھائی دیتی ہے -

شاہد احمد دہلوی کے بعد خاکہ نگاری کے حوالے سے متعدد نام آتے ہیں جو قابلِ ذکر ہیں- صالحہ عابد حسین نے " جانے والوں کی یاد آتی ہے " میں بعض بڑے خوبصورت خاکے لکھے ہیں - خصوصاً خواجہ الطاف حسین حالی اور خواجہ سجاد حسین کے خاکے بڑے دلچسپ اور روح پرور ہیں - موصوفہ

۱- نقوش دسمبر ۱۹۷۰ء ، ص ۲۷۱

نے بالعموم اعلی انسانی قدروں کی عکاسی کی ہے - وہ کمزوریوں اور خامیوں سے درگزر کرتی ہیں - اسلوب ان کا دلچسپ ہے - ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خاکوں پر مشتمل دو کتابیں شائع ہوئیں (آوارگانِ عشق اور" نوردانِ شوق) "آوارگانِ عشق" میں مجاز ، میرا جی ، ناصر کاظمی کے اور "رہ نوردانِ شوق" میں جگر مراد آبادی کے خاکے قابل مطالعہ ہیں اور ان حضرات کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کمزوریاں اور خامیاں بھی نظر آتی ہیں - سید صباح الدین عبدالرحمٰن (بزمِ رفتگاں حصہ اول) کے خاکے عقیدت و احترام کا انداز لئے ہوئے ہیں - تاہم اس میں مولانا عبدالسلام ندوی کا خاکہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس میں مولانا کی طبعی کمزوریوں اور مزاج کے تضادات کا بھی اندازہ ہوتا ہے -

مشہور عالمِ دین ، مفکر اور مبلغ و مصنّف مولانا ابو الحسن علی ندوی نے بھی "پرانے چراغ" کے عنوان سے دو جلدوں پر مشتمل خاکے قلم بند کئے ہیں - یہ خاکے اپنے اسلوب کی بے ساختگی روانی اور اعلیٰ انسانی قدروں کے اظہار کے اعتبار سے ناقابل فراموش حیثیت کے حامل ہیں -

"نقوش" کے مدیر محمد طفیل بھی خاکہ نگاری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں - اس ضمن میں ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ "صاحب" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اور وفات (۱۹۸۵ء) تک ان کے آٹھ مجموعے صاحب ، آپ ، جناب ، محترم ، مکرّم ، معظم ، محبّی اور مخدومی کے عنوان سے شائع ہو چکے تھے جن میں مجموعی طور پر ایک سو سے زائد خاکے شامل ہیں -

محمد طفیل متواضع مزاج کے خستعلیق انسان تھے ، اس لئے ان کی خاکہ نگاری بھی اپنے اندر وقار اور تواضع کا خاص انداز رکھتی ہے - اپنے اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ "آپ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"اچھی باتیں تو سب کے منہ سے اچھی لگتی ہیں ، بُری باتوں کو اچھے انداز میں کہہ دینا بھی تو فن کہلاتا ہے" -[۱]

اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں :

۱- دیباچہ "آپ" ادارہ فروغ اردو ۱۹٦۷ء ، ص ۱۵

" صرف عیب جوئی شخصیت نگاری نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے میرے نزدیک تو خوفِ خدا کے ساتھ فنکارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے " ۔[۱]

اپنے اسلوب کا تعارف یوں کرتے ہیں :

" میں نے چاہا ہے کہ عام بول چال اور بہت ہی سادہ سے اسلوب میں چہروں کی نقاب کشائی کرتا جاؤں " ۔[۲]

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ طفیل صاحب نے بہت ہی سادہ اسلوب میں عام بول چال کے انداز میں خاکہ نگاری کی ہے ۔ وہ احترام اور لحاظ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور خواہ مخواہ برائیوں کی تلاش میں پریشان نہیں ہوتے ۔ وہ واقعی خوفِ خدا کے ساتھ مگر فنکارانہ چابکدستی سے اپنی بات اس طرح کہتے ہیں کہ شگفتہ لہجے میں ہنستے مسکراتے سب کچھ کہہ جاتے ہیں مگر حفظِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں ۔ ان کے ساتویں مجموعے میں ان کے بعض مخالفین کے خاکے بھی ہیں ، مگر ڈاکٹر خواجہ زکریا کے بقول وہ بھی بڑے متوازن ہیں ۔[۳]

عہد حاضر میں یوں تو بہت سے لوگوں نے خاکے لکھے ہیں جن میں ضمیر جعفری ، میرزا ادیب ، ممتاز مفتی اور عطاء الحق قاسمی قابل ذکر ہیں لیکن مشہور صحافی اور حریت کراچی کے کالم نویس نصر اللہ خان کے خاکوں کا مجموعہ " کیا قافلہ جاتا ہے " خصوصی توجہ کا مستحق ہے ۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اور اس میں چھوٹے بڑے ۵۲ خاکے شامل ہیں جن میں علماء ، سیاست دان ، ادیب ، صحافی اور موسیقار سب شامل ہیں ۔ مصنف اگرچہ بنیادی طور پر صحافی ہے ، مگر ان کا انداز صحافتی نہیں بلکہ خالص ادبی ہے اور ان کی خوبصورت انشاء میں مختلف شخصیات جیتی جاگتی نظر آتی ہیں ۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے الفاظ میں " خان صاحب نے لفظوں سے مرقع کشی نہیں کی ، ان مرقعوں میں جان بھی ڈال دی ہے ۔ یہ کتاب اردو خاکہ نگاری میں ایک اہم اور زندہ رہنے والا اضافہ ہے " ۔[۴]

۱- آپ ، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۶۷ء ، ص ۱۵۹

۲- دیباچہ صاحب ، ایضاً ۔

۳- " محبی " نقوش عصری ادب نمبر ستمبر ۱۹۸۲ء ، ص ۸۵۸ ۔

۴- کیا قافلہ جاتا ہے ۔ نصر اللہ خاں ۔ مکتبہ اسلوب کراچی ۔ (فلیپ)

ماہر القادری کی خاکہ نگاری :

ان معروضات کی روشنی میں ماہر القادری کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیا جاتا ہے -

ماہر القادری خاکہ نگاری سے گہری قلبی مناسبت رکھتے ہیں اور ان کے ہاں شخصیات کا غیر معمولی تنوع اور پھیلاؤ ملتا ہے - چنانچہ " یارِ رفتگاں " میں ان شخصیات کو موضوع بنایا گیا جو یا تو کسی نہ کسی اعتبار سے ممتاز اور نمایاں حیثیت کی حامل تھیں یا معروف و مشہور تو نہ تھیں ، لیکن سیرت و کردار کے لحاظ سے اس قابل تھیں کہ ماہر نے ان کا ذکر محفوظ کر لیا - ثالثاً مصنف نے ایسے حضرات کو منتخب کیا ہے جن سے اس کا براہ راست تعارف و تعلق تھا - ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن سے مصنف کی گہری دوستی تھی اور ایسے بھی جن سے محض رسمی تعلقات تھے اور وہ بھی جن سے شدید نظریاتی اختلاف تھا مثلاً سید سجاد ظہیر اور مخدوم محی الدین - اس سلسلے میں ماہر نے مسلک و مشرب کو آڑے نہیں آنے دیا - اصل میں ماہر القادری کے پیش نظر محض چند شخصیات کو نمایاں کرنا نہ تھا بلکہ ان کے حوالے سے اعلٰی انسانی اقدار کو عام کرنا تھا - چنانچہ اگرچہ ماہر کے خاکوں میں بعض حضرات کی بشری کمزوریوں کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں ، مگر مجموعی اعتبار سے " یارِ رفتگاں " میں بہترین انسانی قدروں کا ذکر عام ملتا ہے - اخلاص و شرافت اور دردمندی ، دوست داری ، دیانت داری ، سادگی ، بے نفسی ، للّٰہیت ، طبیعت و شائستگی ، استقلال و حوصلہ مندی ، محبت و شفقت ، حلم و وقار ، اور تدبر و توازن کی مثالیں افراط سے ملتی ہیں -

ماہر القادری بنیادی طور پر ایک دیندار انسان تھے، اس لئے ان کے ہاں خاکہ نگاری ادب بھی ہے اور عبرت بھی - انہوں نے اس حوالے سے بالواسطہ طور پر نیکی کی تبلیغ بھی کی ہے اور بدی سے بیزاری کا اعلان بھی کیا ہے - چنانچہ ان کے خاکوں میں کمزوریوں پر بے جا زور نہیں دیا گیا نہ اچھائیوں کے اظہار میں مبالغے یا غلو سے کام لیا گیا ہے - انصاف اور توازن ماہر القادری کی خاکہ نگاری کا نمایاں وصف ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں سے بھی انصاف کیا گیا ہے جن سے مصنف کا شدید اختلاف تھا یا جن سے اُسے سخت ذہنی تکلیف پہنچی تھی -

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے اپریل ۱۹۵۱ء سے ماہر القادری نے خاکہ نگاری کا آغاز کیا - پہلی قسط میں شعر و ادب کی سات معروف شخصیات کے خاکے ہیں جن میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی مرحوم کے علاوہ سر شیخ عبدالقادر ،سیماب اکبر آبادی ، صفی لکھنوی ، مولانا تاجور نجیب آبادی ، ابو العلا ناطق لکھنوی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل ہیں - یہ بظاہر تعزیت نامے ہیں جن میں ماہر نے اپنے تعارف اور یادوں کے حوالے سے مرحومین کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس کا اظہار انہوں نے تمہید اور افتتاح کے طور پر یوں کیا ہے :

" اس مضمون کا عنوان[1] ہی بتا رہا ہے کہ یہ ایک نالۂ غم اور داستانِ حزن و ملال ہے - ایک ہی سانس میں کتنی ہی آہیں اور بہت سے نالے کر رہا ہوں - کیا بتاؤں کہ دل کا کیا حال ہو رہا ہے ؟ "[2] -

مگر یہ مضامین محض روکھے پھیکے رسمی انداز کے تعزیت نامے نہیں ہیں اور نہ ان پر نوحہ گری کا انداز طاری ہے جیسا کہ سطورِ بالا سے تاثر ملتا ہے ، بلکہ مصنف کے حافظے میں مرحومین کی جتنی یادیں بھی محفوظ ہیں اور وہ جس قدر ثقہ معلومات رکھتا ہے ، وہ بامعنی تاثر کے ساتھ قلم بند کر دی ہیں اور یوں یہ مضامین متعلقہ شخصیات کی جیتی جاگتی تصاویر اور زندہ مرقع بن گئے ہیں - اس کی وضاحت اسی تمہید میں ماہر صاحب نے یوں کی ہے :

" دوستوں ، عزیزوں ، کرم فرماؤں اور مشاہیر کی رحلت پر جس انداز میں اظہارِ غم کیا جاتا ہے ، یہ داستان اس سے کچھ مختلف ہے - میں نے جان کر شخصی تعلقات اور ذاتی تعارف کا ذکر کیا ہے تاکہ سوانح نگار ان سے کام لے سکیں "[3] -

مگر ذاتی تعلقات اور تعارف کے باوجود یہ امر خوشگوار ہے کہ ماہر نے فن کے تقاضوں کو مجروح نہیں ہونے دیا اور اگرچہ ان شخصیات کے مطالعے سے ایک طرف قیمتی اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں جو عبرت و موعظت ، حکمت و دانش ، سعیٔ پیہم اور اخلاقِ فاضلہ کا تاثر چھوڑتی ہیں ، مگر ساتھ ہی بعض حضرات کی کمزوریاں بھی شائستہ انداز میں بیان کر دی گئی ہیں - مثال کے طور پر

۱- یعنی " یادِ رفتگاں " - ۲- فاران اپریل ۱۹۵۱ء ص ۲۵

۳- فاران اپریل ۱۹۵۱ء ، ص ۲۵

جہاں علامہ سیماب اکبر آبادی کے کمالات و فضائل کی خوب تحسین کی ہے ، وہاں ان کے کردار کے ایک تضاد کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :

" اب سے کوئی سات سال پہلے کی بات ہے - صابر صاحب دہلوی کی لڑکی کی شادی تھی - حضرت سیماب بھی اس تقریب میں شریک تھے - فلم کمپنیوں کا ذکر چھڑ گیا - حضرت سیماب نے فرمایا کہ فلم انڈسٹری میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے - میں نے ایک اسٹوری مرتب کی ہے اور اس کے مکالمے اور گانے بھی خود ہی لکھے ہیں - اس سلسلے میں فلمی گانوں کی دھنوں کا بھی ذکر آیا - مجھ سے نہ رہا گیا - میں نے کہا مولانا فلمی لائن سے تعلق آپ کو زیبا نہیں - یہ آپ کے رتبہ سے فرو تر ہے - میں خود اس لغزش میں مبتلا رہ چکا ہوں اور اس حماقت پر آج تک متاسف ہوں - حضرت سیماب نے میری بات کا برا نہیں مانا بلکہ کچھ سوچ میں پڑ گئے "[1] -

اسی طرح خود اپنی طبیعت کی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی - ابو العلا ناطق لکھنوی کی طرحِ غزل کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" میں نے بھی طرح میں غزل کہی تھی ، مگر ناطق کے شعروں کے بعد اپنی غزل کے اشعار پیش کر کے اربابِ ذوق کو بےمزہ کرنا نہیں چاہتا "[2] -

اپنی طبیعت کی ایک اور خامی کا اظہار یوں کرتے ہیں :

" نئی جگہ کا پتہ لگانا میرے لئے بڑا دشوار ہے - طبیعت میں کچھ کیا جھجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے - لوگوں سے پتہ پوچھتے ہوئے شرم سی آتی ہے - پہلے اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کی رہنمائی کا احسان لئے بغیر ہی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں اور جب اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوتی تو راہِ سخن وا کرنی ہی پڑتی ہے "[3] -

ان ابتدائی خاکوں میں بعض مقامات پر سراپا نگاری بڑی کامیابی سے کی گئی ہے جس سے تاثر میں شدت پیدا ہو گئی ہے - مثال کے طور پر مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے ضمن میں لکھتے ہیں :

۱- فاران اپریل ۱۹۵۱ء ، ص ۳۲-

۲- ایضاً - ص ۲۸

۳- ایضاً - ص ۳۰

" وہ ان کا رنگین عمامہ ، جامہ دار کی اچکن اس پر جڑاؤ ہیرا ، شرعی پاجامہ کسے پائینچوں پر بیل لگی ہوئی ، پھول دار جوتہ ، سرخ و سفید رنگت ، خوبصورت ناک نقشہ اور پھبن کے ساتھ وجاہت بھی اور سب سے بڑھ کر خاندانی شرافت اور علمی وقار جو سر سے پیر تک چھایا ہوا تھا ۔۔ دیکھنے والوں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ جس کا چہرہ اس قدر روشن اور تابناک ہے اس کا دل نہ جانے کیا ہوگا ؟ " ۔[1]

بقول ڈاکٹر تحسین فراقی " کامیاب خاکے کے لئے سراپا نگاری ویسی ہی ضروری ہے جیسے کامیاب غزل کے لئے توانا مطلع " ۔[2] اس اعتبار سے دیکھیں اور انصاف ، توازن ، اخلاص اور انسانی کمزوریوں کے دردمندانہ اظہار اور خود اپنی طبعی خامیوں کے اعتراف کو سامنے رکھیں اور اس بھرپور تاثر کو پیش نظر رکھیں جو ان " مضامین " کے مطالعے سے دل و دماغ قبول کرتا ہے ، تو پتہ چلتا ہے کہ یہ مضامین محض سیدھے سادے تعزیت نامے نہیں ہیں ، بلکہ خاکہ نگاری کے فنی لوازمات کو خاصی حد تک پورا کرتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ سات میں سے کم از کم تین خاکے (صفی لکھنوی ، تاجور نجیب آبادی اور ڈاکٹر تاثیر) اپنے اختصار کے اعتبار سے تشنہ ہیں اور اس کا سبب شاید یہ ہے کہ انہوں نے اپنے خاکوں میں " شہدہ " کے بجائے " دیدہ " کو بنیاد بنایا ہے ۔ مگر پھر بھی ان مختصر خاکوں میں بھرپور فنی خوبیاں نظر آتی ہیں ۔ ڈاکٹر تاثیر کے تعارف میں خیر خواہی ، حقیقت نگاری ، خلوص اور جامعیّت کا خوبصورت نمونہ نظر آتا ہے ، لکھتے ہیں :

" ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا ۔ طبیعت بہت ذہین اور اخّاذ پائی تھی ۔ نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے ۔ جس محفل میں بیٹھتے ، چٹکلوں اور لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ کر بزم کو باغ و بہار بنا دیتے ۔ وہ ایک اچھے مقرر ، شگفتہ نگار انشا پرداز اور خوش بیان شاعر تھے ۔ لاہور میں ان کے دم سے شعر و ادب کی چہل پہل تھی ۔ چند دن تک وہ نام نہاد " ترقی پسندی " سے بھی متاثر رہے ، مگر پھر غالب و اقبال کی راہ پر آ گئے ، لیکن کبھی کبھار اس بجھی ہوئی آگ کی ایک آدھ چنگاری ابھر آتی ۔ غزل میں ایسے ایسے جاندار اور معرکے کے شعر کہے ہیں ۔۔۔۔۔ "

١۔ فاران اپریل ١٩٥١ء ، ص ٢٥

٢۔ مقالہ پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی احوال و آثار ۔ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ١٩٨٥ء ص ٢٧٠ ۔ ١٩٨٥ء

داورِ حشر ! میرا نامۂ اعمال نہ دیکھ —،
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں [1] " —

غرض ماہر القادری نے ۱۹۰ شخصیات کو موضوعِ قلم بنایا ہے — جن میں سے ۳۲ مضامین ایک ایک دو دو صفحات پر مشتمل ہیں اور متعلقہ شخصیات کا ادھورا ، نامکمل تعارف پیش کرتے ہیں ، مگر بقیہ ۱۵۷ خاکے بھرپور اور مکمل ہیں — ان میں سے ۳۹ مضامین ۶ صفحات سے ۱۳ اور ۱۵ صفحات پر محیط ہیں — (جگر مراد آبادی کا خاکہ ۲۵ ، نظام دکن کا ۲۲ ، اور نیاز فتح پوری کا خاکہ ۲۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے) —

جگر مراد آبادی والے خاکے کی تمہید میں ماہر لکھتے ہیں :

" بہت سے لوگ شخصیتوں اور سیرتوں کے قریب سے سرسری گزر جاتے ہیں — کوئی عقیدت کے جذبات میں گم ہوکررہ جاتا ہے ، کسی کی نگاہ صرف " محاسن نگر " ہوتی ہے اور کوئی عیب بین ہوتا ہے — کرداروں کا مطالعہ کرنے کی یہ دونوں انتہائیں غلط ہیں — نگاہ وہ معتبر ہے جو تصویر کے دونوں رخ دیکھ سکے — آئینہ کی طرح ، جو وہی بتاتا ہے ، جو کچھ وہ دیکھتا ہے ، اسی لئے تو کسی آزمودہ کار شاعر نے نصیحت کی ہے —

آنکھ آئینہ کی پیدا کر ، دھن تصویر کا [2] " —

اور یہ امر خوشگوار ہے کہ ماہر القادری نے اپنی خاکہ نگاری میں اس معیار کو قائم رکھا ہے چنانچہ ان کے خاکوں کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ مصنّف نے مختلف شخصیات کے ضمن میں اعتدال توازن ، دیانت اور انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے اور جہاں مزاج اور عمومی روّیے کی خوبیاں بیان کی ہیں ، وہاں بعض خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندھی بھی کی ہے — ذیل میں اس سلسلے کی چند مثالیں دی جاتی ہیں :

" علامہ تمنا عمادی علم و فضل کا سمندر تھے — ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ دورِ حاضر میں اس قدر کثیر المطالعہ علماء خال خال ہی ہوں گے — وسیع الاطراف جامع شخصیت — تجوید کے فن سے عام طور پر بڑے بڑے علماءِ دین واقف نہیں ہوتے ، مگر علامہ

۱— فاران اپریل ۱۹۵۱ء ، ص ۳۶

۲— یاد رفتگاں حصہ دوم — ص ۲۵۵

تمنّا اس فن میں بھی درک رکھتے تھے ۔ شعر و سخن اور فنِ عروض میں انہیں استادی کا مرتبہ حاصل تھا ۔ آخر عمر میں ہزاروں صفحے قدیم مطالعہ ، یاد داشت اور حافظہ کی مدد سے لکھ ڈالے ۔ لکھنا اور مسلسل لکھنا ان کی زندگی تھی ۔ تحریر و انشا ہی رات دن کا مشغلہ تھا بلکہ یوں کہئے کہ اسی شغف ، جذبے اور شوق و مشغولیت کے سہارے جی رہے تھے " ۔[۱]

تعریف و تحسین کے ساتھ ساتھ ماہر صاحب مولانا موصوف کی فکر کا ایک کمزور پہلو بھی دکھا دیتے ہیں کہ وہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو " امّی " نہیں بلکہ خواندہ (لکھا پڑھا) سمجھتے تھے اور اس پر انہیں اس قدر اصرار تھا کہ باقاعدہ ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی ۔ ماہر صاحب نے اس موقف کے ردّ میں بڑے دلائل دیئے ، مگر مولانا عمادی اپنی ہٹ پر قائم رہے اور اپنے خیال و فکر کے درست ہونے پر اصرار کیا ۔[۲] اسی طرح موصوف نے سات ہزار اشعار پر مشتمل ایک کتاب " العقدۃ الزھرا " شائع کی جس میں انہوں نے سیدنا علی مرتضیٰ کے مقابلے میں امیر معاویہ کو برسر حق قرار دیا اور مروان و یزید کی تعریف کی ۔ ماہر صاحب اس روش کو مولانا کا " مکروہ تشدد " قرار دیتے ہیں ۔[۳] لیکن اس کے باوجود اخیر میں مولانا کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں :

> " علامہ تمنا عمادی مرحوم اسلام اور ملّت کی خیر خواہی کا بڑا شدید جذبہ رکھتے تھے ۔ دین ان کی گھٹی میں پڑا تھا ۔ نماز میں " اللّٰہ اکبر " بڑے ہی سوز و درد کے لہجہ میں ان کے منہ سے نکلتا " ۔[۴]

مولانا حسرت موہانی کے سلسلے میں بھی ماہر القادری کا روّیہ اعتدال و انصاف پر مبنی ہے ۔ وہ موصوف کا بھرپور تعارف کراتے ہیں ، ان کی درویشی ، انکساری اور مجاہدانہ کردار کی تعریف کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی فکری و عملی لغزشوں کی طرف اشارہ بھی کر دیتے ہیں :

۱۔ یاد رفتگان جلد اول ۔ ص ۱۳۸
۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۹
۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۴۰
۴۔ ایضاً ۔ ص ۱۴۱

" مولانا حسرت موہانی مرحوم سے بھر نیاز حاصل ہوتا ہی رہا - سیاسی جلسوں میں ، مشاعروں میں ، دعوتوں اور پارٹیوں میں ، ایک بار ان کے ساتھ ہم سفری کا موقعہ بھی میسر آ گیا - میں دہلی سے حیدر آباد جا رہا تھا - مولانا مرحوم کانپور سے آ رہے تھے جھانسی کے ریلوے جنکشن پر وہ اسی ڈبے میں اتفاق سے سوار ہو گئے جس میں راقم الحروف بھی بیٹھا تھا - سید حسن ریاض صاحب ان کے ساتھ تھے - ان کے اسبابِ سفر کا حال بھی لگے ہاتھوں سن لیجئے - ٹین کا چھوٹا سا بکس تھا جس میں کپڑوں کے دو جوڑے رکھے تھے - معمولی لٹھے کے دو پاجامے ، گھٹیا قسم کی ململ کے دو کُرتے جن پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں - میرے خیال میں یہ کپڑے گھر ہی میں ہاتھ کے دھلے ہوئے تھے - پانچ چھ پیسہ والا لکڑی کا کنگھا ، سرمہ دانی ، چند کتابیں اور بستر ، شکستہ دری ، ایک تکیہ اور بہت ہی فرسودہ کمبل - یہ تھی " شہنشاہِ متغزلین " کے سفر کی کل کائنات -[1]

مزید لکھتے ہیں :

" مولانا حسرت کی قومی اور سیاسی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں - انہوں نے اس وقت انگریزی سامراج کے خلاف عَلمِ احتجاج بلند کیا ہے جبکہ ایک برص زدہ " ٹامی " کو دیکھ کر اچھے اچھوں کے حواس باختہ ہو جاتے تھے - " انگریز دشمنی " حسرت کی گھٹی میں پڑی تھی - وہ اس زمانے میں جیل میں گئے ہیں جبکہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر خس خانوں اور شبستانوں میں رہا کرتے تھے - حسرت اپنی جگہ کوہ وقار و ثبات تھے ، کسی قیمت پر وہ خریدے نہیں جا سکتے تھے[2]

مگر اسی مضمون میں ماہر نے لکھا ہے کہ مولانا کو انہوں نے حیدر آباد کے ایک ادبی جلسہ میں مدعو کیا ، انہوں نے دعوت قبول بھی فرما لی مگر اپنی صدارتی تقریر میں بغیر کسی لحاظ یا مروت کے برملا کہا کہ ماہر القادری نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی ، مگر میں ان کے خیالات سے متفق نہیں ہوں - وہ ہوسناک شاعری کی مخالفت کرتے ہیں ، مگر میں کہتا ہوں ---------- شعر و ادب میں ہوس کو لاؤ ، ہوس کو لاؤ - اس تقریر میں انہوں نے اپنی شاعری کو فاسقانہ شاعری قرار دیا

۱- یاد رفتگان جلد اول - ص ۱۶۵ ، ۱۶۶

۲- ایضاً - ص ۱۷۰

اور اس کی پُرزور وکالت کی - یہی نہیں بلکہ تقریر کے جوش میں خدا کے بارے میں بھی ناگفتنی باتیں کہہ گئے - [1]

ماہر اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ مولانا حسرت موہانی کمونزم سے خاصے متاثر تھے اور اس مسئلہ میں کسی کی بھی نہ سنتے تھے -[2] اس کے ساتھ ہی وہ عرس ، فاتحہ اور قوالی وغیرہ کے بھی شوقین تھے جبکہ عملاً ان کی پہلی بیگم پردہ نہ کرتی تھیں - چہرہ کھلا رکھتی تھیں-[3]

مشہور صوفی خواجہ حسن نظامی کے فکر و عمل کے بعض پہلوؤں سے ماہر کو شدید اختلاف تھا ، مگر ان کے خاکے میں بھی انہوں نے دیانت اور انصاف کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور جہاں ان کی خامیوں کی طرف اشارے کئے ہیں ، وہاں ان کی خوبیوں کا بھی کُھلے دل سے اعتراف کیا ہے - چند اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

" خواجہ صاحب مرحوم نے بڑی ملنسار طبیعت پائی تھی - ہر عقیدے ، ہر مزاج اور ہر حیثیت کے آدمی کو خوش رکھنے کا فن ان کو اتنا آتا تھا کہ شاید ہی کسی کو آتا ہو " -[4]

" خواجہ صاحب پروپیگنڈے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ید طولیٰ سے بھی ان کے اس وصف کی صحیح تعریف نہیں ہوتی - ہندوستان میں کوئی اس فن میں مشکل ہی سے ان کا مقابلہ کر سکتا تھا - اپنی ذات کو کس کس عنوان سے نمایاں کیا جاتا ہے ، اس منزل میں کوئی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا - حیدرآباد دکن میں ایک شخص دیوانہ نظامی خواجہ صاحب کا مرید تھا - شاعر کیا ُتک بند تھا اور یہ ُتک بندی بھی بحر اور وزن سے بے نیاز ہوتی - خواجہ صاحب کی تعریف میں وہ الفاظ جوڑ لیتا تو ان ُتک بندیوں کو خواجہ صاحب اپنے روزنامچے میں چھاپ دیتے " -[5]

۱- یاد رفتگاں جلد اول - ص ۱۶۹
۲- یاد رفتگاں جلد اول - ص ۱۷۱
۳- ایضاً - ص ۱۷۱
۴- ایضاً - ص ۱۸۳
۵- ایضاً - ص ۱۸۷

" ضرورت مندون اور پریشان حالون کی افسرون اور عہدیدارون کے یہان سعی سفارش کرنے مین خواجہ صاحب بڑی فراخدلی سے کام لیتے اور ہمدردی کا جذبہ ان کی شخصیت کے احساس پر غالب آ جاتا ۔ SELF MADE کی تعریف خواجہ حسن نظامی کی ذات پر بڑی طرح صادق آتی ہے ۔ شہرت ، عزت اور دولت کی اتنی ترقی اور وہ بھی اپنی ذہانت اور محنت سے حاصل کی ہوئی ترقی ،کم ہی دیکھنے اور سننے مین آئی ہے ۔ ایک وہ دَور بھی ان پر گزرا ہے کہ نظام الدین سے دلّی پیدل آتے تھے ۔ نان بائی کے یہان آٹا دے کر روٹیان پکوائین ، کھایا پیا اور سرھانے تکیہ کی جگہ پتھر رکھا اور سو گئے ۔۔۔ پھر وہ زمانہ بھی آ گیا کہ ان کے گھر کا خرچ تین چار ہزار روپیے ماہوار سے کم نہ تھا ۔ روپیے کی تو ان پر سچ مچ بارش ہوتی تھی ۔ ملاّ واحدی صاحب اس کے راوی ہین کہ ایک بار خواجہ صاحب ، جہانگیر آباد کے راجہ نوشاد علی خان اور وہ حضرت سلطان جی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گئے ۔ فاتحہ پڑھ کر واپس ہوئے تو دروازے پر جوتون کی حفاظت کرنے والے کو کچھ دینے کے لئے خواجہ صاحب نے جیب مین ہاتھ ڈالا ۔ اتفاق سے اشرفی ہاتھ مین آ گئی اور خواجہ صاحب نے وہی اشرفی جوتے والے کو دے دی ۔ اس پر خواجہ صاحب نے کہا کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ مین بھی اسی طرح درگاہ شریف کے دروازے پر زائرین کی جوتیون کی رکھوالی کر کے چند پیسے کما لیا کرتا تھا اور اب اللہ تعالیٰ کی دین کا یہ حال ہے کہ مین ایک اشرفی جوتے والے کو انعام مین دے سکتا ہون " ۔[۱]

لیکن اس کے ساتھ ہی ماہر کے ہان خواجہ صاحب کی شخصیت کے یہ پہلو بھی نظر آتے ہین:

" خواجہ صاحب پکے صوفی تھے اور اس مسلک و مشرب کے تمام ظاہری لوازم و رسوم کے حامل اور عامل تھے ۔ بدعات کے معاملہ مین اتنے بڑھے ہوئے کہ سجدۂ تعظیمی کے جواز مین ایک رسالہ تصنیف کر دیا اور سب سے زیادہ عجیب تر یہ کہ ہندوؤں کو مرید کرتے تھے ۔"[۲]

*

مشہور صحافی ، شاعر اور ادیب آغا شورش کاشمیری کی جراتٔ مندی، قادر الکلامی اور حق و صداقت کی حمایت مین ان کی مساعی کی ماہر نے کُھلے دل سے تحسین کی ہے ، مگر اس کے ساتھ ہی

۱- یاد رفتگان - جلد اول ص ۱۹۰

۲- ایضاً - ص ۱۸۶

انہون نے متعدد مثالین دی ہین کہ آغا صاحب کے مزاج مین خاصا تلوّن تھا - وہ معمولی بات پر مشتعل ہو جاتے اور الزام تراشی بلکہ گالی گلوچ پر اتر آتے تھے - ماہر مولانا ابو الکلام آزاد کے نکتہ چین تھے اس پر ناراض ہو کر آغا صاحب نے چٹان مین یہان تک لکھ دیا کہ " ماہر القادری کا نسبی تعلق اودھ کے معزول فرمانروا واجد علی شاہ کی ایک منتوعہ حرم سے ہے " — مگر اس کے باوجود ماہر نے ان کی شخصیت پر مفصل مضمون قلم بند کیا اور ان کے کردار کی خوبیون کی جی بھر کر تعریف کی -[1]

اس سے ماہر کی وسعتِ قلبی اور حوصلہ مندی کا اندازہ ہوتا ہے -

ماہر کے خاکون مین مزید متعدد مثالین دی جا سکتی ہین کہ مخالفین پر لکھتے ہوئے بھی انہون نے غیر جانبداری اور انصاف پسندی کو برقرار رکھا ہے - مولانا عبدالماجد دریا بادی ، مولانا یوسف بنوری ، نیاز فتح پوری اور مشہور کمیونسٹ ادیب اور سیاست دان سید سجاد ظہیر سے ان کے شدید نظریاتی اختلافات تھے ، مگر ان پر لکھتے ہوئے ان کی خوبیون کو سراہنے مین انہون نے بخل سے کام نہین لیا - خصوصاً سجاد ظہیر کے وہ ہمیشہ ہی مخالف رہے ، مگر ان کے بارے مین لکھتے ہین :

" سجاد ظہیر کسی وفد کے سلسلہ مین ماسکو گئے ہوئے تھے - وہین ان کا انتقال ہو گیا وہ بھی شیعہ گھرانے مین پیدا ہوئے تھے ، مگر کمیونزم کے بہت بڑے مبلّغ اور اس گروہ کے لیڈر تھے - بہرحال ان کی ادبی خدمات کا انکار نہین کیا جا سکتا - اردو زبان کے وہ شائق اور منجھے ہوئے ادیب تھے اور ان کی تحریرون مین خاصی جاذبیت اور ادبی تغزّل پایا جاتا تھا - کئی برس ہوئے بھارت کے کسی رسالہ مین ان کی ایک تصنیف کا اشتہار پڑھا کہ سجاد ظہیر صاحب نے حافظ شیرازی کی شاعری پر کتاب لکھی ہے - ان کے مر جانے سے بزمِ اردو مین جو جگہ خالی ہوئی ہے ، اس کا اردو سے محبت کرنے والون کو ملال ہے - لکھنؤ اور مشرقی تمدّن کی جھلک سجاد ظہیر کی زندگی مین پائی جاتی تھی - مین نے انہین کبھی کوٹ پتلون مین نہین دیکھا " -[2]

۱- یہ مضمون جلد اول کے ص ۳۲۸ سے ۳۴۰ تک یعنی تیرہ صفحات پر مشتمل ہے -

۲- یاد رفتگان - حصہ اول - ص ۲۷۰

مولانا عبدالماجد دریا بادی قادیانیوں کو غیر مسلم نہیں مانتے تھے ، اور اپنے اخبار میں ان کی تعریف و توصیف کرتے رہتے تھے - جبکہ دوسری جانب وہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے سخت نکتہ چیں تھے اور ان کی مذمت کے مواقع پیدا کرتے رہتے تھے - ماہر القادری موصوف کی اس روش سے سخت نالاں رہے اور " فاران " میں اس پر گرفت کرتے رہتے تھے - مولانا دریا بادی کی وفات پر ماہر نے ان کا خاکہ تحریر کیا ، تو اختلافات کی یہ ساری تفصیل رقم کر دی ، مگر انصاف ، غیر جانبداری اور توازن کا یہ عالم ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود کھلے دل سے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" مولانا عبدالماجد دریا بادی اردو زبان و ادب کے گنے چنے بلند پایہ اہل قلم میں ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے تھے - طنز نگاری کے بادشاہ ، زبان و روزمرہ کے مستند و معتبر استاد ، فلسفی ، صوفی ، مبلّغ اخلاق ، مفسّر ، نقّاد ، طنّاز ، ان کی شخصیت گوناں گوں کمالات کی جامع تھی - اشعار اور خاص طور سے مصرعوں کا اس قدر موزوں اور برجستہ استعمال اور کسی اہلِ قلم کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا - مغربی تہذیب و تمدّن پر طنز ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا - " سچ " اور " صدقِ جدید " میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے شذرے دراصل زبان و ادب کے شہ پارے ہیں - مغرب زدوں کی ایسی چٹکیاں لیتے کہ یہ گروہ سی سی کرتا اور تلملاتا ہوا رہ جاتا - راقم الحروف اس حقیقت کے اعتراف میں جھجک نہیں بلکہ فخر محسوس کرتا ہے کہ مولانا دریا بادی کی تحریروں اور کتابوں سے میں نے بھرپور استفادہ کیا ہے " -[۱]

نظامِ دکن میر عثمان علی خان پر ماہر کا خاکہ ۲۳ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے - جس میں حیدر آباد اور نظام دکن اپنی ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت زندہ و متحرک نظر آتے ہیں - یہ خاکہ شگفتگی ، دلچسپی اور بوقلموں معلومات کے اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے - اس میں نظام

۱- یادِ رفتگاں - جلد دوم - ص ۸۰

کی منفی اور مثبت دونوں تصویریں بڑی دیانت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں - پہلے منفی رخ کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے :

" روزنامہ " صبح دکن " میں نظام حیدر آباد کی غزلیں " استاد رائے جلیل " کے ساتھ چھپا کرتی تھیں ، نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل تلمیذو جانشینِ حضرت امیر مینائی ، اس انداز کے شعروں کو آخر کہاں تک درست کرتے :---ہ

کس کا یہ بوجھ تھا ، جس کو اٹھایا ہی ہے

رکھی کرسی ہے کہاں پوچھ لے تو میز سے بھی

اخباروں میں جو غزلیں شائع ہوتیں ، ان میں نظامِ دکن کے نزدیک جو مشکل اور ادق الفاظ ہوتے ، ان کے معنی بھی خود ہی درج فرما دیتے مثلاً " گل --- بہ معنی پھول " ایک بار " حنا " کے معنی " سرسون " لکھ مارے ! فارسی میں جو تک بندی فرماتے اس میں بعض اشعار کی شرح اور توصیف میں فارسی جملے لکھ دیتے - بعض خوشامدی حاشیہ نشینوں نے نظام حیدر آباد کو یہ باور کرایا کہ ایران کے اہلِ قلم سرکار کے فارسی اندازِ تحریر کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں - یہ لَے پھر یہاں تک بڑھ گئی کہ ان کے سامنے حافظ اور سعدی وغیرہ جیسے اکابر شعراء کا ذکر آتا تو "تابحدِخویش" ان کی زبان سے نکلتا ، مطلب یہ کہ شعراء بس اپنی وسعت و استطاعت کی حد تک خوب ہیں ، مگر ما بدولت ----- ! ؟ "[۱] -

-----

" نواب سالار جنگ بہادر کے یہاں مجلسِ عزا تھی - لکھنؤ کے مشہور بلکہ اپنے دور کے سب سے بڑے سوز خوان منجھو صاحب کو سوز پڑھنے کے لیے خاص طور سے بلایا گیا تھا ، راقم الحروف بھی منجھو صاحب کو سننے کے لیے وہاں پہنچا - جلسہ گاہ حاضرین سے کھچا کھچ بھری تھی اور حضور نظام کی تشریف آوری کا انتظار ہو رہا تھا اتنے میں پولیس کی سیٹیاں بجنی شروع ہوئیں اور سرکار تشریف لے آئے ، مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بھی اس مجلس میں موجود تھے ، ان کی نیاز مندی اور احترام و تعظیم کا یہ عالم تھا کہ جیسے رکوع کر رہے ہیں ، اور کچھ دیر میں سجدے میں گر پڑیں گے -

" مہاراجہ ، قریب آو ، قریب آو .... " نظام نے فرمایا -

۱- یاد رفتگان - جلد دوم - ص ۱۱۰

مہاراجہ بہادر صاحب ادب کے ساتھ ، سر جھکائے ہوئے قریب آ کر بیٹھ گئے ، زبانِ شاہ پھر یوں گویا ہوئی :-

" مہاراجہ پرانے چاول ہیں ، یہ میرے اشعار سمجھیں گے یہ (مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) عوام کالا نعام میری شاعری کو بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں "

اس کے بعد منجھو صاحب نے حضور نظام کا کہا ہوا تازہ ترین سلام سنایا اور سوز خوانی میں جتنا فن بھی ان کو آتا تھا وہ سارے کا سارا صرف کر دیا - اپنے ایک ایک مصرعہ پر نظام خود ہی لوٹ ہوئے جاتے تھے ، یہ غلط فہمی بھی تھی ، خود ستائی بھی اور خود فریبی بھی ، مگر کس کی مجال تھی جو بادشاہِ وقت کی شاعری پر زبانِ تنقید دراز کرتا ، راقم الحروف سے اگر وہ اپنی شاعری کے بارے میں رائے لیتے تو میری زبان سے بھی تعریف و توصیف ہی نکلتی یہ مضمون تو میں اس فضا میں لکھ رہا ہوں جہاں نظامِ دکن کی ذات کا کوئی خوف ہے اور نہ لالچ ہے ، ورنہ ...... ! ۱؎

نظام کی عجیب و غریب عادات اور مزاج کی ایک اور جھلک :

" نواب میر عثمان علی خان موزون طبع واقع ہوئے تھے اس لیے شاعری میں بہرحال کچھ نہ کچھ شُدبد تھی - مگر شاعری کی طرح فنِ طب میں بھی وہ خود کو " امام " سمجھتے تھے۔ شاعری اور طب کی سلطانی کا خطاب اور سپاسنامہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان کے متوسلین ، جاگیردار اور حکام اپنی بیماری ان سے چھپاتے - اگر کوئی قسمت کا مارا اپنی بیماری کا بھولے سے ذکر کر دیتا ، تو اس کے لئے نسخہ تجویز فرمایا جاتا اور وہ نسخہ اسے پینا پڑتا " ۲؎

اس کے ساتھ ہی ماہر نے نظامِ دکن کی ذاتی زندگی میں کارفرما بُخل کا بھی ذکر کیا ہے ان کے چھچھورے پن کی مزید مثالیں بھی دی ہیں اور عقاید کی سطحیت کو بھی واشگاف کیا ہے ، مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف ملّی و عوامی شعبوں میں نظام کی عظیم الشان خدمات کا کُھلے دل سے اعتراف کیا ہے لکھتے ہیں :

" میر عثمان علی خان — ہزاگزالٹیڈ ہائی نس اور برطانیہ کے یارِ وفادار تھے ، ان کی حیثیت نوابوں کی نہیں بادشاہوں جیسی تھی - والیانِ ریاست ان کو " سرکار اور

۱- یاد رفتگان جلد دوم - ص ۱۱۱

۲- ایضاً - ص ۱۱۱ ، ۱۱۲

حضور " کہہ کر خطاب کرتے ! راقم الحروف نے بہت قریب سے ہز مجسٹی غازی شاہِ عراق، شریف علی والئی حجاز، موجودہ شہنشاہِ ایران اور شاہ افغانستان کو دیکھا ہے مگر عثمان علی خان کے چہرے سے جو شاہانہ رعب نمایاں تھا، وہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا - مرحوم کو اگر اچھا ماحول اور سازگار فضا ملتی تو وہ مسلمانوں کے جہاد کے کارناموں کو دہرا دیتے - ان میں جرأت بھی تھی اور ساتھ ہی جوش و عزیمت اور دینی حمیت بھی ! مذہب سے انہیں غیر معمولی شغف تھا، باغِ عام کی مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد بے اختیار سجدے میں گر جاتے ! جمعہ کے دن قرأت سننا ان کے معمول میں داخل تھا - علمائے دین کے قدر شناس تھے - حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تقریر فرما رہے تھے، نظام اس جلسہ میں تشریف فرما تھے - مولانا نے کہا کہ یہ میر عثمان علی خان بادشاہِ وقت ہیں مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے جوتے کا تسمہ انہیں کہیں مل جائے تو یہ اسے اپنے سر کا تاج بنا لیں گے ! اس پر میر عثمان علی خان نے والہانہ انداز میں" بیشک مولانا، بیشک" فرمایا - اپنی والدہ کے احترام و مزاج داری میں انہوں نے ایک مثال قائم کر دی -

بڑے جفا کش واقع ہوئے تھے، ایک سو چار بخار ہے اور کام کر رہے ہیں، اپنا بستر جھاڑنا، تکیہ رکھنا اس قسم کے کام وہ خود کرتے، اردو کا خط صاف اور دیدہ زیب تھا، حرفوں پر احتیاط کے ساتھ نقطے لگاتے اور تحریر کو " مشکول " (PUNCTUATE) کرتے جاتے ! دماغ کی یکسوئی اور ذہن و فکر کی ترتیب کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف وائسرائے ہند سے خط و کتابت میں پیشی کے سیکرٹری کو مشورہ دے رہے ہیں، دوسری طرف کسی ملازم کا کوئی بچہ بیمار ہے، تو اس کی خیریت پوچھ کر اس کے لیے دوا تجویز فرما رہے ہیں -

انہی کے دور میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور اردو کو انتہائی عروج نصیب ہوا، نظام ساگر اور دوسرے تالاب اور بند تعمیر ہوئے - عثمانیہ دوا خانہ، ہائی کورٹ اور آصفیہ لائبریری کی خوبصورت عمارتیں بنیں، طبِ یونانی کو فروغ میسّر آیا - عہدِ عثمانی نے حقیقت میں علم پروری اور معارف نوازی میں غرناطہ اور بغداد کی یاد کو تازہ کر دیا تھا، ترقی و تعمیر کی یہ اسکیمیں کوئی شک نہیں عمّال حکومت ہی بناتے تھے، مگر ان کی منظوری کا دار و مدار تو " اعلیحضرت " ہی کی مرضی پر تھا - ان کی منظوری کے بعد یہ اسکیمیں کاغذ سے عملی دنیا میں منتقل ہوتی تھیں -

نواب میر عثمان علی خان مرحوم کی وفات پر مسلمانوں کی تاریخ کے ایک قابل ذکر باب کا خاتمہ ہو گیا — اللہ تعالی مغفرت فرمائے — "[۱]

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم سے ماہر کا بہت پرانا تعلق تھا جو حیدر آباد دکن سے شروع ہوا اور کراچی آ کر بھی قائم رہا — ماہر نے مولوی صاحب کی وفات (ستمبر ۱۹۶۱ء) پر ان کا طویل خاکہ قلم بند کیا (صفحات ۱۵) اور اردو زبان و ادب کے لئے مولوی صاحب کی خدمات کی خوب تحسین کی — ان کی منکسرالمزاجی اور خوش اخلاقی کی بھی تعریف کی ، مگر ان کے مزاج کی کمزوریوں کی بھی نشاندھی کر دی — متعلقہ عبارتیں ملاحظہ فرمائیں — پہلے کردار کے روشن پہلو :

" اس کاظرف کی قابل ذکر بات یہ ھے کہ مولوی صاحب جو کھانے کے معاملے میں متنوع اور نفیس ذوق رکھتے تھے ، سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے — ایک وقت میں معمولی پکا ہوا صرف ایک سالن ہوتا تھا — مولوی صاحب نے کھانے کے معاملے میں اپنے لئے خاص اہتمام پسند نہیں فرمایا — وہ ذرا سا اشارہ بھی کر دیتے ، تو سب کچھ ہو سکتا تھا "—[۲]

" دلی میں کئی بار مولوی صاحب نے مجھے دوپہر اور رات کے کھانے پر بلایا — مجھے اچھی طرح یاد ھے کہ انہوں نے کھانا کھلا کر شعر سننے کی کبھی فرمائش نہیں کی ، ورنہ عام طور پر شاعروں کو شعر خوانی کے لئے ھی دعوتوں میں بلایا جاتا ھے —"[۳]

اب کردار کے منفی رخ :

• مولوی سید تقی الدین مرحوم سے مولوی صاحب کے پرانے تعلقات تھے — اردو کالج کی انہی نے بنا ڈالی تھی — ان کو مولوی صاحب نے کھڑے کھڑے علیحدہ کر دیا۔یہی صورت سید ھاشمی فرید آبادی کے ساتھ پیش آئی — ھاشمی صاحب مولوی صاحب کے انتہائی مخلص رفیقِ کار تھے — کم از کم ۳۵ سال سے وہ ہر مرحلہ پر مولوی صاحب کے

۱- یاد رفتگان — جلد دوم — ص ۱۲۲

۲- ایضاً — ص ۳۳

۳- ایضاً — ص ۳۳

دست و بازو بنے رہے - پیر حسام الدین راشدی جن کی کوششون سے انجمن ترقی اردو کو یہ عمارت الاٹ ہوئی تھی ، انجمن اور کالج کی رسہ کشی اور ان افسوس ناک حالات کو دیکھ کر وہ بھی چیخ اٹھے - ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر معین الحق جیسے مخلص اور بے غرض کارکن بھی ان الجھنون کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے - مولوی صاحب نے انہی دنون اپنا ایک خاص نمائندہ مسٹر اسکندر مرزا کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو کام مین لائین اور انجمن کی مجلس منتظمہ کو توڑ دین ، مگر مولوی صاحب کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی - مولوی صاحب کوئی شک نہین انجمن ترقی اردو کے معمار اور محافظ و سرپرست تھے ، مگر انہی کے مزاج و طبیعت کے ہاتھون انجمن کو جس خار زار سے گزرنا پڑا ، اس کا سبب ان کی وہ پیرانہ سالی تھی جسے حدیث شریف مین " ارذل العمر " کہا گیا ہے "[1] -

----

" مولوی صاحب سر سید احمد خان سے بہت زیادہ متاثر تھے ، مگر اس تاثر کا تعلق ادب و انشا سے تھا - سرسید کی مذہبیت کا مولوی صاحب نے اثر قبول نہین کیا - ان کے ڈاڑھی تھی - " مولوی " ان کے نام کا جزو تھا ، لیکن وہ مذہبیت سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے - پرائیویٹ صحبتون مین مذہب پر ان کی زبان سے پھبتیان بھی سنی گئین ، مگر انہون نے اپنی تحریرون مین مذہب کے خلاف ایک حرف بھی نہین لکھا "[2] -

ماہر کے ہان توازن اور انصاف کا یہ عالم تھا کہ انہون نے اپنے آپ کو بھی معاف نہین کیا اور اپنی بعض بشری خامیون کا اعتراف برملا کر دیا ہے - اس سلسلے کی چند مثالین ذیل مین درج کی جاتی ہین :

" وہ جو مجھے بحث و گفتگو مین کبھی کبھی جلال آ جاتا ہے ، تو ادیب سہارنپوری نے میری طبیعت کے اس جلال اور تیزی کو گوارا کیا ہے ، ان کی زندگی مین اس کا خیال نہ آتا تھا ، اب سوچتا ہون تو ندامت محسوس کرتا ہون "[3] -

---

۱- یاد رفتگان - جلد دوم - ص ۳۶ ، ۳۷

۲- ایضاً - ص ۴۱

۳- ایضاً جلد اول ص ۲۹

" اسے خوش ذوقی سمجھئے یا کمزوری سے تعبیر کیجئے ، شاعر خوش شکل اصناف سے ضرور متاثر ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر زور (سید محی الدین قادری زور) کی شخصیت کے اس رخ نے مجھے پہلی ملاقات ہی میں متاثر کیا ۔ بات کرنے میں ان کا سنجیدہ و شگفتہ تبسم بڑی کشش رکھتا تھا " ۔[1]

ابو العلا ناطق لکھنوی کے ضمن میں بغیر کسی مصنوعی انکساری کے بڑی بے تکلفی کے ساتھ دوسرے کی برتری اور اپنی فروتری کا اعتراف کیا ہے ۔ اس سے ماہر کی حوصلہ مندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے :

" میں نے بھی اس طرح میں غزل کہی تھی ، مگر ناطق کے شعروں کے بعد اپنی غزل کے اشعار پیش کر کے اربابِ ذوق کو بے مزہ کرنا نہیں چاہتا " ۔[2]

اس نوعیت کی حقیقت بیانی کا اظہار ماہر نے بعض دیگر مقامات پر بھی کیا ہے :

" شہید ملّت لیاقت علی خان مرحوم کو انجمن ترقی اردو نے بلایا ، تو اس جلسہ کے لئے مولوی صاحب[3] کے ایماء پر میں نے نظم کہی ۔ مولوی صاحب نے اس نظم کو پسند فرما کر اس کا عنوان نظم کے اس مصرعہ

حکم ہو جائے کہ اردو کا چلن اب عام ہو

کو تجویز فرمایا ۔ یہ نظم انجمن کی طرف سے چھاپی گئی اور جلسہ میں تقسیم کی گئی ۔ سامعین نے اس نظم کا خاصہ خیر مقدم کیا ، مگر جب میں نے اپنے کلام پر اشاعت سے قبل نگاہِ انتخاب ڈالی ، تو اسے خارج کر دینا پڑا کہ اس میں واقعیت زیادہ اور شعریت کم تھی " ۔[4]

" اب سے اکتیس[5] سال قبل میں کسی حیثیت سے بھی قابل تعارف نہ تھا " ۔[6]

" میرا یہ کہنا کہ میں نے مولوی صاحب کی مدافعت کی یقیناً چھوٹا منہ بڑی بات ہے ، میں کیا اور میری مدافعت کیا " ۔[7]

۱۔ یاد رفتگان ۔ جلد اول ص ۲۲۸ ۲۔ یاد رفتگان ۔ جلد دوم ۔ ص ۳۲۸

۳۔ مراد بابائے اردو مولوی عبدالحق ۴۔ یاد رفتگان ۔ جلد دوم ۔ ص ۳۵

۵۔ تقریباً ۱۹۳۰ء میں یہ تحریر ۱۹۶۱ء کی ہے ۔ ۶۔ ایضاً ۔ ص ۲۹

۷۔ یاد رفتگان ۔ جلد دوم ۔ ص ۳۰

امجد کدیانی نے لکھا ھے کہ " خاکے کو تکنیک ، ساخت اور دیگر فنی لوازم پورے کرنے کے علاوہ بھی تو کسی حسن کا حامل ہونا چاہیئے اور وہ قاری کے لئے سرور و انبساط ، مسرّت و بہجت اور کچھ نہ ہو تو کم از کم روحانیت کو ہلکی سی رفعت کا احساس تو ضرور ہو "۔[1] اس معیار کو سامنے رکھیں تو ماہر کے خاکوں میں جگہ جگہ اخلاقِ عالیہ اور عظمت انسانی کے ایسے نمونے دکھائی دیتے ہیں جن کے مطالعے سے روح شاداب اور دل نہال ہوتا ھے ۔ یوں تو اس سلسلے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ، مگر میں خوفِ طوالت سے صرف تین تحریریں پیش کرتا ہوں :

" حمید صدیقی کے نعتیہ کلام میں جو تنوّع ، تازگی ، شادابی ، اور عقیدت و محبت پائی جاتی ھے بس وہ انہی کا حصہ ھے ۔ مدینہ منورہ کے گلی کوچوں ، باغوں ، بازاروں اور حرم نبوی کے دروازوں ، ستونوں اور دوسرے متبرک آثار و مقامات کو انہوں نے جس شاعرانہ زبان میں منظوم کیا ھے ، اس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ھے ۔ پڑھنے کا انداز بھی بڑا ہی دلکش تھا ۔ صورت ، شکل اور وضع قطع خالص شرقی اسلامی ۔ صوم و صلوٰۃ کے اس درجہ پابند کہ اشراق و تہجد اور تسبیح و ذکر معمولات میں داخل تھے ۔ مدینہ اور مدینہ والے کے فدائی ، عاشق ، متوالے اور مدح خوان ، برسوں مسلسل حج کئے اور روضۂ نبوی کی زیارت سے مشرّف ہوئے ۔ ہر حاضری اور زیارت کے بعد شوق دو چند ہو جاتا ۔ دل کی لگی اور بھڑک جاتی ۔ مدینہ اور سرکارِ مدینہ کی یاد اور تصور ہی میں ابدی نیند سو گئے "۔[2]

" ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک " مومن " تھے " قلبِ اُو مومن دماغش ہم مومن بود " صورت ، سیرت ، چال ڈھال ، وضع قطع اور نشست و برخاست میں اسلامی شرافت اور مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ ۔ فلالوجی میں ڈاکٹر ، عربی کے عالم ، حکومت میں بڑے سے بڑے عہدوں پر رہے ، مگر طبیعت کی سادگی اور مزاج کے انکسار میں کوئی فرق نہ آیا ۔ مردِ یک رنگ۔اپنے اللہ سے جو عہدِ وفا باندھا تھا ، اسے آخر وقت تک نبھاتے رہے ۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اسلامی اخلاق کی ایک مثال، دین و دنیا میں کامیاب و بامراد ۔ اللہ تعالی قبر سے لے کر یوم آخرت تک کی ہر منزل کو ان

۱- اردو میں خاکہ نگاری ۔ نگار پاکستان کراچی سالنامہ ۱۹۷۲ء ، ص ۲۳۱

۲- یادِ رفتگان حصہ اول ۔ ص ۲۰۰

کے لئے آسان بنائے (آمین) " ۔[۱]

" سر عبدالقادر مرحوم نے اپنی ذاتی قابلیت اور کوشش سے ترقی کی منزلیں طے کیں ۔ ذمہ داری اور عزت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ۔ اردو ادب کے وہ نہایت مخلص خدمت گزار تھے ۔ ان کے رسالہ " مخزن " سے اردو لٹریچر کی تاریخ وابستہ ہے ۔ مرحوم کی نثر کا انداز بہت سادہ اور سلیس تھا ۔ شاعروں اور ادیبوں کے بڑے قدر دان تھے ۔ بعض مشہور شاعروں کی سر عبدالقادر مرحوم نے زندگیاں بنا دیں ۔ ہونہار نوجوانوں کو ابھارنے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا مرحوم میں بے پناہ جذبہ تھا ۔ اردو زبان کی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتی " ۔[۲]

مشہور محقق ، عالم ، مصنّف اور نیشنل بنک کے ڈائریکٹر ممتاز حسن غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شرافت ، اخلاقِ فاضلہ اور انسانی احترام کا جیتا جاگتا نمونہ تھے ۔ ماہر صاحب نے انہیں بھی جی بھر کر خراج تحسین پیش کیا ہے :

" ترقی اردو بورڈ جب جمشید روڈ کے متصل ایک عمارت میں تھا تو وہاں ممتاز حسن مرحوم ہی کے ایماء سے علامہ عبدالعزیز میمن کے عربی شعر و ادب پر لیکچر ہوا کرتے تھے ۔ ایک نشست میں زبان و ادب کی گفتگو چلی ، تو ڈاکٹر ممتاز حسن نے فرمایا کہ اردو کو آسان بنانے کی ضرورت ہے ۔ بس ان کا یہ کہنا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے تن بدن میں کسی نے شتابہ لگا دیا ۔ میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر عرض کیا کہ جس اردو زبان کا بوسوں سے چلن ہے ، وہ معیاری زبان ہے ۔ اس کے مشکل و دشوار ہونے کی کوئی شخص شکایت نہیں کرتا ۔ اردو کو آسان بنانے کی کوشش میں زبان کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا ۔ احتیاط و ضبط کے باوجود میرے لہجہ میں تیزی آ گئی ۔ ممتاز صاحب کی یہ عالی ظرفی تھی کہ میری باتوں کی تردید میں ایک حرف بھی نہیں کہا ۔ بحث و مباحثہ ان کا مزاج ہی نہ تھا ۔ اپنی رائے کے منوانے پر وہ اصرار نہ کرتے اور کسی صحبت اور محفل کو دلیل و مباحثہ کا اکھاڑا نہ بننے دیتے " ۔[۳]

۱۔ یاد رفتگاں ۔ جلد دوم ۔ ص ٤٧

۲۔ ایضاً ۔ ص ۵۵

۳۔ ایضاً ۔ ص ۳۳٦

" علامہ اقبال کے فدائی اور شیدائی مگر --
زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز

سے اپنے کو محفوظ رکھا ۔ اس لئے ہر حکومت میں وہ کسی نہ کسی بڑے عہدے پر فائز رہے ۔ وہ نہ " زمانہ ساز " تھے اور نہ " زمانہ ستیز " ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حکومت سے تعاون کر کے ملک و ملت کو فائدہ پہنچایا جائے اور اپنی توانائیاں تصادم کی بجائے تعاون و توافق میں صرف کی جائیں ۔ ان کے اس موقف پر گفتگو کی جا سکتی ہے ، مگر ان کی خیر پسندی اپنی جگہ بہرحال مسلم ہے ۔

ان کی زبان سے میں نے کسی پر طنز و تعریض نہیں سنی ان کی زبان اور قلم سے کسی شخص کو دکھ نہیں پہنچا ۔ ان کا شعار " فصل " نہیں " وصل " تھا ۔ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللّٰہ علیہ کی خدمت میں کسی عقیدت مند نے قینچی ہدیہ کے طور پر پیش کی تو آپ نے فرمایا :

" میں کاٹنے کے لئے نہیں ، جوڑنے کے لئے آیا ہوں ۔ مجھے قینچی نہیں ، سوئی چاہیئے"

ممتاز حسن مرحوم کی پوری زندگی اور سیرت و کردار میں اسی قول کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ کتنے بڑے بڑے عہدوں پر وہ فائز رہے ہیں ، مگر ہر کسی سے " تواضع " کے ساتھ پیش آتے ۔ اپنے مناصب اور عہدوں کی شان اور تمکنت کو انہوں نے فراموش کر دیا تھا ۔ آمدنی کا خاصا حصہ ضرورت مندوں کی امداد پر صرف کرتے ، نادار طلباء کے وظائف ان کے یہاں سے مقرر تھے ۔ لباس سادہ اور معمولی ، کھانا لباس سے بھی زیادہ سادہ جس جگہ رہے نیک نام اور ہر دلعزیز رہے ۔ ان کی دیانت کی قسم کھائی جا سکتی ہے "۔[1]

ماہر نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں ، ان سے وہ بالعموم بے پایان خلوص کا جذبہ رکھتے ہیں ، ان کی خامیوں کے حوالے سے وہ چٹکی لینے کا انداز ضرور اختیار کرتے ہیں ، مگر ان کی شخصیت کی خوبیوں اور کردار کی عظمت کے اعتراف میں وہ بخل سے کام نہیں لیتے ۔ نامور ادیب اور نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی پر متعدد مضامین لکھے گئے ہیں ، مگر ماہر کی تحریر اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں ایک راست فکر اور باعمل مسلمان کا مشاہدہ نظر آتا ہے ۔ ایک ایسا مسلمان جسے نماز جیسے

۱۔ یاد رفتگان جلد دوم ۔ ص ۳۳۷

فریضہ مین کوتاھی پریشان کئے بغیر نہین رھتی اور وہ حیرت اور افسوس سے اس کا اظہار کرتا ھے چنانچہ پروفیسر موصوف کے علمی و ادبی کارنامون کی تحسین کے بعد ماہر لکھتے ھین :

" رشید احمد صدیقی شریف النفس انسان تھے - ان کی ذات سے کسی کو دکھ نہین پہنچا - دل آزاری کو وہ کفر سمجھتے تھے اور خدمت خلق کو عبادت - خدمتِ خلق اور دوسرون کو آرام اور سہولت پہنچانے کا جذبہ ان پر اس قدر غالب تھا کہ اس کے مقابلے مین فرائضِ عبادت شاید ان کی نگاہ مین ثانوی حیثیت رکھتے تھے - اللّٰہ ، رسول ، اسلام اور آخرت کے بارے مین ان کا یقین پختہ اور غیر متزلزل تھا - ملّت اسلامیہ کے سچے بہی خواہ تھے - اس کے ساتھ سرسید احمد خان سے بھی وہ بہت زیادہ متاثر تھے - اس لئے کہا جا سکتا ھے کہ تجددّ کی بھی تھوڑی بہت جھپٹ ان کو لگ گئی تھی " -۱

سچے خلوص اور انسانی احترام کا نتیجہ ھے کہ ماہر نے متعدد ایسے حضرات کو موضوع بنایا جو خاص معاشرتی حیثیت اور شہرت کے حامل نہ تھے - مگر کسی نہ کسی لحاظ سے خوبیون کے حامل تھے - اس اعتبار سے دیکھین تو کتنے ھی گمنام لوگون کو ماہر نے اپنی تحریرون مین زندۂ جاوید کر دیا ھے - اور ان کا ذکر بڑی چاھت ، اپنائیت اور خلوص سے کیا ھے - چند مثالین ملاحظہ فرمائین :

" ادیب سہارنپوری کے تعارف مین لکھتے ھین :

" ادیب کا ترنم پرسوز تھا - ان کے لہجہ مین خاص کھنک تھی - اور تو اور حضرت جگر مراد آبادی جو شعر و ترنم کے بادشاہ تھے ، ادیب کے ترنم کو بہت پسند کرتے تھے - غزل مین ادیب نے اپنا آھنگ پیدا کیا - شاعرون اور شعر و ادب کی محفلون کی تو وہ رونق تھے ان کی کئی غزلین خاصی مشہور ھوئین - ان کا مجموعۂ کلام " رنگ و آھنگ " کئی سال ھوئے جب چھپا تھا - اس کے بعد سے اب تک انھون نے بہت کچھ کہا ھے - دیکھئے ان کے مرنے کے بعد دنیا ان کے کلام کے ساتھ کیا سلوک کرتی ھے - جو شاعر اتنے اچھے شعر کہتا ھو ---

ہزار باندھ لئے عقل و آگہی نے حصار ---
ترا خیال نہ جانے کہاں سے آتا ھے

۱- یاد رفتگان جلد اول - ص ۲۲۳

۵- یا رب متاعِ دین کو کہاں تک کوئی بچائے

ملتے ہیں روز دشمنِ ایمان نئے نئے

۶- کتنے دل راہ میں لوگوں نے بچھا رکھے ہیں اے میری سروِرواں اور ذرا آہستہ

اسے اہلِ دل اور اہلِ ذوق کس طرح بھلا سکتے ہیں ۔[1]

ارم لکھنوی کی یاد یوں تازہ کرتے ہیں :

" نام تھا شہنشاہ حسین ، ارم تخلص ، خاص لکھنو کے باشندے ، شاعری میں علامہ آرزو لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا ۔ نوجوانی لکھنؤ میں اور جوانی کا خاصا حصہ کلکتہ میں بسر ہوا ۔ وہاں بھی اہلِ علم اور اربابِ فن کی صحبت اور ہم نشینی انہیں میسّر آئی ۔ انگریزی کے ایم ۔ اے مگر وضع قطع ، لباس ، نشست و برخاست اور چہرے مہرے سے اردو کے ادیب فاضل نظر آتے تھے ۔ سلام کرنے میں وہ ان کے ہاتھ کی جنبش اور گردن کا خم ، ان کے لکھنوی ہونے کی شہادت دیتا تھا ۔[2]

عبد المجید حیرت شملوی کی شخصیت اور کلام کا تعارف یوں کرایا ہے :

" مختصر جسم ، چھوٹا قد ، بچوں جیسے ہاتھ ، باریک ناک نقشہ مگر مجموعی طور پر بدن متوازن۔ شاید جسم و اعضا کی مناسبت سے چھوٹی بحروں میں زیادہ تر غزلیں کہتے تھے ۔ کلام ترنم سے سناتے ۔ قد و قامت کی طرح اگرچہ آواز نحیف اور پست تھی ، مگر نغمگی سے خالی نہ تھی ۔ نہایت مشّاق غزل گو شاعر ، مصرعوں کے نوک پلک درست ، تغزل میں قیامت کی سادگی اور بےتکلفی ، ہر غزل میں ایک آدھ شعر تو ضرور " ممتنع " ہوتا ۔ زبان و روزمرہ کی پابندیوں کا سختی کے ساتھ خیال رکھنے والے ۔ " آئینۂ حیرت " ان کا کلام شائع ہو چکا ہے ۔ نثر میں " بنی اسرائیل کا چاند " اردو ناول ترجمہ کی حیثیت سے یادگار چھوڑا ۔ نہ جانے ان کے کتنے نثر پارے ، یادداشتیں اور غزلیں چھپنے سے رہ گئیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ موتی بازار میں آئیں گے یا گمنامی کے گرد و غبار میں دب کر رہ جائیں گے " ۔[3]

۱- یاد رفتگاں جلد اول ۔ ص ۷۰ ۔

۲- ایضاً ۔ ص ۷۲

۳- ایضاً ۔ ص ۲۱۱

محمد اسحاق صابر دہلوی ماہر کے دوست تھے - قیامِ پاکستان کے بعد ملتان میں مقیم ہوئے - ان کے خاکے میں بے تکلفی ، شگفتگی ، اور ظرافت کا انداز نمایاں ہے :

" صابر مرحوم کی سرشت اور فطرت میں دو چیزیں شامل تھیں ، عاشقی اور شاعری - انہی چٹخاروں کی بدولت وہ کم و بیش ستر سال کی عمر میں بھی پچاس سال کے لگتے تھے - یار دوست چھیڑنے کی خاطر ان کی عمر پوچھتے - اس پر وہ بگڑ جاتے - ان کی زندگی سے بہت سے افسانے ، لطیفے اور رنگین و دلچسپ واقعات منسوب ہیں - پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کیا تو راستہ بھر سہمے ہوئے بیٹھے رہے ، ہوائی جہاز سے جب وہ اترے تو چند قدم چل کر ہوائی جہاز کو مڑ کر دیکھا اور خاص انداز میں بولے :
" اب میں کہتا ہوں - سواری خطرناک ہے " -[۱]

ظریف جبلپوری کے خاکے میں بھی اسی نوعیت کی شگفتگی ، بے تکلفی اور اخلاص و خیر خواہی کارفرما نظر آتی ہے :

" مشاعروں میں ان کے دم سے بڑی چہل پہل اور رونق ہو جاتی۔ خاص طور سے نوجوانوں کے وہ بہت زیادہ پسندیدہ مزاح نگار شاعر تھے - چھ سات گھنٹے کے مشاعرے میں جہاں تیس چالیس شاعروں کی تعداد ہوتی ، تنہا ظریف جبلپوری گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ شعر سناتے اور پھر بھی سننے والوں کی سیری نہ ہوتی - اتنی تالیاں ، داد و تحسین کا شور اور قہقہے کم ہی شاعروں کو میسّر آئے ہوں گے - سید محمد جعفری ، شوکت تھانوی مرحوم اور ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری ، مشاعروں میں قہقہوں کی لہر دوڑا دیتی - ان کے بعد کسی ظرافت نگار شاعر کا جمنا دشوار تھا ، مگر ظریف کے اسٹیج پر آتے ہی تبسم و قہقہہ کی لہریں سیلاب بن جاتیں جس میں پورا مشاعرہ غوطے کھاتا ہوا نظر آتا - وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ خوب جم کر شعر سناتے اور مشاعرے پر چھا جاتے " -[۲]

نہال سیوہاروی ایک ایسے ہی باصلاحیت مگر غریب شاعر تھے جن کے ساتھ زمانے نے انصاف نہ کیا اور وہ گمنامی کی موت مر گئے - ماہر نے ان کی موت کا اور زمانے کی ناقدری کا یوں ماتم کیا ہے -

---

۱- یاد رفتگاں - جلد اول - ص ۳۵۶

۲- ایضاً - ص ۳۹۱

" نہال سیوہاروی محکمۂ ریلوے کے دفتر میں ملازم تھے - شام کو دفتر سے آتے ، تو ان کی بغل میں دفتر کی بہت سی فائلیں دبی ہوتیں - جس کی زندگی دانش گاہوں اور علمی اداروں میں بسر ہونی چاہیئے تھی ، قسمت نے اسے دفتر میں پھینک دیا تھا - اس کی ساری جوانی دفتر ہی کی نذر ہو گئی - پاکستان میں نہال کی قدر دانی کی توقع تھی مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی - یہاں صوبہ پرستی کا کابوس قلب و دماغ پر سوار ہے - نذر الاسلام کے لئے سب کچھ ہو رہا ہے ، مگر نہال سیوہاروی کو کسی نے پوچھا نہیں - یہاں تک کہ وہ بے چارہ سول ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا - حالانکہ نذر الاسلام کی شاعری کا جتنا ترجمہ میری نگاہ سے گزرا ہے ، اس کے مقابلہ میں نہال سیوہاروی کا کلام ذرا بھی دبتا ہوا نظر نہیں آتا - کسی کو شبہ ہو تو موازنہ کر کے دیکھ لے " -[۱]

اس ضمن میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ماہر مختلف شخصیات کے حالات اور انقلاباتِ زمانہ کے حوالہ سے جگہ جگہ عبرت اندوزی کا انداز اختیار کرتے ہیں - خصوصاً موت کی بے رحمی اور حالات کے تغیرّ سے وہ اخلاقی نتائج پیدا کرتے اور دنیا کی بے ثباتی اور نعمتوں کے زوال کا نقشہ کھینچتے ہیں - نواب نثار یار جنگ بہادر اور مخشب جارچوی کے خاکے اس سلسلے کے خاص نمونے ہیں -

ماہر کے ہاں اس میں کوئی شبہ نہیں ، کہ نفسیاتی تجزیے کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے وہ انسان کے اندرون میں کم جھانکتے ہیں اور عموماً واقعات اور حالات کے حوالے سے شخصیت اور کردار کا تجزیہ کرتے ہیں ، مگر پھر بھی ان کی تحریروں میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں انہوں نے بعض شخصیات کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے اور اسی تناظر میں ان کا مطالعہ کیا ہے - علامہ حیرت بدایونی کے خاکے میں لکھتے ہیں :

" ان سے آخری ملاقات میں محسوس ہوا کہ بڑھاپے کی وجہ سے شعر و ادب اور علم وفن کی گفتگو میں ان کا مزاج قدرے ضدی ہو گیا ہے اور باتوں میں الجھاؤ بھی تقسیمِ ہند

۱- یاد رفتگاں جلد دوم ص ۲۰۲-۲۰۳ ، یہ تحریر ۱۹۵۲ء کی ہے - اس سے ماہر کی جرأت مندی اور حقیقت شناسی کا بھی اندازہ ہوتا ہے -

کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو بپتا پڑی ، خاص طور سے حیدر آباد کے سقوط کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو جس آشوبِ قیامت سے گزرنا پڑا ، اس کے ردِّ عمل نے علامہ حیرت کو اس طرح جھنجھوڑا کہ کمیونزم کی طرف قدرے مائل ہو گئے - ان کے ہاتھ میں سرخ رومال رہتا تھا - مگر بعد میں جا کر یہ ژھول دور ہو گیا اور یہ دھندلکا بہت جلد چھٹ گیا" -[1]

ماہر القادری اپنے عقاید پر یقینِ محکم رکھتے ہیں اور انہیں اپنی صلاحیتوں اور اپنی ذات پر بے پناہ اعتبار ہے ، وہ لکھتے ہیں " میرا مزاج یہ ہے کہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو ، کلمۂ حق کہتے ہوئے میں جھجھک محسوس نہیں کرتا " -[2] چنانچہ تذکیر اور کلمۂ حق کا موقع ضائع نہیں کرتے اور ان کے خاکوں میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے کسی غلط بات پر بڑی سے بڑی شخصیت کو ٹوک دیا ہے - رشید ترابی[3] ، علامہ سیماب اکبر آبادی[4] اور مخشب چارجوی[5] کے تعارف میں بھی منظر نظر آتا ہے ، مگر وہ کسی بات کو عزت کا مسئلہ نہیں بناتے تھے - جراتٔ اور حکمت کے ساتھ بات کرتے اور ضد یا ہٹ دھرمی کا انداز اختیار نہیں کرتے تھے ، یہی سبب ہے کہ لوگ ان کی تذکیر کا عموماً برا نہیں مانتے تھے اور تعلقات میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تھی -

----

ماہر کے خاکوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ پسِ پردہ نہیں رہتے - وہ شخصیات کے ساتھ چلتے ہیں اور اپنی ذات کو ابھارنے کا موقع ضائع نہیں کرتے - البتہ وہ دوسروں کی شخصیت پر چھائے ہوئے نظر نہیں آتے ، بلکہ متعلقہ شخصیت کے حالات و واقعات کو زیادہ نمایاں کرنے کے لئے کہیں کہیں ضمناً اپنا ذکر کر دیتے ہیں اس طرح ان خاکوں سے خود مصنف کی اپنی شخصیت کے بعض ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جن کے جاننے کی کوئی اور صورت نہ تھی - چنانچہ راقم الحروف نے ماہر کا بیشتر سوانحی خاکہ " یادِ رفتگاں " ہی سے مرتب کیا ہے -

---

۱- یاد رفتگان جلد اول - ص ۲۰۸ ۲- یاد رفتگان جلد اول - ص ۲۲۹
۳- ایضاً - ص ۲۳۰ ۴- یاد رفتگان جلد دوم - ص ۳۶۵
۵-

ماہر القادری کا حافظہ غضب کا ہے سنہ اور تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ اپنی یادداشت کی خرابی کا اعتراف کرتے ہیں ، مگر واقعات ، مقامات اور مختلف شخصیات کے اسماء و حالات کی تفصیلات وہ جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں - چنانچہ ان خاکوں میں ان کے ذاتی کوائف و معلومات کے ساتھ ساتھ برصغیر کی ایک نصف صدی (۱۹۲۵ سے تک ۱۹۷۸ء) جیتی جاگتی اور متحرک نظر آتی ہے اور اس دور کی معاشرت ، تہذیب ، ثقافت ، تاریخی احوال ، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ، ادبی صورت حال اور مذہبی و مسلکی اختلافات آئینہ ہو گئے ہیں - پتہ چلتا ہے کہ آزادی کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مشاعرے ، تفریحات اور بے فکری بھی عام تھی - اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان معاشرے کی خوبیاں اور خامیاں کیا تھیں -

حرفِ آخر :

ڈاکٹر تحسین فراقی نے کامیاب خاکہ نگاری کے لئے چند بنیادی شرائط بیان کی ہیں :

" مثلاً لکھنے والا حکیمانہ نگاہ رکھتا ہو ، مسلسل اور دقیق مشاہدے کی ہمت اور میلان رکھتا ہو ، شخصیتوں کے انسانی پہلو نمایاں کرنے کو عیب نہ سمجھتا ہو ، صداقت نگاری صاف بیانی ، فضا بندی اور سراپا نگاری کا سلیقہ رکھتا ہو اور بات اختصار سے مگر شگفتہ اسلوب میں کہنے پر قادر ہو .... ریاضیاتی ایجاز اور شگفتہ اسلوبِ تحریر اس کے بنیادی خصائص ہیں - کامیاب خاکے کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ شخصیت زیرِ تحریر کی کلید بن جائے "۔ [1]

اس معیار کو سامنے رکھیں ، تو ماہر القادری کی خاکہ نگاری میں یہ خصوصیات اکثر و بیشتر موجود ہیں - ان کا مشاہدہ عمیق اور وسیع ہے ، وہ حکمت و بصیرت کا بہرۂ وافر رکھتے ہیں اور اس کی مثالیں ان کے خاکوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں وہ شخصیتوں سے متاثر ضرور ہیں ، مگر وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے اور کہیں بھی ان کی شخصیت دبتی ہوئی نظر نہیں آتی ، یہی سبب ہے کہ شخصیت اور کردار کی خامیوں کا اظہار وہ بڑے سلیقے سے کر دیتے ہیں - وہ خامیوں کو اس

۱- دیباچہ دید و شنید از رئیس احمد جعفری ، ص ۲۰

انداز سے بیان نہیں کرتے کہ لوگ ان کا مضحکہ اڑائیں۔ وہ حفظِ مراتب کا برابر خیال رکھتے ہیں اور اسقام کا ذکر احتیاط اور حکمت سے کرتے ہیں ۔ صداقت شعاری اور صاف گوئی ان کی تحریر کا لازمی جزو ہے ۔ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے پر بلا خوف لومتہ لائم آمادہ نظر آتے ہیں ۔ مگر تعصّب ، تنگ نظری اور طنز و تشنیع ان کی تحریر میں نہ ہونے کے برابر ہے ۔

ماہر کا اسلوبِ بیان سیدھا سادا اور سلیس ہے کہیں رنگ آمیزی نہیں + تحریر سادگی اور پُرکاری کا خوبصورت نمونہ ہے ۔ ماہر صاحب طرز شاعر ہیں مگر ان کی نثر شاعرانہ صنعت گری سے پاک ہے اور عربی و فارسی کے الفاظ سے بوجھل نہیں ۔ ان کے ہاں فرحت اللّٰہ بیگ، رشید احمد صدیقی یا چراغ حسن حسرت کے برعکس قہقہہ یا تبسّم زیرِ لب کی کیفیت کم ہے ، سنجیدگی زیادہ ہے اور شاید اس کا سبب یہ ہے کہ جب کوئی صاحب وفات پاتے ، تو ماہر فوری طور پر اس سے متعلق یادیں قلم بند کرنے بیٹھ جاتے جو عموماً اسی ماہ " فاران " میں چھپ جاتیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کی تحریر خشکی یا یبوست سے پاک ہے اور شگفتگی اور دلچسپی کا عنصر اوّل سے آخر تک جاری و ساری رہتا ہے ۔

لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان ساری خوبیوں کے باوجود اور اتنی کثیر تعداد میں خاکے لکھنے کے باوصف کسی ایک نقاد یا مقالہ نگار نے خاکہ نگاری کے ضمن میں ماہر کا ذکر نہیں کیا ۔ اور جو سلوک دوسری اصنافِ ادب میں موصوف کے ساتھ روا رکھا گیا ہے ، وہی طرزِ عمل زیرِ نظر شعبے میں بھی نظر آتا ہے ۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے نقد و ادب کے ایک حلقے میں وسعتِ قلبی ، انصاف اور توازن کا کیا عالم ہے اور ساتھ ہی ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کے بغیر کیا تنقید واقعی تنقید کہلانے کی مستحق ہے ؟

باب-۸

ماہر القادری ــ سفر نامہ نگار کی حیثیت سے

سفر نامہ عہد حاضر کی ایک مقبول صنفِ ادب ہے ۔ اتنی مقبول کہ دنیا بھر کے مختلف ملکوں کے بارے میں اب تک اردو میں چھوٹے بڑے سینکڑوں سفر نامے شائع ہو چکے ہیں جن میں حج کے سفر نامے بھی بیسیوں کی تعداد میں ہیں[۱] ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان سفر ناموں میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے ۔

" سفر نامہ ادب کی ایک مستقل بیانیہ صنف ہے جس میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے ۔ البتہ سفر سے متعلق ہونے کے باعث سفرنامے میں تحیّر کا عنصر نمایاں تر ہے لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفر نامے کی پیش کش ادبی نوع کی ہو گی نہ کہ صرف مسافر کا بیان "[۲] اس اعتبار سے دیکھیں تو اردو میں بعض سفر نامے معلومات آفرینی کے ساتھ ساتھ ادبی نقطۂ نظر سے بھی واقعتاً معرکہ آرا ہیں ۔ ان میں محمود نظامی کا نظرنامہ ، اختر ریاض الدین کے سات سمندر پار اور دھنک پر قدم ، ابن انشاء کے مختلف سفر نامے ، افضل حسین علوی کا "دیکھ لیا ایران " اور سلمٰی یاسمین نجمی کا "کرئے ملامت" خاص طور پر قابل ذکر ہیں اِن کے برعکس بعض سفرناموں میں زبان کا چٹخارہ تو موجود ہے ، مگر وہ اپنے مصنفین کی مادر پدر آزادی کا جیتا جاگتا اشتہار ہیں اور زبانِ حال سے اس عربی مقولے کے ترجمان و عکاس ہیں کہ " سیاح عموماً جھوٹ بولتے ہیں"۔

ماہر کی تصانیف میں دو سفر نامے بھی شامل ہیں سفر نامہ حج یعنی " کاروانِ حجاز " اور " سیاحت نامۂ ماہر " آئندہ سطور میں ہم ان دونوں کا تجزیہ پیش کریں گے ۔

۱ـ دیکھئے کتابیات " اردو ادب میں سفر نامہ " از ڈاکٹر انور سدید ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ۱۹۸۷ء ، ص ۲۱

۲ـ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ، ۱۹۸۷ء ، ص ۱۰

ماہر نے متعدد مقامات پر اظہار کیا ہے کہ انہیں سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا " راقم الحروف سیر سپاٹے کا رسیا اور تفریحی و قدرتی مناظر کا انتہائی شوقین ہے " [1] راقم الحروف کی طبیعت لاابالی اور سیر و تفریح اور مشاہدہ و نظارہ میرا مزاج " [2] یہی شوق انہیں قیامِ پاکستان سے قبل ہندوستان بھر کی سیاحت کرا چکا تھا اور انہوں نے مشاعرے پڑھنے کے ساتھ ساتھ برصغیر کے تقریباً سب قابلِ دید مقامات کی سیر کر لی تھی۔ چنانچہ اسی ذوق کی تسکین کی خاطر انہوں نے مختلف وقتوں میں دنیا بھر کے متعدد ملکوں کا سفر اختیار کیا اور اپنے اسفار کے تاثرات خطوط یا مضامین کی صورت میں " فاران " میں چھپواتے رہے ۔ یہ سب تحریریں ماہر کے دوست اور مصنف و محقق جناب طالب ہاشمی نے "سیاحت نامۂ ماہر" کے عنوان سے کتابی صورت [3] میں شائع کر دی ہیں ۔ اس سے قبل ماہر نے ۱۹۵۴ء میں حجِ بیت اللّٰہ کا مقدس سفر اختیار کیا تھا ، جس کی تفصیلات کو انہوں نے "کاروانِ حجاز" کی صورت میں مرتب کرکے شائع کیا تھا [4] ۔ اس باب میں " سیاحت نامۂ ماہر " اور کاروانِ حجاز" کے حوالے سے بات ہو گی اور ہم ان کتابوں کا فنی و موضوعاتی محاکمہ پیش کریں گے ۔

زمانی ترتیب کے لحاظ سے پہلے " کاروانِ حجاز " کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

ماہر نے حج کا یہ سفر بحری جہاز سے طے کیا وہ ۱۳ ۔ جولائی ۱۹۵۴ء کو کراچی سے روانہ ہوئے اور ۱۰ ۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو واپس آئے ۔ تقریباً تین ماہ کا عرصہ انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بسر کیا اور اپنے مشاہدات و تاثرات کو ڈائری کی صورت میں مرتب کرتے رہے ۔

یہ سفر نامہ ماہر کے سوزِ دروں ، جذب و شوق ، حبِ رسولؐ ، توحید پرستی

۱۔ " فاران " اپریل ۱۹۷۳ء ، ص ۲۶ و ایضاً" ستمبر ۱۹۷۷ء ، ص ۳۷

۲۔ ایضاً" ، نومبر ۱۹۷۶ء ، ص ۳۳

۳۔ مطبوعہ حسنات اکیڈمی ، لاہور ، ۱۹۸۷ء ، صفحات ۳۰۴

۴۔ مکتبہ فاران ، کراچی ، سن ۔ ن

اور دیدنی غیرت کا خوبصورت مرقع هے ۔ اس مین عقیدت بھی هے اور جذباتی وارفتگی بھی۔ مگر منفرد بات یہ هے کہ ماهر کے هان جوش اور هوش پہلو بہ پہلو سفر کرتے نظر آتے هین ۔ موصوف دین کا صحیح تصور رکھتے هین اور توحید کو اسلام کی روح سمجھتے هین ، وہ ایک بیدار مغز صحافی هین ۔ تاریخی ، ملی اور سیاسی معلومات رکھتے هین اور عصری شعور سے بہرہ ور هین ، اس لئے کاروانِ حجاز [1] مین متذکرہ موضوعات کے حوالے سے تبصرے کئے گئے هین جو جابجا موتیون کی طرح چمکتے هوئے نظر آتے هین اور قاری کے دل و دماغ کو منور کرتے چلے جاتے هین۔ مثال کے طور پر مکہ مکرمہ کے جوار مین پہنچ کر ان کی سوچ کا دھارا یہ صورت اختیار کرتا هے :۔

" مکہ کی آبادی آ گئی ۔ رات کا وقت هے ایسے مین جو محلہ ، جو پہاڑی اور جو مکان بھی نظر آتا هے ، عقیدت کہتی هے کہ اسے دل مین اتار لیجئے ...... اس پاک اور مبارک شہر کا سب سے بڑا شرف یہ هے کہ یہ انسانیت کے محسنِ اعظم ، دنیا کے سب سے بڑے انسان اور هم سب کے خاتم محمد عربی (فداہ ابی و امی) کا مولد و منشا هے ...... اسی شہر سے حق کی وہ آواز بلند هوئی جس نے باطل کے جسم مین تھرتھری پیدا کر دی ۔ یہ تاریخی شہر نہین ، بلکہ خود ایک تاریخ ساز شہر هے ۔ اس شہر پر تاریخ کا ذرہ برابر بھی احسان نہین هے بلکہ خود تاریخ پر اس شہر کا احسان هے ۔ تاریخ اس شہر سے جانی پہچانی جاتی هے ۔ اگر تاریخ سے مکہ کو نکال دیا جائے تو پھر باقی کیا رہ جائے گا ! "

مدینہ منورہ کے سفر مین ماهر کے احساس کا رنگ یہ تھا :۔

" هم سب سے پچھلی سیٹ پر تھے اس لئے سب سے زیادہ هچکولے همارے هی حصہ مین آئے مگر طبیعت ذرا سی دیر کے لئے جو مکدر هوئی تھی تو ضمیر نے سرزنش اور وجدان نے تنبیہ کی کہ یہ راہِ طیبہ کے

۱۔ کاروانِ حجاز ، ص ۳۶ ، ۳۷

ھچکولے ھین اس پر چین پہ جبین ھونا اس ذوق و شوق کو توھین ھے جو بوسون سے مدینہ کی ببولوں کے کانٹوں کی تمنا کر رھا ھے۔ اس راستہ مین پاؤن لہولہان بھی ھو جائین تو بھی یہ سودا سستا ھی رھے گا "۔[1]

" مدینہ کے دروبام نہین ھین ، روشنی کے مینارے ھین ۔ یہان کی مٹی سچ مچ " خاکِ شفا " ھے اور راستے اور گلیان --- راہِ نجات اور شاھراہِ مغفرت ۔ اس مقدس بستی کی محبوبیت کاعالم کہین لفظ و بیان مین آ سکتا ھے "۔[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری کا مبارک مرحلہ آتا ھے ، تو ماھر اپنے جذبات کی عکاسی یون کرتے ھین :۔

" قصد ھے اور کہان حاضری کا قصد ھے ؟ وہان کا جہان کی تمنا اور آرزو نے بزمِ تصوّر کو سدا آباد رکھا ھے ۔ خوشی کی کوئی انتہا نہین۔ جسم کے روئین روئین سے مسرت کی خوشبو سی نکل رھی ھے ۔ خوشی کے ساتھ ساتھ دل پر ایک دوسرا عالم بھی طاری ھے ۔ یہ چہرہ جس پر گناھون کی سیاھی پھری ھوئی ھے ، کیا حضور نبی کریم علیہ الصلواۃ و التسلیم کے مواجہ شریف مین لے جانے کے قابل ھے ۔ اے آلودہ گناہ! اے سرتاپاقدم معصیت ، اے مجسم گندگی ، اے غفلت شعار! اُن کے حضور جا رھا ھے کہ اللہ تعالٰی کے بعد پاکی، تقدیس ، عصمت اور عظمت بس انہی کو سزا وار ھے "۔[3]

مدینہ منورہ سے ماھر کو جو گہری قلبی محبت ھے ، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے بھی کیا جا سکتا ھے :۔

" یون تو مدینہ کی ھر چیز دلکش و حسین ھے اور مجھے تو یہان کے کتون مین بھی محبوبیت کی ادا نظر آئی ، مگر یہان کا جیسا پانی روئے

۱۔ کاروان حجاز ، ص ۱۲۹
۲۔ ایضاً ، ص ۱۳۲ ، ۱۳۳
۳۔ ایضاً ، ص ۱۳۴

زمین پر کہیں نہ ہو گا ۔ شیرین ، سبک اور خُنک بھی ۔ گرمی کے زمانے میں نل کا پانی صراحی میں بھر دیجئے ۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر میں ٹھنڈا ہو جائے گا ۔ کیا ذائقہ اور لطافت و نظافت ہے ۔ سیر ہو جانے کے بعد بھی گلاس لبوں سے ہٹانے کو جی نہیں چاہتا " ۔

ماہر کا مشاہدہ عمیق ہے اور نتائجِ فکر پر خالص دینداری اور للّہیت کا اثر نظر آتا ہے ۔ چنانچہ حکمت اور بصیرت کا اسلوب جگہ جگہ نظر آتا ہے ۔

* " سمندر جس کی نہ تھاہ ملتی ہے اور نہ اور چھور دکھائی دیتا ہے ۔ اس میں جہاز ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ سمندر کی ایک پُرشور موج اسے تہ و بالا کر سکتی ہے ۔ یہ صرف اللّٰہ تعالیٰ کی قدرت ہے جو جہاز کو تیرا رہی ہے اور موجوں کو اس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ بلند تو ہوتی ہیں ، مگر جہاز کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں ۔ سائنس کی معجز نمائیاں اپنی جگہ برحق ، لیکن سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں کس کی قدرت کا ظہور ہیں "[1] ۔
* پانی اور سایہ کی قدر سچ تو یہ ہے کہ سفرِ حجاز ہی میں ہوتی ہے ۔ یہاں محسوس ہوتا ہے کہ ٹھنڈا پانی اللّٰہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے ۔ ہم کس بیدردی کے ساتھ پانی خرچ کرتے رہتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس کا بھی قیامت کے دن حساب دینا ہے "[2] ۔
* " جدہ میں جو نئی عمارتیں بن رہی ہیں وہ اپنی دیدہ زیبی ، جدت اور تنوع کے اعتبار سے دیدنی ہیں ۔ مغربی تمدن بڑی تیزی کے ساتھ لباس ، موٹر، ریڈیو ، سامانِ آرائش ، کمپنیوں اور کارخانوں کے ذریعہ اپنے قدم جماتا جا رہا ہے ۔ دیکھئے یہ ڈرامہ کیا سین دکھاتا ہے ؟ عرب کی سادگی پر مغربیت نے خدانخواستہ فتح پالی

۱۔ کاروانِ حجاز ، ص ۱۲۱

۲۔ ایضاً ، ص ۱۲۶

تو یہ سودا بہت مہنگا پڑے گا اور یہ ٹوٹے کی تجارت ہو گی - صورت یہ ہے کہ امریکہ والے کروڑوں روپے جو پٹرول کی قیمت ادا کرتے ہیں ، اس قیمت کے کافی حصہ کاسامان بھی یہاں بھیج دیتے ہیں - فیشن کی کونسی چیز ہے ، جوحجاز میں نہیں ملتی - اس فتنہ کی روک تھام نہ ہوئی تو عرب اسی طرح سر پکڑ کر روئیں گے جس طرح وہ انگریزوں سے دوستی اور ترکوں سے بغاوت کرکے آج تک رو رہے ہیں "۔[1]

ماہر توحیدِ کامل و خالص کے قائل ہیں اور بدعات کی ہر صورت سے متنفر - اس حوالے سے متعدد مقامات پر ان کے رشحاتِ فکر نظر آتے ہیں -

ماہر دینِ اسلام کی ایک ایک تعلیم پر جو شرحِ صدر اور یقینِ کامل رکھتے ہیں، ذیل کی تحریروں میں اس کا اظہار بھی ہوتا ہے - علاوہ ازیں وہ تذکیر و تبلیغ کا کوئی موقع بھی ضائع نہیں کرتے -

" اسلام " قیصرو کلیسا " کی تقسیم اور حصہ بندی کا قائل نہیں ہے- اس میں پوری کی پوری زندگی اور ظاہر و باطن کا تمام کا تمام نظام صرف اللّٰہ تعالیٰ کے لئے ہے - زندگی کے کسی شعبہ کو بھی اطاعتِ حق اور بندگئ رب سے مستثنیٰ اور منفک نہیں کیا جا سکتا ، مگر افسوس ہے کہ دین کے اس تصورِ کامل اور اس کے حیات گیر حدودِ عمل کی طرف لوگوں کی توجہ بہت کم جاتی ہے - ہم مسلمانوں میں بہت سے تہجد و اشراق پڑھنے والے ان فیصلوں کو جو صریحاً اسلام کی ضد ہیں ، مان لیتے ہیں اور ایسا کرنے میں ہمارا دل ذرا سی بھی بھچاوٹ/(دکھ) محسوس نہیں کرتا اور کافرانہ نظام اور غیر اسلامی ماحول میں رہتے رہتے فکر و نظر کا اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ اس پر متنبہ کیا جاتا ہے تو لوگوں کو دینِ کامل کی یہ دعوت /اجنبی (اجنبی) سی معلوم ہوتی ہے"۔[2]

۱- کاروانِ حجاز ، ص ۳۳

۲- ایضاً ، ص ۵٦ ، ۵۷

* نعت و منقبت کی شاعری کا کتنا حصہ ہے جس نے مسلمانوں کو عجمی تصورات اور شاعرانہ تخیّلات کے سوا اور کچھ نہیں دیا ۔ اس پر تنقید کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ شاعری کی زبان ہے ۔ یہ میدان ہی دوسرا ہے ۔ یہاں شریعت کا قانون نہیں چلتا ۔ یہ ذوق و شوق اور عشق و محبت کی باتیں ہیں ۔ حالانکہ اللہ کا دین انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے ۔ شعر و ادب کو دین کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا ۔ شاعر اور افسانہ نگار بھی خدا کے یہاں اتنا ہی جواب دہ ہے ، جتنا ایک فقیہ اور فلسفی ہے "۔[1]

ماہر کے اس سفرنامے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں سفرِ حج کی کیا دشواریاں تھیں اور اب وہاں کس قدر آسانیاں پیدا کر دی گئی ہیں[2] ۔ مثال کے طور پر "کاروانِ حجاز" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں بھی مکہ سے مدینہ کا راستہ خاصا تکلیف دہ تھا ۔ بعض مقامات پر پہاڑوں کے اندر باقاعدہ سڑک نہیں بنی تھی ۔ مسافروں کو بس سے اترنا پڑتا تھا اور پہاڑیوں کے اندر چڑھائی کے مراحل پریشان کن تھے ۔ ڈرائیور "بخشیش" کی خاطر حجاج کو تنگ کرتے اور جہاں چاہتے، جتنے وقت تک چاہتے ، بس روکے رکھتے۔ بعض مقامات پر پانی کا حصول بھی مشکل تھا اور اس وقت تک مدینہ میں بجلی اور گیس کی سہولت بھی میسر نہ تھی ۔

المختصر "کاروانِ حجاز" ایمان و یقین ، سوز و گداز ، معلومات آفرینی اور دلچسپی کے اعتبار سے ایسا سفر نامۂ حج ہے جو آج بھی اپنے اندر کشش رکھتا ہے ڈاکٹر انور سدید نے بالکل درست لکھا ہے کہ متذکرہ سفر نامہ :

۱- کاروانِ حجاز ، ص ۲۱۱ ، ۲۱۲

۲- ۱۹۸۹ء میں راقم الحروف کو حج کی سعادت حاصل ہوئی اور اُسے سفر اور ضروریات زندگی کی ان بےپناہ سہولتوں سے بہ نفسِ نفیس مستفید ہونے کا موقع ملا جو چند سال پہلے تک ناپید تھیں ۔

" جذبے کی آنچ سے سلگتا ہوا ادبی کارنامہ ہے ۔ ماہر القادری کا سفرِ حجاز شوقِ فراوان اور سوز و درد مندی کا سفر تھا ، اس سفر میں خارج کی ہر حقیقت ان کے ایمان و ایقان کو پختہ کرنے اور باطن کو منور کرنے میں معاون تھی چنانچہ انہوں نے وجدانِ روح کے ہر محرک کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اور اپنے سرِ نیاز کو عقیدت کی چوکھٹ پر سرنگون کر دیا " [1]

ڈاکٹر انور سدید مزید رقمطراز ہیں :-

" کاروان حجاز " کے اسلوب میں عشقِ رسول ﷺ گندھا ہوا ہے اور یہ شعری اسلوب قرار دیا جا سکتا ہے جس میں گدازیٔ قلب بھی موجود ہے " [2]

سفرِ حج کے تقریباً پندرہ برس بعد ۲۸ مارچ ۱۹۶۹ء کو ماہر ڈربن (جنوبی افریقہ) کی جشنِ نزولِ قرآن کونسل کی دعوت پر عازمِ سفرہوئے اور جنوبی افریقہ کے مختلف شہروں کے علاوہ کینیا ، اٹلی ، سپین ، انگلستان ، پیرس ، جینوا ، استنبول ، بیروت ، دمشق اور حجاز مقدس کی سیاحت کی ۔ چار ماہ کے اس سفر میں جب وہ بیروت سے جدہ پہنچتے ہیں ، تو لکھتے ہیں :-

" وہاں پہنچ کر ایسا محسوس ہوا کہ اب تک تو میں مسافر کی حیثیت سے سفر میں تھا ، اب میں اپنے وطن اور گھر میں ہوں ۔ دین کا رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ قوی اور پائیدار ہے ۔ اس نسبت اور تعلق کے اعتبار سے ایک مسلمان کو سب سے زیادہ ربط ارضِ حجاز ہی سے ہونا چاہیئے "

چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حوالے سے ماہر کا قلم جس والہانہ محبت اور وارفتگی و شوق کا مظاہرہ کرتا ہے ، وہ واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس سفر کے تاثرات

۱۔ اردو ادب میں سفر نامہ " از ڈاکٹر انور سدید ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ۱۹۸۸ء ص ۵۱۰

۲۔ ایضاً ، ص ۵۱۱

خطوط کی صورت میں " فاران " کے جولائی ، اگست اور ستمبر ۱۹۶۹ء ، کے شماروں میں شائع ہوئے - یہ خطوط موصوف نے اپنے چھوٹے بھائی سرور حسین کے نام لکھے تھے - ۲۶ جولائی ۱۹۶۹ء کو ماہر واپس آئے -

۱۳- اگست ۱۹۷۶ء کو ماہر دوسری مرتبہ انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے اور اس ملک کے مختلف شہروں کی سیاحت کرنے کے علاوہ وہ واپسی پر قاہرہ آئے اور پھر حجاز پہنچے کہ اس سرزمین کی زیارت کے بغیر ان کے ذوقِ سفر کی سیری نہیں ہوتی تھی اس سفر کے مشاہدات و تجربات نومبر ، دسمبر ۱۹۷۶ء اور جنوری و مارچ ۱۹۷۷ء کے " فاران " میں شائع ہوئے - " سیاحت نامہ ماہر " میں انہی دو سفروں کی تفصیلات یکجا کر دی گئی ہیں -

ماہر القادری کا زیرِ نظر سفر نامہ کئی سال پرانا ہے ، مگر معلومات اور زبان و اسلوب کی خوبیوں کے اعتبار سے اس میں آج بھی تازگی ، دلچسپی اور ندرت کا پہلو برقرار ہے - خصوصاً جنوبی افریقہ کے بارے میں چونکہ اردو میں سفر نامے نہ ہونے کے برابر ہیں ، اس لئے اس ملک کی معلومات قارئین کے لئے تازہ بھی ہیں اور نادر بھی ، مگر زبان اور معلومات سے بھی بڑھ کر ماہر کے سفرناموں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں ایک دردمند اور بیدار مغز مسلمان کی سوچ اور فکر ہر مقام پر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے اور جہاں وہ ضروری سمجھتے ہیں دعوت و تذکیر کا فریضہ ادا کرنے سے نہیں چوکتے - مثال کے طور پر جو ہنسبرگ میں ایک تقریبِ طعام کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

" میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے دعوتیوں سے کہا کہ چھری کانٹے سے کھانا کھانا شریعت کی رو سے ناجائز نہیں ہے ، مگر کانٹا سیدھے ہاتھ میں لے کر کھانا کھانا چاہئے - الٹے ہاتھ سے کھانا کھانے کی ممانعت آئی ہے - اس پر ان لوگوں نے اپنا اپنا کانٹا سیدھے ہاتھ میں لے لیا - [1]

۱- سیاحت نامۂ ماہر ، ص ۳۵

اسی طرح جہان ماہر القادری کوئی عظیم الشان عمارت دیکھتے ہین ، انسان کے کمالِ فن کا کوئی نمونہ دیکھتے ہین ، یا انہین کوئی خوش منظر جگہ نظر آتی ہے ، تو وہ بےاختیار پکار اٹھتے ہین :-

" ہر تعریف اور حمد و ثنا کی مستحق دراصل اللّٰہ تعالٰی ہی کی ذات ہے کہ اس نے انسان کو اور کائنات کو خلق کیا اور اسی کی دی ہوئی ذہانت اور قوت کے بل بوتے پر انسان اسی (اللّٰہ تعالٰی) کے بنائے ہوئے عناصر و اشیاء مین تصرف و تسخیر اور ایجاد و اکتشاف کا کارنامہ انجام دیتا ہے - جل شانہ و عم نوالہ " -[1]

ماہر کے مزاج مین بڑا انکسار تھا ، مگر دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کبھی کسی احساس کمتری یا (Complex) مین مبتلا نہین ہوئے - انہین اپنے معتقدات پر یقینِ محکم اور اعتمادِ کامل تھا ، اس لئے وہ اپنے سفر نامے مین ہر اس منظر سے بیزار و گریزان نظر آتے ہین ، جو دینی و اخلاقی اعتبار سے مکروہ‌ومردود ہے ، ایک سفر کے حوالے سے لکھتے ہین :-

" پانچ دن کا یہ سفر رہا - سیاحون مین راقم الحروف اور لیبیا کے ایک مسلمان نوجوان کے علاوہ باقی سب یورپین تھے جن مین زیادہ تعداد امریکیون کی تھی - دو ڈھائی گھنٹہ کے بعد جس ہوٹل مین بس رکتی ، یہ لوگ شراب پر ٹوٹ پڑتے - شراب اور لحمِ خنزیر نے ان کے مزاج مین گندگی پیدا کر دی ہے - ظاہری بھی اور باطنی بھی - دیکھنے مین چہرے سرخ و سفید اور اجلے ، مگر علامہ اقبال کے بقول

...... اندرون چنگیز سے تاریک تر[2]

۱- سیاحت نامہ ماہر ، ص ۴۳ ، ۴۴

۲- ایضاً ، ص ۹۸

پیرس کے دریائے سین کو دیکھتے ہیں ، تو یوں تبصرہ کرتے ہیں :-

" دریائے سین شہر میں ہو کر گزرتا ہے - اس کے دونوں کناروں پر شہر کی خاصی آبادی ہے ، مگر لندن کے ٹیمز اور پیرس کے سین کا پانی ان شہروں کے معاشرے کی طرح گندہ اور میلا ہے - پاکستان اور ہندوستان کے دریاؤں کی سی بات نہیں ہے جن کا پانی مقطر اور صاف ہوتا ہے - جسے لوگ پیتے ہیں اور اس میں تیر کر فرحت حاصل کرتے ہیں"[1] -

دعوت و تذکیر اور دینی غیرت کے علاوہ ماہر کے سفر نامے میں مختلف مقامات کے بارے میں قیمتی اور نادر معلومات بھی ہیں اور منظر کشی اور جزئیات نگاری کی خوبصورت اور دلچسپ مثالیں بھی۔اس حوالے سے ذیل کے اقتباسات دیکھئے :-

" اب ہم خاصے گھنے جنگل سے گزر رہے تھے ، نہایت خوبصورت بندر درختوں کی شاخوں پر جھولتے ہوئے دکھائی دیئے - چکارے اور نیل پائے بھی قلانچیں بھرتے نظر آئے - جھیل کے پاس پہنچے تو FLAMINGS ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں سطحِ آب پر تیر رہے تھے۔ان کی کثرت سے کئی میل تک جھیل کا پانی چُھپ گیا تھا جیسے اس جھیل میں کائی کی جگہ پرندوں کو قدرت جما دیتی ہے - ان کو لوگ لگلے کہتے ہیں مگر یہ ملصل و سار کی کوئی قسم ہے - سفید پروں پر گلابی رنگ کتنی بھلی لگتی ہے جیسے ان کے پروں پر ہولی کا گلال لگا دیا گیا ہو - گردنیں اٹھا کر جب ناز سے چلتے ہیں ، تو یہ سماں دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔جھیل کے ایک طرف پہاڑ ہیں اور دوسری طرف جنگل کا رقبہ ایک سو میل سے بھی زیادہ ، سمندر کی طرح جزرومد کی کیفیت - یہاں کی یہ شام بہت دنوں تک یاد رہے گی "[2]

۱- سیاحت نامہ ماہر ، ص ۱۲۱

۲- ایضاً ، ص ۷۴

نیپلز (اٹلی) کے قریب ایک سمندری غار کی سیر کا حال یوں لکھا ہے :-

" کاپری پہنچ کر اسٹیمر بدلنا پڑا - یعنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں مسافروں کو بٹھایا گیا - سمندر اور اس کے کنارے اونچا پہاڑ ، خاصا دلچسپ اور ساتھ ہی ہیبت ناک منظر تھا - پھر چھوٹے چھوٹے ڈونگوں میں چار چار آدمیوں کو سوار کرایا گیا - ساؤتھ افریقہ کی سونے کی کان میں تو صرف خطرے تھے جن میں وہم و خیال تا بھی دخل تھا ، مگر یہاں تو سچ مچ جان جوکھوں کا معاملہ تھا - سمندر ہے ، اونچا پہاڑ ہے ، پہاڑ میں کھوہ ہے - اس کھوہ کے دہانے سے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو گزارا گیا - کتنی عورتوں کی تو چیخیں نکل گئیں ...... ملاح نے جیسے تیسے ہمارا ڈونگا غار کے اندر پہنچایا - وہاں کچھ اور ہی تماشا نظر آیا - پہاڑ کا غار گہرا تھا ، سمندر کا پانی نیلا مگر شفاف ، دسیوں ڈونگے یہاں تیر رہے تھے - اس غار کا بس یہ دہانہ کھلا تھا - راستہ ہر طرف سے بند تھا - تھوڑی دیر کے بعد ہمارا ڈونگا غار سے باہر لایا گیا اور صحیح سلامت واپس آنے پر اللّٰہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا "۔[1]

★ " یہ زمانہ انگلستان کا موسمِ بہار تھا - یہاں ونڈر میر میں فصلِ گل اپنے شباب پر تھی - جھیل کے تین طرف سرسبز پہاڑیاں ، سیاحوں کو سیر کرانے کے لئے کشتیاں اور چھوٹے اسٹیمر ہر وقت تیار رہتے ہیں - جس دن ہم وہاں تھے ، اس دن ترشح نے موسم کو خنک بنا دیا ، مگر ہوا تیز نہیں ہونے پائی ، اس لئے خنکی ناگوار محسوس نہیں ہوئی - مختار سلیم صاحب اپنے ساتھ کھانے اور پھل لے کر آئے تھے ، جھیل کے قریب میدان میں لکڑی کا سائبان تھا ، وہاں ہم نے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا - کھانے کے بعد بمبئی کے مشہور الفانسو آموں نے کام و دہن کو اور زیادہ لذّت اور حلاوت بخشی - گورے لوگ ہم کالوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے - ہمارے کھانے اور بیٹھنے کا انداز ہی ان سے

۱- سیاحت نامہ ماہر ، ص ۹۴ ، ۹۵

مختلف تھا ۔ پھر ہم نے جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی ۔ یہ منظر ان کے لئے اور زیادہ عجیب تھا"[1] ۔

ہمارے متعدد سفر نامہ نگاروں نے یورپ میں مردوں کے اختلاط اور عریاں مناظر کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے بلکہ خود بھی اس حمام میں ننگے ہونے میں کوئی دریغ نہیں کیا ، مگر ماہر ایک با غیرت مسلمان سیاح کی طرح ان مناظر پر اچٹتی نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے ہیں ۔ جنوبی افریقہ کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

" یورپ میں مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط کا جو رواج ہے ، اس کے مناظر یہاں بھی نظر آئے ۔ لباس کی کوتاہی جو بعض اوقات برہنگی کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے ، کوئی معیوب بات نہیں ۔ یونیورسٹیوں میں کم از کم اخلاقی ضابطہ پبلک لائف سے مختلف ہونا چاہیے ، مگر وہاں بھی طلباء وطالبات کو خاصہ بےتکلف دیکھا گیا "[2] ۔

میڈرڈ (سپین) کا ایک منظر :-

" چاروں طرف بلند و بالا اور حسین عمارتیں اور وسط میں فوارے ، بڑے بازار میں مجھ جیسی وضع قطع کا ایک بھی آدمی نہیں ۔ یہاں کسے مرد عورت اور خاص طور سے نوجوان بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور بعض مسکرا بھی دیتے ہیں ۔ قدم قدم پر شراب خانے اور ہر طرف جنسی اختلاط کے حیا سوز مناظر ، شام بہت رنگین شام ، مگر عصمت و حیا کے لہو سے رنگین ۔ شیطان کو پوری طرح چھوٹ ملی ہوئی "[3] ۔

ڈاکٹر وحید قریشی سفر نامہ کے فن کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" (سفر نامہ نگار) لفظوں کی شعبدہ بازی نہیں کرتا ۔ لفظوں کے

۱۔ سیاحت نامہ ، ص ۱۱
۲۔ ایضاً ، ص ٦٨
۳۔ ایضاً ، ص ٨٨

حوالے سے اپنے باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا انکشاف کرتا اور داخل میں وارد ہونے والے ہر تجربے کو لفظوں کی مدد سے جانچتا اور پرکھتا ہے ان تجربات کو محسوس کی سطح پر لانے کے لئے لفظ کے لسانیاتی پیکر ایک نئی کشفی حالت سے دوچار ہوتے ہیں ۔ سفر نامے میں ایسے ایک دو نہیں کئی مقام آتے ہیں ۔ کبھی یہ سفر خارج سے داخل کا سفر ہے یا پھر داخل سے خارج کا سفر "۔[1]

ڈاکٹر مختار الدین احمد کے نزدیک :-

" سفر نامے میں دو خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں ایک تو وہ قاری کے دل میں سیر و سیاحت کا شوق پیدا کر دے اور اگر پہلے سے موجود ہے تو سفر نامہ آتشِ شوق کو تیز کر دے ۔ دوسری یہ کہ منظر کشی ایسی مکمل اور جاندار ہو کہ ہر منظر کی صحیح اور سچی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے "۔[2]

اور ماھر کے سفر نامے متذکرہ دونوں معیارات کے خاصا قریب ہیں ۔ یعنی ان میں خارج کے سفر کی تفصیلات بھی ہیں اور مصنف کے داخل کی تصویر کشی بھی جس کے اثر سے قاری ان تاثرات اور معلومات سے محظوظ ہوتا ہے اور متحیّر بھی ۔ اس کے دل میں متذکرہ مقامات دیکھنے کا شوق انگڑائیاں لینے لگتا ہے اور مختلف مناظر کی تصاویر اس کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں ۔ ایک مکمل سفر نامے کی تعریف میں اگر یہ اضافہ بھی کر دیا جائے کہ سفرنامہ نگار کسی مقام پر اپنا ذاتی اور قومی تشخص فراموش نہ کرے اور مرعوبیت کے کسی منفی احساس میں مبتلا نہ ہو ۔ تو ماھر کے سفر نامے اردو کے منفرد سفرنامے ہیں جنہیں پڑھ

۱- تبصرہ " اے آبِ رودِ گنگا "

از رفیق ڈوگر " معاصر " نمبر ۲ ص ۵۹۹

۲- بحوالہ آج بھی اس دیس میں از محمد حمزہ فاروقی مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۲ء (فلیپ)

معلومات بھی ملتی ہیں اور مصنف کے دینی احساس اور ملی حمیت کا سکہ بھی دل پر بیٹھتا ہے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ جگہ جگہ حِکمت و بصیرت کے موتی بھی چمکتے نظر آتے ہیں ۔

باب ۔۹

ماہر بحیثیت لغت شناس

ماہر کی لغت شناسی کے سلسلے میں وارث سرہندی رقمطراز ہیں :۔

" ماہر القادری ایک ایسے صاحبِ قلم تھے جن کو الفاظ کے استعمال کا سلیقہ آتا تھا ۔ یہ سلیقہ ان کو یوں ہی حاصل نہیں ہو گیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے بہت محنت کی تھی ۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ایک ایک لفظ کی تحقیق اور محلِ استعمال معلوم کرنے کے لیے اتنی کاوش کرتے تھے کہ عام آدمی اس کے تصور سے بھی گھبرا جاتا ہے ۔ پہلے وہ کسی لفظ کی تحقیق میں اپنے پاس موجود کتبِ لغت سے مدد لیتے تھے ۔ اگر تشفی نہ ہوتی تو مقامی اہلِ علم و زبان سے خود مل کر یا فون کرکے اور بیرونی اصحاب کو خطوط لکھ کر اپنا مسئلہ پیش کرتے اور اس کا حل تلاش کرتے ۔ بسااوقات ان کے سوالات اور ان کے جوابات پر ان کے اعتراضات اتنے برمحل ہوتے اور موصوف ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے کہ مجیب بغلیں جھانکنے لگتا ۔ بعض اوقات یہ بحث اتنی طویل ہو جاتی کہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک چلتی رہتی ——— خود مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے ۔ بعض لسانی مسائل پر ان سے مدتوں بحث چلتی رہتی اور میں اکتا جاتا ، مگر وہ کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ہر بار ان کا دم خم پہلے سے زیادہ ہوتا ۔ الفاظ کے صحیح استعمال کا تو ان کو جنون تھا ۔ کسی نے غلط لفظ استعمال کیا اور انہوں نے فوراً گرفت کی۔ اس معاملہ میں وہ کسی رعایت اور مروت کے قائل نہ تھے"۔[۱]

وارث سرہندی مزید لکھتے ہیں :۔ تحقیقِ الفاظ کے اسی شوقِ فراواں نے انہیں لغت شناس بنا دیا تھا۔ ترقی اردو بورڈ (موجودہ نام اردو لغت بورڈ) کے زیرِ

۱۔ " فاران " کراچی اگست ۱۹۸۶ء ، ص ۳۰

ترتیب اردو کی جامع لغت مین ان کو گہری دلچسپی تھی کیونکہ کسی زبان کے لیے کسی جامع اور مستند لغت کی جو اہمیت ہو سکتی ہے، اس سے وہ پوری طرح واقف تھے - اس زمانہ مین بورڈ کا ایک سہ ماہی مجلہ "اردو نامہ" شائع ہوتا تھا - جس مین اس لغت کے اجزاء مسلسل شائع ہوتے تھے - تاکہ اہلِ علم و لسان ان پر اپنی رائے ظاہر کر سکین - اور اس طرح لغت کی خامیان دور ہو سکین - ان اجزا پر " اردو نامہ " کے اوراق مین ان کے تبصرے مکاتیب کی صورت مین محفوظ ہین - ان مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لسانی امور مین ان کی نظر کتنی گہری اور دقیقہ رس تھی "-[1]

" اردو نامہ " مین ان کے مراسلات سے پتہ چلتا ہے کہ جونہی انہین متذکرہ رسالہ ملتا ، وہ فوری طور پر اس کا مطالعہ کرتے اور زبان و بیان اور لغت کے حوالے سے اپنی آراء قلم بند کرتے - اس ضمن مین ان کا ذوق و شوق دیدنی ہے - ہفتہ آدھی ہوتی، مگر وہ " اردو نامہ " ختم کئے بغیر نہ سوتے -[2] " اردو نامہ " کے سابق مینجر مرزا ضیم بیگ لکھتے ہین کہ ماہر بورڈ کے دفتر مین آکر بورڈ کے سیکرٹری اور رسالے کے مدیر شان الحق حقی سے بالمشافہ ملاقاتین بھی کرتے اور تذکیر و تانیث اور تشریح وغیرہ کے سلسلے مین اظہارِ خیال کرتے " ایسے موقعون پر ان کی زبان سے اکثر یہ سنا گیا کہ دوآبہ مین یہ لفظ یون بولا جاتا ہے اور فلان لغت مین یہ یون درج ہے - آپ کی لُغت مین اس بات کی بھی وضاحت ہونی چاہیے - آپ کی لغت مین یہ بات درج ہونی چاہیے- یہ بات بھی یون درج ہونا چاہیئے تھی- یہان اس کا محل تھا - وغیرہ وغیرہ "-[3]

لغت وزبان کے سلسلے مین ماہر احتیاط اور جستجو کا جو غیر معمولی اہتمام کرتے تھے ، مرزا ضیم بیگ کی تحریر مین اس کی ایک دلچسپ مثال نظر آتی ہے:-

---

۱- فاران اگست ۱۹۸۶ء ، ص ۳۰

۲- ایضاً ، ص ۹۱

۳- ایضاً، ص ۲۰

" میرے پاس بورڈ میں ایک مرتبہ ان کا ٹیلی فون آیا اور انہوں نے یہ دریافت فرمایا کہ رانی کیتکی کا پورا نام کیا ہے - میں نے جواب میں پورا نام بتایا تو کہنے لگے ایسے نہیں ذرا کتاب منگوا کر دیکھ کر بتائیے - میں نے کتاب منگوائی اور ٹائیٹل پڑھ کر سنایا اور ان کے اصرار پر دوبارہ پڑھا تو وہ کہنے لگے " ذرا ٹھہریئے میں نوٹ کر لوں - اس پر میں نے پھر پڑھا اور لکھوایا - اس کے باوجود دوسرے روز صبح سویرے ہی وہ ترقی اردو بورڈ کے دفتر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ کل آپ کو زحمت دی ، لیکن میرا اطمینان نہ ہوا - دراصل مجھے اس کتاب کا حوالہ دینا ہے ، اس لیے کتاب کو خود دیکھنا چاہتا ہوں ، کیونکہ اس کے نام میں " کی " کی تکرار مجھے پریشان کر رہی ہے - پھر انہوں نے کتاب دیکھی اور حرف بہ حرف ٹائیٹل نقل کر لیا " کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی از انشاءاللہ خان انشاء دہلوی "-[۱]

اب دیکھیئے " اردو نامہ " کی مراسلت کے حوالے سے ماہر کی لسانیات سے متعلق غیر معمولی دلچسپی ، اہلیت ، نکتہ آفرینی ، عمومی ذہانت و ذکاوت اور ہمہ نوع وسیع معلومات - چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ،

ج " ص ۲۲ - " ابرِ رحمت --- خدا کا بھیجا ہوا بادل " کیا وہ بادل جو زحمت و عذاب ثابت ہوتا ہے ، خدا کا بھیجا ہوا نہیں ، کسی اور کا بھیجا ہوا ہوتا ہے ؟ ابرِ رحمت ہو یا ابرِ عذاب دونوں قسم کے بادل خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں" ابرِ رحمت" کی تشریح میں اس انداز کی عبارت ہونی چاہیئے " ابرِ رحمت خدا کا

۱- مرزا نسیم بیگ ، فاران اگست ۱۹۸۶ء ، ص ۶۰ ، ۶۱

بھیجا ہوا بادل جو زحمت و عذاب کی بجائے نشاط و آسودگی کا سبب بن سکے"۔[1]

" ماہ جون ۱۹۶۷ء کا " اردو نامہ " ملا ، صفحہ ۲۲۲ " پر " احاطہ " کے معنی مین متعدد الفاظ دیئے گئے ہین - یہان تک کہ " گھیرا بھی موجود ہے ، مگر " گھیر " نہین دیا گیا- یہ لفظ " گھیر" احاطہ کے معنی مین لازمی طور پر آدا چاہیئے تھا- یو - پی کےاضلاع مین " احاطہ " کو عام طور پر " گھیر" بولتے ہین -

رام پور مین وہان کےمشہور آدمیون کے بنائے ہوئے احاطے ہین جو " گھیر" کے نام سے مشہور ہین ، یہان تک کہ ان محلون کے نام گھیر ہی کےنامون سے مشہور ہو گئے ہین - مثلاً" گھیر نجوخان -[2]

★ شعبہ لغت کے تحت صفحہ ۱۰۷ پر یہ عبارت نظر آئی = " درس حدیث، طب یا پیش نمازی ، وغیرہ کی اجازت یا سند " اس مین لفظ پیش نمازی غور طلب ہے -

اردو لغات مین بیشک نماز پڑھانے والے کو " پیش نماز " بھی لکھا گیا ہے ، مگر اردو بولنے والے مسلمانون کی اکثریت پیش نماز نہین بولتی ،"امام " بولتی ہے اور " پیش نمازی " یعنی نماز پڑھانے کے عمل (FUNCTION)کو امامت کہتی ہے - اردو لغت مین بھی " امام " اور " امامت " کے یہی معنی لکھے ہین -

شیعہ حضرات البتہ " پیش نماز " بجائے " امام " اور " امامت " کی جگہ " پیش نمازی " بولتے ہین -[3]

۱- فاران اگست ۱۹۸۶ء ، ص ۶۲

۲- ایضاً" ص ۶۳

۳- ایضاً، ص ۳۶

"(۱)بارہ برس بعد کوڑی کےبھی دن پھرتے ہیں" صفحہ ۱۲۶

اصل ضرب المثل یوں ہے

" بارہ برس میں گھوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں"

(۲) بھانڈوں کو دوپٹے اور روپے دل کھول کر انعام دیئے"

بیاہ برات اور خوشی کی تقریبوں میں " دوپٹے " تو ڈومنیوں

کو دیئے جاتے ہیں - بھانڈوں اور میراثیوں کوانعام میں

" دو شالے " دیئے جاتے ہیں -[1]

(۳) ہم نے اپنے گھر میںایسے غصے نہیں دیکھیئے" صفحہ ۱۳۲

اردو میں غصہ کی جمع نہیں آتی -

(۴) " اور سب نے منہ ہاتھ دھویا " صفحہ ۱۳۳

ہاتھ منہ دھویا لکھنا چاہئے تھا -[2]

* اردو کی وسعت و ترقی کے معاملے میں راقم الحروف تنگ نظر نہیں ہے - میں تو " فوق البھڑک " اور لبِ سڑک " کو بھی اس لیے درست سمجھتا ہوں کہ یہ " غلط العام" بن چکے ہیں - اسی طرح عربی ، فارسی ، انگریزی اور ہندی الفاظ میں اردو بولنے والوں کا جو تلفظ ہے ، وہی میرے نزدیک درست ہے - مثلاً اردو کے مَونہ " (ن بالفتحہ) کو " مُونہ " (ن پیش کے ساتھ) اور " سیّد " کو " سیِّد " (زیر کے ساتھ) بولنا خوش ذوقی نہیں ہے -

میں خیال میں ادب صرف " ابلاغ کانہیں " حُسنِ ابلاغ " کا نام ہے - شعرو ادب میں سارا کھیل لفظوں کے صحیح استعمال کا ہے اس میں مشاہیر سے سہو بھی

۱- فاران اگست ۱۹۸۶ء ، ص ۶۵

۲- ایضاً ، ص ۶۶

ہو جاتا ہے اور وہ " سہو " چاہے اس کا ارتکاب میر تقی میر اور سرسید احمد خان ہی نے کیوں نہ کیا ہو ، سند نہیں بن سکتا ۔ اس لیے نقد و احتساب میں بڑی باریک بینی کی ضرورت ہے ۔ ادبی ذوق و وجدان کو نازک و حساّس ہی ہونا چاہیئے ۔[1]

" لا طمع " کے سلسلے میں عرض ہے کہ یہ ترکیب غلط نہیں ہے ، مگر فصیح تر اور سلیس وروان بلکہ روز مرہ " بے طمع " ہے ضرورت ہے کہ آپ نے " لا طمع " کو اس بنیاد پر فوقیت دی ہے کہ یہ دونوں اجزاء عربی میں ہیں ، تو پھر " بے اثر " بے عقل " اور بے ضمیر " کے بارے میں کیا رائے ہے ؟ کیا ان میں بھی " بے " کی جگہ " لا " بولا اور لکھا کریں " بے اور " لا " کے استعمال میں بڑا نازک فرق پایا جاتا ہے ۔ اس کا بہت کچھ تعلق ذوقِ صحیح ، وجدان اور عام استعمال و رواج سے ہے ۔[2]

٭ ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے لکھا ہے :-

"ججمان --- میزبان کے معنوں میں " (صفحہ ۳۲)

سنسکرت یا پراکرت یا اپبھرنش میں " ججمان " کے معنی " میزبان " کے ہوں گے ، لیکن اردو میں " یہ تعظیمی لقب " ہے اور نائی ، کہار ، بھاٹ اور ڈوم ڈھاری ان لوگوں کو جن سے انعام ملنے کی توقع ہوتی ہے ، " ججمان " کہتے ہیں ۔[3]

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے " گٹّا " کے معنی یوں لکھے ہیں :-

" پاؤں پر اکثر جوتی کی رگڑ سے کھال سخت ہو کر گٹھی بندھ جاتی ہے " صفحہ ۷۰ ۔

۱- فاران اگست ۱۹۸۲ء ، ص ۸۰ ، ۸۱

۲- ایضاً ، ص ۸۲

۳- ایضاً ، ص ۸۷

مگر یہ بھی تولکھنا تھاکہ نمازوں میں سجدہ کرتے وقت بار بار کی رگڑ سے ماتھے پر بھی " گٹّا " پڑ جاتا ہے - چکی پیستے ہوئے ہاتھوں میں بھی گٹّے پڑ جاتے ہیں "-[1]

غلام ربانی عزیز صاحب کا مقالہ ناصر علی سرھندی پر ہے - انہوں نے " نتائج الافکار" کے حوالے سے عجیب بات لکھی ہے:-

" جب سیف خان مر گیا ، تو ناصرعلی الہ آباد سے سرھند واپس چلا آیا - ایک دن شہر سے باہر ایک باغ میں چند ہم مشرب احباب کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول تھا - حضرت مجدّد صاحب کا وہاں سے گزر ہوا " (صفحہ ۹۱)

ناصر علی سرھندی کا سن پیدائش ۱۶۳۸ء ہے اور حضرت مجدد الف ثانی ، ناصر علی کی پیدائش سے چودہ برس پہلے ۱۶۲۴ء میں وفات پا چکے تھے - یہ بات تو تھوڑی معلومات رکھنے والے لوگ بھی جانتے ہیں کہ حضرت مجدد صاحب عہدِ جہانگیری کے بزرگ ہیں اور ناصر علی سرھندی عالمگیری عہد کا شاعر ہے - یہ دونوں ہم عصر کس طرح ہو سکتےہیں "-[2]

اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے :

" حضرت بابا فرید الدین شکر گنج اجودھیا تشریف لے گئے "(صفحہ ۹۶) اجودھیا تو فیض آبادکا قدیم نام ہے - بابا فرید الدین شکرگنج اجودھیا نہیں" اجودھن" تشریف لے گئے تھے جو پنجاب میںواقع ہےاور پاک پٹن کا پرانا نام ہے یہیں آپ کا مزار ہے"-[3]

" داخلہ " کی تانیث " داخلی " پہلی‌بار نظر سے گزری ، مگر نوراللغات میں یہ لفظ مل گیا اور میری معلومات میں اضافہ ہوا -[4]

۱- فاران اگست ، ۱۹۸٦ء ، ص ۸۸
۲- ایضاً ، ص ۸۹
۳- ایضاً ، ص ۸۹
۴- ایضاً ، ص ۹۵

" دکانیں لبالب بھری ہوئیں " (صفحہ ۱۱۲)

میرے خیال میں دریا ، نہر ، تالاب ، حوض وغیرہ کے علاوہ برتنوں کے لیے لبالب بولتے ہیں ، مگر مکانوں اور دکانوں کے اوپر تک بھرے جانے کو لبالب نہیں کہتے ۔[1]

" میرانِ تالپور کی شاعری " پر جو مقالہ ہے وہ معلومات افزا ہے۔ اس سلسلے میں اتنا عرض کروں گا کہ بادشاہوں، شاہزادوں، اور امیروں کی شاعری کا مسئلہ مشتبہ ہے۔ ہمارے دور میں نظامِ دکن کے صاحبزادے نواب معظم جاہ بہادر شجیع کی ہزاروں غزلیں دوسرے شاعروں کی کہی ہوئی ہیں ۔ وہ خود ناموزوں طبع واقع ہوئے ہیں ۔ ہز ہائی نس نواب سعادت علی خان والیٔ ریاست ٹونک کی غزلیں حضرت جام کی کہی ہوئی تھیں۔ اتنے اچھے اشعار

ع ۔۔ تری غم کی شکایت کر رہا ہوں ، یہ کیا کفرانِ نعمت کر رہا ہوں ،
انہیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں

تک جام صاحب نے نواب صاحب ٹونک کو کہہ کر دیئے تھے ۔ یہ بات میں پوری طرح تحقیق کے ساتھ کہہ رہا ہوں ۔ تین بار ٹونک جانا ہوا ۔ ہز ہائی نس نواب سعادت علی خان مرحوم کے ساتھ شکار میں بھی سفر کا اتفاق ہوا ۔ ان کے ساتھ تھیٹر بھی دیکھا۔ شرفِ ہمطعامی اور ہم کلامی بھی حاصل رہا ، مشاعروں میں بھی شرکت رہی ۔[2]

" آپ نے یہاں کی ہریس کھائی ہے "۔ (صفحہ ۷۹)

ہریس نہیں ہریسہ عام طور بولا اور لکھا جاتا ہے ۔ یہ مذکر ہے[3]۔

۱۔ فاران اگست ، ۱۹۸۶ء ، ص ۹۵
۲۔ ایضاً ، ص ۹۸
۳ ۔ ایضاً ، ص ۹۹

* "کتابِ زندگی" میں "کُنڈے" کے معنی قوسین میں "جھیل" لکھے ہیں حالانکہ جھیل قدرتی ہوتی ہے اور کنڈ پانی روک کر آبپاشی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ کنڈ کا صحیح ترجمہ Pond , Pool ، پوکھر ، ڈھر اور جوھڑ ہے - مثلاً بلدہ حیدرآباد میں میر جملہ کا تالاب ۔دیدی تال اور بھوپال میں تال یعنی جھیلیں ہیں - ان کو کُنڈے نہیں کہہ سکتے ، کنڈ کا ترجمہ "تالاب" تو ہو سکتا ہے مگر "جھیل" (LAKE) نہیں ہو سکتا -[1]

* آپ کی لغت کے صفحہ ۷۶۳ پر "اڑ بنگا" کے جو معنی لکھے ہیں وہ مزید شرح و وضاحت چاہتے ہیں - یہ لفظ مرکب ہے "اڑ" اور "بنگا" سے - "اڑ" کے معنی آڑے آنا اور روک کے ہیں -"بنگا" کے معنی ہیں بانس ، ڈنڈا ، سونٹا (سونٹا) - راستہ روکنے کے لیے بانس یا ڈنڈے کی وضع کی کوئی لکڑی راستے میں لگا دی (یا ڈال دی) اور کھڑی کر دی جائے ، اس کا نام "اڑبنگا" ہے - چلتے ہوئے کام میں پچر لگانا ، روکنے اور حارج ہونے کے معنی میں یوں بولتے ہیں :

"ٹھیک کام چل رہا تھا ، مگر ایک دوست نے اڑبنگا لگایا "۔[2]

ہاں "اڑ" کے سلسلے میں ایک اور لفظ یاد آیا - "اڑ تک" ---- شاہراہ روڈ ، پگڈنڈی اور معروف راستے کو چھوڑ کر جو راستہ جنگل ، میدان اور کھیتوں میں ہوکر اختیار کیا جائے ، اسے "اڑ تک" بولتے ہیں - لغات میں یہ لفظ مجھے نہیں ملا - مگر میں نے سنا ہے اِس قسم کے الفاظ تحقیق طلب ہوتے ہیں اور تحقیق ہو جائے ، تو "لغت" میں ان کے آنے سے لغت کی قدروقیمت میں اضافہ ہوتا ہے-[3]

۱- فاران اگست ۱۹۸۶ء ، ص ۱۰۰

۲- ایضاً ، ص ۱۰۳

۳- ایضاً ، ص ۱۰۳

* میں نے اپنے متعدد خطوط میں یہ بات کہی ہے کہ متقد میں شعراء ہوں یا نثرنگار ، ان سے بھی زبان و بیان کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ۔ یہ حضرات زبان و روز مرہ میں کوئی شک نہیں سند بھی ہیں ، مگر جہاں غلطی کرتے ہیں ، وہ غلطی سند نہیں بن سکتی ۔ جراُت کا شعر ہے ۔

ـــہ پردہ مت منہ سے اٹھانا زنہار ... خجلہ میں اوسان نہیں رہے گا

" اوسان " متفقہ طور پر جمع ہے ، واحد نہیں ہے ۔ قافیہ (دھیان ، احسان) کی مجبوری کے سبب اوسان کو واحد نظم کیا ۔ مصحفی کا شعر ہے ۔

آتے ہی جب مچاتی ہے ، اس نے چمن میں چخ
دیکھ اس کو ہو گیا ہے ہر گُل کا رنگ فق

اس میں کئی باتیں محلِ غور ہیں ۔ کیا " چخ " جمع بولا جاتا ہے ؟ کیا"چخ مچانا" روز مرہ ہے ۔ عام طور پر " چخ چلی " " چخ رہی " یا " چخ ہوئی " بولتے ہیں۔ پھر قافیہ کی مجبوری اور رعایت کے سبب مصحفی نے " فق " کو فخ " سے باندھ دیا۔ یہ قافیہ کا کھُلا ہوا عیب ہے۔[1]

خواجہ میر درد کا شعر ہے :

ہم فقیروں کی طرف بھی تو نگاہیں دمبدم
پھینکتے جاتے تھے آپ اگر وہ خیراتیں کہاں

خیرات خیر کی جمع ہے بہ معنی نیکیاں اور بھلائیاں ، مگر اردو میں مونث اور مفرد بولتے ہیں ۔ خیرات کی جمع خیراتیں تحقیق طلب ہے ۔ یہاں بھی یہی صورت

۱۔ فاران اگست ۱۹۸۲ء ، ص ۱۰۶-۱۰۷

ھے ۔ خواجہ میردرد کی غزل کے قافیے باتین ، برساتین اور ملاقاتین ھین ۔

ع اور موسم مین جدا مجھ سے رھو تم،تو رھو

پر مری جان نہ کرو موسمِ برسات مین فرق

کیا مصحفی کے اس شعر کو سند بنا کر " فرق کرنا " جدائی اور دُور رھنے کے معنی مین لغت مین لکھا جائے گا ۔

ع باتون نے اس کی ھم کو خاموش کر دیا ،

گو زبان تھی لیکن اب گوش کر دیا (مصحفی)

اگر مصرع ثانی ٹھیک کتابت ھوا ھے ، تو " گوش کر دینا " کیا کوئی اردو محاورہ ھے ۔ اس محاورے کا اب چلن نہین رھا ۔ یہ لفظ متروک ھے ۔ یہ لفظ شاذ بولا جاتا ھے اس کا فیصلہ آپ نہ کرین گے تو اور کون کرے گا ؟مثلاً مصحفی کا شعر ھے ۔

ع یہ حالت ھے کہ دل سینے میں گھبراتا ھے بے موجب

طبیعت پر کدر اپنی آ جاتا ھے بے موجب ،

آجکل " بے موجب " نہین ، " بے سبب " اور " بے وجہ " بولنے اور لکھنے کا چلن ھے ۔ یا تو اس شعر کے " بےموجب " کا لغت مین ذکر ھی نہ کیا جائے اور ذکر آئے تو لکھ دینا چاھیے کہ بے موجب بولنا اور لکھنا اب متروک ھے ۔[1]

★ مین نے اپنے خط مین مصحفی کا شعر درج کیا تھا جس مین " چخ " کا قافیہ " فخ " کیا گیا ھے ۔ یعنی قافیہ کی ضرورت کے سبب فق کو فخ بنا لیا ۔ میرے خط کے بعد حاشیہ مین جرابا" لکھا گیا " مصحفی کے عہد مین " فق ھونا " اور " فخ ھونا "

۱۔ فاران اگست ۱۹۸٦ء ، ص ۱۰۷

دونوں رائج ہوں گے ۔ حضرت یہ " ہوں گے " کیا ؟ تحقیق کے بعد اس کی مثالیں لکھتی تھیں ۔ ۔ فق کا قافیہ فسخ اور خندق کا قافیہ اندک ، اردو میں یہ قافیہ کا عیب ہے ۔ جس کا نام " اکفا " ہے، اسی طرح خبیث کا قافیہ نفیس بھی عیب ہے جسے " اجازہ " کہتے ہیں، محل کاقافیہ بلبل ، قافیے کے اس عیب کو " اقوا " کہتے ہیں ۔ مگر عربی شاعری میں منزل ، مشعل اور قُل ایک ہی نظم میں باندھتے ہیں ۔ عربی عروضِ شاعری میں اختلافِ توجیہہ جائز ہے ۔

مشاہیر و اسلاف ادیبوں اور شاعروں کی غلطی کی توجیہہ و تاویل ہو جائے ، تو بڑی اچھی بات ہے ، لیکن ان کی ہر غلطی کی تائید و توثیق کی کوشش اور ضرورت سے زائد خوش گمانی تحقیقی انداز فکر نہیں ہے ۔[۱]

" ترقیٔ اردو بورڈ " سے جو ماہر القادری کی یہ مراسلت " فاران " کے ستائیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور بیحد دلچسپ ، معلومات افزا اور فکر انگیز ہے ۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ ماہر زبان و بیان کی پیچیدگیوں اور لغت کے مسائل میں غیر معمولی درک رکھتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ سرکاری سرپرستی میں جو لُغت تیار ہو ، وہ ہر اعتبار سے معیاری اورمکمل ہو ۔

لغت میں ماہر کی غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ موصوف کی ان تحریروں سے بھی ہوتا ہے جو " فاران " اور روز نامہ " جسارت " کراچی میں جا بجا بکھری ہوئی نظر آتی ہیں ۔ " جسارت " میں ماہر " زبان و بیان " کے عنوان سے ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے ۱۲ اپریل ۱۹۷۸ء

۱۔ فاران اگست ۱۹۸۲ء ، ص ۱۱۱ ، ۱۱۲

تک ہفتہ وار کالم لکھتے رہے ۔ جس میں انہوں نے اردو الفاظ ، ضرب الامثال اور روز مرہ و محاورہ کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ اس سلسلے کی ضروری تصریحات ذیل میں دی جاتی ہیں :۔

* "دنیا میں جتنے بڑے ادیب اور عظیم شاعر گزرے ہیں وہ سب کے سب زبان و روز مرہ پر پوری طرح قدرت رکھتے تھے ۔ بر محل الفاظ برتنے کا سلیقہ انہیں آتا تھا اور زبان کی نزاکتوں پر ان کی نظر تھی ۔ خیال کا درجہ زبان و اظہار کے بعد کا ہے ۔ بلند سے بلند خیال کو اگر مناسب و موزوں پیرایہ بیان نہ ملے تو اس خیال کی بلندی اور رعنائی غارت ہو جاتی ہے ۔ نظم ہو یا نثر زبان کی صحت ہر حال میں ضروری بلکہ ناگزیر ہے"۔
"فقہ کی طرح زبان میں بھی اجتہاد کے کچھ شرائط ہیں اور ہر ادیب و شاعر مجتہد نہیں ہوتا ۔ ہر زبان کا اجتہاد زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے"۔[1]

* "زبانیں صحرا کے پھولوں اور ہریالی کی طرح فطری طور نشو ونما پاتی اور پروان چڑھتی ہیں ۔ اہلِ زبان الفاظ ، تراکیب ، تانیث و تذکیر ، مصادر اور محاوروں کو جس انداز پر بھی تشکیل دیتے ہیں وہ زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں ۔ ان کا عام رواج ہو جاتا ہے اور انہی کو بولی، روز مرہ اور زبان کہا جاتا ہے"۔

* "زبان کے الفاظ ، محاورے مصادر اور ان کے لواحق و سوابق اور متعلقات یہ سب کے سب عین فطرت اور ضرورت کے مطابق بنے ہیں۔

۱۔فاران جون ، ۱۹۷۵ء ، ص ۲۹

ان کی تشکیل میں مفہوم کی ترجمانی ، ضرورت ، آواز ، سماعت ، نطق و تلفظ ، اور ذوق و وجدان کے تمام محاسن ، خوبیوں اور نزاکتوں کی رعایت رکھی گئی ہے"۔[۱]

* "زبان الفاظ کے مجموعہ کا نام ہے اس لیے یہ بات سوفیصد درست ہے کہ تحریر و تقریر میں الفاظ کا استعمال برمحل ہونا چاہیئے۔ لفظوں کے غلط اور بےمحل استعمال سے زبان میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے - اس طرح بگڑی ہوئی غلط زبان سے جو ادب وجود میں آئے گا - وہ بھی "ادب لطیف" نہیں ، "ادبِ کثیف" کہلائے گا ..... "ادبِ کثیف" تربیتِ فکر و نظر کی ٹریجیڈی ہے - اس قسم کے ادب سے متاثر دماغ ملک و ملت اور معاشرے کو الجھنوں کے سوا کچھ اور نہ دے سکیں گے"۔[۲]

* "اردو زبان کاشمار دنیا کی چند عظیم ترین زبانوں میں ہوتا ہے - اردو ہر علم و فن کی بھرپور ترجمانی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو تلفظ ہر ملک کے بسنے والے اور غیر اہلِ زبان کے لب ولہجہ کی ہم نوائی کرتا ہے اور اردو سیکھنے والے اردو سے بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں - کتنے ہی انگریزوں نے اردو میں شاعری کی ہے اور یہ اردو کی مقبولیت اور محبوبیت کی دلیل ہے - اردو تمام زبانوں کی ہمجولی اور سہیلی ہے کسی زبان کی سوکن نہیں ہے۔

۱- فاران مارچ ، ۱۹۷۷ء ، ص ۲۱

۲- روز نامہ جسارت " کراچی ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء ، ص ۳

* "یہ بھی اردو زبان کا معجزہ ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے، مگر کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے کسی بڑی زبان سے ہیٹی نہیں ہے - اردو کی ثروت میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے - ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سیاسیات اور عمرانیات کی سینکڑوں جدید اصطلاحات اور نئے الفاظ اردو زبان و ادب میں شامل ہوئے ہیں" - [1]

* "اردو بے قاعدہ نہیں ، با قاعدہ اور منظم زبان ہے ناپختہ نہیں ، انتہائی پختہ زبان ہے - ہم اردو زبان کی جامعیت ، ہمہ گیری ، سلاست ، روانی اور دلکشی پر فخر کرتے ہیں - اردو زبان کے محاسن پر جب بھی نظر جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ "دیم ربّانی" زبان ہے" - [2]

* "قاعدہ ہے کہ جس زمانے میں جو مرض "وبا" کی صورت اختیار کر جاتا ہے ، اطبا اور ڈاکٹر اس "وبا" سے بچانے کی سب سے زیادہ فکر کرتے ہیں - آج کل ادیبوں ، شاعروں ، افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں میں زبان سے بے پروائی کا عام چلن ہو گیا ، لہذا میں اپنے تبصروں میں زبان کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر خاص طور پر گرفت کرتا ہوں" - [3]

ماہر اردو میں نئی نئی ترکیبوں اور اصطلاحوں کے مخالف نہیں - وہ اس سلسلے میں کسی جمود کے قائل نہیں ، مگر ان کا موقف ہے کہ اس نوعیت کے اضافے "زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہونے چاہئیں - ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے - اس مزاج کو سمجھنے کی ضرورت ہے" چنانچہ ماہر کے نزدیک "ادب بدلا جاتا ہے ، مگر زبان خود رو پودے کی طرح اگتی ہے ، پروان چڑھتی ہے - کسی بھی زبان میں دوسری زبان کے لفظوں کو کسی سوچی سمجھی اسکیم کے

۱- فاران جنوری ۱۹۷۸ء ، ص ۲۵

۲- ایضاً ، مارچ ۱۹۷۷ء ، ص ۳۲

۳- ایضاً ، اپریل ۱۹۷۱ء ، ص ۵۳

تحت داخل کیا جائے گا ، تو یہ غیر فطری عمل ہو گا ۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اس حماقت کا آغاز کیا تھا ۔ وہ بنگلہ زبان کے لفظوں کو اردو میں ٹھونسنا چاہتے تھے ، مگر ان کی یہ زہریلی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی" ۔[۱]

ان کے خیال میں " ہر زبان کے بنیادی الفاظ کا تعلق الہام و القا سے ہے ۔ اللّٰہ تعالیٰ نے اشیاء کے لیے ان کے نام لوگوں کے دلوں میں ڈال دیئے ۔ مگر الفاظ و تراکیب کے وضع کرنے میں انسان کے ذوق و وجدان کا بہت بڑا دخل رہا ہے ۔ وہ جو علامہ اقبال نے فرمایا ہے ۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

تو اللّٰہ تعالیٰ نے اشیا کے اسماء بنائے اور انسان کے ذوق و وجدان نے اشتقاق و تصرّف کا کارنامہ سرانجام دیا ۔ مثلاً " اردو میں دس کے بعد کے عدد (۱۱) کو ایک (۱) سے اکارہ بنانا چاہئے تھا ، مگر ذوق و وجدان نے گیارہ بنایا ۔ پھر " دو " سے دوارہ " کی جگہ بارہ (۱۲) بنایا گیا ۔ .... " لکھنا " سے " لکھاوٹ " یا " لکھائی " یا " لکھت " بنایا گیا ، مگر " بولنا " سے " بلاوٹ " نہیں " بولی " بنایا گیا " نیل " سے نیلاہٹ مشتق ہے ، مگر " لال " سے " لیلاہٹ " یا " لالاہٹ " کا اشتقاق نہیں کیا گیا ۔ الفاظ کے اشتقاق میں کوئی قاعدہ کلیہ کی حیثیت سے نہیں ملتا ، اس کا تعلق ذوق و وجدان سے رہا ہے "۔[۲]

دیگر زبانوں نے اردو میں آکر کیا صورت اختیار کی ہے ، اس سلسلے میں ماہر لکھتے ہیں :-

---

۱- روز نامہ جسارت ، کراچی ، ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء ، ص ۳

۲- فاران جنوری ۱۹۷۸ء ص ۲۸

" اردو زبان کی یہ خاصیت اورخصوصیت ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کے تلفظ کو بدل دیا ہے ۔ مثلاً انگریزی کے لفظ لینٹرن (LANTERN) کو اردو میں لالٹین بولا اور لکھا جاتا ہے ۔ اسی طرح کیپٹن (CAPTAIN) کو کپتان بنا لیاگیا ہے اور میونسپل کمیٹی کے " سکرٹری " کو " سکتر " سے بدل دیا ۔ عربی کے سَیِّد اور مَیِّت " کی " ی " کو اردو والے " زیر " کے ساتھ بولتے ہیں ۔ اردو میں " مشکور " شکرگزار اور متشکر کے معنی میں مستعمل ہے ۔ یہی صورت لفظ " تابعدار " کی ہے ۔ عربی میں نائی (باربر) کو حلاق اور پچھنے لگانے والے کو " حجام " کہتے ہیں ۔ مگر اردو میں نائی کے معنی میں " حجام " بولا جاتا ہے " نزاکت " " چاہت " بھلمناھٹ " ، " رنگت " یہ اردو کے " تصرفات " ہیں ۔ یہاں تک کہ " لبِ سڑک " اور " فوق البھڑک " بھی اردو روزمرہ میں داخل ہیں ۔ اس قسم کے تصرفات دوسری زبانوں کی گرامر ، تلفظ اور املا کے اعتبار سے چاہے غلط ہوں ، مگر اردو زبان میں وہ صحیح سمجھے جاتے ہیں اور اردو زبان و ادب سے " صحت " کے نام پر ان لفظوں اورتراکیبوں کو دیس نکالا نہیں دیا جا سکتا ۔ اس قسم کی کوششوں سے اردو کے سرمایہ کو بڑا نقصان پہنچے گا " [1]

اسی ضمن میں " غلط العام " پر بحث کرتے ہوئے ماہر لکھتے ہیں :۔

" غلط العام اس لفظ کو کہتے ہیں جو زبان اور گرامر کے اعتبار سے غلط ہوتا ہے مگر اردو بولنے والے خاص و عام اسے بولتے اور لکھتے ہیں ۔ اردو کے غلط العام الفاظ کی اگر تصحیح کی گئی یا ان کو زبان سے خارج کیاگیا تو اردو زبان کے سرمائے کو بڑا نقصان پہنچے گا " [2]

۱۔ فاران نومبر ۱۹۶۸ء ، ص ۳۷ ، ۳۸

۲۔ ایضاً جنوری ۶۷ء ص ۲۶

ماهر نے اس ضمن میں متعدد الفاظ گنوائے ہیں کہ وہ گرامر کے اعتبار سے غلط ہیں، مگر عربی جاننے والے اہل قلم اور زبان دان حضرات بے تکلف لکھتے اور بولتے ہیں ، اس لیے ان کا استعمال درست ہے ۔ مثال کے طور پر " اجنّہ " جن کی جمع کے معنی میں بولا جاتا ہے ۔ حالانکہ عربی میں یہ دراصل جنین کی جمع ہے ۔ اسی طرح تابعدار فوق البھڑک ، راشی (رشوت لینے والے کے معنی ہیں) کاروبار ، مذبح خانہ ، مقروق (قرق کیا گیا) خواہشات ، جنگلات ، فرامین ، مشکور ، اژدھام ، ریل (بہ معنی ٹرین) مرغن وغیرہ غلط العام ہیں اور اردو میں ان کا لکھنا اور بولنا درست ہے۔[1]

اسی ضمن میں مزید لکھتے ہیں :۔

" غلط العام کوئی اصول نہیں ہے جس کو سامنے رکھ کر دوسرے الفاظ وضع کئے جائیں ۔ " فوق البھڑک " درست ہے ، مگر " فوق الچمک " غلط ہے ۔ اسی طرح " شعاعیں " کو بعض اہلِ قلم " شعاؤں " لکھتے ہیں ۔ یہ غلط ہے جمع میں " ع " کو ہمزہ سے نہیں بدلا جا سکتا اور بے خیلِ مرام (خَیل بروزن لَیل) کو بے نِیل و مرام (نیل بروزن چھیل) بولنا اور لکھنا جہالت کی دلیل ہے ۔ نیل اور مرام کے درمیان واوِعطف لانا فاحش غلطی ہے "۔[2]

ماہر بعض تراکیب اور تشبیہات کے حق میں نہ تھے ۔ مثال کے طور پر وہ آنکھوں سے جھیل کی تشبیہ اور زلف وگیسو سے سانپ کی تشبیہ کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :۔

۱۔ فاران جون ۱۹۷۵ء ، ص ۲۵

۲۔ فاران ، جون ۱۹۷۵ء ، ص ۲۵

" ترقی پسندوں نے محبوب کی آنکھوں سے جھیل کو تشبیہ دے کر بڑی بدمذاقی کا ثبوت دیا ہے - جو آنکھ " جھیل " یا " کنوئیں " کی مانند ہو گی وہ کتنی خوفناک ہو گی "[۱]-

گیسو اور مارِ سیاہ کے حوالے سے موصوف رقمطراز ہیں :-

" قدیم شعراء نے گل عارض ، غنچہ دہن ، سرو قد ، شمشاد قامت ، کمان ابرو ، ناوک مژگان ، سیمین بدن ، آہو چشم ، لوح جبین وغیرہ جو ترکیبیں ایجاد کی ہیں - وہ اتنی دلکشی ، جاذبیت اور تازگی رکھتی ہیں کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کے حسن و خوبی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ، مگر راقم الحروف کو محبوب کی زلف و گیسو کو " سانپ " " مارِ سیاہ " " افعی " اور ناگن سے تشبیہ بہت زیادہ کھٹکتی ہے بلکہ میں اسے صحیح نہیں سمجھتا -

" سانپ " ڈرنے کی چیز ہے - " مارِ سیاہ " اور " افعی " سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا - سانپ کے دیکھنے سے وہ خوف پیدا ہوتا ہے جس میں ناپسندیدگی کا جذبہ پایا جاتا ہے .... اس لیے میری رائے میں محبوب کی زلف و گیسو کو " سانپ " سے تشبیہ دینا خوش ذوقی کی دلیل نہیں ہے "[۲] -

ماہر لفظ " مواد " سے کراہت محسوس کرتے تھے کہ اس لفظ کو بولتے ، لکھتے اور پڑھتے ہوئے اس کے اردو معنی پیپ اور پھوڑے پھنسی کی رطوبت -- کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے - اس کے بجائے انہوں نے لفظ " لوازمہ " تجویز کیا - اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں :-

---

۱- فاران جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۵۹

۲- ماہر القادری ماہنامہ " دوام " ناندہ فیض آباد یوپی ، بھارت ، فروری ۱۹۶۹ء ، ص ۷۰۶

" ضرورتاً" کسی ایک آدھ لفظ کے معنی یا واحد و جمع یا تلفظ
میں تبدیلی یا اجتہاد سے نہ تو زبان کا کوئی اصول ٹوٹتا ہے
اور نہ زبان کی ہیئت اور معنویت میں کوئی خرابی واقع ہوتی ہے۔
لوازمہ " کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ پھر " مواد " کی طرح یہ بھی عربی
لفظ ہے ۔ ایک عربی لفظ کو عربی لفظ ہی سے بدلا گیا ہے ۔ عربی
اور فارسی بولنے والوں سے ہمارا خطاب نہیں ہے کہ وہ لفظ
" مواد " کی جگہ " لوازمہ " بولنے اور لکھنے لگیں ۔ ہماری درخواست
اردو کے ادیبوں اور شاعروں سے ہے کہ اگر ان کا ذوق " مواد "
میں ناگواری اور کراہت محسوس کرتا ہے ، تو وہ مواد کی بجا ئے
" لوازمہ " لکھنا اور بولنا شروع کر دیں ۔ اس طرح یہ لفظ (لوازمہ)
چل پڑے گا اور میٹریل کے معنی میں اس کے استعمال کا رواج عام
ہو جائے گا"۔

مگر مشہور لغت نگار وارث سرہندی نے ماہر کے اس استدلال کو قبول نہیں کیا ۔
ان کا خیال ہے کہ " لوازمہ " میٹر (MATTER) کے مفہوم کی صحیح ترجمانی نہیں
کرتا اور اس کا صحیح مفہوم " مواد " ہی سے ادا ہو سکتا ہے ۔ جہاں تک پیپ وغیرہ کے
لیے " مواد " کے استعمال کا تعلق ہے تو یہ مجازی استعمال ہے ۔ کسی لفظ کے مجازی
معنی کتنے ہی مشہور ہوں ، اس کے اصلی اور لغوی معنی بہرحال برقرار رہتے ہیں۔[1]
اس معاملے میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے بھی ماہر سے اختلاف کیا ۔[2]

ماہر کو اُردو لغت و زبان سے جو غیر معمولی دلچسپی اور قلبی وابستگی
تھی ، متذکرہ بالا بیانات کے علاوہ بھی اس کی بہت سی مثالیں نظر آتی ہیں ۔ پاکستان

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۵۳ ، ۲۵۴ و مئی ۱۹۸۵ء ، ص ۲۳

۲- دیکھئے فاران مئی ۱۹۸۳ء ، ص ۸۱

بٹنے کے بعد مقامی زبانون کے اثر سے اردو مین جو بعض نئے الفاظ شامل ہو گئے ہین ماہر کی ان پر بھی گہری نظر ہے ۔[1] ماہر ضرب الامثال مین تصرف کے خلاف ہین ۔[2] تذکیرو تانیث اور املا کے ضمن مین جو بےاحتیاطی ہوتی جاتی ہے اس پر گرفت کرتے ہین[3] اور زبان و بیان کے سلسلے مین ان جدت پرست ادیبون اور شاعرون سے بیزاری کا اعلان کرتے ہین جو نامانوس تراکیب و تشبیہات گھڑتے ہین اور انشاء و معانی مین ابہام و اہمال پیدا کرنے کے شوقین ہین ۔[4] چنانچہ دکھ بھرے انداز مین لکھتے ہین :-

" اندازہ لگا لیجیئے کہ اردو زبان اور اس کے شعرو ادب کو کیا بنایا جا رہا ہے ۔ لکھنے والے غریب اردو کو کن خار زارون مین الجھا رہے ہین ۔ اردو لٹریچر کا حلیہ کیسے کیسے عجیب روپ دھار کر بگاڑا جا رہا ہے ۔ فکرو اظہار مین کوئی ربط ، رشتہ ناتہ اور ہم آہنگی نہین ۔ اگر شعرو ادب مین یہ بگاڑ راہ پا گیا اور اس پر احتساب نہین کیا گیا تو اردو ادب جو باغ و بہار ادب ہے، ایک اجاڑ جنگل بلکہ مرگھٹ بن کر رہ جائے گا ۔"[5]

ماہر دینِ اسلام اور توحید کے بعد الفاظ و زبان کے معاملے مین ناقابل لچک رویہ رکھتے تھے جو اسمٰعیل میناٹی کے الفاظ مین " آخری دنون مین ان کے ذہن پر تقریباً مسلط ہو گیا تھا اور احباب کی خوشگوار محفلین ان کے اِسی ذوق کی بےاعتدالی کے باعث بدمزہ ہو جاتی تہین ۔[6] بلاشبہ ان کی نظر لفظون کے استعمال کی جانچ پڑتال ،

۱- روز نامہ جسارت کراچی ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء ، ص ۳

۲- ایضاً ،

۳- ایضاً ، ۲ نومبر ۱۹۷۷ء ، ص ۳

۴- ایضاً ، ۱۳- اپریل ۱۹۷۸ء ، ص ۹

۵- روزنامہ جسارت کراچی ۱۳- اپریل ۱۹۷۸ء ، ص ۹

۶- فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۰۵

محاورات کی چھانٹیں اور زبان کی نزاکتوں کے اہتمام میں بڑی " دور رس " واقع ہوئی تھی اور اسی ذوق کی وجہ سے وہ شعر و نثر کو کئی پہلوؤں سے جانچتے تھے۔ ان کے نقد و نظر کا ایک معین اور ٹھوس سانچہ تھا ۔ چنانچہ شعری دیوان ہوتا یا کوئی نثری تصنیف ، وہ اس کے حسن و قبح پر تفصیل سے محاکمہ کرتے تھے ۔ وہ دہ مناقب کے بیان میں بخل سے کام لیتے نہ زمائم کی نشاندھی میں رعایت برتتے تھے ۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کی تنقید یا تبصرے میں ذاتیات کا ہرگز عمل دخل نہ ہوتا تھا اور وہ شخصی احساس سے بالا تر ہو کر خالص تنقیدی نقطہ نظر سے نگارشات کا تجزیہ کرتے تھے اور مقصد محض یہ تھا کہ اردو کی معیاری صورت بگڑنے نہ پائے، اسے وسعت و ترقی نصیب ہو اور ہر شعبہ حیات سے متعلق لسانی ضروریات کو یہ زبان احسن طریقے سے پورا کر سکے ۔

.....

ماہر القادری کی تنقید

ماہر القادری کے تنقیدی نظریہ کا اظہار ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے :

" میرا شعر و ادب کے بارے میں ایک خاص نقطہ نگاہ ہے - میرا ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کا ہے کہ جو شعر و ادب میں نگاہ رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ صحتِ فکر کے ساتھ صحتِ زبان بھی ضروری ہے - اگر صرف صحتِ فکر ہو اور صحتِ زبان نہ ہو تو وہ ادب ایک مُردہ اور بے جان ادب ہوتا ہے اور اگر صحتِ زبان ہو ، زبان ہی کا چٹخارا ہو اور فکر میں تمیز نہ ہو ، صحت نہ ہو تو وہ چیز بھی انسانی معاشرہ کے لئے اچھی نہیں ہوتی - دنیا کے جتنے بڑے بڑے شعراء اور ادیب گزرے ہیں ، خواہ وہ فردوسی ہوں ، سعدی ہوں، حافظ ہوں یا نذیر ہوں یا اقبال ہوں اور خسرو ہوں ، شبلی نعمانی ہوں یا حالی ہوں ، یہ سب کے سب زبان و ادب کی نزاکتوں پر نگاہ رکھتے تھے -

شعر و ادب کے معاملے میں میرا ذوق خاص علامہ شبلی نعمانی کا پروردہ ہے ، ایک ہزار ناقد ایک طرف ہوں ، شبلی نعمانی کا ذوق ایک طرف ، جن لوگوں نے شعر العجم کو پڑھا ہے ، جن لوگوں نے موازنہ انیس و دبیر کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ شبلی کتنا ستھرا ذوق رکھتے تھے" -[1]

اس طرح پتہ چلتا ہے کہ ماہر تنقید میں " دبستانِ شبلی " سے تعلق رکھتے ہیں اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ لفظ و معنی کی بحث میں شبلی کا جھکاؤ حسنِ الفاظ پر ہے جنہوں نے ایک جگہ تو صاف فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ " حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے " -[2]

اِسی طرح " شاعری کا مقصد شبلی کے نزدیک یہ ہے کہ اس خود غرضی کی دنیا میں

١- ماہنامہ " پیغام " لندن فروری مارچ ١٩٧٠ء ص ٢٣ ، مضمون "ادب ، بے ادبی اور ذوق کی باتیں " - از ماہر القادری -

٢- اشاراتِ تنقید ، مکتبہ خیابان ادب لاہور ، ١٩٦٦ء ، ص ٢٣١

لوگوں میں شریفانہ جذبات کو زندہ رکھا جائے ۔ یہ کام سائنس نہیں کر سکتی ۔ فلسفہ اخلاق کر سکتا ہے مگر وہ بھی خشک منطقی کاروبارِ استدلال ہے ۔ اس لئے بے تاثیر ہوتا ہے ۔ شاعری سے مادیت کی بجائے روحانیت قائم ہوتی ہے یعنی شاعری روحانی اقدار پر زور دے کر روحانی انقلاب کا ذریعہ بنتی ہے " ۔[۱]

چنانچہ ماہر اپنے " امام " ، " یا " مرشد " شبلی کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں :

" علامہ شبلی کو اللہ تعالی نے وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں تھیں جو ایک ادیب ، شاعر ، ناقد ، مورخ اور مفکر میں ہونی چاہئیں ۔ وہ خود ایک نغزگو شاعر تھے ، مگر افسوس ہے کہ ان کے دوسرے کمالات کے سامنے ان کا یہ کمال دب کر رہ گیا ۔ خاطر خواہ ابھر نہ سکا " ۔[۲]

مزید لکھتے ہیں :

" شبلی کا شاعرانہ ذوق بلند ہی نہیں معیاری تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جس طرح بعض علماء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں عالم اپنی جگہ ایک " امت " کے برابر ہے تو شبلی بھی شاعرانہ ذوق کے اعتبار سے اہلِ ذوق کی ایک پوری امت کے ہم پلہ ہیں " ۔[۳]

چنانچہ شعر العجم پر ایک تنقیدی و تجزیاتی مضمون میں ماہر نے اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار یوں کھل کر کیا ہے :

۱۔ اشاراتِ تنقید ، مکتبہ خیابان ادب ، لاہور ۔ ۱۹۶۶ء ، ص ۲۳۵

۲۔ فاران ۔ مارچ ۶۱ء ص ۳۰ ، مضمون شعر العجم ۔ ایک مطالعہ ۔

۳۔ ایضاً ۔

" شاعری پر تنقید کرنے کے لئے کسی ناقد کا ادیب و انشا پرداز ، ذھین و نکتہ رس اور صاحب مطالعہ ہونا ھی کافی نہین ھے یہ تمام خوبیان تو ایک ناقد مین ہونی ھی چاھین - شاعری کے ناقد کی طبیعت و مزاج کو ان تمام خوبیون کے علاوہ شعر سے خاص مناسبت ہونی ضروری ھے - تنقیدِ شعری کا بہت کچھ دار و مدار ذوق و وجدان پر ھے - اگر کسی ناقد کو شعر پرکھنے کے لئے وجدانِ صحیح میّسر نہین ھے ، تو وہ شعر کے خارجی عوامل پر چاھے شرح و بیان کا ایک طلسم کھڑا کر دے ، مگر اس کا موئے قلم شعر کی حقیقت کو نہین چھو سکتا ایسے ناقد کا حال اس سائنس دان جیسا ھے جس کی قوت شامہ بیکار ہو گئی ہو مگر وہ خوشبو پر کتابون کی مدد سے مضمون لکھتا چلا جائے -

اصنافِ ادب مین سب سے زیادہ لطیف و نازک صنف شاعری ھے - اس لئے اس کے ناقد کا ذوق بھی انتہائی لطیف و پاکیزہ ہونا چاھئے - شیشون اور آبگینون کی کارگاہ مین ایک جوھری اور آئینہ سازی کی ضرورت محسوس ہوتی ھے - ایک آھنگر کا وھان کیا کام" [1] -

تنقید مین " وجدانِ صحیح " اور "ذوقِ لطیف" کی بات انوکھی نہین ھے - ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق دونون اسی موقف کے مؤیّد نظر آتے ھین - سیّد صاحب لکھتے ھین : ادب یا فن مین حُسن کی شناخت کا مرحلہ فلسفیانہ اصول بندی کے باوجود ، ذوق یا تاثر کے ذریعے ھی طے ہوتا ھے " [2] - اور " ذوق ایک ہمہ گیر صلاحیت ھے جس کی ترکیب مین عقل و فکر ، جذبات اور اجتماعی احساسِ تناسب بھی شامل ہوتا ھے" [3] -

اور مولوی عبدالحق کی رائے یون ھے :

" تنقید پر وھی شخص لکھ سکتا ھے اور دوسرون کو ھدایت کر سکتا ھے جس کا تجربہ وسیع اور مطالعہ گہرا اور نظر دور بین ہو - جو نہ صرف ذوقِ صحیح

۱- فاران ، مارچ ۶۱ء ص ۳۰

۲- اشاراتِ تنقید از ڈاکٹر سید عبداللہ ، خیابانِ ادب ، لاھور - ۱۹۶۶ء ، ص ۱۱

۳- ایضاً - ص ۱۵

رکھتا ہو بلکہ دنیائے ادبیات کا شناور ہو - جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور دوسروں کے دل نشین کر سکتا ہو " -[۱]

ایک اور مقام پر ماہر فنِ تنقید کے تقاضوں کے بارے میں اپنا موقف بیان کرتے ہیں :

" تنقید کا فن سچ مچ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے - یہ احساسِ ذمہ داری ، دیانت اور اصابت رائے کے ساتھ ساتھ وسعت مطالعہ بھی چاہتا ہے - فکری اور نظری مطالعہ - کتابوں ہی کا نہیں ، صحیفۂ فطرت کا بھی - تنقید نگار کے فکر و ذہن کا مربوط اور سلجھا ہوا ہونا بہت ضروری ہے " -[۲]

ماہر کی لغت شناسی کے ضمن میں یہ وضاحت سامنے آ چکی ہے کہ موصوف شاعری اور انشا پردازی میں الفاظ کے صحیح استعمال اور حسنِ بیان پر خاص زور دیتے ہیں - اور یہ تقاضہ شبلی ہی کا ایک رخ ہے - اسی سلسلے میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو یوں بیان کرتے ہیں :

" ہمارا ہی نہیں دنیا کے تمام نقادوں اور اہلِ علم کا فیصلہ ہے کہ جو شخص زبان و روزمرّہ پر قدرت نہیں رکھتا اور صحیح الفاظ برتنے کا جسے سلیقہ نہیں آتا ، وہ " عظیم ادیب و شاعر " ہو ہی نہیں سکتا - دنیا کی ہر زبان کا ادب جو " عظیم ادب " کہلاتا ہے وہی ہے جس میں فکر و خیال کے ساتھ اظہار و بیان کا حُسن اور زبان و روزمرّہ کی خوبیاں پائی جاتی ہیں " -[۳]

شبلی ہی کی تقلید میں ماہر شاعری میں " شریفانہ جذبات " اور " سچائی " کی کارفرمائی کو ضروری قرار دیتے اور اس کی بنیاد پر " صالح اور غیر صالح ادب " کی تقسیم پر تبصرہ کرتے ہیں :

۱- بحوالہ اشارات تنقید ، ص ۲۷۴

۲- فاران اگست ۱۵۹ء ، ص ۲۱

۳- ایضاً - اکتوبر ۶۵ء ، ص ۳۰

" صالح اور غیر صالح ادب کا آخری معیار " سچائی " ہے - وہ ادب صالح اور مفید ہے جس کے پڑھنے سے آدمی میں شریفانہ جذبات پیدا ہوں - سیرت و کردار کی پاکبازی کی بنیادوں پر تعمیر ہو جو آدمی کو نیک بناتا اور نیکی کی راہ سجھاتا ہو — اور جس لٹریچر کو پڑھ کر نفسِ ہوس کار کو سہارا ملتا ہو ، جس کے مطالعہ سے سفلی جذبات کی تخلیق ہوتی ہو ، فکر و نگاہ کی عصمت و پاکیزگی پر جن کا برا اثر پڑتا ہو ، وہ غیر صالح ادب ہے چاہے اس پر ترقی ، انقلاب ، سماجی اصلاح اور نفسیاتی تحلیل کے کتنے ہی ٹھپے کیوں نہ لگے ہوں " -[1]

چنانچہ ماہر شعر و ادب میں ہوا وہوس کے بھی خلاف ہیں اور برملا لکھتے ہیں :

" لیلی مجنون ، شیرین فرہاد ، وامق و عذرا ، ہیر رانجھا ، نل اور دمنتی جیسے عاشقوں کی داستانوں نے شعر و ادب کو بہت کچھ دیا ہے ، مگر شاعری میں ہوا و ہوس کا رنگ جہاں زیادہ شوخ اور عریان ہو گیا ہے ، وہاں فن کاری نے سیہ کاری کا روپ دھار لیا ہے " -[2]

الفاظ کے صحیح استعمال اور حسنِ بیان کا جواز ماہر نے دینی حوالے سے بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے استدلال میں خاصا وزن نظر آتا ہے :

" مزہب اور اخلاق چاہتے ہیں کہ چیزیں صحیح طریقہ پر استعمال کی جائیں یعنی جو چیز جس مقصد اور جس غرض کے لئے بنی ہے اس سے ٹھیک وہی کام لیا جائے - تلوار سے اگر کوئی نادان ترکاری کاٹنے لگے ، تو یہ تلوار کا غلط استعمال ہے اور اس طرح ترکاری کے ساتھ انگلیاں کٹ جانے کا بھی احتمال ہے — " الفاظ " بھی صحیح استعمال چاہتے ہیں - بولنے میں ، لکھنے میں ، تقریر میں ، شعر و افسانہ میں ، فلسفہ و منطق میں ، حکایت و مزاح میں ،

۱- فاران اداریہ فاران ستمبر ۴۹ء ، ص ۲

۲- ایضاً - دسمبر ۷۷ء ، ص ۱۸ ، ۱۹

غرض ہر صنف میں اور ہر محل پر لفظوں کو صحیح برتنا چاہیئے - اس لئے لفظ و بیان کی صحت کی کوشش ، نماز روزے کی طرح دینی ضرورت تو نہیں ہے ، مگر اس کی اباحت اور استحباب کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور پھر جب یہ نیت اور یہ ارادہ ہو کہ لفظوں کی صحت کو " مثنوی زہرِ عشق " میں نہیں " مثنوی چراغِ کعبہ " (محسن کاکوروی کی نعتیہ مثنوی) میں اور " لیلی کے خطوط " میں نہیں ، " الجہاد فی الاسلام " میں صرف کیا جائے گا، تو یہ کوشش اور زیادہ نیک اور مفید بن جاتی ہے - حق کے اظہار اور صداقت کی تبلیغ کے لئے دل نشین انداز اور صحیح زبان کام میں لانی چاہیئے اس لئے کہ حُسنِ صحت حق کی بہت بڑی خصوصیت ہے " -[1]

مزید رقمطراز ہیں :

" موجودہ زمانہ میں خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کہ " حق لوگوں کے سامنے آئے تو خوب نکھر کر آئے، ادب و انشاء کی تمام خوبیوں کے ساتھ - سپاٹ تحریریں قرآن اور حدیث کے حوالوں کے باوجود زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتیں " -[2]

ایک زمانے میں " اسلامی ادب " کی بحث بھی مختلف رسائل کے صفحات کی زینت بنتی رہی ہے اور اس سلسلے میں مثبت و منفی آراء کا اظہار کیا جاتا رہا ہے - ماہر ادبِ اسلامی کے گرم جوش پرچارک تھے اور محکم دلائل رکھتے تھے - وہ لکھتے ہیں : " حیرت ہے کہ جو حضرات اسلامی اور غیر اسلامی ادب پر وحدتِ ادب کے ٹکڑے ہو جانے کی طنز فرماتے ہیں، وہ اشتراکی ادب کو کس طرح گوارا کر لیتے ہیں اور انہیں اشتراکی اور غیر اشتراکی ادب میں وحدت کے مجروح ہو جانے کا کوئی خطرہ اور اندیشہ/نظر نہیں آتا - یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ

۱- فاران ستمبر ۵۰ء ص ۳۹ ، مضمون " تلفظ کی غلطیاں "

۲- ایضاً ص ۵۰

اشتراکیت کو تو اس کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ شعر و ادب میں اس کی ترجمانی ہو سکتی ہے ، مگر اسلام کو اس حق سے نہ جانے کیوں محروم کر دیا گیا ہے - یہ لوگوں کی تنگ نظری اور نادانی ہے - اگر اشتراکیت ادب کے قالب میں ڈھالی جا سکتی ہے تو اسلامی افکار بھی ادب کا قالب اختیار کر سکتے ہیں -

اسلامی ادب چونکہ نیکی کا علمبردار اور منبع ہوتا ہے ، اس لئے اس میں بڑا حسن و جمال پایا جاتا ہے - اسلامی ادیب و شاعر کا جمالیاتی ذوق بڑا پاکیزہ اور اعلیٰ ہوتا ہے - شراب نوشی ، سود خواری ، بدکاری ، رشوت ستانی اور اس قسم کی تمام دوسری برائیوں میں جو کشش ہے ، وہ نفس کے غیر فطری تقاضوں کے سبب ہے - اس کشش کا بہت کچھ دار و مدار سفلی جذبات پر ہے ...... نفس کی طرح طرح کی حیلہ سازیوں اور تاویلوں کے بعد بھی ضمیر مطمئن نہیں ہوتا - اس کے برعکس نیکی کا جذبہ لازوال ہے ، اس مسرت کو کوئی جھکولے نہیں ، اس لئے یہ بات عین واقعہ کے مطابق ہے کہ اسلامی ادب ان موضوعات کو پیش کرتا ہے جن میں دائمی مسرت پائی جاتی ہے اور اس سے جوان اور بوڑھے یکساں طور پر اکتسابِ مسرت کر سکتے ہیں -[1]

اس سلسلے میں ماہر " اسلامی ادب " اور " ترقی پسند ادب " کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" اسلامی ادب اور " ترقی پسند ادب " میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے کہ " ترقی پسند ادب " میں معاشرے کی برائیاں اس انداز میں بیان کی جاتی ہیں کہ ان برائیوں سے نفرت کی بجائے دلچسپی اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے - اسلامی ادب میں برائیوں کا ذکر اس طرز پر ہوتا ہے کہ اصل واقعات کے اظہار کے ساتھ وہ برائیاں قاری کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں اور طبیعت ان سے نفرت کرتی ہے " -[2]

۱- فاران جون ۶۵ء ص ۲۲ - مضمون پاکستانی ادب کیا ہے ؟ از ماہر القادری -

۲- ایضاً - ص ۲۵

" ماھر کی تنقید " کے ضمن میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ماہر " ترقی پسند تنقید " سے سخت بیزار تھے اور اردو کے ان نقادوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے جو یورپین نقادوں سے مرعوب ہو کر اپنے مضامین میں نامانوس تراکیب ، اجنبی اصطلاحات لکھ کر اور موٹے موٹے نام گنوا کر قارئین پر رعب گانٹھتے ہیں ۔[1] متعدد مقامات پر انہوں نے اس طبقے سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے :

" ان نام نہاد ترقی پسندوں نے اردو ادب میں فنِ تنقید کی بھی مٹی پلید کر رکھی ہے ۔ ان کے تنقیدی مضامین پڑھئے ، آپ کو محسوس طور پر بے ربطی ، ژولیدگی اور پریشان خیالی نظر آئے گی ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہنا چاہتے ہیں ۔ بس " سماج " ، " پرولتاری " " ، " بورژوا " " پس منظر " ، " قدریں " اور اسی قسم کی چند اصطلاحیں ہیں جو بار بار بیان کی جاتی ہیں اور کچھ نہیں کھلتا کہ لکھنے والے کا آخر منشا اور مقصود کیا ہے ۔ پورا مضمون ایک گورکھ دھندا اور چیستان نظر آتا ہے " ۔[2]

تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یہی بات انہوں نے ایک اور مقام پر بھی دہرائی ہے :

" ادبی نشستوں اور مذاکروں میں دیکھا گیا ہے کہ یہ " ترقی پسند " حضرات عموماً الجھی ہوئی گفتگو کرتے ہیں ۔ دماغی سلجھاؤ کا ان کے یہاں فقدان سا ہے ۔ صوفیوں کے ، مورّخین کے ، فلسفیوں ، نقادوں کے نام گناتے چلے جائیں گے ۔ کچھ تلمیحات بھی ارشاد فرمائیں گے ۔ بعض نقادوں کی عبارتوں کے حوالے بھی دیں گے مگر اس تمام گفتگو سے سننے والوں کے پلّے کچھ نہیں پڑتا " ۔[3]

۱۔ فاران جون ۶۹ء ، ص ۵۶

۲۔ ایضاً اگست ۵۱ء ص ۲۱

۳۔ ایضاً ۔ اکتوبر ۷۶ء ص ۸

ترقی پسند نقادوں کے یکرخہ پن ، تعصب ، تنگ نظری ، دین و اخلاق سے بیزاری اور وطن دشمن رجحانات کا ایک زمانہ شاکی ہے ، چنانچہ ماہر نے بھی اس حوالے سے انہیں آڑے ہاتھوں لیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

" تقریباً پچیس سال سے " تنقید و ادب " پر جن اہلِ قلم کا غلبہ ہے وہ نہ صرف یہ کہ دین و اخلاق سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ اپنے دل میں ایک طرح کی کد رکھتے ہیں ۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ تجارتی منڈیوں کے بھاؤ کی طرح اخلاقی قدریں بھی بدلتی اور اترتی چڑھتی رہتی ہیں ۔ اس دنیا کا کوئی خالق نہیں ۔ یہ کائنات آپ ہی آپ وجود میں آگئی ہے ۔ انسانی حیات کی تمام قدروں کا منبع اور فیصلہ کن عامل " معاشیات " ہے ۔ کھاؤ پیو ، مزے کرو ، عیش اڑاؤ اور مر جاؤ ۔ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ، کسی عمل پر کوئی محاسبہ نہیں ۔

اسی مزاج اور ذہنیت کے اہل قلم نے کچھ اس قسم کی فضا پیدا کر دی ہے کہ کوئی شخص کارل مارکس کی " قدر زائد " کو موضوع قرار دے کر کوئی مقالہ لکھتا ہے تو اسے روشن خیال اور متجدد الفکر سمجھا جاتا ہے ، مگر دوسرا شخص زکوٰۃ کا فلسفہ اپنے مضمون میں پیش کرتا ہے ، تو اس پر قدامت پرستی اور ملائیت کی طنز کی جاتی ہے ۔ شوپن ہار اور ہیگل کے فلسفہ کا شارح " ترقی پسند " ، لیکن غزالی اور شاہ ولی اللہ کے افکار کا ترجمان " قدامت زدہ " ۔

کسی ناول میں پاکبازی ، خدا ترسی اور عفت وتقویٰ کی جھلکیاں ہوں ، تو اس ناول کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے ، مگر اس کے برخلاف کوئی ناول بے حیائی ، ہوا وہوس اور سفلی جذبات کا ترجمان ہو ، تو اس کا لکھنے والا بہت بڑا فنکار قرار پاتا ہے ۔ کتنی بے انصافی ہے کہ نسیم حجازی جیسے عظیم ناول نگار کو صرف اس جرم کی پاداش میں نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ اس فنکار نے اپنے ناولوں میں شرافت و عصمت اور اخلاق و نکو کاری کی ترجمانی

کی ہے اور وہ اسلامی فکر رکھتا ہے۔[1]

اس سلسلے میں ماہر ایک افسوس ناک مثال بھی دیتے ہیں :

کرشن چندر کا ایک افسانہ حال ہی میں نظر سے گزرا ۔ اس میں انہوں نے موہنجو دارو کے آثارِ قدیمہ کو پس منظر قرار دے کر ایک افسانہ لکھا ہے ۔ ان آثار کو کھودتے میں ایک روشنی نکلتی ہے جسے افسانہ نگار نے " خدا " ٹھہرایا ہے ۔۔ تو جو لکھنے والے روشنی کو خدا ٹھہرائیں ، ان کے فن کی تعریف کرتے کرتے زبانیں خشک ہو جائیں ، مگر جو افسانہ نگار " حقیقی خدا " کا اپنی تحریروں میں ذکر کر دیں ، تو ان بیچاروں پر طرح طرح کی پھبتیاں چست کی جائیں ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے ، یہ کیا ذہنیت ہے ، یہ کس طرح کی عصبیت ہے ؟ علم و ادب کی دنیا میں بھی ایسی دھاندلی ہونے لگے ، تو ۔۔۔۔ پھر کسے رہنما کرے کوئی ۔[2]

" ترقی پسند تنقید " کے ساتھ ساتھ ماہر اس ادب پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں منظر عام پر آیا ہے :

" ترقی پسند کے نام سے جو ادب منظر عام پر آ رہا ہے اس میں انسان کو اس حیثیت سے نمایاں کیا جاتا ہے جیسے انسان مذہب کے پیش کئے ہوئے " خدا " کا حریف اور مد مقابل ہے اور اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں خدائی صفات کو معاذ اللّٰہ شکست دے دیں گی اور اس مادی کائنات کے پورے نظام پر کسی غیر مادی طاقت کی نہیں ، بلکہ صرف انسان کی جو مادی طاقتوں کا سرچشمہ ہے ، حکمرانی ہوگی چنانچہ ملحد ادیبوں اور شاعروں نے لا الٰہ الا اللّٰہ کے مقابلہ میں ، لا الٰہ الا الانسان " اپنا کلمہ ایجاد کیا ہے " ۔[3]

۱۔ فاران دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۳ (اداریہ)

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً ۔

ترقی پسند ادب کے حوالے سے ماھر فری ورس (آزاد نظم) کے سخت مخالف تھے کہ ترقی پسند شعراء ھی اس کے موجد تھے - اپنی رائے کا اظہار وہ یون کرتے ھین :

" اردو مین " بلینک ورس " بری طرح ناکام ھو چکی ھے - نہ عوام مین وہ مقبول ھوئی اور نہ خواص نے اسے پسند کیا - بے ردیف و بے قافیہ (بے سر و پا) شاعری مین کوئی تسطیق ، کوئی جاذبیت اور کوئی مزہ نہین - اس مین کسی " فکر " کی ضرورت نہین پڑتی - بس ذرا طبیعت پر زور دیا اور لفظ جُڑتے چلے گئے - شاعری آمد کی حالت مین بھی غور و فکر چاھتی ھے " -[1]

اور یہ کہ :

" قافیہ ردیف اور وزن سے بے نیاز تک بندی اردو شاعری کے مزاج سے ھم آھنگ نہین ھے - علامہ اقبال نے کیسے کیسے نازک فلسفیانہ مسائل وزن ، بحر اور ردیف و قافیہ کے حدود مین رہ کر نظم کئے ھین - " آزاد نظمین " اردو شاعری کے ساتھ مذاق ھین " -[2]

المختصر ماھر جچی تلی ، واضح اور سلجھی ھوئی تنقید کے قائل ھین - وہ لکھتے ھین کہ شعر و ادب " مین ابہام اور الجھاؤ سے مجھے سخت نفرت ھے " -[3] چنانچہ ایک مقام پر اسلام پسند ناقدین کو مشورہ دیتے ھوئے لکھتے ھین کہ وہ زیادہ سے زیادہ مواد (Matter) اور معلومات سے کام لین ، مگر اظہارِ بیان مین حالی اور شبلی کا اسلوب و انداز اختیار کرین تاکہ جو بات ان کے قلم سے نکلے وہ جچی تلی ، واضح اور سلجھی ھوئی ھو " -[4] اور آخر مین ماھر کی اھلِ تنقید و تحقیق کے بارے مین یہ رائے بھی قابل غور ھے کہ " اربابِ تحقیق انصاف دوست اور حق پسند ھوتے ھین " -[5]

۱- فاران نومبر ۵۱ء ص ۵۲

۲- ایضاً فروری ۷۲ء ، ص ۳۸

۳- ایضاً مارچ ۶۳ء ، ص ۳۸

۴- ایضاً ، جنوری ۵۷ء ، ص ۲۵

۵- ایضاً - فروری ۶۹ء ص ۵۱ -

باب ۔ ۱۱

ماہر القادری کی تبصرہ نگاری

کلیم الدین احمد ایک جگہ لکھتے ہیں :

" تبصرہ ایک فن ہے اور فنِ تنقید کی ایک شاخ - اردو میں فنِ تنقید ، اس کے اصول اور اغراض و مقاصد سے صحیح واقفیت نہیں ، اسی وجہ سے اردو تبصرہ نگار میدانِ تبصرہ میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اور اسے فنی حیثیت سے نہیں برت سکتے ، ان کے خیال میں تبصرہ کا مفہوم بے انتہا تعریف یا شدید تنقیص ہے اور یہ تعریف یا تنقیص کسی اصول کے تحت نہیں ہوتی - اگر کسی وجہ سے ، اور یہ وجہ ہمیشہ غیر متعلق ہوتی ہے ، کتابِ زیر نظر پسند ہے ، تو پھر تعریف کی بھرمار ہوتی ہے - اگر ناپسند ہے تو ہجو کی بوچھاڑ ہوتی ہے - دونوں صورتوں میں کوئی سنجیدہ معیار پیشِ نظر نہیں ہوتا اور سمجھ بوجھ صداقت ، حقیقت کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے " ۔[1]

موصوف مزید وضاحت کرتے ہیں :

" تبصرہ کا مقصد کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اور اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ہے " ۔[2]

چنانچہ اس میں شبہ نہیں کہ تبصرہ نگاری کے شعبے میں ایک عرصے تک افراط و تفریط کی وہی حالت نظر آتی ہے جس کی جانب کلیم الدین احمد نے اشارہ کیا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے اور پھر ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور سید ابو الاعلیٰ مودودی نے غیر جانبدارانہ تبصروں کو رواج دیا ۔[3] یا پھر نیاز فتح پوری نے " نگار "

۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر - کلیم الدین احمد ، ادارۂ فروغ اردو لکھنو ۱۹۵۷ء ، ص ۳۰۳

۲۔ ایضاً ۔

۳۔ پروفیسر خورشید احمد " ادبیات مودودی " اسلامک پبلی کیشنز ، لاہور - ۱۹۷۲ء ، ص ۱۲

میں اس سلسلے کا ایک خاص معیار قائم کیا ، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تبصرہ نگاری کا جو بے لاگ ، غیر جانبدارانہ اور اچھوتا معیار ماہر القادری نے قائم کیا ، اس کی مثال اردو تبصرہ نگاری کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی -

ماہر القادری نے کتابوں پر تبصرے یوں تو " فاران " کے پہلے شمارے (اپریل ۱۹۴۹ء) ہی سے شروع کر دیئے تھے ، مگر وہ رسمی اور محض تعارفی نوعیت کے تھے - جولائی ۱۹۴۹ء سے انہوں نے " ہماری نظر میں " کے عنوان سے تنقید و تجزیے کا وہ بے لاگ اسلوب اختیار کیا ، جس نے آگے چل کر خاص شہرت حاصل کی اور جس میں ماہر کا کوئی شریک و سہیم نہ تھا - متذکرہ شمارے سے انہوں نے اس سلسلے کا آغاز ان فقروں سے کیا :

> " جو لوگ تنقید کو صحیفۂ مناقب سمجھتے ہیں ، ان کی خوش فہمیوں کا " فاران " ایک قدم بھی ساتھ نہیں دے سکتا - ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری یہ روش بہت سوں کو ناخوش کر دے گی ، مگر کسی کی ناجائز دلدہی اور غلط خوشی کے لئے ہم اپنی روش میں جھکاؤ پیدا نہ ہونے دیں گے " -[1]

اس طرح ماہر نے نہایت پابندی کے ساتھ " فاران " کے آخری شمارے تک تبصرۂ کتب کے اس منفرد سلسلے کو جاری رکھا اور دو ہزار سے زاید کتابوں پر بھرپور اور جامع تبصرے قلم بند کئے -[2]

ماہر نیاز فتح پوری کے " نگار " کا مطالعہ بدوِ شعور سے کر رہے تھے اور یوں لگتا ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر نیاز کے معیاراتِ تنقید سے متاثر تھے اور بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ نیاز زبان و محاورے کے مسئلے کو خاص الخاص اہمیت دیتے تھے جس کا اندازہ ان کے اس مشہور

۱- فاران جولائی ۱۹۴۹ء ، ص ۵۸

۲- راقم الحروف کے پاس چند شماروں کے استثنیٰ کے ساتھ فاران کا مکمل فائیل (۴۹ سے ۷۸ء تک) موجود ہے اور جن کتابوں پر تبصرے کئے گئے ہیں ان کی تعداد ۲۱۴۴ بنتی ہے -

نقی سے ہوتا ہے کہ " شاعر پیدا ہوتا ہے ، بنتا نہیں لیکن اگر شاعر اسی نظریے پر بھروسہ کر کے شعر کہے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے "۔[1] چنانچہ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"نیاز کو اصرار ہے کہ کامیاب شاعری کے لئے زبان کی صحت اور بیان کی کامیابی ناگزیر ہے اور " ادب کے لباس یعنی زبان و بیان کو بہ ہر حال حسین ہونا چاہیئے " ۔[2]

ماہر بھی اپنی تنقید میں اسی اسلوب و پیرائے کو اختیار کرتے ہیں اور صحتِ زبان کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ ماہر کا رویہ نیاز کے برعکس[3] لچک دار اور متوازن و معتدل ہے اور جونہی کسی نے دلائل کے ساتھ ان کے موقف کی کمزوری واضح کی ہے، انہوں نے اسے بلا تامل نہ صرف قبول کیا ، بلکہ " فاران " میں اس کا اعلان بھی کر دیا ۔

وارث سرہندی تبصرہ نگاری کے لئے تین شرطوں کی پابندی لازمی قرار دیتے ہیں " پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے ۔ دوسری یہ کہ تبصرہ نگار کو زیرِ تبصرہ کتاب کے موضوع پر عبور ہو اور تیسری شرط یہ کہ تبصرہ نگار دیانت دار ہو اور کتاب کے مطالعہ سے جو اثر اس کے ذہن نے قبول کیا ہے ، اسے کسی رو رعایت کے بغیر مدلل انداز میں بیان کر دے " ۔[4]

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماہر کے ہاں ان تینوں شرائط کی کماحقہٗ پاسداری نظر آتی ہے۔ وہ زیرِ تبصرہ کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھتے اور نفسِ مضمون پر غور کرتے ۔ اگر موضوع پر عبور ہوتا تو فبہا ، ورنہ اس موضوع سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ہر ذریعہ اختیار کرتے ۔ احباب کو ٹیلی فون کرتے ، دوستوں کو خط لکھتے اور بسا اوقات چل کر جاتے ۔

۱۔ پیش لفظ ۔ مالہ وما علیہ ۔ از نیاز فتح پوری ۔ مکتبہ نگار لکھنؤ ۱۹۶۸ء، ص ۵

۲۔ بحوالہ " مباحث " از ڈاکٹر سید عبداللہ ، علمی کتاب خانہ لاہور ، ۱۹۷۹ء ، ص ۳۸۷

۳۔ دیکھیئے " مباحث " از ڈاکٹر سید عبداللہ ۔ ص ۳۸۵

۴۔ فاران مئی ۸۳ء ص ۳۲

اور جب تک مطمئن نہ ہوتے ، چین نہ لیتے - ڈاکٹر ابو الخیر کشفی لکھتے ہیں کہ " کسی لفظ کا تلفظ اگر ان کے لئے الجھن پیدا کرتا تو وہ ہر ملنے والے سے پوچھتے کہ آپ کے ہاں اسے کس طرح بولتے ہیں - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہر صاحب مختلف علاقوں کے تلفظ کو بھی اہمیت دیتے تھے اور ان کو بھی سند ماننے میں ذرا تامل نہیں کرتے تھے " -[1]

اور پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ :

" تبصروں کے سلسلے میں ماہر بڑی محنت کرتے تھے۔ نہ صرف کتاب کا لفظ لفظ پڑھتے، بلکہ موضوع سے متعلق دیگر کتب کا بھی مطالعہ کرتے - ضرورت پڑتی تو احباب سے معلومات حاصل کرتے -[2] اور وارث سرہندی کے بقول ماہر القادری کو الفاظ کی تحقیق کا شوق جنون کی حد تک تھا - کسی لفظ کی صحت میں ذرا سا شبہ پڑ جاتا تو اہلِ علم دوستوں کو خطوط لکھتے ، مقامی احباب کو فون کرتے اور اس تحقیق و جستجو میں میلوں کا سفر کرتے اور اس وقت تک کوشش جاری رکھتے جب تک اطمینان نہ ہوتا " -[3]

تبصرے کے لئے جو کتابیں آتیں ، ماہر ان کا حرف حرف پڑھتے اور بالعموم بھرپور اور مبسوط تبصرہ کرتے وہ عجلت اور روا روی میں تبصرہ کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ بغور مطالعہ کرنے کے بعد کتاب کے حُسن و قبح پر رائے زنی کرتے اور اپنے موقف کی تائید میں بہت سی عبارتوں کو نقل کرتے تاکہ قارئین پر ان کے دلائل بخوبی واضح ہو جائیں -

بقول حبیب احمد صدیقی زبان و بیان اور موضوعات کے حوالے سے اغلاط کی تلاش میں وہ جس محنتِ شاقّہ کا مظاہرہ کرتے تھے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اردو اپنی اصل اور صحیح حالت میں محفوظ رہے اور تاریخ اور عقائد میں کچے پکے خیالات کی ملاوٹ نہ ہونے

۱- فاران مئی ۸۳ء ص ۵۱

۲- ایضاً - دسمبر ۷۸ء ص ۳۳۰

۳- ایضاً - ص ۳۵۷

پائے کہ اگر غلطیوں پر ٹوکنے والا کوئی نہ ہو تو زبان اور عقائد کا حلیہ بگڑ جائے گا اور سچ جھوٹ اور کھرے کھوٹے میں امتیاز ختم ہو جائے گا ۔[1]

اپنے تبصروں کے بارے میں خود ماہر نے یوں وضاحت کی ہے :

" ہم سرسری تنقید اور چلتے ہوئے ریویو کے قائل نہیں ہیں۔ ہم کیا کہیں کہ وقت کا کتنا حصّہ کتابوں کے مطالعہ کی نذر ہو جاتا ہے ۔ اس معاملہ میں ہم نے ذاتی تعلقات کی بھی پروا نہیں کی اور نہ کسی مشہور شخصیت سے مرعوب ہوئے ۔ ہم نے جس کسی کی بات کو قابلِ اعتراض سمجھا ، اس کے اظہار میں کمزوری نہیں دکھائی تنقید کے سلسلہ میں ہمارے یہاں جو خطوط آئے ، ان کو بھی ہم نے اپنے رسالہ میں شائع کیا اور اپنی غلطی کو کھلے دل کے ساتھ مان لیا " ۔[2]

زبان و بیان کے سلسلے میں ماہر کی دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک شعر پر اعتراض کیا کہ " سر میں خاک ڈالنا غلط ہے ۔ خاک کے لئے " سر پر ڈالنا " بولتے ہیں "۔[3] لیکن اس کے جواب میں ایک صاحب نے توجہ دلائی کہ سر میں خاک ڈالنا بھی درست ہے اور ثبوت میں مومن کا یہ شعر پیش کیا کہ ؎

سُرمگیں چشم کی گردش جو نہ بھا جاتی تو
خاک یوں کا ہے کو ہم ڈالتے سر میں پھرتے

اس پر ماہر نے بر صغیر کے اُنیس مختلف نامور اہلِ قلم حضرات سے رابطہ قائم کیا اور ان کی آراء حاصل کیں جن میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ، مولانا عبدالماجد دریا بادی ، اثر لکھنوی ، نوح ناروی ، رشید احمد صدیقی ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ،

۱۔ فاران مئی ۸۲ء ص ۲۳
۲۔ ایضاً اداریہ فاران مارچ ۵۲ء ص ۶
۳۔ ایضاً اپریل ۶۲ء ص ۵۳

شاہ معین الدین احمد ندوی ، علامہ عرشی رامپوری اور شاہد احمد دہلوی جیسے حضرات شامل تھے ۔ سب نے " سر پر خاک ڈالنا " کو صحیح قرار دیا ، البتہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھا کہ میر امن نے " باغ و بہار " میں " سر میں خاک ڈالنا " بھی استعمال کیا ہے ، اس پر ماہر نے اپنی بے خبری کا اعتراف کیا اور معذرت کی ۔ تاہم یہ وضاحت کر دی کہ " سر میں خاک ڈالنا " اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے بولتے اور لکھتے تھے ، مگر اب " سر پر خاک ڈالنا" مشہور ، مانوس ، زیادہ صحیح اور فصیح تر ہے " ۔[1]

صحتِ زبان کے سلسلے میں ماہر غیر معمولی حد تک حسّاس واقع ہوئے تھے ۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" اردو ادب میں آجکل " زبان " محاورہ اور روزمرہ سے غفلت اور بے پروائی کی رو چل پڑی ہے اور یہ مرض اب وبا کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے ۔ اس لئے " فاران " میں جن کتابوں پر تبصرہ ہوتا ہے ، ان میں زبان و روزمرہ کے تسامحات پر خاص طور سے گرفت کی جاتی ہے " ۔[2]

اپنے تبصروں کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے ماہر ایک بنیادی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

" میں تو اپنی تنقید میں سب سے زیادہ اسلوب اور زبان کی صحت پر زور دیتا ہوں ---- اس زمانے میں ادیب اور شاعر عام طور پر زبان کی صحت سے بے پروائی برتتے ہیں ۔ میں تو زبان کی صحت ، الفاظ کے برمحل استعمال اور روزمرہ کی سادگی کو مقدّم خیال کرتا ہوں " ۔[3]

اور " وجدانِ صحیح " کے نزدیک صحتِ زبان کی جو اہمیت ہے ، اسے ایک خوبصورت مثال سے واضح کیا ہے :

۱۔ فاران ستمبر ۶۲ء ص ۳۱

۲۔ ایضاً ۔ ستمبر ۶۳ء ص ۲۶

۳۔ انٹرویو ماہر القادری ماہنامہ " سیارہ " لاہور نومبر ۱۹۶۳ء ، ص ۲۷

"جس طرح آنکھ میں باریک تریں ذرہ بھی کھٹکنے لگتا ہے اور جب تک وہ نکل نہ جائے ، آدمی کو چین نہیں پڑتا ، یہی حال زبان اور روزمرہ کا ہے کہ اس باب میں زرا سی غفلت ، بھول چوک اور سہو بھی وجدانِ صحیح کو بے چین کر دیتا ہے" -[۱]

ماہر نے شعری مجموعوں پر نسبتاً تفصیل سے تبصرے لکھے ہیں یا پھر تصوف ، سوانح اور تاریخ پر خصوصی توجہ دی ہے - بہرحال ادبی زبان و بیان ، واقعات اور عقائد کے حوالے سے جہاں بھی کوئی خامی نظر آتی ہے ، اس کی نشاندہی کی ہے اور تاریخی واقعات کے ضمن میں غلطیوں، عقائد کی خامیوں اور نظریاتی مغالطوں پر تنقید کی ہے - حقیقت یہ ہے کہ وہ کہیں سے بھی احتساب کا فریضہ انجام دیئے بغیر نہیں گزرے -

ماہر نے ایک جگہ تنقید و تبصرہ کے سلسلے میں اپنے موقف کو یوں بیان کیا ہے :

"تنقید کو ہم نے تحسین و ستائش سمجھا ہے اور نہ عیب جوئی و نکتہ چینی- تنقید ہماری نظر میں ایک کسوٹی ہے جو کھوٹے اور کھرے کو پرکھتی ہے - ہمارے ذوق ، وجدان اور علم و مطالعہ کی کسوٹی جو کچھ پرکھ کر بتاتی ہے ، اس کے اظہار میں ہم کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور اظہارِ حق میں کسی کی خوشی اور ناخوشی کی ہمیں پروا نہیں ہوتی - یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہماری رائے غلطی کر جائے ، مگر دانستہ طور پر ہم نہ تو خوب کو ناخوب کہتے ہیں اور نہ کسی کی کمزوری پر تحسین و ستائش کا ملمع چڑھاتے ہیں" -[۲]

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماہر کا یہ دعویٰ ان کے تبصروں میں جاری و ساری نظر آتا ہے اور جس انصاف ، توازن ، غیر جانبداری ، بے باکی اور جرأت مندی سے موصوف نے مختلف کتابوں پر تبصرے کئے ہیں اس پر وجدان تعریف کئے بغیر نہیں رہتا - وہ واقعۃً کسی

۱- فاران اپریل ۶۴ء ص ۲۹

۲- ایضاً جنوری ۵۸ء ص ۲۱

بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے اور تسامحات کے سلسلے میں انہوں نے کسی سے کوئی رعایت نہیں برتی - حتٰی کہ اس ضمن میں انہوں نے مولانا مودودی تک کا کوئی لحاظ نہیں کیا - ماہر القادری مولانا مودودی سے غائت درجے کی محبت رکھتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے موصوف محترم کی تعریف اور مدافعت میں نہ صرف بہت سے اداریے اور مضامین لکھے بلکہ متعدد نظموں میں بھی اُنہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے - چنانچہ مولانا مودودی کی تفسیر " تفہیم القرآن " جلد چہارم پر ماہر نے تیس صفحے کا طویل تبصرہ تحریر کیا جس میں اس تفسیر کی ایک ایک خوبی کا ذکر کیا ، مگر کمال دیانت اور جرأت سے انہوں نے مطالب و زبان کی مبیّنہ خامیوں کی بھی نشاندھی کی -[1]

ماہر کی انصاف پسندی کا معاملہ یہیں تک محدود نہیں ، بلکہ موصوف نے تو اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کیا - ان کے تنقیدی شعور اور خود احتسابی کا یہ عالم ہے کہ کراچی کے ایک ماہنامہ رسالے " گرد و پیش " کے خاص نمبر میں ماہر کی ایک نظم شائع ہوئی- " فاران " میں اس خاص نمبر پر تبصرہ شائع ہوا ، تو ماہر نے خود اپنی نظم کی ایک خامی پر گرفت کرتے ہوئے لکھا کہ ماہر القادری کی نظم میں " نگاہ " کو " چشم " کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو قابلِ غور ہے -[2]

اسی طرح لاہور کے رسالہ " ہم قدم " میں اپنی ہی ایک نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : " ماہر القادری کی نظم کے دوسرے شعر ---

پھر اس پہ حسنِ بصیرت ، کمال دیدہ وری

میں " کمال دیدہ وری " کی جگہ کوئی زیادہ حسین و موزوں ترکیب آتی ، تو شعر میں خاطر خواہ روانی پیدا ہو جاتی " -[3]

۱- دیکھئے فاران مئی ۶۷ء ص ۲۹ تا ۵۲

۲- فاران اکتوبر ۶۵ء ص ۲۹

۳- ایضاً مئی ۶۷ء ص ۳۸ ، ۳۹

" ماهنامہ " سیارہ " لاہور میں ماہر کی غزل چھپی ، کسی نے اس پر تنقید لکھی ، اس پر ماہر نے مدیرِ " سیارہ " کو خط لکھا :

" میں نے اپنی غزل پر تنقید پڑھی اور لُطف اندوز ہوا ۔ داد و ستائش کے ہجوم میں ایسے ناقد اور محتسب نہ ہوں ، تو دماغ متوازن نہ رہے " ۔[1]

تنقید و تبصرہ کے سلسلے میں احتساب اور انصاف کا جو کڑا معیار ماہر نے قائم کیا ، اس کی جانب وہ یوں اشارہ کرتے ہیں :

" کیا کروں نقد و تبصرہ اور محاکمہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عدالت کے جج کی کرسی پر بیٹھا ہوں اور کسی کی رو رعایت کئے بغیر عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے ۔ اس صاف گوئی کی بدولت مجھے گالیاں بھی کھانی پڑی ہیں اور لوگوں کی دشمنی بھی مول لی ہے " ۔[2]

چنانچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماہر ایک بےرحم نقاد ہیں ، وہ جتنی شدید گرفت کسی کمیونسٹ کی کتاب پر کرتے ہیں ، اس سے کہیں زیادہ تنقید اپنے ہم نظریہ و ہم مسلک حضرات کی کتابوں پر کرتے ہیں ۔ مولانا مودودی کے علاوہ انہوں نے نعیم صدیقی جیسے گہرے دوست سے بھی رعایت نہیں کی ۔ ان کے " مجموعہ کلام " " شعلۂ خیال " پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے تحسین و تعریف میں بھی کسی بخل سے کام نہیں لیا ، مگر خامیوں کی نشاندھی بھی جراٴت و بے باکی سے کی ۔[3] اس سلسلے میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر یوں بیان کیا ہے :

" وہ حضرات جن کا شمار مشاہیر میں ہوتا ہے اور جن سے راقم الحروف کے روابط بھی ہیں ، ان کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ذہن و فکر کو شدید کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ محبت آمیز روابط کے تقاضے تسامحات (یا مسامحات) سے درگزر کا مطالبہ کرتے ہیں ، مگر نقد و نظر کی ذمہ داریاں عدل و انصاف کا تقاضا کرتی

۱۔ ماھنامہ " سیارہ " لاھور مارچ ۶۳ء ص ۷۵

۲۔ " سیاست نامہ ماہر " مرتبہ طالب ھاشمی ۔ حسنات اکیڈمی لاھور ، ۱۹۸۷ء ، ص ۵۱

۳۔ فاران مئی ۵۵ء ص ۴۳ تا ۵۵

ھین - ھم اٹھائیس برس سے مقصد و نظر کی ذمہ داریون کو نباہ رھے ھین اور عدالت کے ایک جج کی طرح ناقد کے عادلانہ فرائض انجام دے رھے ھین - ھماری اس روش نے بعض شاعرون اور ادیبون کو ھم سے برھم بھی کر دیا ھے ، مگر ھم کسی کی ناخوشی اور برھمی کے خوف سے سامحات اور غلطیون سے صرفِ نظر نھین کر سکتے " -[۱]

ماھر کی انصاف پسندی اور مکمل غیر جانبدارانہ تنقید کا اندازہ کرنے کے لئے تین مثالون پر اکتفا کرتا ھون :

ماھر منکرین حدیث کے سخت مخالف تھے اور " فاران " کے متعدد اداریے اور مضامین اس کے شاھد ھین ، مگر وہ دشمن کے لئے بھی ایسی زبان پسند نہ کرتے جو وقار سے گری ھوئی ھوتی - چنانچہ ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ھوئے لکھتے ھین :

" یہ کتاب پرویز صاحب کی تصنیف " قرآنی فیصلے " کے جواب مین لکھی گئی ھے - کوئی شک نھین کہ لکھنے والے کی نیت نیک ھے اور مدافعتِ دین کے جذبہ نے فاضل مولف سے یہ کتاب لکھوائی ھے - مسٹر پرویز نے قرآنی آیتون کی شرح و ترجمانی مین جو تحریف و تلبیس کی ھے ، اس کی قلعی بھی خوب خوب کھولی ھے ، مگر افسوس ھے کہ طنز و تشنیع کی بھر مار نے کتاب کی افادیت کو مجروح کر دیا ھے - اور کہین کہین تو زبان اتنی درشت اور لہجہ اس قدر تلخ ھو گیا ھے کہ کتاب کی سنجیدگی مجروح ھو جاتی ھے " -[۲]

حبیب جالب معروف کمیونسٹ شاعر ھین جنھون نے کارل مارکس ، لینن اور روس کی تعریف مین نظمین لکھی ھین ، لیکن ماھر کی وسعتِ ظرفی قابلِ داد ھے کہ موصوف نے جالب کی شاعرانہ صلاحیتون کی برملا تعریف کی اور کسی تعصب کو آڑے نھین آنے دیا - لکھتے ھین :

۱- فاران ، نومبر ۶۷ء ، ص ۳۶

۲- ایضاً - جولائی ۵۵ء ص ۴۷ ، ۴۸

" حبیب جالب کا شمار " شعر گوؤں " مین نہین بلکہ " شاعرون " مین ہوتا ہے - انہون نے کسی پروپیگنڈے کے بغیر اپنی شاعرانہ صلاحیتون کے بل بوتے پر ترقی کی اور نام پیدا کیا ہے ------ بہت سے شاعر سالہا سال کی مشق کے بعد بھی اپنا کوئی آہنگ پیدا نہین کر سکتے ، مگر حبیب جالب نے بہت سے بہت آٹھ سال کی مدت مین غزل مین " اپنا آہنگ " پیدا کر لیا " -[۱]

ماہر خود مہاجر تھے - دلّی مین ان کا نو تعمیر مکان جلا دیا گیا ، وہ لٹ پٹ کر بڑی مشکلون سے پاکستان پہنچے ، مگر سیّد ہاشمی فرید آبادی کی کتاب " تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت " پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین :

" صاحبِ تالیف نے حیدر آباد دکن ، بہار ، یو پی ، دہلی اور مشرقی پنجاب مین مسلمانون پر ہندوؤں اور سکھون کے جن درد انگیز مظالم اور قتل ، غارت گری اور عصمت دری کے واقعات کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً درست ہین اور ---ہ

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین

مگر مغربی پنجاب کے فساد اور واقعات سے وہ نظرین بچا کر گزر گئے ہین - مغربی پنجاب مین مسلمانون نے صرف مدافعت پر ہی قناعت نہین کی ، ان کے حملے جارحانہ بھی تھے - انہون نے غیر مسلمون پر جو زیادتیان کی ہین اور غیر اسلامی حرکتین ان سے سرزد ہوئی ہین، قیامت کے دن ان کی جوابدہی سے وہ شاید بری نہین ہو سکتے " -[۲]

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ماہر نے تنقید کے سلسلے مین کبھی ضد کا انداز اختیار کیا نہ کسی معاملے کو عزت کا مسئلہ بنایا بلکہ جب کسی جانب سے توجہ دلائی گئی اور ثابت ہو گیا کہ ان کی رائے درست نہ تھی ، تو انہون نے اپنی غلطی تسلیم کی اور " فاران " مین باقاعدہ اس کا اعلان کر دیا - مثال کے طور پر جگن ناتھ آزاد نے " لتاڑنا " پامال کرنے کے

۱- فاران - فروری ۶۱ء ، ص ۴۱

۲- ایضاً - فروری ۵۳ء ، ص ۵۳ تا ۵۴

معنی میں نظم کیا تھا ۔ ماہر نے اس پر گرفت کی ، لیکن ایک صاحب نے توجہ دلائی کہ قدیم شعراء نے یہ لفظ (لتاڑنا) " پامال کرنے " کے معنی میں نظم کیا ہے اور ماہر نے لغات کی مدد سے اس کی تصدیق کر لی ، تو برملا اس غلطی کا اعتراف کر لیا ۔[1]

اسی طرح موصوف نے فضل احمد کریم فضلی کے ناول " خونِ جگر ہونے تک " پر تبصرے[2] میں ایک ترکیب " دھوم دھامی " پر اعتراض کیا مگر جب ایک صاحب نے انہیں داغ کا شعر لکھ بھیجا جس میں " دھوم دھامی " استعمال کیا گیا تھا تو ماہر نے اپنی غلطی کا اعلانیہ اعتراف کر لیا ۔[3]

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کتاب میں " چھپ تختی " پڑھ کر ماہر نے گرفت کی کہ " یہ لفظ ہم نے اس سے پہلے نہ سنا اور نہ کہیں پڑھا " ایک صاحب نے موصوف کو توجہ دلائی کہ لغت میں یہ لفظ موجود ہے اگرچہ اب مستعمل و مروّج نہیں ہے ۔ اس اطلاع کے بعد ماہر نے فاران میں اپنی اس غلطی کا اعتراف و اعلان کیا ۔[4]

ماہر نے ایک جگہ " انگارۂ خاکی " کی ترکیب پر اعتراض کیا تھا کہ انگارہ ہندی زبان کا لفظ ہے ، اس لئے اضافت کے ساتھ نہیں آ سکتا ، مگر جب پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے توجہ دلائی کہ انگارۂ خاکی میں انگارہ " انگاردن " اور " انگاشتن " سے مشتق ہے اور یہ جلتے ہوئے کوئلے کے معنی میں نہیں بلکہ " نقشِ ناتمام " کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو ماہر نے تصدیق کے بعد اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرلیا اور آزاد صاحب کا شکریہ ادا کیا ۔[5]

۱۔ فاران جنوری ۵۸ء ص ۲۱ ، ۲۲

۲۔ ایضاً اپریل ۵۸ء ، ص ۵۲

۳۔ ایضاً مئی ۵۸ء ، ص ۵۶

۴۔ ایضاً اکتوبر ۶۵ء ، ص ۲۹

۵۔ ایضاً دسمبر ۷۱ء ص ۳۳ ، ۳۴

ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ماہر غیر معمولی حد تک حوصلہ مند، دیانت دار اور انصاف دوست تبصرہ نگار ہیں وہ خود لکھتے ہیں :

" ہم اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ ہماری تحریریں اور تنقیدیں غلطیوں سے پاک صاف ہیں اور ہمارے قلم سے بھول چوک ہی نہیں ہوتی .... علم و تحقیق کی دنیا میں ہٹ دھرمی اور دھاندلی گناہ نہیں " کفر " ہے -[1]

اور یہ کہ :

" جو حضرات " فاران " کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتے رہتے ہیں وہ اس کا اعتراف کریں گے کہ " فاران " میں کسی مصنّف ، مولف ، مترجم یا شاعر کے ساتھ میں نے بیادتی نہیں کی ، کسی نثر کی کتاب میں ایک جملہ یا ایک واقعہ یا جزئیہ بھی معلومات آفریں یا جاذبِ نظر ملا ہے تو اسے بھی نقل کر دیا گیا ہے - شعر و سخن کے مجموعوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھے اشعار منتخب کئے گئے ہیں " -[2]

اور اس نوعیت کے تبصروں کے سلسلے میں ماہر کو جو محنت اور جستجو کرنی پڑی ہے ، اس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں :

" یہ ہمیں جانتے ہیں اس تحقیق و تفکّر میں کتنی کاوش اور محنت کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات صرف ایک لفظ ، محاورے یا واقعہ (تلمیح) کی تحقیق میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں - پھر ہم خود کو غلطیوں سے محفوظ نہیں سمجھتے - جب کسی اہلِ قلم نے ہماری کسی واقعی غلطی پر ہمیں ٹوکا ہے تو ہم نے " فاران " میں اس کا اعتراف کیا ہے " -[3]

۱- فاران ، اکتوبر ۶۵ء ، ص ۲۹

۲- ایضاً - نومبر ۶۹ء ، ص ۳۰

۳- ایضاً اگست ۷۲ء ، ص ۳۶

ماہر کا تبصرہ کرنے کا انداز یہ تھا کہ پہلے وہ کتاب اور مصنف کا ضروری اور مختصر تعارف کراتے - پھر کتاب کی خوبیوں کی تحسین کرتے اور تیسرے مرحلے میں " دوسرا رخ " کے عنوان کے تحت موضوع اور زبان و بیان کے اعتبار سے کتاب کی خامیوں اور نقائص کی تفصیلات بیان کرتے اور صحیح تر لفظوں میں بخیے ادھیڑ دیتے - اس سلسلے میں ان کی ہمہ نوع معلومات اور تبحرِ علمی پر حیرت ہوتی ہے - پتہ چلتا ہے کہ وہ ادبی ، دینی ، فقہی ، تاریخی اور سیاسی معلومات کا کتنا بڑا ذخیرہ اپنے سینے میں محفوظ رکھتے تھے - الفاظ ، ان کی بناوٹ ، تلفّظ ، تذکیر و تانیث ، ضرب الامثال ، محاورات ، لغت و لسانیات اور فنِ عروض میں وہ استادِ کامل تھے - اردو ، عربی ، فارسی کے علاوہ ہندی زبان پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور ان کے تبصروں میں ان کی متذکرہ خوبیوں کا بار بار اظہار ہوتا ہے - عقائد اور شاعری کی کتابوں پر ان کے تبصرے خصوصاً بڑے مفصّل ہیں اور ان شعبوں میں انہوں نے غیر معروف مصنّفین اور غیر اہم کتابوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا -

ماہر حسناتِ شعر سے خوب آگاہ ہیں اور شعر و سخن کی کتابوں پر ان کے تبصرے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر کس طرح جزئیات کا احاطہ کرتی اور گہرائی میں اترتی چلی جاتی ہے - خصوصاً حفیظ جالندھری ، فیض احمد فیض ، جوش ملیح آبادی اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری پر ان کے بھرپور اور مفصّل تبصرے خوب ہیں - اس میں اگرچہ ان کے نقطۂ نظر سے کہیں کہیں اختلاف کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اور وہ شعروں کا پوسٹ مارٹم یوں کرتے ہیں جیسے کوئی خوشبو اور رنگ کی کھوج کا سراغ لگانے کے لئے پھولوں کو چیرنے پھاڑنے لگ جائے ، تاہم ان کی دقتِ نظر ، کمالِ جستجو اور معلومات کا تنوع مرعوب کن اور تعجب انگیز ہے اس سے غور و فکر کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور بڑے شاعروں کی فنی خامیاں جو ان کی شہرت کی چکا چوند میں بظاہر نظر نہیں آتیں ، عیاں ہو کر

سامنے آ جاتی ھین ۔[1]

ماھر کے تبصروں کی ان ساری خوبیوں کے باوصف ان کے ھاں بعض خامیاں بھی ھین ۔ مثال کے طور پر شعر و شاعری کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ھوئے بعض مقامات پر ماھر کا لب و لہجہ درشت اور تلخ بھی ھو جاتا ھے جسے قاری بھی محسوس کرتا ھے اور صاحبِ کتاب بھی توھین پر محمول کرتا ھے ۔ اس نوعیت کی مثالین جگہ جگہ نظر آتی ھین اور اس طرح کے تاثراتی جملے عام دکھائی دیتے ھین :۔

" پورا شعر کمزور اور سپاٹ ھے " " دوسرا مصرع کس قدر سپاٹ اور بے مزہ ھے " " سناٹے کا لیٹے رھنا اور لیٹ کر پس گھولنا " " شاعرانہ محسوسات اور شاھدات کے ساتھ مذاق نہین تو اور کیا ھے " ۔ " کیا اس کا نام شاعری ھے ؟ تو پھر " " یہ کیا اندازِ بیان ھے ؟ کوئی شاعرانہ لطف ، کسی کیفیت کا اظہار ؟ " " لاؤ کے " واؤ " کو کھینچ کر پڑھنا ذوقِ سلیم پر کس قدر گران گزرتا ھے " ، " ابطالِ عظیم " ایک پتھر ھے جو شاعر نے ذہنِ شعر پر لڑھکا دیا ھے " ، " یہ شعر قدامت و فرسودگی کا ایک نمونہ ھے "

" پختہ مشق شاعروں کو ایسے شعر زیب نہین دیتے " وغیرہ

اور یہ تو پہلے عرض کر چکا ھون کہ بعض اوقات وہ شعروں کا اس طرح پوسٹ مارٹم کرتے نظر آتے ھین ، جیسے کوئی رنگ اور خوشبو کی تحقیق مین پھولوں کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دے ۔ ان کا یہ طرز عمل بسا اوقات قاری پر اکتاھٹ بھی طاری کر دیتا ھے ۔

۱۔ دیکھئے فاران ۔ تبصرہ " افکار " کراچی " حفیظ نمبر " جنوری ۶۵ء ص ۳۹ (۱۰ صفحے) و تبصرہ " افکار " فیض نمبر اگست ۶۵ء ، ص ۳۶ (۳۰ صفحے) ، و تبصرہ " یادون کی برات " از جوش ملیح آبادی فاران فروری ۷۲ء ص ۳۵ (۲۹ صفحے) و تبصرہ افکار " ندیم نمبر " فاران مئی ۷۵ء (۲۱ صفحے)

تبصرہ نگاری کے چند عملی نمونے :
==========================

اب چند مثالیں ماہر کی تبصرہ نگاری کی :

۱۔ عبدالعزیز خالد کی کتاب " فارقلیط " پر اپنے تبصرے میں ماہر نے پہلے شاعر کی پُر گوئی ، زبردست معلومات اور رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے اس کی محبت کی تعریف کی ہے اور پھر ایک بڑی ہی پتے کی بات کی ہے ۔ کہتے ہیں :

" شاعری کے جسمِ لطیف و نازک کو عبدالعزیز خالد نے لغات و تلمیحات کی بوجھل زرہ بکتر پہنا دی ہے ، یہ اگر کارنامہ ہے تو بڑا سنگین کارنامہ ہے " ۔[1]

اس تبصرے میں ماہر نے مثالیں دے دے کر عبدالعزیز خالد کی شاعری کی خامیوں کو بیان کیا ہے موصوف کی شاعری پر اس نوعیت کا تبصرہ شاید کسی نے بھی نہ کیا ہو ۔

۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی رسالہ " اردو " پر تبصرہ کے تین اقتباس :

" جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ایک جگہ اس خیال کا اظہار فرمایا ہے :

" وہ زبان زندہ ہے جو ہر عہد میں کچھ نہ کچھ بدلتی رہتی ہے اور جب تک یہ بولی جائے گی بدلتی رہے گی ۔ یہ زندہ زبان کی خصوصیت ہے ۔ صرتی کی جو زبان تھی ، وہ ولی کی نہ تھی اور جو ولی کی تھی وہ میر تقی میر کی نہ تھی ، اور جو میر صاحب کے زمانے میں تھی وہ اب نہیں اور جو اب ہے وہ پچاس برس بعد یا ایک صدی کے بعد کچھ اور ہو جائے گی "

ولی اور میر کی زبان میں یقیناً بہت فرق ہے ، مگر میر کی جو زبان تھی اور آجکل جو اردو بولی جاتی ہے ان دونوں میں بس ایسا ہی تفاوت ہے جیسے اردو پر سفیدی ۔ " فرق و تفاوت " کی وہ صورت ہرگز نہیں ہے جو ولی اور میر کی زبان میں تھی اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ، اس رہے سہے فرق میں کمی ہوتی جائے گی ۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان ترقی کر کے

۱۔ فاران جنوری ۶۵ء ص ۳۸-۳۹

" معیاری " بن جاتی ہے اور یہ " معیار " پھر باقی رہتا ہے اس میں برائے نام تبدیلی ہوتی ہے ۔ ہاں اسلوب (Style) اور اندازِ نگارش بدلتا رہتا ہے تو وہ شعراء اور ادیب جو معیاری زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے ہیں ، ان کے کارناموں کو گردشِ روزگار چھو بھی نہیں سکتی ۔ وہ زندہ بلکہ شگفتہ رہتے ہیں ۔ ہمارے زمانہ میں اردو زبان " معیاری " بن گئی ہے اور یہ باقی رہے گی ۔[1]

* " عزیز احمد ان لوگوں میں سے ہیں جو مغربی فکر و ادب کی دارو پی کر مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ بلکہ HOBBY یہ ہوتی ہے کہ مغربی مفکرین کے ناموں ، حوالوں اور ان کے مضامین کے اقتباسات کے انبار لگا دیں ۔ اس مقالہ میں بھی اسی جذب و شوق کی فراوانی ہے " ۔[2]

* مولانا مناظر احسن گیلانی سے ماہر کے ذاتی نیاز مندانہ تعلقات تھے ۔ ان کی کتاب " حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی " پر تبصرہ چار صفحات پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے مولانا گیلانی اور ان کی تصنیف کی دل کھول کر تعریف کی ہے ، مگر آخر میں زبان کی چند خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے ۔ متعلقہ اقتباس کا ایک حصہ یہ ہے :

" (ص ۳۳) ہر کمرہ پر قفل توڑا لگا دیا جاتا تھا " ــــ مہر توڑا لکھنا چاہئے تھا یہ CEALED کا فنی اور اصطلاحی ترجمہ ہے ۔ (ص ۳۱) " زر بو سرِ سنگ نمی نرم شود " ضرب المثل اس طرح واقع ہوئی ہے " زر بر سرِ فولاد نہی نرم شود " ضرب المثل کے الفاظ میں رد و بدل درست نہیں الّا یہ کہ اس رد و بدل سے کوئی خاص ندرت اور نکتہ آفرینی یا کسی خاص واقعہ کا اظہار مقصود ہو (ص ۳۵) " امام صاحب کے عقب میں ایک شخص نے خزھی کا تھان ایک ہزار درم میں بیچ دیا " ۔ یہاں " عقب " کا نہیں " غیاب " یا " غیر موجودگی " کا محل تھا ۔[3]

۱۔ فاران نومبر ۱۹۶۹ء ص ۵۶

۲۔ ایضاً ۔

۳۔ ایضاً دسمبر ۱۹۶۹ء ص ۵۵

٭ مولانا عبدالماجد دریا بادی کی کتاب " حکیم الامّت " (سوانح مولانا اشرف علی تھانوی) پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہر رقمطراز ہیں :

" سرسید کی لائف (حیاتِ جاوید) مولانا حالی کی شاہکار تصنیف ہے ، حیاتِ شبلی میں علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کا کمال دکھایا ہے ، مگر "حکیم الامت " اپنے انداز اور اسٹائل میں منفرد ہے - خطوط اور روزنامچوں سے واقعات کی آئینہ سازی کی ہے - اس اچھوتے انداز پر کم سے کم اردو میں تو کسی کی لائف نہیں لکھی گئی "

دوسرا رخ " کے عنوان کے تحت زبان و بیان کی خامیوں کی نشاندھی یوں کرتے ہیں :

(ص" ۵۸) آخر ایک روز صبح سویرے ۳/ عہ کی رقم اڑ گئی " — رقم کے سلسلہ میں " اڑ گئی " کے یہ معنی ہوئے کہ خرچ ہو گئی اور مصنف نے " چرا لی گئی " کے معنی میں استعمال کی ہے جو درست نہیں ہے — " ہر خط ، خط کیا ہوتا تھا ایک مستقل ہدایت نامہ ہوتا تھا مفید بھی لذیذ بھی .... " فارسی میں اگرچہ داستان و حکایت کو " لذیذ " بولتے ہیں ، مگر اردو میں مکتوب ، غزل ، شعر وغیرہ کو لذیذ نہیں کہتے - اردو میں عام طور پر " لذیذ " ماکولات اور مشروبات کے لئے بولتے ہیں (صفحہ ۱۲۷) " ایک اتھاہ سمندر ہر وقت بہ رہا ہے " سمندر کے لئے " بہنا " محلِ نظر ہے " -[1]

٭ ماہر کے ہاں بعض تبصرے مختصر اور چند سطروں پر مشتمل ہیں ، مگر جامعیّت کا پہلو صاف نظر آتا ہے ۔مثال کے طور پر ایک تبصرہ ملاحظہ ہو کتاب کا نام "ملّا جمعراتی" ہے :

" یہ ایک طنزیہ افسانہ ہے جس میں ایک بدعتی دنیا دار پیر کا کردار پیش کیا گیا ہے - جہاں تک نفسِ کردار کا اور افسانہ نگار کے جذبۂ اصلاح کا تعلق ہے ، یہ

۱- فاران نومبر ۵۲ء ، ص ۳۸ ، ۳۹

دونوں چیزیں اپنی جگہ لائقِ قدر و ستائش ہیں ، مگر کتاب میں تحریر کے اس رنگ :

" اس کے علاوہ علم و عمل کی لایعنی جھنجھٹ سے قطعاً خالی الذہن اپنے چند حواریوں کے حلقہ میں اپنا اجدادی اور آبائی اثر و وقار قائم و برقرار رکھنے کے لئے

.... "

نے افسانے اور اس کی ٹیک ٹک کو کمزور کر دیا ہے " ۔ [۲]

ایک کتاب " امام احمد بن حنبل " پر تبصرے کا ایک اقتباس :

اس کتاب میں کہیں کہیں " تورس " ، " المعوت " ، " تاثم " ، " اعراب " جیسے الفاظ بھی آ گئے ہیں جنہوں نے ترجمہ کو بوجھل بنا دیا ہے ۔ بعض مقامات پر طویل جملوں میں بڑا تکلّف پیدا ہو گیا ہے اور لفظوں کا در و بست وجدان کو کھٹکتا ہے " ۔ [۲]

" افکار " کراچی کے " احمد ندیم قاسمی نمبر " پر تبصرہ (اقتباس)

" صہبا لکھنوی نے یہ خاص شمارہ صرف دوستی اور تعلقات کی بناء پر مرتب نہیں کیا بلکہ احمد ندیم قاسمی کی شخصیت بھی اس کی مستحق تھی ۔ ندیم قاسمی شاعر ہیں ، افسانہ نگار ہیں ، کالم نویس اور نقاد ہیں۔ان کی شخصیت متنوع اور وسیع الاطراف ہے اور ان تمام خوبیوں پر مستزاد یہ کہ شریف انسان ہیں " ۔

؎ میں سوچتا ہوں حقیقت کا یہ تضاد ہے کیا   خدا جو دیتا ہےسب کچھ،خدائی دیتا نہیں

اللّٰہ تعالیٰ انسان کو بھی خدائی دے کر خود کیا رہ جائے گا ؟ اللّٰہ کی عطا میں شاعر کو آخر کیا تضاد نظر آتا ہے،ممکن ہے شاعر کا خیال اس طرف گیا ہو کہ آدمی اختیار نہ رکھنے کے باوجود مجبور بھی ہے مگر شعر میں اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا ۔۔۔۔

؎ یوں تو جنگل کا گھنا پن ہے بلا کا لیکن   ان گرانڈیل درختوں پہ نہ پتے ہیں نہ پھل

۱- فاران مئی ۶۰ ، ص ۵۶ ، ۵۷

۲- ایضاً - دسمبر ۶۱ء ص ۳۷

ـــہ یوں تو یہ ٹھنڈے ستاروں کی خبر لاتے ہیں دیکھ لے ان کو تو ہنسنے لگے صحرا کے ببول

یہ کوئی خاص قسم کا جنگل معلوم ہوتا ہے جو گھنا ہے اور اس کے درخت تناور ہیں، مگر وہ سب کے سب سوکھ کر ٹھنٹھ رہ گئے ہیں مگر یہ ٹھنٹھے ستاروں کی خبر کس طرح لاتے ہیں اور ان کو دیکھ کر صحرا کے ببول کیوں ہنسنے لگیں گے -

ـــہ اک بت مجھے بھی گوشۂ دل میں پڑا ملا واعظ کو وہم ہے کہ اسی کو خدا ملا

پہلا مصرع کس قدر پست اور کمزور ہے اپنے محبوب (بت) کی یہ تعریف کہ وہ میرے گوشۂ دل میں پڑا ہوا ملا محبت کے نقطۂ نگاہ سے کتنی عجیب تعریف ہے -

ـــہ تجھ کو پوجا ہے کہ اصنام پرستی کی ہے میں نے وحدت کے مفاہیم کی کثرت کر دی

دوسرا مصرعہ مہمل ہے " میں نے ...... کثرت کر دی " اس طرح کون بولتا ہے -

اس شمارے میں ندیم کی یادگاری تحریریں بھی ہیں - وہ لکھتے ہیں " صہبا سوچتے ہوئے شاعر ہیں ،(ص ۱۰۰) سوچتے ہوئے ، متفکر کے معنی میں استمال کیا ہے حالانکہ "سوچنے والے" متفکر کا ترجمہ ہو سکتا ہے -

ان کا ذہن اور پڑھنے والے کے خیالات ایک ابدی پھڑ پھڑاہٹ کا شکار بن جاتے ہیں ،(ص ۱۱۱) یہ ابدی پھڑپھڑاہٹ کیا ہوتی ہے ؟ احمد ندیم قاسمی کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے تھے تو صہبا لکھنوی کو ندیم کی تحریر کے ایسے مسودے اپنے انتخاب میں پیش نہیں کرنے چاہئیے تھے -

ـــہ کھڑا تھا کب سے زمیں پیٹھ پر اٹھائے ہوئے اب آدمی ہے قیامت سے لو لگائے ہوئے

زمین کا پیٹھ پر اٹھانا ، یہ آخر کیا استعارہ ہے -

ـــہ یہاں دھول پر چند کھڑوں نے لکھی ہے تاریخِ ماضی انوکھی زبان میں

وہاں اک سولے کے پنجوں کی دھاری، گرہن پتیاں جیسے آبِ رواں میں

خاک پر گھوڑوں کے رینگنے سے جو نشان ابھرتے ہیں وہ اوکھی زبان میں ماضی کی تاریخ کس طرح بن گئے اور یہ سولہ کہاں سے آ گیا جس کے بچے کی دھاری شاعر کو ایسی لگتی ہے جیسے آبِ رواں میں پیچان کرتی ہیں - آبِ رواں میں کرتی ہوئی پتیوں اور سولے کے بچے کی دھاری میں کیا مناسبت ہے -[۱]

مولانا محمد حنیف ندوی کی کتاب " اساسیاتِ اسلام " پر تبصرہ :

" جناب مولانا محمد حنیف ندوی مفکر ، عالم اور شگفتہ نگار انشاء پرداز ہیں - صاحب موصوف متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف و مولف ہیں - غزالی ، ابنِ تیمیہ اور ابنِ خلدون کے افکار کی شرح و ترجمانی ان کا علمی کارنامہ ہے - مولانا کی کتابوں سے راقم الحروف نے استفادہ کیا ہے .... اس کتاب میں مولانا محمد حنیف ندوی نے اللّٰہ تعالیٰ کی ربوبیت اور خلاقیت کو ایمان افروز انداز میں پیش کیا ہے - .... اس کتاب میں جن عبارتوں سے اللّٰہ ، رسول اور اسلام کے بارے میں حسنِ ظن پیدا ہوتا اور یقین اور تقویٰ کے جذبات اور خیالات ابھرتے ہیں ، وہ عبارتیں تحسین کی مستحق ہیں " -

ماہر نے اس ستائش کے بعد مولانا ندوی کے ایسے خیالات پیش کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت ، نظریۂ ارتقاء ، مسئلہ تصویر وغیرہ میں اکابر علماء کے ہم نوا نہیں ہیں اور ان پر ماہر کی تنقید کے کچھ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :-

" مولانا موصوف اس یقین و اذعان کے باوجود سائنس اور اشتراکیت سے بری طرح متاثر و مرعوب ہیں .... حیرت ہے کہ فاضل مصنف نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا (EVOLUTION) کی تائید کی ہے .... قرآن کریم میں تخلیقِ آدم کا جو ذکر آیا ہے ، ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء اس کی تردید کرتا ہے " -

---

۱- فاران ، مئی ۷۵ء ص ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹

" موت ایک ایسا تضاد ہے جو زندہ رہے گا .... موت زندگی کا جز ہے اور جزوِ تکمیلی ہے"، جب موت زندگی کا جزو ہے تو اسے تضاد کہنا عجیب سی بات ہے ، حالانکہ زندگی کی طرح موت بھی ایک حقیقت ہے اور اللّٰہ تعالٰی حیات و موت کا خالق ہے ..... آج کا زمانہ تذبذب ، شک اور بےیقینی کا زمانہ ہے .... ان حالات میں مسلم مفکرین اور اہلِ قلم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسی تحریریں منظر عام پر لائیں جن سے سائنس سے مرعوبیت کی بجائے سائنس کی ایجادات اور سائنسی ترقیوں کو اللّٰہ تعالٰی کی حکمت، قدرت اور خلاقیّت کا رہینِ منت اور مظہر ثابت کیا جائے - ..... سرسید احمد خان نے یورپ سے متاثر ہو کر غلطیاں کیں - بعد کے مسلمان اہلِ فکر کو ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے " -

" سب سے زیادہ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد جعفر ندوی نے اشتراکیت کو جائز ٹھہرایا اور اس غیر فطری اور لادینی نظام کو انسانیت پر احسان قرار دیا ہے " -

مولانا ندوی کی زبان کی غلطیاں -

" وسعت و گہرائی (ص۱۳) ، و ، کا نہیں اور کا محل تھا کیونکہ ایک لفظ عربی اور دوسرا اردو ہے - فکر و اطاعت کی گرانبار امانت کو اٹھا لیا ص ۱۳ ، خلافت یا نیابت لکھنا چاہیے تھا - کسی ذہنی گو مگو کا شکار نہ ہوں (ص ۱۸) - التباس یا پھر گھپلا لکھتے - ان کے ذہن کو تغذیہ حاصل ہوا (ص ۲۵) غذا کا موقع تھا - خرد و دانش (ص ۲۵) دانش و خرد صوتی طور پر بھلے لگتے ہیں - ، الٹے اس میں یہ خطرہ پنہاں ہے ، ص ۳۳ - الٹا لکھنا تھا - وہی نقطۂ نظر فکر کی میزان میں جچے گا (ص ۲۵) - میزان کا تعلق تو لے جانے اور وزن کرنے سے ہے - ان کے پندارِ علم و ادراک کو گزند پہنچتا (ص ۲۹) - گزند کی جگہ ٹھیس کا صحیح محل تھا - ، زندگی کو زیادہ لذیذ (ص ۳۳) پُر لطف صحیح لفظ ہے -[1]

۱- فاران ، مارچ ۷۲ء ، ص ۳۱ ، ۳۳

سید اسعد گیلانی کی تصنیف " مولانا مودودی " پر ماہر کا تبصرہ بھی انصاف

اور اعتدال کا خوبصورت نمونہ ہے - شروع کے پانچ صفحات میں کتاب اور مولانا مودودی کی

تعریف کی گئی ہے ، مگر کتاب کی خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا وہ حصّہ یوں ہے:

" جب کوئی بات موضوعِ بحث نہ ہو تو وہ خوامخواہ کوئی بات نہ چھیڑ ے رکھیں گے"

(ص ۲۷)اس عبارت میں " نہ چھیڑ ے رکھیں گے " کھٹکتا ہے - "ترش کلامی ان سے بہت دور ہے -

ص ۲۹ - یہ آخر کیا اسلوبِ نگارش ہے -

مولانا مودودی انہیں اپنی لوری کی مانند ٹھنڈی اور میٹھی منطق و استدلال

سے اسلام سمجھا دیتے ہیں ، (ص ۷۸) اپنی لوری سے کیا مراد ہے ؟ پھر منطق ٹھنڈی اور

میٹھی کہنا بھی عجیب اندازِ بیان ہے -

اس نے پورے ملک کا انتظامی ڈھانچہ اکھاڑ پچھاڑ دیا ،(ص ۱۶۲) ، ڈھانچہ سے پچھاڑ نے

کی صحت عجیب سی لگتی ہے - کہنا یوں چاہیئے تھا کہ پورے ملک کے انتظامی ڈھانچہ کا تیا پانچہ

کر دیا یا اسے الٹ پلٹ کر دیا - اور ان کی کردار کشی کی بدترین مہمیں چلائی گئیں (ص ۱۶۳)-

" کردار کشی" نے اس عبارت کو قابلِ غور بنا دیا - یہ بات دوسرے موزوں الفاظ میں بیان کرنی تھی -

کوئی فرد ، ادارہ ، یا حکومت کسی شخص کو بدنام کرنے کے لئے کوئی مہم چلائے تو اسے کردار کشی

کون کہتا ہے اور بولتا ہے - مگر ہو سکتا ہے یہ ترکیب (کردار کشی) زبان میں چل پڑے اور

اسے قبول کر لیا جائے -[1]

ایک عالم نے مولانا کی چند کتابوں کا ترکستانی زبان میں بھی ترجمہ کیا ہوا تھا ،

(ص ۱۸۹) - اس جملے میں " ہوا " زائد ہے " پہلے سے " جملے میں لاتے تو " ہوا " عبارت میں

کھپ جاتا -

۱- اور واقعی اب یہ ترکیب کثرت سے استعمال ہوتی ہے - (مولف)

پاکستان بننے کے بعد " سوچ" اور " سوچ بچار " کو بعض اہلِ قلم اور خاص طور سے خطّہ پنجاب کے داش ور موٴنث لکھنے لگے ہیں ------ نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں سوچ بچار کو مذکر لکھا ہے مگر ص ۲۱۴ پر مولانا کی تحریر کا جو اقتباس درج کیا ہے اس میں گہری سوچ بچار پڑھنا پڑا (سیاسی کشمکش حصّہ اول) ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو ۔[۱]

ماہر کی تبصرہ نگاری پر وارث سرہندی یوں اظہارِ رائے کرتے ہیں : " حق گوئی اور بے باکی ان (ماہر) کا مسلک ہے ۔ کتابوں پر ان کے تبصرے بہت دقیع اور معلومات افزا ہوتے ہیں ۔ تنقید و تبصرہ میں کسی رُو رعایت کے قائل نہیں ۔ جہاں خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں وہاں خامیاں تلاش کرنے میں بھی ان کو کمال حاصل ہے ۔ ہر کتاب کا دوسرا رخ ضرور دکھاتے ہیں اور کتاب کے معائب و نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ ان کی اس روش نے ان کے بعض دوستوں کو بھی ان کا مخالف بنا دیا ہے ،مگر موصوف اسے تقاضائے دیانت سمجھتے ہیں اور کسی صورت میں یہ روش ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں ۔ ماہر صاحب کی ایک نمایاں خوبی ان کی حقیقت پسندی ہے ۔ اگر ان پر ان کی غلطی واضح ہو جائے تو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں " ۔[۲]

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے بھی ماہر کے تبصروں کی تعریف کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

" وہ زبان و بیان کی جن فروگزاشتوں کی طرف توجہ دلاتے تھے ، وہ بڑی اہم ہوتی تھیں ۔ اگر شاعر ، ادیب یا مصنف نے اردو زبان کے محاورے اور اہلِ زبان کے طریقِ ادا کے خلاف کسی جملہ کا استعمال کیا ہے ، تو وہ اس پر ضرور ٹوکتے

۱۔ فاران جنوری ۷۵ء ص ۳۹ تا ۴۵

۲۔ سہ ماہی " العلم " کراچی ۔ جنوری تا مارچ ۸۷ء ص ۳۳ ، ۳۴ ۔

تھے اور اس میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے "۔[1]

وہ حضرات جنہوں نے ماہر کے خصوصاً تبصروں کا غور اور سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا ، وہ زبان و بیان کے سلسلے میں ماہر کے اعتراضات کا ذکر تمسخر کے انداز میں کرتے ہیں اور انہیں کوئی مقام دینے کے لئے تیار نہیں ، مگر جو شخص بھی زبانِ اردو سے محبت رکھتا ہے اور اس کی ترقی و مقبولیت کا خواہاں ہے وہ لفظیات اور صحتِ زبان کو خصوصی اہمیت دیئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس ضمن میں ماہر کی کوششوں کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے گا ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس موضوع سے متعلق بڑی قطعیت کے ساتھ ایسی باتیں لکھی ہیں جو بڑی قابلِ غور ہیں اور ماہر کے موقف کی سو فیصد تائید کرتی ہیں ۔ موصوف رقمطراز ہیں :

" بعض لوگ زبان کی صحت کے مسئلے کو لفظی حرف گیری کے نام سے یاد کرتے ہیں ، لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ سچ نہیں ۔ ادب اور تحریر کی ہر قسم میں زبان کسی صحت کی بڑی اہمیت ہے بلکہ ناگزیر حیثیت رکھتی ہے ـــــ اور غور کیجئے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ ادبی تحریر اپنے اظہار و ابلاغ میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے وسائلِ اظہار بلیغ اور کامیاب نہیں ہونے پاتے اور ادب کا واحد وسیلۂ اظہار زبان و بیان ہے ۔ کیا کسی نے کوئی ایسا بھی مصور دیکھا ہے جو اپنے رنگوں کی صحیح ترتیب و ترکیب کے بغیر کامیاب تصویر بنانے کا مدعی ہوا ہو اور اگر ایسا کوئی ہے تو وہ یقیناً ژولیدگیٔ تصور کا مریض ہے ۔ یہی حال شاعری اور ادب کا ہے کہ اس میں زبان و بیان کی بلاغت کے بغیر کامیاب نظم یا نثر لکھنے کا دعویٰ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو پتنگ اڑانے کا عادی ہے مگر ڈور کے بغیر " ۔[2]

۱۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی پرانے چراغ جلد دوم مجلس نشریات اسلام ، کراچی ۔ ۱۹۸۱ء ، ص ۲۰۶

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ، مباحث ، ص ۳۸

باب ۱۲

ماہر القادری کی مذہبی تحریرین

عہد حاضر کے نامور عالم دین ، مفکر اور مصلح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی[1]

لکھتے ہین :-

" ماہر القادری صاحب صرف ادیب و نقاد ہی نہ تھے ، وہ اسلامی فکر اوراسلامی انقلاب کے ایک پُر جوش داعی اور نقیب بن گئے تھے - انہون نے اپنی ساری تحریری و ادبی صلاحیت و توانائی اس کے لیے وقف کر دی تھی اوران کا پرچہ اِس کا مستقل ترجمان بن گیا تھا[2]-

چنانچہ اس مین کوئی شبہ نہین کہ اگرچہ ماہر معروف معنون مین کوئی عالمِ دین نہ تھے ، نہ انہون نے کسی دینی مدرسہ سے سندِ فراغت حاصل کی تھی ، مگر ذاتی محنت ، ہمہ جہت مطالعے ، گہرے علمی ذوق اور دینِ حق سے غایت درجے کے قلبی تعلق کی بنا پر بقول سید محمد عبدالرشید فاضل انہون نے وہ علمی تبحر حاصل کر لیا تھا کہ کالجون اور دارالعلومون کے فارغ التحصیل علماء مین اس کی مثال مشکل سے ملے گی "[3]-

ماہر القادری کو اردو ، فارسی ، عربی اور دینیات مین یکسان کمال حاصل تھا جس کا اندازہ ان کے بھرپور، مبسوط اور مفصل مضامین سے ہوتا ہے جوانہون نے قادیانیت ، انکار سنت اور بدعاتِ عجمی تصوف کے رد مین تحریر کئے اور جن مین وہ حوالون کے ڈھیر لگا دیتے تھے- یہ بات محض وہمی انداز کی نہین ہے ، بلکہ اس کے ثبوت مین صرف ایک مضمون کو پیش کرون گا - ذہین شاہ تاجی (مدیر تاج کراچی) نے اپنے رسالے مین (شمارہ جون ۱۹۷۵ء) مروجہ تصوف کی حمایت مین ایک مضمون لکھا جس کی تردید مین ماہر نے دو قسطون

۱- ناظم اعلی ندوۃ العلماء لکھنو (بھارت)

۲- پرانے چراغ جلد دوم ، از مولانا ابو الحسن علی ندوی ، ص ۲۱۰

۳- فاران مئی ۱۹۸۲ء ، ص ۲۰

مین پچاس صفحے پر مشتمل طویل مقالہ " نقشِ توحید " کے عنوان سے قلمبند کیا[1] - جس
مین اڑتیس حوالے قرآن پاک سے اور چھبیس حوالے مستند احادیث سے دیئے گئے ھین - اس
سے اندازہ کیاجاسکتا ھے کہ ماھر کامطالعہ کتنا وسیع تھا اور وہ اپنے موقف کی وضاحت
کے لیے خالص علمی اور تحقیقی اسلوب اختیار کرتے تھے -

ماھر کے تبحّرِ علمی کا اندازہ کتابون پر تبصرون کے مطالعے سے بھی ھوتا
ھے - مذکورہ بالا موضوعات کے بارے مین موقع محل کےمطابق وہ بہت سے حوالے تحریر کر دیتے
تھے جن کے مطالعے سے قاری مختلف شخصیات کے بارے مین انکشافات بھی حاصل کرتا ہے اور
ماھر کے کثرتِ مطالعہ اور متنوع معلومات سے مرعوب بھی ھوتا ھے - چنانچہ بالکل درست
لکھا حبیب احمد صدیقی نےکہ " ماھر وسیع المطالعہ اور بالغ نظر عالم دین تھے مختلف دینی
موضوعات پر ان کی معلومات حیران کن حد تک وسیع تھین اور وہ ضرورت کے مطابق انھین دلائل
و براھین کے ساتھ بڑی تیزی سے قلم بند کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے"[2]

ماھرالقادری کی مذھبی تصانیف مین پہلے نمبر پر " آخری رسولؐ " ھے۔ یہ ۱۰۲
صفحے کی مختصر کتاب ھے جو ۱۹۳۶ء مین مکتبہ علمیہ چار مینار حیدر آباد دکن نے شائع
کی اور بنیادی طور پر بچون اور نیم خواندہ افراد کے لیے لکھی گئی تھی - کوشش کے باوجود
مجھے اس کا کوئی نسخہ نہین مل سکا - تاھم ماھنامہ ترجمان القرآن " (حیدر آباد دکن)
کے مدیر سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اس پر جو تبصرہ شائع کیا وہ مختصر مگر جامع ھے اور
اس سے کتاب کا ضروری تعارف ھو جاتا ھے۔ تبصرہ درج ذیل ھے:-

" جناب ماھر نے اس کتاب مین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بہت
سادہ اور عام فہم زبان مین لکھی ھے - مقصد یہ ھے کہ مولود کی

۱- دیکھئے فاران دسمبر ۱۹۷۴ء و جنوری ۱۹۷۵ء

۲- فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۲۵۷

بے اصل کتابوں کے بجائے اس قسم کی کتابوں کو رواج دیا جائے جن
میں سیرتِ پاک کے صحیح حالات ہوں اور ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیمات
پر مبنی کچھ روشنی پڑتی جائے۔ کتاب بلاشبہ اس مقصد کے لیے مفید
ہے مگر بہتر ہوتا کہ عام مذاق کی رعایت ملحوظِ خاطر رکھ کر بیان
کو زیادہ رنگین اور خطیبانہ کر دیا جاتا اور بیچ بیچ میں نعتیہ اشعار
بھی لائے جاتے ۔ جناب ماہر یہ دونوں کام خوبی کے ساتھ کر سکتے
تھے ۔ خصوصاً نعت کے باب میں عام مذاق جس قدر پست ہو گیا ہے
اس کو بلند کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ماہر جیسے قادر الکلام شاعر صحیح
قسم کی نعتیں کہیں اور ان کو عام رواج دیا جائے ۔
بعض مقامات پر مصنف نے جوشِ عقیدت میں نامناسب الفاظ استعمال
کیے ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے ۔ مثلاً نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم
کو جگہ جگہ شہنشاہ لکھا ہے ، حالانکہ حضور نے خود اس لفظ کو
غیر اللّٰہ کے لیے استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے
کہ حضور کا چہرہ سورج سے زیادہ چمکیلا تھا اور آپ کے پسینہ میں
مشک و عنبر سے زیادہ خوشبو تھی ۔ یہ محض ایک عقیدت مندانہ
مبالغہ ہے اور رسالتماب کے محاسن و فضائل اس سے بالا و برتر ہیں
کہ آپ کی فضیلت بیان کرنے کسے لیے اس قسم کے مبالغوں کی ضرورت ہو۔
ترتیبِ واقعات میں بھی کچھ فروگذاشتیں رہ گئی ہیں مثلاً بادشاہوں
کے نام آپ کے دعوت ناموں کا ذکر فتح مکہ کے بعد کیا ہے ، حالانکہ
اس سے پہلے ہونا چاہیے تھا "۔ [1]

ماہر کی دوسری مذہبی تصنیف " خدا اور کائنات " ہے جو ۴۸ صفحات پر
مشتمل کتابچہ ہے اور ۱۹۴۴ء میں حیدر آباد دکن کے ادارہ اشاعت اردو نے شائع کیا تھا۔
اس میں ماہر نے نظامِ کائنات کی بوقلمونی اور رنگارنگی اور مظاہرِ فطرت کے اندر کارفرما

---

۱ ۔ ماہنامہ ترجمان القرآن " حیدر آباد دکن اگست ۱۹۳۷ء ، ص ۱۶۰

حیرت انگیز نظم و ضبط کی مثالیں دے دے کر ثابت کیا ہے کہ " کائنات کا یہ تمام کارخانہ ایک غیر متغیر قانون کے تحت چل رہا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ قانون خود بخود نہیں بن گیا اس کا کوئی بنانے والا ضرور ہے "۔[1]

ماهر کی یہ کتاب بڑی دلچسپ اور عقلی و نقلی دلائل سے مزّین ہے اور قاری کو مثبت انداز میں غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے ۔ ذیل کے دو اقتباس کتنی حقیقت پسندی پر مبنی ہیں :-

" کیا خدا کے مانے بغیر آدمی کامیابی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا؟ نہایت ادب کے ساتھ گذارش ہے کہ کسی وجود کو ہوتے ہوئے اس کا انکار کرنا بےعقلی کی دلیل ہے اور جو شخص اتنی کھلی حقیقت کا انکار کر سکتا ہے ، اس سے دنیا میں عدل و احسان کے بہت سے قوانین کے انکار کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ اس طرح زندگی کی بہت بڑی ضرورت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے "۔[2]

" ایک خدا پرست کا اس بات پر ایمان ہے کہ دنیا کی حکومت و قانون سے بلند ایک ایسی ہستی بھی موجود ہے جو ہر جگہ اور ہر حال میں اس کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتی ہے اور اس سے چھپا کر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا ۔ لہذا خلوت اور تنہائی میں بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور تنہائی کے باوجود بھی وہ تنہا نہیں ہے ۔
خدا کا منکر جہاں کسی جھجک کے بغیر قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا ، وہاں خدا پرست یقیناً روک ، جھجک ، شرم اور خوف محسوس کرے گا ۔ اس طرح خدا پرست سوسائٹی اور زندگی کے لیے بہت زیادہ مفید ثابت ہو گا ۔ خدا کو ماننا گویا عدل و احسان سے قریب ہو جانا ہے "۔[3]

۱- خدا اور کائنات " ص ١٧

۲- ایضاً ، ص ۲۹

۳- ایضاً ، ص ۳۰

جیساکہ پہلے عرض کر چکا ہوں ماہر نے مختلف وقتوں میں مختلف دینی موضوعات پر بھرپور اور مفصل مضامین قلم بند کیے ہیں اور ان تحریکوں پر تنقید کی ہے جو دین کی تحریف پر مبنی ہیں اور عامتہ المسلمین کے عقاید کی تخریب کرتی ہیں ۔ اس سلسلے میں ماہر نے اپنی حکمتِ عملی اور نقطۂ نظر کا اظہار ذیل کی سطور میں کیا ہے:-

" فاران " کے پڑھنے والے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ " فاران" نے جس بات کو حق سمجھا ہے ، اس کی حمایت میں کسی مصلحت ، خوف اور طمع کی پروا نہیں کی ۔ اس نے ڈنکے کی چوٹ حق کا اعلان کیا ہے ۔ دین کے معاملہ میں " فاران " کی یہ پالیسی بلکہ اس کا مقصدِ اشاعت رہا ہے کہ اللّٰہ کے خالص و سادہ دین کو اُسی انداز میں پیش کیا جائے جس بے میل اور خالص و سادہ انداز میں وہ نازل ہوا ہے اور عجمی افکار اور غیر اسلامی تصورات کا جو غبار دین کی قبائے یک رنگ پر جم گیا ہے اس پر انگلی رکھ کر بتا دے کہ یہ دین میں اضافہ اور زیادتی ہے"۔[1]

اثباتِ توحید کے معاملے میں ماہر کسی مصلحت یا مصالحت کے قائل نہ تھے ۔ وہ " بدعات " کے سخت مخالف تھے اور " شطحیاتِ صوفیا" سے بھی بیزار تھے اور اسمٰعیل میناٸی کے بقول انہیں بدعت سے بھی بڑھ کر بگاڑ کا سبب گردانتے تھے۔[2] اس معاملے میں وہ کسی مجدد ، ولی ، علامہ یا قطب و ابدال کو رعایت دینے کے قائل نہ تھے ۔ توحید کے تحفظ میں اور بدعت کے مقابلے میں ان کا قلم تلوار کی طرح چلتا تھا اور وہ کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے ۔ اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں :-

---

۱۔ فاران ، اگست ۱۹۵۶ء ، ص ۲۲

۲۔ ایضاً دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۰۲

" جو تصوف کتاب و سنت کے مطابق ھے وہ ھماری سرآنکھوں پر مگر جہاں کتاب وسنت سے آمیزش سی نظر آتی ھے اس جگہ تصوف کو ھمارا دور سے سلام ، اس لیے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے ھمیں رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا ھے کسی کے کشف ، مشاھدہ اور ذوق و وجدان کی اطاعت کا حکم نہیں دیا "۔[۱]

ماھر نے مختلف وقتوں میں اللّٰہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت اور وجود پر اداریے اور مضامین قلم بند کئے ھیں۔ذیل کا اقتباس اس سلسلے میں خاصا اھم ھے ۔

" اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر سب سے زیادہ جہالت اور بے عقلی کی بات اگر کوئی ھو سکتی ھے یا کہی جاسکتی ھے تو وہ اللّٰہ تعالیٰ کے وجود کی نفی اور انکار ھے۔ایک کچا دھاگا اور ننھی سی سوئی بھی آپ ھی آپ نہیں بن سکتی ۔ کوئی بناتا ھے تو بنتی ھے۔اسی پر قیاس کیا جا سکتا ھے کہ یہ اتنی بڑی کائنات جس کی پہنائیوں کی کوئی حد و وسعت نہیں اور جس میں ایک خاص نظم ، سلیقہ اور ربط پایا جاتا ھے ، آپ ھی آپ وجود میں کیسے آ سکتی ھے ؟ "۔[۲]

ماھر نے علمِ جدید کے ایک بہت بڑے مغالطے کی بھی تردید کی ھے۔ تحریر کا زور ، حسن اور اثر آفرینی قابلِ غور ھے ۔

" غلط کہتا ھے جوکوئی یہ کہتا ھے کہ انسانی زندگی کا آغاز ضلالت اور جہالت سے ھوا ھے ۔ اللّٰہ کی کتاب اس پر شاھد ھے کہ سب سے پہلا انسان ھدایت یافتہ تھا اور اللّٰہ تعالیٰ نے اسے " علم " کی دولت سے نوازا تھا ۔ انسانی آبادی اور انسانیت پر ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزری کہ انسان تو موجود ھو اور ھدایت موجود نہ ھو ۔ یہ دوسری

۱۔ فاران ستمبر ۱۹۵۳ء ، ص ۵۱

۲۔ ایضاً ، مارچ ۱۹۵۳ء ، ص ۱۹

بات ھے کہ انسان ہدایت کے ہوتے ہوئے بھٹکگیا ھے اورعلم کی موجودگی
مین اس نے جہالت کو قبول کر لیا ھے ۔

یہ بھی سو فیصدی غلط ھے اور کسی بھکے ہوئے دماغ کی بڑی اپج ھے
کہ انسان بت پرستی کی سطح سے ترقی کرکے خدا پرستی کی بلندی
تک پہنچا ھے ہم ابھی ابھی اوپرکہہ چکے ھین کہ دنیا کا سب سے پہلا
انسان " ہدایت یافتہ " تھا اس لئے وہ خدا شناس اور خدا پرست تھا ۔
جس طرح انسانی زندگی کا آغاز " مرض " سے نہین " صحت " سے ہوا ھے
اور پہلا انسان مریض نہین صحت مند تھا ، اسی طرح انسان جاھل نہین
عالم ، گمراہ نہین ہدایت یافتہ اور بت پرست نہین ، خدا پرست تھا ۔

اسی طرح وہ اسلام کے بارے مین بھی مغرب کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیون کی
یون تصحیح کرتے ھین :-

" اسلام کے بارے مین یہ غلط فہمی مستشرقین کی پیدا کی ہوئی ھے کہ
وہ حضور خاتم المرسلین سیدنا محمد عربی نبی الامی صلی اللّٰہ علیہ وسلم
کی بعثت سے اسلام کی ظہور و آغاز کو منسوب کرتے ھین اور حضور کو
بانئ اسلام کہتے ھین ۔ مستشرقین کی یہ غلط فہمی اور غلط اندیشی " اسلام "
کی ازلیت اور ابدیت کو مجروح کرتی ھے اور اس طرح اسلام کی عمر زیادہ
سے زیادہ چودہ سو سال کے قریب قرار پاتی ھے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ھے کہ
اسلام کی بنیاد کسی نبی اور رسول نے نہین رکھی اور نہ یہ کسی مصلح
کی ایجاد ھے ۔ اسلام کا بانی اور خلّاق اللّٰہ تعالیٰ ھے اور جب
سے دنیا مین انسان کے وجود کا پتہ چلتا ھے اسی وقت سے اسلام
ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح محسوس و معلوم و مشہور ھے ۔ دوسرے

لفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسانیت کا آغاز اور اسلام کا ظہور ایک ہی ساتھ ہوا ہے ۔ پہلا انسان " مسلم " تھا اور دنیا میں جتنے نبی اور رسول بھی مبعوث ہوئے ہیں وہ سب کے سب دینِ اسلام ہی کے داعی اور مبلّغ تھے ۔ ان سب کا ایک ہی مشن تھا اور وہ " اسلام " ہی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے ۔"

مزید وضاحت کرتے ہیں :-

" اسلام جن اچھائیوں کو معروف کہتا ہے ، وہ اچھائیاں انسانی فطرت کے نزدیک پسندیدہ اور مطلوب ہیں ، اسی طرح اسلام میں جن برائیوں کو مُنکر کہا جاتا ہے ، وہ برائیاں فطرتِ انسانی سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی لیے اسلام کو " دینِ فطرت " کہا گیا ہے کہ اس کے تمام تقاضے فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہیں"۔

جنوری ۱۹۵۲ء میں " فاران " کا " سیرت نمبر " شائع ہوا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسوۂحسنہ پر مختلف علماء کے مضامین شامل تھے ۔ اس نمبر کا پہلا مضمون جو " نقشِ اوّل (اداریہ) کے طور پر لکھا گیا ، ماہر کی اہم مذہبی تحریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے ، اس کا ایک اقتباس درجِ ذیل ہے :-

" کوئی شک نہیں کہ تمام انبیاء و رسل ہدایت لے کر آئے تھے اور ان کی پاک زندگیوں میں انسانوں کے لیے نمونہ تھا ، مگر اس کو کیا کہیئے کہ ان مقدس زندگیوں کو انسانوں کے حافظہ نے محفوظ ہی نہیں رکھا۔ انسانی تاریخ میں صرف ایک زندگی ہے جو پوری کی پوری حافظہ میں ، ذہن وفکر میں ، کاغذ پر بلکہ اعمال و کردار میں محفوظ رکھی گئی ہے اور وہ زندگی حضور خاتم النبیین کی ہے (فداہ ابی و امی) اور یہ اہتمام و انتظام خود اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت کا کیاہوا ہے ۔ اپنے

کلام (قرآن) کی حفاظت اس نے خود کی اور رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی زندگی کی حفاظت صحابہ کرام کو سونپ دی کہ جن میں رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے زندگی بسر کی ہے تاکہ وہ خود بتائیں کہ رسول اللّٰہ کیا تھے؟

تمام دنیا کے چھوٹے اور بڑے انسانوں میں رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی زندگی کا تمام و کمال محفوظ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسانوں کے لیے کامل نمونہ بس یہی زندگی ہے ۔ پس جو زندگی اس کامل و مقدس نمونہ سے جتنی دور ہے، اتنی ہی وہ پست ، بدبخت اور نکمی ہے اور جس فرد میں ، قوم میں ، ماحول اور معاشرے میں یہ مقدس زندگی جھلکتی ہے ، وہاں سعادت و فلاح کی قندیلیں روشن ہیں اور نیکی کے پھول کھلے ہوئے ہیں ۔ انسانیت کے بگاڑ اور بناؤ کا دارومدار حضور کے اسوۂ حسنہ سے دُوری اور قُربت پر ہے اور یہ ایک کلیّہ ہے جس میں کوئی استثنا نہیں"۔[1]

" فاران " توحید نمبر (جون ۱۹۵۷ء) کے آغاز میں ماہر نے ۵۷ صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون قلم بند کیا ہے جس میں توحید کی اہمیت اور شرک کی مذمت کے علاوہ دیگر متعلقہ موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس میں خدا کے سامنے نبیوں کی حیثیت واضح کی گئی ہے کہ وہ اپنی ساری عظمتوں کے باوجود بہرحال انسان تھے ، عبدیت اور بشریت کے حامل تھے ، بےپناہ علم رکھنے کے باوجود علمِ غیب نہیں رکھتے تھے اور معجزات صرف اللّٰہ کے فضل کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اس میں نبیوں کا اپنا عمل دخل نہیں ہوتا تھا ۔ اس مضمون میں مصنف نے بدعت اور اس کی مختلف صورتوں کی تردید میں زوردار دلائل دیئے ہیں ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ماہر نے اپنے موقف کے حق میں سارے دلائل قرآن و سنت

---

۱ ۔ فاران جنوری ۱۹۵٦ء ، ص ۵ (سیرت نمبر)

سے اخذ کیے ھیں اور بعض علماء کی روش کے برعکس کوئی کچی اور سطحی بات نہیں کی ۔ مضمون کے آغاز میں توحید کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ھیں "

" اللّٰہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس پر گواہ ھے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سب سے زیادہ اپنی " توحید " کا ذکر فرمایا ھے یہی وہ محور ھے جس کے اردگرد اسلام ، ایمان اور اخلاق کے تمام تقاضے گردش کرتے ھیں ۔توحید اسلام اور ایمان کی بنیاد ھے۔اس بنیاد میں اگر فرق آ گیا اور یہ عقیدہ خدانخواستہ مجروح ہو گیا ، تو پھر ایمان ، اسلام اور عبادت و تقویٰ سب کے سب نامعتبر قرار پاتے ھیں اور یہ وہ خسارہ اور نقصان ھے جسے نہ رسولؐ کی محبت پُر کر سکتی ھے اور نہ کسی ولی کی عقیدت ، اور نہ کوئی نیکی اس کا بدل ہو سکتی ھے۔ انبیائےکرام کی بعثت کی غرض و غایت ھی یہ تھی کہ انسانوں کے سامنے خالقِ کائنات کی توحید ، معبودیت اوراس کے الٰہ ہونے کے عقیدے کو پیش کریں ۔ چنانچہ یہ نفوسِ قُدسیہ بعثت سے لے کرنفسِ واپسین تک توحید ھی کا درس دُنیا کو دیتے رھے ۔ یہی نقطہ توحید ان کی دعوت کا آغاز بھی تھا، وسط بھی تھا اور نقطۂ اختتام بھی۔"[۱]

مضمون کے اختتام پر ماہر اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ھیں :-

" شرک و بدعت " کا معاملہ کوئی فرقہ وارانہ معاملہ نہیں ھے ۔ شرک و بدعت کو ہر دَور میں اہلِ حق نے قابل ردو ملامت ھی سمجھا ھے ۔ شرک جسے قرآن " ظلمِ عظیم " کہتا ھے اورجس گناہ کی خوفناکی کا یہ عالم ھے کہ اس کو اللّٰہ کی شانِ غفاری نے معاف نہ کرنے کا اعلان کیا ھے اور " بدعت " جسے اللّٰہ کے آخری نبیؐ نے " ضلالت" کہا ھے اس کا رد کرنا دین کی سب سے بڑی خدمت اور مسلمانوں کے ساتھ انتہائی خیر خواہی ھے ۔ اگر اس کوشش کو کوئی فتنہ سمجھتا ھے تو وہ انبیاءِ کرام پر

۱۔ فاران جون ، ۱۹۵۷ء ، ص ۲ (توحید نمبر)

معاذ اللہ" فتنہ ساز " ہونے کی تہمت لگاتا ہے جن کا مشن ہی شرک و بدعت کا استیصال ، اللہ کی توحید کی تبلیغ اور دینِ خالص کے قیام کی دعوت تھی۔

جس طرح نجاست و طہارت کے درمیان اعتدال کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح " شرک و بدعت " اور " توحید و سنت " میں کوئی درمیانی راہ نہیں نکالی جا سکتی ۔ " توحید " پر ایمان کا دارومدار ہے۔ یہی اسلام کی اولین اساس ہے۔ اس بنیاد پر بال برابر بھی آنچ آئے تو ایمانی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ مدافعت کے لیے تیار ہو جائے"[1]

ماہر کو عجمی تصوف اور بدعات سے سخت نفرت تھی ، وہ قادیانیت کے بھی شدت سے مخالف تھے اور منکرین حدیث سے بھی وہ بیزار و متنفر تھے ، مگر خاص بات یہ ہے کہ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے وہ کبھی غصے سے مغلوب نہ ہوئے - نہ بعض مذہبی مقالہ نگاروں کی طرح وقار اور معیار سے گرا ہوا انداز اختیار کرتے ۔اس کے برعکس انہوں نے ہمیشہ دلائل و براہین کا اسلوب اپنایا اور ہر بات کا جواب قرآن و سنت اور سلف صالحین کے ارشادات پر استوار کرتے -[2]

۱- فاران جون ۱۹۵۷ء ، ص ۵۶ ، ۵۷ (توحید نمبر)

۲- راقم الحروف نے ماہر کی ان تحریروں سے عمداً تعرض نہیں کیا جو اختلافی نوعیت کی ہیں - یا جن میں مناظرانہ انداز اختیار کیا گیا ہے -

باب - ۱۲
========

ماہر اور ترقی پسند تحریک
========================

ماہر نے قیامِ حیدر آباد سے لے کر تا دمِ آخر ترقی پسند ادب اور تحریک کی شدید مخالفت کی ۔ وہ اس پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ نام نہاد" ترقی پسند ادب " کی سب سے زیادہ مخالفت اس عاجز نے کی ہے ۔ بمبئی جو ان ترقی پسندوں کا گڑھ ہے ، وہاں اپنے زمانے تک میں نے ان کی چلتی نہیں چلنے دی "۔[۱]

اس مخالفت کا سبب یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک ادب و شعر کے لبادے میں دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد اشتراکی انقلاب برپا کرنا اور روسی مفادات بروئے کار لانا تھا ۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں لندن میں تعلیم حاصل کرنے والے کمونسٹ خیالات کے نوجوانوں نے رکھی ۔[۲] ہندوستان میں بھی اس انجمن کی توسیع و ترقی میں یہی لوگ پیش پیش رہے ۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں جب پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی اور اس کا منشور مرتب ہوا ، تو اس میں بھی برملا اس امر کا اعتراف کیا گیا کہ " ہماری فکری اساس اشتراکی حقیقت پسندی پر ہے ...... اس جدوجہد میں ہمیں اپنی ہمسایہ ریاست سوویٹ یونین کی رہنمائی حاصل ہے ...... ہمارے ساتھ جمہوریہ چین کے سورما ہیں " ۔[۳]

جہاں تک دین و مذہب اور روحانی و اخلاقی قدروں کا تعلق ہے، کمونزم

۱- فاران جولائی ۱۹۵۱ء ، ص ۳۴

۲- ہفت روزہ " زندگی " لاہور ۱۵- دسمبر ۱۹۶۹ء

" ترقی پسند تحریک اپنے آئینے میں " از ڈاکٹر وحید قریشی

۳- "سویرا " لاہور نمبر ۷ ، ۸ ، ۱۹۴۹ء ، ص ۳۰

کے سب بانی مذہب کے سخت ترین مخالف ہیں ۔ کارل مارکس نے اسے " عوام کے لئے افیون " قرار دیا اور لینن ہوملا کہتا ہے کہ مارکسیت مادیت کا دوسرا نام ہے اور اس لحاظ سے یہ مذہب کی سخت ترین دشمن ہے "۔[1] اور انقلابِ اکتوبر کے بعد طے پایا کہ " کمونسٹ پارٹی کا ممبر اس شخص کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا جو صدقِ دل سے صاف صاف اس بات کا اعلان نہ کر دے کہ وہ دہریہ ہے "[2] ۔

چنانچہ اشتراکیت میں مذہب انسان کا ذاتی مسئلہ ہرگز نہیں ، بلکہ اسے ریاست اور انسانیت کے لئے بدترین خطرہ قرار دے کر اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں روس میں جو کچھ ہوا ، اسے انسانی تاریخ کا بدترین المیہ قرار دیا جائے ، تو شاید کوئی مبالغہ نہ ہو گا ۔[3]

چنانچہ ترقی پسند مصنفین اور ادباء و شعرا کی تخلیقات کا سرسری نظر سے جائزہ لیں تو ــــــ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ان حضرات نے مشرقی و اخلاقی قدروں کو تلپٹ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کو لکھنا پڑا کہ :

> ترقی پسند ادب کے عناصر ترکیبی یہ ہیں :۔ عورت ، سرمایہ و مزدور ، انقلاب ، زندگی کی دیرینہ قدروں کو زندگی کی موجودہ مصیبتوں کا ذمہ دار قرار دینا ، اپنے سے مایوسی ، دوسروں سے بیزاری ، نفس کی حیوانی خواہشوں کو اصلِ حیات سمجھنا اور ان کو تسکین دینے میں انتہائی بیباکی سے کام لینا ۔ احترام اور حفظِ مراتب کو زندگی کی لغت سے خارج کر دینا جدید ادب کے بڑے اہم اور مقبول مضامین ہیں "[4]

۱۔ بحوالہ " اشتراکیت مذہب اور اخلاق " از نذر محمد خالد مکتبہ چراغ راہ کراچی ۱۹۵۱ء ص ، ۲۷

۲۔ ماہنامہ چراغ راہ کراچی سوشلزم نمبر ۱۹۶۷ء ، ص ۱۹۳

۳۔ تفصیلات ملاحظہ ہوں " اشتراکیت مذہب و اخلاق از نذر محمد خالد ۔

۴۔ نقش ہائے رنگ رنگ از پروفیسر رشید احمد صدیقی مرتبہ نظیر صدیقی کاروان ادب ملتان صدر ۱۹۷۷ء ، ص ۱۳۸

اور ڈاکٹر وحید قریشی نے "ترقی پسند تحریک" کے بارے مین اپنے طویل مقالے مین دلائل و براہین اور مستند حوالون سے یہ ثابت کیا کہ :

(١) اس تحریک کی قیادت کمونسٹون کے ہاتھ مین تھی ۔ وہی اس کی پالیسیان مرتب کرتے تھے ۔

(٢) اس تحریک کی پالیسی متحدہ ہندوستان کے حق مین تھی ۔

(٣) ترقی پسند تحریک کے مطابق پاکستان انگریزی سازش کے نتیجے مین وجود مین آیا تھا ۔

(٤) قیامِ پاکستان کے بعد ترقی پسند ادبا و شعرا نے مسلسل و متواتر آزادی کو فریبِ آزادی اور سحر کو شبِ تار کے نام سے یاد کیا ۔[١]

ترقی پسند ادیبون کو پاکستان سے جو بُغض اور دشمنی تھی ، اس کی شہادت ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے بھی دی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیون مین سے تھے ، مگر بعد مین اس سے علیحدہ ہو گئے تھے ۔ ڈاکٹر تاثیر کے بقول مشہور کمونسٹ لیڈر اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے قائد سجاد ظہیر نے لکھا کہ " ہر ایماندار شخص کا فرض ہے کہ وہ کشمیر کو ہندوستان سے ملانے کی کوشش کرے "۔[٢] سید احتشام حسین نے تحریر کیا کہ ہم ہند اور پاکستان کو ایک کرکے دم لین گے ۔[٣]

ڈاکٹر تاثیر اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے ہین کہ " روس مین روس کی حمایت ترقی پسندی اور پاکستان مین پاکستان کی حمایت رجعت پسندی "۔[٤]

١۔ ترقی پسند تحریک اپنے آئینے مین قسط نمبر ۹ از ڈاکٹر وحید قریشی ہفت روزہ زندگی لاہور ۹ فروری ١٩٧٠ء ، ص ٣٥

٢۔ مقالاتِ تاثیر مرتبہ ممتاز اختر مرزا ۔ مجلس ترقی ادب لاہور جون ١٩٧٨ء ، ص ٢٩٠

٣۔ ایضاً ، ص ٢٩٣

٤۔ ایضاً

وہ ترقی پسندوں کے بارے میں مزید اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

" ان کے نزدیک پاکستان غلط ہے - اس کی بنیاد " مذہبی کلچر" غلط ہے - اس میں اردو کا ذریعہ تعلیم ہونا غلط ہے - سٹالن کی تعریف قومیت کے مطابق ، مذہب کا ایک ہونا وجہِ اتحاد نہیں ہونا چاہیئے - مادری زبان میں ابتدائی تعلیم ہونی چاہیئے اور اردو ہماری مادری زبان نہیں ، اس لئے انہوں نے اپنے پہلے جلسے میں ، جس میں ان کی جماعت کے باہر کے آدمی بھی آ سکتے تھے- پنجاب میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی مخالفت کی "-[1]

چنانچہ یہ تھا مزاج ترقی پسند ادب کا اور یہ تھی پالیسی اس تحریک کی ، جسے ماہر نے بالکل ابتدا میں پہچان لیا اور اس کا خوب تعاقب کیا - جب ماہر بمبئی پہنچے ہیں تو انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان بھر کے کمونسٹ وہاں جمع ہیں - علی سردار جعفری ، ساحر لدھیانوی ، کیفی اعظمی ، ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی جیسے لوگ وہاں موجود تھے جو اپنی تحریروں میں مذہبی اقدار کا مذاق اڑاتے ، اور دینی شعار کے معاملے میں تضحیک کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے - ماہر نے بقول اسمٰعیل میناٸی ترقی پسندوں سے چوکھی جنگ لڑی اور ضرورت پڑنے پر "رفعِ یدین" سے بھی گریز نہ کیا -[2]

کمونسٹوں سے مقابلے کے لئے ماہرنے ۱۹۴۵ء ، میں بمبئی میں " حلقۂ فکر و نظر " قائم کیا - جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد نے کی اور رئیس احمد جعفری نے جس کا صدر بننا منظور کر لیا - اس تنظیم کے زیرِ اہتمام بہت سے اجلاس ہوئے جن میں ماہر کے علاوہ سید حسن ریاض[3] ، شریف الدین پیرزادہ[4] اور مرزا غلام احمد آرزو[5] نے بھر پور حصہ

۱- مقالاتِ تاثیر ایضاً ۲۹۳

۲- فاران مئی ۱۹۸۲ء ، ص ۲۶

۳- مشہور صحافی اور مصنف

۴- مصنف ، دانشور ، سیاس

۵- مدیر " انقلاب " بمبئی -

لیا اور کمونزم اور کمونسٹون کا رد کیا ۔ اس مہم مین شکیل بدایونی کا تعاون بھی ماہر کو حاصل رہا[1] ۔ ماہر نے اس زمانے مین ملک بھر کے اخبارات و رسائل کے نام ایک اپیل بھی روانہ کی تھی جس کا ایک اقتباس یون تھا ۔

" ترقی پسند تحریک کمونزم کے پرچار کا ایک ذریعہ ہے ۔ یہ کفر و الحاد اور فحش نگاری کی ایک تحریک ہے ۔ تمام ادیبون اور شاعرون کو اس کے خلاف مہم چلانی چاہیئے ۔[2]

ماہر نے بمبئی مین ترقی پسندون کا جس طرح تعاقب کیا اور اس کے نتیجے مین عوام مین اس کی جس طرح ہوا اکھڑی، اس پر یہ لوگ خوب سٹپٹائے ۔

سجاد ظہیر نے اسی جانب اشارے کرتے ہوئے گالیان دین ۔

" رجعت پسندی بانجھ ہوتی ہے ۔ اس کی کوکھ سے فن و ادب کی تخلیق نہین بلکہ تحقیر و بربادی ہی ہوتی ہے ۔ چنانچہ بعض کٹر اور فرقہ پرست حلقے اور افراد ترقی پسند ادب کی تحریک پر حملے کرکے اور اس پر بے بنیاد اور لغو الزامات لگا کر اس غلط فہمی مین مبتلا تھے کہ وہ اسلامی کلچر اور اردو زبان کی خدمت کر رہے ہین "۔[3]

اپریل ۱۹۴۹ء سے ماہر نے کراچی سے ماہنامہ "فاران" کا اجرا کیا اور جولائی ۱۹۴۹ء مین ترقی پسندون کے خلاف تحریک کا احیا کر دیا ۔ اس شمارے مین انہون نے ترقی پسند ادب کی تین مثالین نقل کین ۔ ایک افسانے کا اقتباس[4] ، ایک پابند نظم اور ایک

۱۔ اسمٰعیل میناٹی فاران مئی ۱۹۸۳ء ، ص ۳۶

۲۔ ڈاکٹر وفا راشدی ، مدیر و مالک " ادبِ جدید " کلکتہ فاران مئی ۱۹۸۳ء ، ص ۶۳

۳۔ " روشنائی از سجاد ظہیر مکتبہ اردو لاہور نومبر ۱۹۵۶ء ، ص ۳۶۸

۴۔ وہ اقتباس یون ہے :" سعیدہ کی گوری اور نازک کلائیون کو جب اس کا بھائی سعید چھوتا تو سعیدہ کی آنکھون کے ڈورے ایکا ایکی سرخ ہو جاتے اور سعید کے جذبات جھومنے لگتے . . . بھائی بہن کے رشتہ کو اب خون نہین رومان جوڑے ہوئے تھا " ۔ (اداریہ ص ۵)

نظمِ معاشرہ اور اس "شعر و ادب" پر شدید تنقید کرتے ہوئے اس کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔[۱]

چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ اردو زبان میں "ترقی پسند ادب" کے موجد ، بانی ، حامل اور علمبردار وہی اہل قلم اور ارباب فکر ہیں جو یا تو پورے "کمیونسٹ" ہیں یا کمیونزم سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہیں ، اردو کی سرزمین میں نام نہاد "ترقی پسندی" کا بیج انہی اشتراکیت زدوں نے بویا تھا ، اور اس بیج سے جو پودا اگا ہے اس کی مرجھائی ہوئی ڈالیوں پر یہی لوگ پانی چھڑک رہے ہیں ۔

توڑ پھوڑ کمیونزم کا مزاج ہے ، اس لئے کمیونسٹ لٹریچر میں بھی لازمی طور پر اسی قسم کے رجحانات ، داعیات اور محرکات پائے جاتے ہیں --- بے اعتدالی ، عدم توازن ، مار دھاڑ کی ترغیب ، خونیں انقلاب کی دعوت ، سازشوں کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرنا ، فحاشی ، اور بدکاری کا پرچار ، خدا اور مذہب کے خلاف بغاوت اور بیزاری -- انہی تصورات کے تانے بانے سے "اشتراکی ادب" تیار ہوتا ہے ۔ کمیونزم کی فطرت ہی میں خشونت اور جھنجھلاہٹ ہے ۔ اس لئے اس کا ادب نرمی ، نزاکت اور صلح و آشتی سے محروم ہے"۔[۲]

ترقی پسند ادبا و شعرا نے دھڑے بندی اور تحسینِ باہمی کا جو انداز اختیار کیا اور اس طرح جانبداری اور تعصب کا جو ماحول پیدا کیا ، اس پر ماہر یوں تبصرہ کرتے ہیں :-

"ان لوگوں نے دھڑے بندی قائم کر رکھی ہے ۔ آپس میں ایک دوسرے کی شاعری اور انشاپردازی پر مضامین لکھتے ہیں ۔ پروپیگنڈے کا فن ان کو خوب آتا ہے ۔ اور اسی پروپیگنڈے کے زور پر انہوں نے ان لوگوں

۱- اداریہ "فاران" جولائی ۱۹۴۹ء

۲- "فاران" اگست ۱۹۵۱ء ، ص ۱۲ ، ۱۸

کو " صدر " میں بٹھا رکھا ہے جو صفِ نعال میں بھی مشکل ہی سے بیٹھنے کے قابل ہیں - تعصب، پارٹی بازی اور جانبداری میں پادریوں پنڈتوں اور مولویوں اور ملاؤں کو ان " ترقی پسندوں " نے کوسوں پیچھے چھوڑ دیا - اپنے ٹھیکروں کو یہ لوگ مانجھ مانجھ کر بازار میں لاتے ہیں اور دوسروں کے لعل و گوہر کو چاہتے ہیں کہ گمنامی کے گرد وغبار میں دبے پڑے رہیں اور اس پر دعویٰ یہ کہ ہم طبقوں اور فرقوں کی تعصب آمیز تقسیم کو مٹا دینا چاہتے ہیں - حالانکہ یہ لوگ خود انتہا درجہ کے متعصب، فرقہ پرست اور گروہ ساز واقع ہوتے ہیں "۔[1]

ماہر نے جب بھی ضرورت محسوس کی - ترقی پسندوں کو ہدفِ تنقید بنایا، خود بھی لکھا اور دوسرے معتبر چند ادبا و نقاد حضرات کے مضامین بھی شائع کئے -[2] مگر اہم بات یہ ہے کہ اولاً انہوں نے اپنے اداریوں میں کبھی کسی ادیب کا نام نہیں لیا، صرف تحریر کا حوالہ دے کر تبصرہ کیا، ثانیاً موصوف نے کبھی چڑ اور ضد کا انداز اختیار نہیں کیا - چنانچہ لکھتے ہیں:-

برسوں سے ہم نے " فاران " میں کمونسٹوں کی نقل و حرکت اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی تنقید نہیں کی - ہاں مشرقی پاکستان کے حالات کا جب تجزیہ کیا، تو کبھی کبھار سرسری طور پر ان کا ذکر آ گیا ہے۔ ہم خیالی اندیشوں اور وہم و اشتباہ کی بنیاد پر کسی موضوع پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے اور کوئی فرد یا گروہ چاہے وہ ہمارا مخالف ہی کیوں نہ ہو، اس سے بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ، ہم شرافت و انسانیت کی توہین سمجھتے ہیں "[3]

۱- فاران اگست ۱۹۵۱ء، ص ۲۰

۲- مثال کے طور پر سلیم احمد، پروفیسر اسرار احمد خان، شبنم رومانی - وغیرہ

۳- فاران نومبر ۱۹٦٦ء، ص ٦

۱۹۶۹ء میں پاکستان میں کمونزم کا غلغلہ بلند ہوا اور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے بھی ادب کی آڑ میں اپنے نظریات کا بلند آہنگی سے پرچار شروع کیا ، تو ماہر نے حسب سابق ان کی خبر لی :-

" ترقی پسند ادب جو دراصل کمونسٹ ادب ہے ، خدا سے ، مذہب سے اور اخلاق سے بغاوت کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی بغاوت کرتا ہے - بنے بنائے سانچوں کو توڑنا اور ہر تعمیر کو تخریب سے بدلنا ان کا مزاج اور فطرت ہے - ان لوگوں کی تحریروں نے اردو زبان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے "-[۱]

اسی اداریہ میں زبان کے حوالے سے وہ آگے چل کر اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں :-

" اردو زبان میں نئی ترکیبوں کی ایجاد کے ہم منکر نہیں ہیں - زبان و ادب ترقی کے دور سے گزرتے رہتے ہیں - مگر یہ ترقی زبان کے بگاڑنے کے لئے نہیں ، بنانے کے لئے ہونی چاہیے - مثلاً " بلینک ورس اور فری ورس جسے میں " بے سروپا " شاعری کہا کرتا ہوں ، اس قسم کی تک بندی اردو کے مزاج سے کوئی نسبت نہیں رکھتی "-[۲]

ایک اور جگہ ماہر ترقی پسندوں پر یوں تنقید کرتے ہیں :-

" جب سے نام نہاد " ترقی پسندی " کو شعرو ادب کی محفل میں در آنے کا موقع ملا ہے ، اردو ادب کو نقصان پہنچا ہے اور اردو شعروادب کی سطح پست سے پست تر ہوتی جا رہی ہے " ترقی پسند ادب " کے مزاج

۱- فاران اگست ۱۹۶۹ ء ، ص ۹ ماہر کی اس رائے کی تائید مشہور شاعر اور مصنف اقبال سہیل ان الفاظ میں کرتے ہیں " ترقی پسند شاعری کا زیادہ تر سرمایہ گھٹیا اور پوچ ہے اور اس میں عام طور سے وہ رعنائی خیال نہیں ملتی جو شاعری کو الفاظ و معانی اور حسن و ترنم کا ایک سحر لرزاں بنا دے " افکار سہیل " بحوالہ فاران جنوری ۱۹۵۹ء ، ص ۳۵ -

۲- ایضاً

میں " کمونزم " سمویا ہوا ہے ، اس لئے نثر و نظم میں عجیب طرح
کی خشونت اور روڑہ پن پیدا ہو گیا ہے ۔ کمونزم اپنی فطرت
کے اعتبار سے نزاکت اور سادگی و پرکاری کا حریف ہے ، اس لئے جو
ادیب اور شاعر روسی ادب سے متاثر ہیں ، ان کے یہاں کرختگی اور ناھمواری
ملتی ہے "۔[1]

ماہر ایک منصف مزاج نقاد اور " شریف دشمن " تھے ، چنانچہ انہوں نے ترقی پسندوں کی جزوی خوبیوں کی تعریف بھی کی ہے ۔ تاہم مجموعی اعتبار سے وہ اسے منفی تحریک ہی قرار دیتے رہے ، لکھتے ہیں :۔

" ترقی پسندی نے شعرو ادب کو کوئی شک نہیں ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے ۔
جہاں اس آہنگ کو ساز کے پردوں کی طرح مناسب ترتیب اور موزوں زیر و بم
میسر آ جاتا ہے وہاں کیف و نغمہ کا سماں بندھ جاتا ہے لیکن اکثر
مقامات پر " یہ جدید آہنگ " ذوق و وجدان کو متوحش ہی بناتا ہے ۔
اس میں لطافت کم اور کرختگی زیادہ ہے "۔[2]

ترقی پسند شعرا و ادباء پر ماہر نے شاعری کی زبان سے بھی تنقید کی ہے ۔
" مزدور سے " خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

تجھ کو کچھ لوگ ملیں گے جو کہیں گے تجھ سے
آ ادھر آ کہ ترے غم کا مداوا کر دیں

تیری قسمت کے ستاروں کو تجلی دے کر
تیری راتوں میں اجالا ہی اجالا کر دیں

ان کی باتوں میں نہ آنا کہ یہ نام تریاق
زہر کے جام مریضوں کو پلا دیتے ہیں

۱۔ فاران اکتوبر ۱۹۷۶ء ، ص ۷

۲۔ ایضاً ، اکتوبر ۱۹۶۵ء ، ص ۳۵

ڈال کر ذہن میں کچھ مُبہم و دلچسپ شکوک
کفر و الحاد کے رستے پہ لگا دیتے ہیں
ان کی محفل میں نہ ایمان ملے گا نہ یقین
ان چراغوں کو تو پہلے ہی بجھا دیتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں جو سرخ سویرے کے لئے
خونِ مزدور شرابوں میں ملا دیتے ہیں ۔[1]

ماہر نے ترقی پسندوں کا جو مسلسل تعاقب کیا ، اس کا انتقام ان لوگوں نے یہ لیا کہ انہیں مکمل طور پر نظر انداز یا انگریزی اصطلاح میں " بلیک لسٹ " کر دیا گیا اور غزل نظم ، ناول ، افسانہ یا خاکہ نگاری کے حوالے سے کسی مضمون میں ان کا ذکر تک نہ آنے دیا گیا ریڈیو اور ٹی وی پر یہی لوگ مسلط تھے ، چنانچہ ان اداروں میں بھی ماہر کا داخلہ بند کر دیا گیا ۔ نہ ریڈیو کے کسی مشاعرے میں انہیں دعوت دی جاتی تھی اور نہ ان کی غزل یا نظم نشر ہوتی تھی ۔ ماہر کو اس امر کا بخوبی احساس تھا ۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" میں اگر ترقی پسند ادب کی مخالفت نہ کرتا یا کم از کم خاموش ہی رہتا تو مجھے اس کا اچھی طرح احساس ہے کہ ادبی حلقوں میں میری کس قدر پذیرائی ہوتی ، مگر میں نے حق کی خاطر اپنی شخصیت اور جذبۂ نام و نمود کی پروا نہیں کی ۔ آغازِ جدوجہد ہی سے میری یہ تمنا رہی ہے کہ میری شخصیت چاہے بالکل گمنام اور فنا ہو جائے ، مگر اردو زبان و ادب نام نہاد ترقی پسندی کے بگاڑ سے محفوظ رہیں "۔[2]

۱۔ " فردوس " ، ص ۴۳

۲۔ فاران اکتوبر ۱۹۶۵ء ، ص ۳۶

باب - ۱۲

ماہر القادری --- بحیثیت مدیر فاران

ماہر القادری نے اپریل ۱۹۴۹ء سے ماہنامہ فاران " کراچی کا اجرا کیا اور وہ نہایت پابندی سے ان کی وفات (مئی ۱۹۷۸ء) تک شائع ہوتا رہا - یہ بات بڑی اہم ہے کہ انتیس سال کی اس طویل مدت میں کبھی ایک پرچے کا بھی ناغہ نہ ہوا - اس اعتبار سے ان کا شمار ملک کے کامیاب ترین مدیران میں ہوتا ہے - " فاران " کی اشاعت میں باقاعدگی کا انہیں اتنا خیال رہتا تھا کہ اگرکبھی لمبے عرصے کے لیے بیرون ملک جانا پڑتا ، تو ایک دو پرچے پیشگی مرتب کرکے دے جاتے تاکہ ان کی غیر حاضری میں " فاران" وقت پر شائع ہو سکے - آخری سفر پر جانے سے پہلے بھی تین شمارے پیشگی مرتب کر گئے تھے جو اگست ۱۹۷۸ء تک شائع ہوتے رہے حالانکہ ان کی وفات مئی میں ہو چکی تھی-

ماہر القادری ایک بااصول ایڈیٹر تھے - انہوں نے کبھی بنک کے اشتہار قبول کئے نہ ایسے اشتہارات شائع کئے جن میں تصاویر ہوتی تھیں ، لیکن یہ ان کے اخلاص ، نیک نیتی اور محنت کا نتیجہ تھا کہ اُنہیں ہر ماہ معقول تعداد میں اشتہار مل جاتے تھے - " فاران" کا اپنا ایک حلقۂ اثر تھا جو خاصا وسیع تھا اور اس طرح ماہر کے اپنے اعتراف کے مطابق " فاران " ان کے لیے ذریعۂ معاش بھی بن گیا تھا -[1]

" فاران " کا اداریہ " نقشِ اول " کہلاتا تھا جس کے موضوعات بالعموم اسلام ، پاکستان ، اردو اور عالم اسلام پر مشتمل ہوتے تھے " فاران " میں دُنیا جہان کے موضوعات پر مختلف مضمون نگاروں اور مصنفین کی معیاری اور سنجیدہ نگارشات شائع ہوتی تھیں جن میں ایک

۱- فاران ، اپریل ۱۹۶۵ء ، ص ۵ (اداریہ)

حصہ منظومات کا بھی ہوتا تھا ۔ چونکہ ماہر کا معیارِ انتخاب کڑا تھا ، اس لئے " فاران " کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ اس میں موضوع اور زبان و بیان کے اعتبار سے خاص معیار کے مضامین اور منظومات ہی شائع ہوتی تھیں اور ماہر معیار سے گری ہوئی کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے خواہ وہ بظاہر کسی بڑے سے بڑے مصنف کی کیوں نہ ہوتی ۔

" فاران کی ادارت کا کام ماہر تن تنہا انجام دیتے تھے ۔[1] انہوں نے پرچے کو ترقی دینے اور اسے معیاری بنانے میں غیر معمولی محنت کی ۔ کتابت شدہ کاپیوں کو تین تین بار پڑھتے تھے ۔[2] اس لیے راقم الحروف بھی اس امر کا شاہد ہے کہ " فاران " میں کتابت کی شاید ہی کبھی کوئی غلطی نظر آتی ہے ۔ ابتدا میں تو انہیں کسی کلرک کی بھی معاونت حاصل نہ تھی ۔ اور " فاران " کے بنڈل وہ خود اٹھا کر ڈاک خانے کے حوالے کرنے جاتے تھے ۔[3] تاہم بعد میں ان کے چھوٹے بھائی سرور حسین نے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لیے لیے تھے اور ماہر کو ادارت کے جملہ فرائض کے لیے فارغ کر دیا تھا ۔

ماہر کا مطالعہ ہمہ جہت تھا اور وہ بڑے ہی زود نویس انشا پرداز تھے ۔ بعض موضوعات کے معاملے میں وہ بہت حساس تھے جن میں اسلامی نظام ، جماعتِ اسلامی ، اردو ، توحید و بدعات ، انکار حدیث اور قادیانیت شامل ہیں ۔ ان موضوعات کے حوالے سے وہ معترضین کے ایک ایک اعتراض کے جواب میں دلائل اور علمی حوالوں کا گویا ڈھیر لگا دیتے ، اور مخالف کے اطمینان کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے ۔ جسٹس مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ " ایک روز میں نے ان کے خط کے جواب میں مولانا مودودی کے تفردات کے بارے میں کوئی

۱۔ فاران ، مارچ ۱۹۷۲ء ، ص ۸ (اداریہ)

۲۔ ایضاً

۳۔ مہدی علی صدیقی (ریٹائرڈ سیشن جج) فاران دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۳۵

جملہ لکھ دیا تھا ۔ آٹھ دس روز بعد ان کی طرف سے ایک پارسل ڈاک میں موصول ہوا ۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی مقالہ ہو گا ، لیکن کھولا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ وہ میرے اس مختصر خط کا جواب تھا جو اڑتیس صفحات پر مشتمل تھا[1]۔

اسی نوعیت کا تجربہ ماہر کے عزیز دوست تابش دہلوی کو ہوا ۔ ایک محفل میں انہوں نے کہہ دیا " کہ فارسی میں تشدید نہیں ہوتی " دوسرے ہی دن ماہر نے ان کی تردید میں کوئی پندرہ صفحے کا طویل خط لکھ دیا[2] ۔

نقش اول کے علاوہ " فاران " میں ماہر کے دو اور مستقل موضوع تھے ۔ کتابوں پر تبصرے جو " ہماری نظر میں " کے عنوان سے شائع ہوتے اور " یادِ رفتگان " جس کے تحت حال ہی میں وفات پا جانے والی مختلف شخصیات کے بھرپور خاکے شامل ہوتے ۔ مذکرہ دونوں شعبوں کے حوالے سے الگ الگ ابواب میں تفصیلی تجزیہ کیا جا چکا ہے۔

ماہر اس اعتبار سے ایک منصف مزاج اور حوصلہ مند مدیر تھے کہ جن لوگوں نے ان کی تنقیدوں کے جواب میں اعتراضات کئے ، وہ انہوں نے جوابی وضاحت کے ساتھ " فاران " میں من و عن شائع کئے ۔

ماہر " فاران " کو زبان و بیان اور موضوعات کے اعتبار سے جس معیار پر لانا چاہتے تھے اور اس کے لیے جو محنت کرتے تھے ، اس کا اندازہ پروفیسر اسرار احمد خان سہاروی کی درج ذیل تحریر سے کیا جا سکتا ہے ۔

" کسی افسانے میں میں نے " کھلی آنکھ " کی ترکیب استعمال کی ۔ یہ ترکیب مرحوم (ماہر) کو نہ بھائی ۔ فوراً مجھے خط لکھا کہ یہ ترکیب سوقیانہ ہے اور آپ جیسے لوگوں کو زیب نہیں دیتی ۔ میں نے بدل کر " کھلی آنکھ " کر دیا ہے۔

۱۔ مولانا تقی عثمانی ، فاران ، دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۸۶ ، ۱۸۷

۲۔ تابش دہلوی ، ایضاً ، ص ۲۹

آپ کچھ برا نہ مانیں گے ۔ خط پڑھ کر مجھے خود اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے فوراً اس توجہ کے لیے شکریہ کا خط لکھ دیا۔ اسی طرح ایک تاریخی افسانہ " شہزادہ جم " فاران میں اشاعت کے لیے بھیجا ۔ اس میں شہزادہ جمشید جو کہ ترکی شہزادہ تھا ، ایک عیسائی بادشاہ کا قیدی ہو گیا ۔ قید میں جو عیسائی کنیز اس کے لیے کھانا لے جاتی تھی اس پر فریفتہ ہو گئی اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر شہزادہ مجھے مسلمان کرکے اور کنیز کے طور پر مجھے ساتھ لے جائے ، تو میں قید میں رہائی کا انتظام کر سکتی ہوں ۔ شہزادہ راضی ہو گیا ۔ کنیز رات کو قلعے کی فصیل کے پاس ایک ترکی گھوڑا لے آئی ۔ شہزادہ کمند سے نیچے اُتر آیا اور دونوں اس گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو گئے ـــ ماہر صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ اگر یہ تاریخی حقیقت بھی تھی کہ دونوں ایک گھوڑے پر سوار ہوکر گئے ، تب بھی آپ اپنی طرف سے تصرف کرکے دو گھوڑے مہیا کرتے ۔ ایک نامحرم کے ساتھ اس حال میں سفر دکھانا اسلامی ادب کے افسانے کے لیے مناسب نہیں "۔ ان دونوں مثالوں سے آپ کو خواہ ماہر صاحب سے اتفاق نہ ہو ، لیکن یہ ضرور ظاہر ہو گیا ہو گا۔ کہ فاران میں چھپنے والی مختلف تحریروں کے سلسلے میں وہ کس محنت اور دِقّتِ نظر سے کام لیتے تھے"۔[1]

ماہر نے " فاران " کی پالیسی کا ایک جگہ کُھل کر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

" فاران " ہم نے اس لیے نہیں نکالا کہ کوئی کام کرنے کے لیے نہیں ہے تو لاؤ ایک رسالہ ہی نکال لیں ۔ نہ اس کی اشاعت کا مقصد نام و نمود ، کھیل تفریح اور مالی منفعت ہے ۔ ہاں یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ وہ اس کے ذریعہ ہماری روزی کا بھی بندوبست فرما دے ۔ ہم ایک حقیر کارکن کی طرح ان شہسواروں کی رکابیں تھام کر چل رہے ہیں جو پوری جراُت اور

۱- فاران " مئی ۱۹۸۳ء ، ص ۵

ناقابلِ شکست عزم و یقین کے ساتھ اللہ کے راستے پر گامزن ہیں ۔[1]

اسی بات کی وضاحت ایک اور جگہ یوں کرتے ہیں ؛-

" فاران " کسی خاص مسلک ، فرقہ اور گروہ کا ترجمان نہیں ہے ۔ ہمارے سامنے اللہ کا پورے کا پورا دین ہے اوراپنی فہم و استطاعت کے مطابق ہر دینی مسئلہ پر اسی نقطۂ نگاہ سے غوروخوض اور اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ مثلاً ہم نے تقلید جامد " پر بھی تنقید کی ہے اور ان حضرات کے مسلک کو بھی صحیح نہیں سمجھا جو تقلید کی تردید میں اس انتہا تک پہنچ جاتے ہیں کہ تقلید سے شرک منسوب کر دیتے ہیں " ۔

" ہم اللہ تعالیٰ کے دین کو شریعت ، طریقت اور حقیقت کے خانوں میں نہیں بانٹتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نےکتاب و حکمت کی جوتعلیم دی ہے ۔ وہ کتابوں میں موجود ہے اور وہی " سب کچھ " ہےعلمِ کلام ہو ، علمِ تصوف ہو یا کوئی اور دوسرا علم و فن ہو ، وہ دین اور شریعت کا تابع ہے ۔ دین و شریعت سے جہاں بھی تجاوز پایا جاتا ہے وہیں فساد ظہور میں آ جاتا ہے "۔[2]

چنانچہ " فاران " نے جس مسلکِ اعتدال کو اختیار کیا ، اس کا اعلان و اظہار ماہر نے ایک دوسرے مقام پر بھی کیا ہے ۔ رقمطراز ہیں :-

" راقم الحروف کو اس کا دعویٰ نہیں ہے کہ جو کچھ میرے قلم سے نکل جاتا ہے وہی حق و صواب ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ غلط اور باطل ہے ۔ جس دن بھی خدانخواستہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاؤں گا وہ لمحہ میری اخلاقی شکست بلکہ اخلاقی موت کا دن ہو گا۔" فاران " کے ہزار ہا صفحات اس کے گواہ

۱- فاران ، مارچ ۱۹۵۲ء ، ص ٦ (اداریہ)

۲- ایضاً ، دسمبر ۱۹٦۳ء ، ص ۱۵

ہین کہ مین نے کتابون ، جماعتون اور شخصیتون پر تنقید کی ہے ۔ بعض مقامات پر لہجہ تند و تیز ہو گیا ہے ، مگر اللہ تعالی دلون کے حال سے واقف ہے کہ کسی کتاب، مصنف ، جماعت اور فرقہ کے ساتھ عمداً زیادتی نہین کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مجھ سے نادانستہ طور پر بھول چوک ہوگئی ہو ۔ اس کوتاہی مین میری سمجھ اور فہم و شعور کا تر قصور ہو سکتا ہے مگر میری نیت اس کوتاہی اور تسامح سے الحمدُ لِلّٰہ بری ہے"۔ [1]

اس جراتِ کردار ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بقول ماہر" پچیس سال کی مدت مین سیکڑون نہین ہزارون تعریفی خطوط راقم الحروف کو ملے ہین ۔ مگر فاران مین ہم نے خطوط اور مراسلون کا باب ہی نہین رکھا ۔ اس قسم کے خطوط ضرورتاً کبھی کبھار شائع کئے گئے ہین۔ اور اس پر بھی طبیعت خلش ہی محسوس کرتی ہے"۔ [2]

" فاران " ایک علمی و ادبی اور مذہبی رسالہ تھا ۔ مگر اس کے اداریون مین ملک کی سیاست پر بھی اظہار خیال ہوتا رہا ۔ چنانچہ ماہر نے " فاران " کے آغاز سے لے کر اخیر تک (۱۹۴۹ - ۱۹۷۸ء) تقریباً ہر قابل ذکر سیاسی مسئلے پر اس تواتر سے بحث کی اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا کہ اس نوبت کے ــــــ اداریون کی مدد سے پاکستان کی سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے ۔ انہون نے کبھی خوشامد کا انداز اختیار کیا نہ تنقید برائے تنقید کا اسلوب اپنایا بلکہ بڑی دردمندی ، خیرخواہی ، سنجیدگی ، جرأت مندی سے دلائل کے ساتھ بات کرتے تھے۔ چونکہ ان کا پیرایۂ بیان حکمت و اخلاص پر مبنی ہوتا تھا اور وہ شخصیات سے زیادہ مسائل کو موضوعِ بحث بناتے تھے ، اس لیے ان کی تحریرون پر گرفت کی نوبت کم آتی تھی ۔ تاہم ایک مرتبہ جب انہون نے عائلی قوانین پر شدید

۱- فاران ، فروری ۱۹۷۵ء ، ص ۳ ، (اداریہ)

۲- ایضاً ، فروری ۱۹۷۳ء ، ص ۳۳

تنقید کی،[1] تو حکومت کی طرف سے نوٹس کی صورت میں ایک عتاب نامہ نازل ہو گیا مگر ماہر نے کسی نوعیت کی معذرت کرنے سے انکار کر دیا ۔ سید ہاشم رضا کی کوشش سے یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ۔[2] سیاسی مباحث کے حوالے سے ماہر اپنا نقطۂ نظر یوں بیان کرتے ہیں :۔

" سیاست کے لفظ سے ہمیں وحشت نہیں ہوتی اور نہ اسے ہم دنیاداری کا دھندا سمجھتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے دین میں سیاست بھی شامل ہے ، یہ دوسری بات ہے کہ زر پرستوں اور جاہ پسندوں نے اس لفظ کو بدنام کر دیا ہے ۔ ہم اس دینِ جامع پر ایمان رکھتے ہیں جو سیاست و حکومت کا بھی حامل ہے۔ سیاست و حکومت کس لیے ؟ اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لیے ۔ہم نہ تو قیصر و کلیسا کی تقسیم کے قائل ہیں اور نہ اس غلط اندیشی کا شکار ہیں کہ دیندار طبقہ کو بس " اللہ اللہ " سے سروکار رکھنا چاہیئے ، سیاست و حکومت دنیاداروں کے کرنے کے کام ہیں ۔کتابُ اللہ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا کی زمامِ کار ان ہاتھوں میں ہونی چاہیئے جو نماز کو قائم کریں ، زکواۃ دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جن کی پالیسی ، مسلک اور طریقِ کار ہو "۔[3]

سیاسی معاملات کے متوازی ماہر نے ان فتنوں کا تعاقب بھی کیا جو اسلام یا پاکستان کے مفادات سے ٹکراتے اور کسی نہ کسی پہلو سے ملّی یا دینی اعتبار سے ضرررساں تھے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے قادیانیت ، انکارِ سنت ، بدعات ، اشتراکیت اور مغرب پرستی کے رجحان کو باربار ہدفِ تنقید بنایا اور پہلو بدل بدل کر ان پر حملہ آور ہوئے ۔ یہ امر البتہ قابل ذکر ہے کہ کسی موقع پر انہوں نے تنقید میں سطحیت کا انداز نہ اپنایا ۔

۱۔ اداریہ فاران ، مئی ، ۱۹۶۰ء

۲۔ شفیق بریلوی ، فاران ، دسمبر ۱۹۷۸ء ، ص ۱۵۵

۳۔ فاران اپریل ، ۱۹۶۷ء ، ص ۲ (اداریہ)

اور دلیل اور وقار کا دامن برابر تھامے رکھا ، چنانچہ اس نوعیت کی تنقید کے سلسلے میں انہون نے منطقی استدلال کے ساتھ اپنی وضاحت پیش کی ہیں:-

فاران " کا ایک ایک صفحہ اس کا گواہ ہے کہ ہم نے اربابِ اقتدار پر جب بھی تنقید کی ہے تو شائستگی ، متانت ، سنجیدگی اور تہذیب کی حد سے بال برابر تجاوز نہین کیا - ہم نے اس سلسلہ مین جو کچھ کہا ہے پوری خیر خواہی ، دل سوزی اور دردمندی کےساتھ کہا ہے مقصد ہمیشہ اصلاحِ حال رہا ہے - پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے جس کے ایک ایک چپہ کو ہم مسجد کی طرح مقدّس سمجھتے ہین اور کوئی مسلمان بھی مسجد مین انتشار ، فتنہ و فساد اور جنگ و جدل دیکھنا پسند نہین کر سکتا "-[۱]

آخر مین " فاران " کے چند اداریون کے اقتباس پیش کئے جاتے ہین تاکہ خصوصاً قومی امور پر ماہر کا نقطہ نظر سمجھنے مین آسانی ہو اور ان کی جرات و حق گوئی ، انصاف پسندی ،باوقار اسلوبِ بیان ، اور شائستہ اندازِ تنقید کا اندازہ لگایا جاسکے -

قیام پاکستان کے بعد حکمرانون نےاسلامی نظام کے سلسلے مین جس لیت و لعل کا مظاہرہ کیا اور اسلام کا نام لے لے کر جس طرح اسلامی تعلیمات سے انحراف کیا ، اِس پر ماہر یون گرفت کرتے ہین:-

" اسلام نے ہمین سازش کرنا نہین سکھایا اور نہ ہم منافقت برتنے کے لیے تیار ہین- جو کچھ ہمارے دل مین ہے وہی ہماری زبان اور قلم پر ہے - ہم جو کچھ کہتے ہین ڈنکے کی چوٹ کہتے ہین اور اس ذمہ داری کو محسوس کرکے کہتے ہین کہ خدا کے سامنے اپنے ہر لفظ کی

۱- فاران ، اپریل ۱۹۵۳ء ، ص ۳

ھمین جواب دھی کرنی ھے اگر ھم کسی پر تہمت دھر کر اور الزام لگا کر ، اِس دُنیا مین قانون کی زد سے بچ بھی جائین تو آخرت مین اللّٰہ تعالیٰ کے مواخذے سے نہ بچ سکین گے ۔ جب ھمارا یہ عزم اور یہ ایمان ھے تو پھر حق گوئی پر کسی قسم کے احتساب کا ھمین خوف بھی نہین ھے ۔ مسلمان کے دل مین صرف خوفِ خدا ھی سما سکتا ھے ۔ خدا کا ڈر اور بندون کا خوف یہ دونون ایک دل مین جمع نہین ھو سکتے ۔

اے پاکستان کی کشتی کے ناخداؤ ! تم جب اسلام کا نام لیتے ھو تو اس سے وھی اسلام مراد ھونا چاھیے جس کو خدا کے آخری رسول (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) نے پیش فرمایا تھا اور جو کتاب و سنت مین پایا جاتا ھے اور جس اسلام مین نہ "مینا بازار" ھین نہ "خنگ ناچ" کے جلسے ھین ، نہ عورتون مردون کا بےحجابانہ اختلاط ھے ، نہ گھوڑ دوڑ کی شرطین اور کلب گھرون کی قمار بازیان اور عیش سامانیان ھین ۔

ھم پوچھتے ھین کہ جس اسلام کا تم نعرہ لگاتے ھو ، وہ اسلام کہان ھے؟ کیا تمہاری جلوتون ، خلوتون ، جلسون ، پارٹیون ، کلب گھرون کوٹھیون اور بنگلون مین وہ "اسلام" پایا جاتا ھے ؟ کیا تمہاری زندگیان تمہارے قول سے ھم آھنگ ھین ؟ اگر جواب اثبات مین ھے تو پھر ھم جیسے دیوانون کو طوق و زنجیر پہنا کر پاگل خانہ مین بند کر دو کہ تم جیسے "مجسّم اسلام" اور "سراپا دین" بزرگ و محترم ھستیون کو ھم سمجھ ھی نہین سکے۔یعنی جن کے نام کے منبرون پر خُطبے پڑھے جانے چاھین تھے،ان پر ھم جیسے کم نظر تنقید کرتے ھین ــــ اور اگر جواب نفی مین ھے تو پھر خدا کے لیے بتاؤ کہ اس غیر اسلامی ماحول کو کب تک برداشت کرتے رھین ۔ آخر انتظار کی کوئی حد ھونی چاھیے "۔[1]

۱۔ اداریہ فاران ، مئی ۱۹۵۱ء ، ص ۷

جس طرح کسی کارخانے کی تنصیب میں انجنیئروں اور کسی ہسپتال کے اجراء میں ڈاکٹروں کا کردار ہوتا ہے، بعینہٖ وہی رول علماء، اسلامی نظام کی تنفیذ میں ادا کرتے ہیں ۔ لیکن پاکستان کا برسرِاقتدار طبقہ ایک طرف، عوام کی تشفی کے لیے، اسلامی نظام کی بات کرتا تھا، مگر ساتھ ہی علماء اور دیندار طبقے کو ہدفِ تنقید بھی بناتا تھا ۔ اس روش پر ماہر یوں تبصرہ کرتے ہیں :-

"اسلام اور دستور کے معاً بعد اسی ایک سانس میں "ملاؤں" اور "ملاؤں کی حکومت برداشت نہ کرنے کا" ذکر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اقتدار کو دراصل "نظامِ اسلامی" سے خطرہ ہے اور یہی خطرہ "ملاؤں" کی مخالفت میں طنز و تعریض بن کر ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ بھی ایک اچھا خاصا لطیفہ بلکہ اعجوبہ ہے کہ اسلامی بنیادوں پر دستور بنانے کا اعلان کیا جائے اور "ملاؤں" کو اس میں بولنے اور مشورہ دینے کی بھی اجازت نہ ہو ۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص مکان تعمیر کرنا چاہتا ہو، مگر انجنیئروں کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دے، یا کوئی مریض کہے کہ میں نہ تو ڈاکٹروں اور طبیبوں کو نبض دکھاؤں گا نہ ان کا بتایا ہوا پرہیز کروں گا۔ اور نہ ان کے لکھے ہوئے نسخہ کی دوائیں لوں گا کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا، تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ڈاکٹروں اور طبیبوں کا زیردست محکوم اور تابع فرمان بن گیا ۔ جب مسائل کو سوچنے کا یہ انداز ہو تو ایسی عقل و بصیرت سے کوئی کہاں تک خیر و فلاح کی امید رکھے ۔"[1]

قومی زندگی کے ایک اور اہم پہلو پر ماہر اپنا موقف یوں بیان کرتے ہیں :-

"کیا سوویٹ روس میں کسی سرمایہ دار کو کوئی عہدہ دیا جا سکتا ہے؟ کیا امریکہ اور فرانس کی جمہوریت میں کسی بادشاہ کو امارت سونپی

۱- اداریہ فاران، ستمبر ۱۹۵۳ء

جاسکتی ھے ؟ اگر ایسا نہین ھو سکتا تو پھر پاکستان کی اسلامی حکومت کی زمامِ کار کے وہ لوگ مستحق نہین ھو سکتے ، جن کی نہ تو زندگیان اسلامی معیار کےمطابق ھین اور نہ جن کے افکار و تصورات اسلامی ھین "۔[1]

اسی ماہ کے اداریے مینُانہون نےحکمرانون کےعزائم کو اس طرح چیلنج کیا ھے :-

" ھم ڈنکے کی چوٹ کہتےھین کہ سنگینون کے زور پر غیر اسلامی دستور ھم پر نافذ نہین کیا جا سکتا ۔ لادینی ، کافرانہ اور غیر اسلامی منشور کا استقبال ھم اپنی ٹھوکرون سے کرین گے ۔ اگر پولیس اور فوج کی تمام بندوقون اور توپون کے دھانے بھی ھماری طرف کر دیئے جائین توبھی ھم انشاء اللّٰہ یہی کہین گے کہ اللّٰہ اور رسولؐ کے احکام کے مقابلہ مین ھم کسی اورکے قانون اور حُکم کی اطاعت نہین کرسکتے "۔[2]

ایوب خان کے آمرانہ اور غیر اسلامی کردار کے حوالے سے ماھر نے ظلم و ستم کی یون مذمت کی :۔

ظلم و ستم اور استبدّار چار کو طاقت کےبل بوتے پر تھوڑے دن ابھرنے کا موقع مل سکتا ھے ، مگر اس نمود کی عمر زیادہ دراز نہین ھوتی۔ ظلم و ستم کا آخری نتیجہ اس کی شکست ھے ۔ مظلومیت کتنی ھی بیچارہ اور درماندہ کیون نہ ھو ، بالآخر اسی افق سے فتح و نصرت کا آفتاب طلوع ھوتا ھے ۔ ظالم شروع شروع مین اپنی طاقت کے نشہ مین یہی سمجھتا ھےکہ مظلوم اس کا بال بیکا بھی نہین کر سکتے ،

۱۔ اداریہ فاران ، اکتوبر ۱۹۵۳ء ،

۲۔ ایضاً

مگر اللہ تعالٰی کے انتقام کی شمشیر جب بے نیام ہو جاتی ہے تو ظالم کا غرور بابل کے بلبلہ کی طرح ٹوٹ کر رہتا ہے ۔ ظالموں کو ہمیشہ ڈھیل ملتی رہتی تو اس دنیا میں تہذیب و تمدن ، علم و دانش اور انسانیت و نیکی کا نام و نشان ہی باقی نہ رہتا اور گھوڑوں اور بیلوں کی جگہ مظلوم و غلام انسانوں سے بار برداری کا کام لیا جاتا ۔ ہم سب کے سامنے کی بات ہے کہ مسولینی اور ہٹلر نے کیسا زور باندھا تھا ، مگر ان کی سطوت و طاقت کے غباروں سے بہت جلد ہوا نکل گئی ۔ آج ان مطلق العنان فرمانرواؤں کا کوئی نام لیوا اور پانی دیوا بھی باقی نہیں رہا ۔ پوری تاریخِ انسانی اسی عبرت کا مرقع ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ کم لوگ اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں "۔ ۱

ماہر اتحادِ امت اور اسلامی نظام کو پاکستان کی وجہِ تخلیق سمجھتے تھے

اور پاکستان کی بقا اور سالمیت بھی اُنہیں انہی دو عوامل میں نظر آتی تھی :-

" پاکستان کا قیام درحقیقت تاریخ کا بہت بڑا معجزہ ہے ، مگر یہ معجزہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے سبب وجود میں آیا ۔ اسلام کے نعرے نے غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا اور انہوں نے تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے تمام فروعی اختلافات کی بساط لپیٹ کر رکھ دی تھی ۔ ایک طرف انگریز کی حکمت عملیاں تھیں ، دوسری جانب ہندو قوم کی مخالفت تھی ، مگر ان موانع ، مشکلات اور دشواریوں کے باوجود ہندوستان تقسیم ہو کر اور پاکستان بن کر رہا ۔

ہندوستان کے تمام مسلمان چاہے وہ کسی خطہ اور علاقہ کے رہنے والے

---

۱ - اداریہ فاران ، ستمبر ۱۹۶۵ ء ، ص ۱۲

ھون ، ایک خاندان اور گھرانے کے افراد کی طرح تحریکِ پاکستان کی جد وجہد میں دوش بدوش شریک رہے ھیں - یہ مسلمانوں کا اتحاد تھا جس نے پاکستان کی تحریک کو کامیاب بنایا - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ھے کہ مسلمانوں کو دیوار کی طرح متحد رہنا چاھیئے جس کی اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ھے - ملتِ اسلامیہ کے درمیان قدرِ مشترک اسلام اور صرف اسلام ھے - یہی ان کے اتحاد کا بلکہ ان کی زندگی ، وجود اور بقا کا ضامن ھے - اسلام ھی نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ھے اور اسلام کا رشتہ وطن ، رنگ اور نسل و خون کے رشتہ سے بھی زیادہ قوی ھے"-[1]

اور جب بد قسمتی سے وطن عزیز میں وہ وقت آیا ، جب ایک مسلمان حکمران خم ٹھونک کر اسلام کے مقابلے میں آ گیا ، تو ماھر نے بڑی خوبصورت تاریخی مثال کے حوالے سے اس پر یوں تبصرہ کیا:-

" اسلام کی تاریخ میں ایک " کربلا " کی ضرورت تھی تاکہ آنے والی مسلمان نسلوں کو اپنے حالات کے لحاظ سے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی .... ھو کہ انہیں حسین رض کی پیروی کرنی ھے یا یزید کا ساتھ دینا ھے - یزید کافر نہیں کلمہ گو تھا اور مسلمان تھا اور صحابیِ رسول کا بیٹا تھا ، مگر حضرت حسین --- صدیقِ اکبر ، فاروقِ اعظم ، عثمانِ غنی اور علیِ مرتضیٰ سے جیسے کردار کے انسان کے ھاتھوں میں زمام حکومت دیکھنا چاھتے تھے کہ ملت کی سربراھی اسی کو زیب دیتی ھے جو خوش اعمال ، خوش کردار اور خوش اوقات ھو اور جس کی زندگی اسلامی اخلاق کی آئینہ دار ھو "-[2]

۱- اداریہ فاران ، جون ۱۹۶۹ء ۶ ص ۳

۲- ایضاً جنوری ۱۹۷۷ء ، ص ۵

اسلام کے ساتھ ساتھ ماہر نے اردو زبان کی حمایت اور مدافعت مین بھی متعدد اداریے قلم بند کیئے ۔ صرف دو اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں ۔

"یہ وہ حقیقت ہے جو سب کے نزدیک مسلّم ہے اور ایسا واقعہ ہے جو کسی دلیل و ثبوت کا محتاج نہیں ہے کہ اردو دنیا کی تمام زبانوں کے مقابلہ مین کمسن ہے مگر جہاں تک اردو زبان کی وسعت و مقبولیت اور اس کے ادب کی گیرائی ، رفعت و عظمت اور ثروت کا تعلق ہے ، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی زبان سے وہ کمتر اور ہیٹی نہین ہے ۔ حال ہی مین بین الاقوامی سطح پر دنیا کی زبانوں کا جو جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی سروے کی گئی ہے ، اس کے نتیجہ مین اردو کو دنیا کی تیسری زبان قرار دیا گیا ہے ۔ اردو زبان مین ہر خیال و فکر اور تصوّر و عقیدہ اور علم و فن کے اظہار اور ترجمانی کی پوری صلاحیت اور کامل استعداد پائی جاتی ہے"۔[1]

" اردو زبان سچ مچ کو ثر و تسنیم مین دُھلی ہوئی زبان ہے ۔ اس زبان مین کتنی شیرینی ، سلاست ، سادگی ، روانی اور شگفتگی ہے ، اس کو عجم کا حسنِ طبیعت بھی میسر ہے اور عرب کا سوزِ دروں بھی ۔ یہ قلعہ معلّٰی سے لے کر جھونپڑوں تک کے تمدن و تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے"۔[2]

" اردو زبان دینی علوم کا خزانہ ہے ۔ پاکستان کی کسی علاقائی اور صوبائی زبان مین دینی علوم کی مقدار ، اردو زبان کے مقابلہ مین عشر عشیر بھی نہین ہے ۔ اس خصوصیت کے پیش نظر بھی اردو زبان پاکستان کی حکومت اور یہاں کے خواص و عوام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور عملی دلچسپی کی مستحق ہے ۔ اس زبان کو زیادہ سے زیادہ عام اور ہر شعبہ حیات مین سمونے کی ضرورت ہے تاکہ دین سے ہمارا رشتہ قوی سے

۱۔ اداریہ فاران ستمبر ۱۹۶۷ء ، ص ۳

۲۔ ایضاً ، ص ۸

قوی تر رہے اور اس رشتہ میں کسی قسم کی فترت ، خلا ، کمزوری اور کھنڈت پیدا نہ ہونے پائے ۔[1]

* تقسیمِ ہند سے قبل جب پاکستان کی تحریک کا زور شور تھا ، متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کس قدر اتحاد ، یک جہتی اور بھائی چارہ پایا جاتا تھا ۔ یہ علاقائی زبانیں اُس وقت بھی موجود تھیں ، مگر مختلف علاقائی زبانیں بولنے والے مسلمان اردو زبان کے نہ صرف حامی بلکہ دل و جان سے شیدائی اور فدائی تھے ۔ بھارت میں ہندوؤں نے جب بھی اردو زبان کو نقصان پہنچانے کی چال چلی ، تو تمام مسلمانوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا ۔ اردو کے نقصان کو پورے متحدہ ہندوستان کے مسلمان اپنا ذاتی نقصان سمجھتے تھے اور اپنی علاقائی زبانوں سے محبت رکھتے ہوئے اردو زبان کا قومی زبان ہونا سب کے نزدیک مسلّم تھا ۔ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم نے ڈھاکہ میں اعلان فرمایا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہے ۔[2]

غرض ماہر کو پاکستان بھر کے مدیرانِ جرائد میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ بیک وقت ادب و شعر کا نکھرا ہوا ذوق بھی رکھتے تھے جس کے تحت وہ خصوصاً نعت اور غزل کا بےحد خوبصورت انتخاب پیش کرتے رہے اور دینی علوم کے متبحّرِ عالم بھی تھے ۔ پاکستان کی سیاسیات پر ان کی گہری نظر تھی اور عالمِ اسلام کے مسائل و حالات سے بھی بخوبی آگاہ تھے ۔ وہ وسعتِ ظرفی ، حوصلہ مندی ، توازن و انصاف اور بے تعصبی کا عجیب و غریب پیکر تھے ۔ فی الحقیقت انہوں نے " فاران " کے ذریعے اردو زبان و ادب کی بھی خوب خدمت کی اور عقاید و نظریات کے حوالے سے بھی اپنے قارئین کی تربیت و تزکیہ کرنے کی سعی کی ۔ اردو ماہناموں کی تاریخ میں ماہر القادری اپنی مثال آپ تھے اور میں اس امر میں کسی مبالغے سے کام نہیں لے رہا ۔

۱۔ اداریہ فاران ستمبر ۱۹۶۷ء ، ص ۹

۲۔ ایضاً ، نومبر ۱۹۶۷ء ، ص ۳ ، ۴

باب - ۱۵

ماهر القادری کا اسلوب بیان

مجموعی اعتبار سے ماہر القادری کا اسلوب نگارش سادہ اور عام فہم ہے - وہ نثر میں بیک وقت مولانا شبلی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے متاثر نظر آتے ہیں اور دونوں کے اسالیب کا اثر ان کی تحریروں میں صاف دکھائی دیتا ہے - چنانچہ ماہر کے طرزِ تحریر کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ دونوں بزرگوں کے پیرایہ اظہار پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے -

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ شبلی کے اسلوب کی نمایاں صفت اس کی وہ قوّت اور جوشِ بیان ہے جو اس کے احساسِ کمال اور احساسِ عظمت کی پیداوار ہے ۔[1] چنانچہ

" شبلی کے طریقہ ہائے خطاب میں خود اعتمادی اور برتری کا احساس ہر جگہ نمایاں ہے - یہ خطاب کسی جگہ خطیبانہ ، کسی جگہ واعظانہ اور کہیں فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں - ان کی تحریروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنےعصر کی جہالت اور بدمذاقی کا پورا یقین تھا ...... اپنی ذات پر انہیں جتنا اعتماد ہے - اتنا ہی انہیں اپنے مقصد کے برتر اور اعلیٰ ہونے کا بھی یقین ہے - اس کی وجہ سے ان کی نثر میں انتہا درجے کی صمیمیت اور صلابت پیدا ہو گئی ہے "۔[2]

ڈاکٹر سید عبداللہ ہی کے تجزیہ کے مطابق شبلی کی تحریروں کا دوسرا خاصہ ایجاز و اختصار ہے۔وہ مبالغہ اور استعارہ سے بھی کام لیتے ہیں اور فارسی کی رنگین تراکیب، اردو محاورات اور اشعار کے برمحل استعمال سے بھی عبارت کو خوشرنگ و حسین بناتے ہیں - نیز ان کا طنزیہ انداز بھی نثر کی تاثیر اور دلچسپی کو دو آتشہ بنا دیتا ہے - چنانچہ

۱- سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ، مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد ۱۹۸۶ء ، ص ۱۷۳ -

۲- ایضاً ، ص ۱۷۳ ، ۱۷۴

اس امر میں میں کوئی شبہ نہیں کہ شبلی کی نثر بظاہر سادہ ہوتی ہے ، مگر اس میں حُسن کاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے جو ان کے شاعرانہ طرزِ بیان کے ساتھ ان کی نثر کو صوتی اور ظاہری اعتبار سے بھی اثر ، حسن اور لُطف کا نادر مجموعہ بنا دیتی ہے -[1]

بقول ڈاکٹر احسن فاروقی " مولانا مودودی کی نثر اردو ادب میں مذہبی نثر کا کمال ہے . . . . اس میں صحت ، پختگی ، زور ، نفاست اور انفرادیت ہے "-[2] اور ڈاکٹر سید محمد یوسف کے نزدیک مولانا مودودی نہ صرف ایک باکمال ادیب ہیں بلکہ اپنی طرز کے آپ موجد ہیں - ان سے پہلے اردو میں تاریخِ اسلام ، سیرت و سوانح کے اچھے اچھے نمونے وجود میں آئے ، لیکن جہاں تک دین کے اصول ، اخلاق کے مسائل اور تہذیب و ثقافت کے مبادی کا تعلق ہے یہ معاملہ وعظ سے آگے نہ بڑھ سکا - مودودی پہلے مولانا اور عالمِ دین ہیں جنہوں نے ایمانی حقیقتوں کو اور عملی زندگی کی جدوجہد کو علمی و ادبی سطح پر لا پہنچایا "-[4]

پروفیسر خورشید احمد[5] نے مولانا مودودی کی نثر کی جو خصوصیات گنوائی ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں -

مولانا مودودی کی نثر مقصدیت کا خوبصورت نمونہ ہے جسے بے پناہ اعتماد اور غیر معمولی قطعیت ایک خاص شان عطا کر دیتی ہے - یہ نثر ہر طرح کے ابہام سے پاک اور

۱- دیکھئے سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء ، ص ۱۴۳ ، ۱۴۵ ، ۱۴۶ ، ۱۴۸ -
۲- ادبیاتِ مودودیؒ مرتبہ پروفیسر خورشید احمد ، اسلامک پبلیکیشنز ، لاہور ۱۹۸۱ء
ص ۱۳۵ ، ۱۳۶ -
۳- پروفیسر شعبۂ اردو ، کراچی یونیورسٹی ،
۴- ادبیات مودودی ، ص ۱۷۰
۵- سابق پروفیسر اقتصادیات ، کراچی یونیورسٹی ، سیاست دان ، ماہرِ اقتصادیات -

واضح ہے اور اس میں فکر کا تسلسل ، دلیل کی قوت اور منطقی ربط پایا جاتا ہے ۔ زبان کی صحت اور سادگی اس پر مستزاد ہے اور ادبیت اور نفاست اس کا طرہ امتیاز۔ وہ مشکل الفاظ اور تراکیب سے اجتناب کرتے ہیں اور طرزِ ادا کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تحریر میں بلا کی شوخی اور ذہانت بھی ہے اور وقار و سنجیدگی بھی ۔ وہ طنز و مزاح سے بھی حسبِ موقع کام لیتے ہیں ۔ جس سے تحریر میں بڑی رعنائی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے ۔[1]

ماہر نے اپنے اسلوبِ تحریر میں متذکرہ دونوں حضرات سے اثرات قبول کئے ہیں ۔ چنانچہ موصوف کی نثر کی پہلی خصوصیت اس کی مقصدیت ہے ۔ ناول ہوں یا افسانے، خاکے ہوں یا سفر نامے ، ان کی مذہبی تحریریں ہوں یا سیاسی نگارشات یا ادبی و علمی مقالات ہر شعبۂ نثر میں ماہر کے سامنے ایک ہی مقصد رہا کہ اعلیٰ اخلاقی و اسلامی قدروں کی تشہیر کی جائے ، اردو زبان کو وسعت و فروغ حاصل ہو ، معاشرے کی اسلامی نقطہ نظر سے اصلاح ہو اور اللہ کا کلمہ بلند ہو ۔ اس ضمن میں متعلقہ ابواب میں ضروری وضاحتیں کر دی گئی ہیں ۔

تاہم ماہر نے مقصدیت کے حوالے سے اپنا موقف یوں بیان کیا ہے :-

" فاران کے گزشتہ شماروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو سب سے زیادہ نمایاں چیز یہ سامنے آئے گی کہ " فاران " میں عنوان بدل بدل کر " اسلام اور اخلاق " ہی کے بارے میں مسلسل لکھا جاتا رہا ہے اور یہی ایک " لَے " ہے جو کہیں مدھم اور کہیں تیز ہو گئی ہے وہ جو کسی بھوکے سے سوال کیا گیا تھا کہ دو اور دو (٢ + ٢) کتنے ہوتے ہیں تو جواب میں اس نے کہا تھا کہ دو اور دو چار روٹیاں ہوتی ہیں ۔

١۔ ادبیات مودودی ، ص ٣١ ، ٣٥

تو ہمارا حال بھی اسی بھوکے جیسا ہے - ہم اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اسلام ہی کی پیاس اپنے اندر رکھتے ہیں - ہمارے نزدیک انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و کامرانی اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور یہی وہ راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم ہے جس پر گامزن ہو کر زندگی کا قافلہ اپنی منزلِ مقصود کو صحیح سلامتی کے ساتھ پہنچ سکتا ہے "۔[1]

(۲) ماہر کے اسلوبِ بیان کی دوسری خصوصیت تحریر کا جوشِ بیان اور قوت ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ شبلی اور مولانا مودودی ہی کے اسالیب کا پر تو ہے - خصوصاً " فاران" کے ان اداریوں میں لہجے کا یہ جوش زیادہ واضح نظر آتا ہے جن میں موصوف نے پاکستانی حکمرانوں کے آمرانہ اقدامات اور غیر اسلامی ہتھکنڈوں پر تنقید کی ہے - ذیل کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں :-

" ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ سنگینوں کے زور سے غیر اسلامی دستور ہم پر نافذ نہیں کیا جا سکتا - لادینی ، کافرانہ اور غیر اسلامی منشور کا استقبال ہم اپنی ٹھوکروں سے کریں گے - اگر پولیس اور فوج کی تمام بندوقوں اور توپوں کے دہانے بھی ہماری طرف کر دیئے جائیں ، تو بھی ہم انشاء اللہ یہی کہیں گے کہ اللہ اور رسول کے احکام کے مقابلہ میں ہم کسی اور کے قانون اور حکم کی اطاعت نہیں کر سکتے "۔[2]

" پاکستان کے عوام پاکستان میں اسلام کے علاوہ اور کسی نظام کا نفاذ نہیں چاہتے - ان کی یہ خواہش ہے کہ جمہوریت اور شورائیت کے تقاضے

۱- فاران مئی ۱۹۶۰ء ، ص ۲ (اداریہ)

۲- فاران اکتوبر ۱۹۵۳ء ، (ادارہ)

پورے کئے جائیں ۔ کسی ایک فرد کو مطلق العنانی حاصل نہ ہو۔ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اُسے کسی الزام میں عدالت کی جوابدہی سے مستثنیٰ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ خلفائے راشدین عدالتوں میں بہ نفس نفیس حاضر ہوئے ہیں ۔ اسلام جن کو معروف کہتا ہے وہ نافذ کئے جائیں، جو منکرات ہیں ان پر قدغن لگائی جائے ۔ معاشرے کو پاکیزہ اور طاہر بنایا جائے ۔ سُود ، زنا ، قمار ، اور شراب نوشی کو قانونی جرم ٹھہرایا جائے"۔[١]

(٣) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریر مدلل ہوتی ہے اور وہ اپنے موقف کی تائید میں مثالوں سے بھی کام لیتے ہیں ۔ جس سے تحریر میں نہ صرف اثر پیدا ہو جاتا ہے بلکہ زور اور قوت کا اضافہ بھی ہو جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر ذیل کا اقتباس دیکھئے:

" یہ لوگ اپنے پیروں اور شیوخ کی زندگی میں خود دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو اپنے پاس سے روپیہ پیسہ ، خزانے ، اور گنجینے دینے کی بجائے ان سے نذرانے قبول کرتے ہیں ۔ ان کو کچھ نہیں معلوم کہ ان کے قریب کے مکان یا گلی میں کیا ہو رہا ہے؛ ان کی بہت سی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں ۔ کمزور ہو جاتے ہیں تو مریدوں کے سہارے چلتے ہیں ۔ لقوہ اور فالج ہو جاتا ہے تو زبان سے ٹھیک طرح الفاظ ادا نہیں ہوتے ۔ زندگی کے تمام معاملات میں مریدوں ہی کی طرح ضرورت مند اور محتاج ـــــ مگر دنیا سے انتقال کر جانے کے بعد نہ جانے کس فلسفہ اور منطق کی رو سے یہ حضرات حلّالُ المشکلات ، حاجت روا ، عالِمُ الغیب ، صاحبِ جود و عطا ، دنیا کے شہنشاہ اور علیم و خبیر بن جاتے ہیں "۔[٢]

١- فاران فروری ١٩٧٧ء ، ص ٥ (اداریہ)

٢- فاران یکم جنوری ١٩٧٥ء ، ص ٢٢

* پاکستان "اسلامی حکومت" ہے پاکستان کے دستور کے سرنامے پر یہی مقدس نام لکھا ہوا ہے جس ہوٹل پر " شربت " کا لیبل لگا ہوا ہو ، اس میں شربت ہی ہونا چاہیے ، مگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو پھر اس لیبل کے بارے میں دنیا کیا کہے گی ۔۔ اسلام کے اوّلین تقاضے دینی اور اخلاقی تقاضے ہیں کیونکہ اسلام کی بنیاد ، معدہ و شکم پر نہیں ، اخلاقیات اور تقوٰی پر ہے ۔ معاشیات کے مسائل تو اہلِ کفر بھی حل کر لیتے ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کو دستوری طور پر " اسلامی حکومت " تسلیم کر لینے کے بعد اخلاقی تقاضوں کے ساتھ کیا سلوک روا گیا "۔[1]

(۴) ماہر شبلی کی طرح نثر میں موقع محل کے مطابق اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں جس سے بیان کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ یہ اشعار عموماً عبرت و موعظت کا تاثر پیدا کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں ۔

* "۲۵ اکتوبر کو مجھے باہر سفر پر جانا تھا ۔ اس سے ایک دن پہلے دو بجے کے قریب تابش دہلوی صاحب نے ٹیلی فون پر یہ ضمناک خبر سنائی کہ استاد قمر کا انتقال ہو گیا ۔ ہم ساڑھے تین بجے کے قریب لیاقت آباد پہنچے ، تو جنازہ آ رہا تھا ۔ مولانا رشید ترابی سوگواروں کے آگے آگے چل رہے تھے ، ہائے خود ان کا یہ شعر ہے

موت نے کتنا کج اخلاق بنایا ہے مجھے ،
لوگ روتے ہیں مری آنکھ میں آنسو بھی نہیں "۔[2]

* " حضرت مفتی صاحب نے اپنے پوتوں کے ناموں میں " اشرف " کی رعایت رکھی ۔ اپنے مکان کو بھی اسی نام سے موسوم کیا ۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی

۱- فاران ، ا گست ۱۹۷۵ء ، ص ۵

۲- یادرفتگان جلد دوم ، ص ۱۹۶

کی شخصیت اور عقیدت مفتی صاحب کے ذہن و فکر ، دل و دماغ بلکہ ریشہ ریشہ میں سموئی ہوئی تھی - جگر مراد آبادی نے کہا ہے -

میں اتنا جذب کر لوں کاش تیرے حسنِ کامل کو ،

تجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر

تو مفتی صاحب کو اپنے شیخ سے اسی قسم کا تعلق تھا" [1]

ء " مولانا نے بہت بڑی عمر پائی ، سو سال کے لگ بھگ ، مگر آخر؟

فنا .... ع

بہت سارے روشنی ان پر جو اس جینے پر مرتے ہیں
زندگی کو کوئی وہم و خواب اور حکایت و افسانہ سمجھ لے تو سمجھ لے ، مگر موت کی واقعیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے -

(۵) نثرِ ماہر کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ طنز سے بھی کام لیتے ہیں - شبلی اور مودودی کے ہاں بھی یہ قدرِ مشترک ہے - ماہر کو چونکہ مختلف طبقوں سے مناظرانہ انداز بھی اختیار کرنا پڑا اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ اطلاقی طنز بحث و مناظرہ کی فضا میں بہت پھلتی پھولتی ہے" - [3] اس لیے ماہر کی طنز میں بھی بڑی کاٹ اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے - مثال کے طور پر وہ اسلام کے معاملے میں دو عملی کا مظاہرہ کرنے والے حکمرانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں -

" ہم پوچھتے ہیں کہ جس اسلام کا تم نعرہ لگاتے ہو وہ اسلام کہاں ہے ؟ کیا تمہاری جلوتوں ، خلوتوں ، جلسوں اور پارٹیوں ، کلب گھروں ، کوٹھیوں اور بنگلوں میں وہ اسلام پایا جاتا ہے ؟ کیا تمہاری

۱- یادِ رفتگان جلد دوم ، ص ۲۶۸
۲- یادِ رفتگاں جلد اول ص ۷۰۰
۳- سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء ، ص ۱۶۸

زندگیان تمہارے قول سے " ہم آہنگ " ہین ؟ اگر جواب اثبات مین ہے تو پھر ہم جیسے دیوانـون کو طوق و زنجیر پہنا کر پاگل خانہ مین بند کردو کہ تم جیسے " مجسم اسلام " اور " سراپا دین " بزرگ و محترم ہستیون کو ہم سمجھ ہی نہین سکے یعنی جن کے نام کے منبرون پر خطبے پڑھے جانے چاہئین تھے ان پر ہم جیسے کم نظر تنقید کرتے ہین ۔ اور اگر جواب نفی مین ہے تو پھر خدا کے لیے بتاؤ کہ اس غیر اسلامی ماحول کو کب تک برداشت کرتے رہین ۔ آخر انتظار کی کوئی حد ہونی چاہیئے ۔[1]

ماہر کی اس طنز مین سنجیدگی اور کرب کا عنصر غالب ہے ، مگر بعض مقامات پر ان کے ہان طنز کے ساتھ مزاح بھی شامل ہوجاتا ہے اور وہ بعض شخصیات کے مضحک پہلوؤں کی اس طرح پردہ دری کرتے ہین کہ کرب قہقہے کے اندر چھپ جاتا ہے :۔

روزنامہ " صبحِ دکن " مین نظام حیدر آباد کی غزلین " استاد واثے جلیل " کے ساتھ چھپا کرتی تھین ۔ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل تلمیذ و جانشین حضرت امیر مینائی اس انداز کے شعرون کو آخر کہا ن تک درست کرتے ؟

سہ کس کا یہ بوجھ تھا ، جس کوکہ اٹھایا اس نے ،

رکھی کرسی ہے کہان پوچھ لے تو میز سے بھی

اخبارون مین جو غزلین شائع ہوتین ، ان مین نظامِ دکن کے نزدیک جو مشکل اورادق الفاظ ہوتے ان کے معنی بھی خود ہی درج فرمادیتے۔ مثلاً " گُل " بہ معنی پھول " ایک بار " حنا " کے معنی " سوسون " لکھ مارا ۔ فارسی مین جو ٹک بندی فرماتے، اس مین بعض اشعار کی شرح اور توصیف مین فارسی جملے لکھ دیتے ۔ بعض خوشامدی حاشیہ شیدون نے

---

۱ ۔ فاران مئی ۱۹۵۱ء ص ۷

نظامِ حیدر آباد کو یہ باور کرایا کہ ایران کے اھلِ قلم سرکار کے فارسی اندازِ تحریر کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ھین"۔[1]

(۶) ماھر کی تحریر کی چھٹی خصوصیت یہ ھے کہ انھین اظہار بیان پر مکمل عبور حاصل ھے ۔ وہ کسی مقام ، شخصیت اور حالت کا ایسا مرقع کھینچتے ھین کہ آنکھون کے سامنے تصویر بھی کھینچ جاتی ھے اور متعلقہ شخصیت کا ضروری تعارف بھی سامنے آ جاتا ھے۔ ایک مثال دیکھیئے:۔

" کانفرنس کے بعد سیرۃ النبیؐ کے جلسون کے لیے رُکنا پڑا ۔ سات آٹھ دن کانپور مین قیام رہا اور مولانا حسرت موہانی کو بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ھوئی ۔ گھنٹون گفتگو رہتی ۔ شعرو ادب پر ، سیاست پر اور مذھب و تصوف پر۔ مولانا کے مکان کی بیٹھک کا نقشہ اب تک آنکھون مین پھر رہا ھے ۔ ایک پلنگ بچھا تھا جس کی ملگجی چادر اور میلے تکیے صاحبِ خانہ کی عسرت کی کہانی زبانِ حال سے سنا رہے تھے ۔ چھوٹی سی میز پر چند کتابین دھری تھین ۔ تین چار کرسیا ن اور غالباً سرکنڈے کے مونڈھے بھی تھے ۔ پلنگ کے سرھانے دیوارمین جو طاق تھا ، اس مین کرشن جی کی ایک مورتی بھی رکھی تھی۔ مٹی کی بنی ھوئی مورتی جو اُس زمانہ مین دو تین پیسہ مین آتی تھی -- بہت ممکن ھے کہ گھر کے بچون نے اس کھلونے کو وھان رکھ دیا ھو --- مگر یہ بھی حقیقت ھےجو مین نے خود حسرت کی زبان سے سنی ھے کہ کرشن جی سے مرحوم کو عقیدت تھی۔وہ بندرابن (متھرا) جایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ " وھان مجھے روحانی کیف حاصل ھو تا ھے"۔[2]

(۷) نثرِ ماھر کی ایک اور خصوصیت یہ ھے کہ اس مین سادگی و سلاست اور پُرکاری کی ایک شان نظر آتی ھے ۔ انھون نے زبان کو عربی یا فارسی کی مشکل اور نامانوس ترکیبون

۱- یاد رفتگان جلد دوم ، ص ۱۱۰

۲- یادرفتگان سال اول ، ص ۱۶۴ ، ۱۶۵

سے کبھی بوجھل نہیں بنایا ۔ شوکتِ الفاظ کا خواہ مخواہ مظاہرہ نہیں کرتے اور صحتِ زبان کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں جذبے کی صداقت اور مقصدیت کا خلوص وافر مقدار میں ہے، اس لیے وہ اعتماد و یقین کی ایک خاص کیفیت سے سرشار نظر آتے ہیں ۔ نتیجۃً ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی تاثیر ، دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ خصوصاً جن مقامات پر وہ جذبات اور قلبی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں، وہاں ان کی نثر میں شعریت و ادبیت کا حسن پیدا ہو جاتا ہے ۔ دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں :-

مولانا ظفر علی خان کی وفات پر لکھے ہوئے خاکے کی آخری سطور یوں ہیں :-

• " جانے والے تجھے اعلیٰ علیّین میں اُن نفوسِ قدسیہ کا قرب نصیب ہو جن کو قرآن میں اَنعَمْتَ عَلَیْہِمْ کہا گیا ہے۔ اگر ارواح کو بارگاہِ احدیت میں عرض معروض کرنے کی اجازت ہو تو عرض کرنا ، ــــ اے معبود ! دنیا کے پردے پر تیرے محبوب نبی ؐ کی امت ہی کو سب سے زیادہ پراگندہ اور پریشانِ روزگار چھوڑ کر آیا ہوں ۔ ہزار بد اعمالیوں کے باوجود آج ساری دنیا میں کوئی قوم تجھ سے ، تیرے نبیؐ سے ، تیرے بھیجے ہوئے قرآن سے نسبت رکھتی ہے تو وہ یہی مصیبت زدہ ملّت ہے۔ چاروں طرف سے " ابرھوں " نے اس ملّت پر ہجوم کر رکھا ہے ۔ تیرے غضب کی ابابیلیں آخر کب آئیں گی اور باطل کی قوتّیں کس دن پاش پاش ہوں گی ۔ وقت وہ آن پڑا ہے کہ سعید روحیں تک " متیٰ نصر اللّٰہ " پکار رہی ہیں ۔ مالک! اپنی نصرت جلد نازل فرما ۔ بہت جلد (آمین) " ۔[1]

• " یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے نواب ستار یار جنگ بہادر مرحوم کے مرنے کا یقین نہیں آتا ۔ دفتر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے شاید وہ ملنے کے لیے آ جائیں ۔ میں نئے رسالے اور اخبار ان

۱۔ یادِ رفتگان حصہ اول ص ۲۰۷

کے سامنے پیش کروں ، پھر سیاست و ادب پر گفتگو چھڑ جائے۔ " زبان " کے کسی مسئلہ یا " لفظ " کی کسی تحقیق کے سلسلہ میں میری طرف سے جب یہ کہا جائے " ہمارے یہاں تو اس طرح بولتے ہیں" تو اس پر نواب صاحب طنز آمیز انداز میں فرمائیں " تم نے اپنے کور دیہہ وطن " کبیر " کو کیاکوئی اقلیم سمجھ رکھا ہے " پھر ہم مل کر چائے پیئیں --- ستمبر کا شمارہ شائع ہوا تو حسبِ معمول خیال آیا کہ نواب صاحب کے پاس یا پرچہ لے کر جاؤں گا اور چند دن بعد جب ...... پھر ملاقات ہو گی ، تو وہ ایک ایک مضمون پر تنقید کریں گے..... تمہارے نقشِ اول کا وہ حصہ کمزور ہے - فلاں بات تم نے خوب لکھی ہے .... افسانہ کا اٹھان اچھا ہے مگر آخر میں تم دھم سے زمین پر گر پڑے سان صاحب کامقالہ بہت جاندار ہے ، میں نے اسے بار بار پڑھا - نظمیں اور غزلیں اوسط درجہ کی ہیں - اور ماہر حیدر آباد سے چلے آنے کے بعد تمہاری شاعری میں وہ شوخی نہیں رہی ..... اس خیال سے چونکتا ہوں تو عقل دل کی اس انجمن آرائی پر مسکراتی ہے کہ نواب صاحب کہاں؟ وہ تو اللہ کو پیارے ہو چکے اور اے سخت جان ماہر! تو نے تو ان کے جنازے کو کاندھا دیا تھا ، ان کے جنازے کی نماز پڑھی تھی ، ان کی قبر پر مٹی ڈالی تھی- وہ چلے گئے ہمیشہ کے لیے چلے گئے - ساری دنیا کی نوحہ گری بھی انہیں واپس نہیں لا سکتی "-[1]

۱- یاد رفتگان حصہ دوم ، ص ۲۹۹ ، ۳۰۰

کتابیات ماہر

نعت :-

۱- ظہورِ قدسی	مکتبہ علمیہ چار مینار ، حیدر آباد دکن	جنوری ۱۹۳۹ء
۲- ذکرِ جمیل	نفیس اکیڈمی ، حیدر آباد دکن	۱۹۴۲ء
۳- ذکر جمیل (اضافہ شدہ ایڈیشن)	مرتبہ طالب ہاشمی ، حسنات اکیڈمی منصورہ لاہور	۱۹۸۹ء

مجموعہ ہائے غزل ونظم :-

۱- محسوساتِ ماہر	ادارہ اشاعتِ اردو حیدر آباد دکن	۱۹۴۲ء
۲- نغماتِ ماہر	ایضاً ایضاً	۱۹۴۳ء
۳- جذباتِ ماہر	کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی	۱۹۴۴ء
۴- فردوس	مکتبہ چراغ راہ ، لاہور	۱۹۵۵ء
۵- گلہائے تازہ (غیر مطبوعہ بیاض)		

ناول :-

۱- جب میں جوان تھی	ست قلندر بک ڈپو ، لاہور	۱۹۴۲ء
۲- کردار	ادارۂ اشاعتِ اردو ، حیدر آباد دکن	۱۹۴۳ء
۳- کانچی ہاؤس	کتب خانہ عابد روڈ ، حیدر آباد دکن	۱۹۴۸ء
۴- دُرِّ یتیمؑ	عالمگیر الیکٹرک پریس ، لاہور	۱۹۴۹ء

افسانے :-

۱- انگڑائی	عالمگیر بک ڈپو ، لاہور	۱۹۳۶ء
۲- طلسمِ حیات	ملک دین محمد اینڈ سنز ، لاہور	۱۹۳۷ء
۳- حسن و شباب	کتب خانہ تاج آفس ، بمبئی	۱۹۳۵ء
۴- پیمانے	مشہور پبلشنگ ہاؤس، دھلی	۱۹۳۶ء

۵- مے خانے	مشہور پبلشنگ ہاوس ، دہلی	۱۹۳۷ء
۶- نگینے	مکتبہ ادب نواز کشمیری بازار ، لاہور	۱۹۵۲ء
۷- اندھیرے سے اجالے تک (مرتبہ طالب ہاشمی)	حسنات اکیڈمی ، منصورہ لاہور	۱۹۸۶ء

خاکے :-

۱- یادِ رفتگاں (حصہ اول) (مرتبہ طالب ہاشمی)	البدر پبلی کیشنز ، لاہور	۱۹۸۳ء
۲- یاد رفتگاں (حصہ دوم)	ایضاً	۱۹۸۶ء

سفر نامے :-

۱- کاروانِ حجاز ،	مکتبہ فاران ، کراچی	۱۹۵۶ء
۲- سیاحت نامہ ماہر، (مرتبہ طالب ہاشمی)	حسنات اکیڈمی ، لاہور	۱۹۸۷ء

مذہبی کتب :-

۱- آخری رسولؐ	مکتبہ جلیلیہ چار مینار حیدر آباد دکن	۱۹۳۶ء
۲- خدا اور کائنات	ادارہ اشاعتِ اردو ، حیدر آباد دکن	۱۹۴۳ء
۳- نقشِ توحید	(فاران توحید نمبر میں شامل طویل مضمون)	س۔ن۔

** ******* * * *
* کتابیات *
* * * * * * * * *

۱۔ آسی ضیائی، پروفیسر امان اللہ خان ، شب تاب چراغاں (تذکرہ شعرائے اردو) شاہ اینڈ سنز ،سیالکوٹ، سن ۔ ن

۲۔ آلِ احمد سرور — تنقیدی اشارے — نذیر اینڈ سنز مسلم ایجوکیشن پریس علی گڑھ ۔ ۱۹۳۲ء

۳۔ ایضاً — ادب اور نظریہ — ادارۂ فروغِ اردو ، لکھنو — ۱۹۵۳ء

۴۔ ابوالاعلیٰ مودودی ، سیّد — سیرتِ سرورِ عالمؐ جلد دوم — ادارہ ترجمان القرآن ، لاہور ۔ — اکتوبر ۱۹۷۸ء

۵۔ ابوالحسن علی ندوی،سید — نقوشِ اقبال — مجلسِ نشریاتِ اسلام ،کراچی — ۱۹۷۳ء

۶۔ ایضاً — پرانے چراغ جلد دوم — ایضاً — ۱۹۸۱ء

۷۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر — غزل اور متغزلین — اردو مرکز ، لاہور — دسمبر ۱۹۵۳ء

۸۔ ایضاً — آج کا اردو ادب — فیروز سنز ، لاہور — ۱۹۷۰ء

۹۔ احتشام حسین ، سید — تنقیدی نظریات — ادارہ فروغ اردو ،لکھنو — ۱۹۶۲ء

۱۰۔ احسان دانش — داریں — دانش اکادمی ، لاہور — ۱۹۷۳ء

۱۱۔ احسن فاروقی ، ڈاکٹر و ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ناول کیا ہے ؟ — دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو ۔ — ۱۹۳۸ء

۱۲۔ ایضاً — اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — سندھ ساگر اکادمی لاہور — ۱۹۶۸ء

۱۳۔ اختر انصاری — افادی ادب — آزاد کتاب گھر ، کلاں محل دھلی ۔ — ۱۹۵۹ء

۱۴- اختر حسین رائے پوری	روشن مینار	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۵۸ء
۱۵- اعجاز حسین، ڈاکٹر سید	ادب اور ادیب	ادارہ انیس اردو ، الہ آباد	۱۹۶۰ء
۱۶- اسرار احمد خان، پروفیسر	اعجازِ بیان	ادارہ آئینۂ ایام، گوجرانوالہ	س ن
۱۷- افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر	مولوی نذیر احمد ، احوال و آثار -	مجلسِ ترقی ادب ، لاہور	۱۹۷۱ء
۱۸- اقبال جاوید، پروفیسر	مخزنِ نعت	علمی کتاب خانہ ، لاہور	۱۹۷۹ء
۱۹- الطاف حسین حالی	مسدس حالی	تاج کمپنی ، لاہور	
۲۰- ایضاً	کلیاتِ نظم حالی جلد اول (مرتبہ افتخار احمد صدیقی)	مجلس ترقی ادب ، لاہور	۱۹۶۸ء
۲۱- انور سدید ، ڈاکٹر	اردو ادب میں سفر نامہ	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور-	۱۹۸۷ء
۲۲- انور محمود خالد ڈاکٹر	اردو نثر میں سیرتِ رسولؐ	اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور -	۱۹۸۹ء
۲۳- ایس اختر جعفری	اختر شیرانی اور اس کی شاعری	آئینہ ادب ، لاہور	۱۹۶۳ء
۲۴- بدر شکیب	جامعہ عثمانیہ	عثمانیہ اکیڈمی ، کراچی	
۲۵- ایضاً	حیدر آباد کا عروج و زوال -	عثمانیہ اکیڈمی ، کراچی	۱۹۶۳ء
۲۶- برج نرائن چکبست	مضامینِ چکبست	انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد	۱۹۳۰ء
۲۷- پریم چند	پریم چند کے مضامین (مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس)	یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ	سن - ن

۲۸- تصدق حسین راجا	نسیم حجازی ایک مطالعہ	قومی کتب خانہ ، لاہور	۱۹۸۷ء
۲۹- جمیل جالبی، ڈاکٹر	ایلیٹ کے مضامین (ترجمہ)	اردو اکیڈمی، سندھ کراچی مئی	۱۹۶۰ء
۳۰- جمیل نقوی	انتخابِ اصغر	اردو اکیڈمی سندھ	۱۹۸۶ء
۳۱- حامد بیگ، ڈاکٹر مرزا	اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ -	مقتدرہ قومی زبان - اسلام آباد	۱۹۸۷ء
۳۲- حفیظ تائب	صلو علیہ وآلہٖ	سیرت مشن، لاہور	۱۹۷۸ء
۳۳- حفیظ جالندھری	شاہنامہ اسلام ، جلد اول	مکتبہ تعمیر انسانیت ،لاہور	۱۹۸۶ء
۳۴- حمید احمد خان	تعلیم و تہذیب	مجلس ترقی ادب ،لاہور	۱۹۷۵ء
۳۵- حمید الدین شاہد	حیدر آباد دکن کے شعرا	آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدر آباد دکن	۱۹۵۸ء
۳۶- خورشید احمد، پروفیسر	ادبیاتِ مودودی	اسلامک پبلی کیشنز ، لاہور	۱۹۷۲ء
۳۷- خلیل الرحمٰن اعظمی	فکر و فن	آزاد کتاب گھر ، دھلی	۱۹۵۶ء
۳۸- خلیل احمد حامدی، مولانا	حسن البناء شہید کی ڈائری -	اسلامک پبلی کیشنز لاہور	۱۹۷۳ء
۳۹- رام بابو سکسینہ	تاریخِ ادبِ اردو	علمی کتاب خانہ ، لاہور	۱۹۷۸ء
۴۰- رشید احمد صدیقی	سہیل کی سرگزشت	نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن	۱۹۳۷ء
۴۱- ایضاً	نقش ہائے رنگ رنگ (مرتبہ نظیر صدیقی)	کاروانِ ادب ملتان صدر	۱۹۷۷ء
۴۲- ایضاً	گنج ہائے گرانمایہ	آئینہ ادب ، انارکلی لاہور	۱۹۶۳ء

۴۳- رشید احمد صدیقی	جدید غزل	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۷۹ء
۴۴- رفیع الدین اشفاق، ڈاکٹر سید	اردو میں نعتیہ شاعری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۷۶ء
۴۵- رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر	اقبال بحیثیت شاعر	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۷۷ء
۴۶- سبط حسن، سید	شہر نگاران	مکتبہ دانیال کراچی	۱۹۸۵ء
۴۷- سجاد ظہیر، سید	روشنائی	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۵۶ء
۴۸- سلام سندیلوی، ڈاکٹر	ادب کا تنقیدی مطالعہ	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۵۹ء
۴۹- سلیمان ندوی، سید	کلیاتِ شبلی	داتا پبلشرز، لاہور	س - ن
۵۰- ایضاً	سیرت النبی جلد سوم	نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد -	۱۹۸۵ء
۵۱- سہیل بخاری، ڈاکٹر	ناول کا فن	مکتبہ جدید، لاہور	۱۹۶۰ء
۵۲-	اردو ناول نگاری		۱۹۶۱ء
۵۳- شاہ علی، ڈاکٹر سید	اردو میں سوانح نگاری	گلڈ پبلشنگ ہاوس کراچی	۱۹۶۱ء
۵۴- شبلی نعمانی، علامہ	سیرت النبی جلد اول	نیشنل بک فاونڈیشن لاہور	۱۹۸۵ء
۵۵- شورش کاشمیری	ظفر علی خان	مطبوعاتِ چٹان، لاہور	سن - ن
۵۶- شمع افروز زیدی، ڈاکٹر	اردو ناول میں طنز و مزاح	پروگریسو بکس، لاہور	۱۹۸۸ء
۵۷- شمیم احمد	۲ + ۲ = ۵	قلات پبلشرز، کوئٹہ	۱۹۷۷ء
۵۸- صدق جائسی	دربارِ دربار	حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدر آباد دکن -	۱۹۶۱ء
۵۹- طالب ہاشمی	تیس پروانے شمعِ رسالت کے	مکتبہ چراغ اسلام، لاہور	۱۹۷۸ء

۶۰- ظفر علی خان، مولانا	خیالستان	مکتبہ کاروان کچہری روڈ، لاہور۔	س-ن
۶۱- ایضاً	بہارستان	کتب خانہ مقبول عام، لاہور	۱۹۶۵ء
۶۲- عابد علی عابد	اصولِ انتقادِ ادبیات	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۰ء
۶۳- عبدالحق، ڈاکٹر مولوی	مقدمات عبدالحق (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو مرکز لاہور	۱۹۶۴ء
۶۴- عبدالسلام، پروفیسر	اردو ناول بیسویں صدی میں	اردو اکیڈمی، سندھ	۱۹۷۳ء
۶۵- عبدالسلام ندوی، مولانا	اقبالِ کامل	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۷۸ء
۶۶- عبدالماجد دریابادی، مولانا۔	انشائے ماجد	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۱ء
۶۷- عبدالمجید سالک مولانا	مسلم ثقافت ہندوستان میں	ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان، لاہور۔	۱۹۵۷ء
۶۸- عبدالمغنی، ڈاکٹر	نقطۂ نظر	کتاب منزل پٹنہ (بھارت)	۱۹۶۵ء
۶۹-	تشکیلِ جدید	ایضاً	۱۹۷۶ء
۷۰- عبداللہ، ڈاکٹر سید	اشاراتِ تنقید	مکتبہ خیابان ادب، لاہور	۹۶۶ء
۷۱- ایضاً	اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء	ایضاً	۱۹۶۷ء
۷۲- ایضاً	درخت اور دریچے	دارالادب چوک انارکلی لاہور	۱۹۶۷ء
۷۳- ایضاً	سخن ور نئے اور پرانے حصہ اول	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور۔	۱۹۷۶ء

۷۴- عبداللہ، ڈاکٹر سید	مباحث	علمی کتاب خانہ، لاہور	۱۹۷۹ء
۷۵- ایضاً	سخن ور نئے اور پرانے حصہ دوم	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور۔	۱۹۷۹ء
۷۶- ایضاً	سرسید احمد خان اور ان کے رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ۔	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۸۶ء
۷۷- علی عباس حسینی	ناول کی تاریخ اور تنقید	لاہور اکیڈمی لاہور	۱۹۶۳ء
۷۸- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر	ظفر علی خان ادیب و شاعر	مکتبہ خیابان ادب لاہور	۱۹۶۷ء
۷۹- غلام محمد	حیاتِ بہادر یار جنگ	بہادر یار اکادمی کراچی	۱۹۷۳ء
۸۰- فاروق اختر نجیب، پروفیسر	تحریکِ آزادی	علمی کتاب خانہ، لاہور	۱۹۷۵ء
۸۱- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	اردو کی نعتیہ شاعری	آئینہ ادب انارکلی، لاہور	۱۹۷۴ء
۸۲- ایضاً	اردو افسانہ اور افسانہ نگار۔	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۸۱ء
۸۳- ایضاً	بیسویں صدی میں اردو غزل	ایضاً	۱۹۸۷ء
۸۴- فیاض محمود، گروپ کیپٹن، سید	تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند دسویں جلد اردو ادب پنجم	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۲ء
۸۵- فیض احمد فیض	میزان	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۸۷ء
۸۶- قمر رئیس، ڈاکٹر	پریم چند کے بہترین افسانے	چودھری اکیڈمی اردو بازار لاہور۔	۱۹۸۸ء
۸۷- کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر	ادارۂ فروغِ اردو، لکھنو	۱۹۵۷ء

۸۸- کے - کے کھلر	اردو ناول کا نگار خانہ	سماقت پرکاش دھلی	۱۹۸۳ء
۸۹- گوپی چند نارنگ	اردو افسانہ روایت اور مسائل	سنگ میل پبلی کیشنز، لاھور	۱۹۸۶ء
۹۰- گوھر ملسیانی، طفیل محمد	عصرِحاضر کے نعت گو	گوھرِادب صادق آباد	۱۹۸۳ء
۹۱- لطیف حسین، ڈاکٹر سید	رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری -	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۶۱ء
۹۲- لعل دین سلیم	تحریک اسلامی منزل بہ منزل		
۹۳- محشر رسول نگری	فخرِ کونینؐ	سجاد پبلیکیشنز، آرٹ سکول روڈ کوئٹہ -	۱۹۸۱ء
۹۴- مرتضیٰ احمد خان میکش	اخراجِ اسلام از ھند	تاج کمپنی لاھور	۱۹۳۸ء
۹۵- محمد ایوب قادری	کاروانِ رفتہ	مکتبہ اسلوب، کراچی	۱۹۸۳ء
۹۶- محمد حسن، ڈاکٹر	اردو میں رومانوی تحریک	کاروانِ ادب، ملتان	۱۹۸۶ء
۹۷- محمد دین تاثیر، ڈاکٹر	مقالاتِ تاثیر (مرتبہ ممتاز اختر مرزا)	مجلس ترقی ادب، لاھور	۱۹۷۸ء
۹۸- محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ	نئے پرانے خیالات	لاھور اکیڈمی، لاھور	۱۹۷۰ء
۹۹- ایضاً	اکبر الہ آبادی، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	مجلسِ ترقی ادب، لاھور	۱۹۸۰ء
۱۰۰- محمد سلیمان منصور پوری، قاضی-	رحمۃ للعالمینؐ جلد اول	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاھور	س ن
۱۰۱- مشتاق احمد خان، نواب	زوالِ حیدرآباد کی اَن کہی داستان	فخر منزل ماڈل ٹاؤن لاھور -	۱۹۸۶ء

۱۰۲- محمد طفیل	صاحب	ادارہ فروغ اردو لاہور	۱۹۶۳ء
۱۰۳- ایضاً	آپ	ایضاً	۱۹۶۷ء
۱۰۴- مظہرالدین ، حافظ	تجلیات	ضیاء القرآن پبلیکشینز لاہور	۱۹۸۳ء
۱۰۵- معین الدین ندوی شاہ	خلفائے راشدین	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۵۳ء
۱۰۶- ممتاز حسین ڈاکٹر	خیر البشرؐ کے حضور میں	ادارہ فروغ اردو ، لاہور	۱۹۷۵ء
۱۰۷- ممتاز منگلوری ، ڈاکٹر	شرر کے تاریخی ناول	مکتبہ خیابان ادب ، لاہور	۱۹۷۸ء
۱۰۸- میرزا ادیب	تنقیدی مقالات	لاہور اکیڈمی ، لاہور	۱۹۶۳ء
۱۰۹- نثار احمد	نوائے سروش (مجموعہ نعت)	سیرت کمیٹی کراچی	۱۹۶۵ء
۱۱۰- نذر محمد خالد	اشتراکیت مذہب اور اخلاق	مکتبہ چراغ راہ کراچی	۱۹۵۱ء
۱۱۱- نصراللہ خان عزیز ، مولانا	کاروانِ شوق	مطبوعہ المحراب ، سمن آباد لاہور	۱۹۶۹ء
۱۱۲- نظیر لدھیانوی ، اصغر حسین خان۔	فنِ شعر اور شعراء پر تنقیدیں	مکتبہ کاروان ، لاہور	۱۹۷۷ء
۱۱۳- نیاز فتح پوری	مالہٗ و ماعلیہ	مکتبہ نگار ، لکھنو	۱۹۳۸ء
۱۱۴- وزیر آغا ، ڈاکٹر	اردو شاعری کا مزاج	مکتبہ عالیہ ، لاہور	۱۹۷۸ء
۱۱۵- وحیدالدین ، فقیرسید	روزگارِ فقیر جلد اول	لائن آرٹ پریس کراچی	۱۹۶۶ء
۱۱۶- ہارون الرشید ، پروفیسر	اردو ادب اور اسلام جلد دوم	اسلامک پبلیکیشنز ، لاہور	۱۹۷۰ء
۱۱۷- وقار عظیم ، سید	داستان سے افسانہ تک	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۶۶ء
۱۱۸- ایضاً	فن اور فنکار	اردو مرکز ، لاہور	۱۹۶۶ء
۱۱۹- ھنسراج رھبر	پریم چند	مکتبہ جامعہ دھلی	۱۹۵۸ء
۱۲۰- یوسف حسین خان ، ڈاکٹر	اردو غزل	آئینہ ادب ، لاھور	۱۹۶۳ء
۱۲۱- یونس حسنی ، ڈاکٹر	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب ۔	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۷۶ء

* * * * * * * * * * * * *
* غیر مطبوعہ مقالات و کتب *
* * * * * * * * * * * * *

١- تحسین فراقی، ڈاکٹر — عبدالماجد دریا بادی — مقالہ پی - ایچ - ڈی
مملوکہ پنجاب یونیورسٹی — ١٩٨٥ء

٢- ریاض مجید ، ڈاکٹر — اردو نعت — مقالہ پی - ایچ - ڈی
مملوکہ پنجاب یونیورسٹی — ١٩٧٦ء

٣- نگہت افزا بخاری — اردو ادب میں شخصیت نگاری مقالہ ایم - اے - اردو
مملوکہ پنجاب یونیورسٹی — ١٩٦٢ء

....

رسائل و جرائد

===============

ماہنامہ "آجکل" دہلی اپریل ١٩٥٨ء نظم نمبر

ہفت روزہ "ادا کار" لاہور ٢- اپریل ١٩٧٥ء فیصل اعظم نمبر

ماہنامہ "افکار" کراچی ، جنوری ١٩٦٥ء (حفیظ نمبر) ، اگست ١٩٦٥ء ، (فیض نمبر)
دسمبر ١٩٧٢ء ، مئی ١٩٧٥ء (ندیم نمبر)

سہ ماہی "العلم" کراچی ، جنوری تا مارچ ١٩٧٨ء

" اقبال ریویو " کراچی ، جولائی ١٩٦٠ء، جولائی ١٩٧٣ء

ماہنامہ " پیغام " لندن ، فروری ، مارچ ١٩٧٠ء

مجلہ "تحقیق" شمارہ نمبر ١ ، سندھ یونیورسٹی ، حیدر آباد ، ١٩٨٧ء

ماہنامہ ترجمان القرآن ، حیدر آباد دکن ، اگست ۱۹۳۷ء

مجلہ ، تعمیرِ نظریہ پاکستان ، (بیاد اقبال و ماہر) ادارۂ تعمیرِ ادب کراچی جون ۱۹۸۱ء

روزنامہ ، جسارت ، کراچی ، ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء ، ۲ نومبر ۱۹۷۷ء ، ۱۲ اپریل ۱۹۷۸ء

ماہنامہ ، چراغ راہ ، کراچی ، نومبر ۱۹۵۸ء ، جولائی ۱۹۶۰ء

نظریہ پاکستان نمبر دسمبر ۱۹۶۰ء ، سوشلزم نمبر ۱۹۶۷ء

مجلہ ، چناب ، ظفر علی خان نمبر ، گورنمنٹ ڈگری کالج وزیر آباد ، ۱۹۸۳ء

ماہنامہ ، درام ، ٹانڈہ یو۔ پی بھارت ، فروری ۱۹۶۹ء

مجلہ ، رگِ سنگ ، قائداعظم و اقبال نمبر ، گورنمنٹ کالج لورالائی ، دسمبر ۱۹۷۷ء

ہفت روزہ ، زندگی ، لاہور ، ۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء ، ۹ فروری ۱۹۷۰ء

ماہنامہ ، ساقی ، دہلی فروری ۱۹۳۳ء

ماہنامہ ، سب رس ، کراچی ، یادِ رفتگان نمبر ، جنوری ۱۹۸۰ء و اکتوبر ۱۹۸۸ء

ماہنامہ ، سویرا ، لاہور نمبر ۷ ، ۸ - ۱۹۴۹ء

ماہنامہ ، سیارہ ، لاہور نومبر ۱۹۶۲ء ، مارچ ۱۹۶۳ء ، مئی ۱۹۶۳ء ، فروری ۱۹۶۵ء

سہ ماہی ، سیارہ ، لاہور شمارہ نمبر ۳ (مارچ ۱۹۷۷ء) شمارہ نمبر ۱۹ (اکتوبر ، نومبر ۱۹۸۳ء)

شمارہ نمبر ۲۳ (ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء) ، شمارہ ۲۷ (جنوری ۱۹۸۹ء)

ماہنامہ ، شام و سحر ، لاہور نعت نمبر ۱ (جنوری فروری ۱۹۸۱ء) نعت نمبر ۲ (جنوری ، فروری ۱۹۸۲ء)

نعت نمبر ۳ (جنوری ، فروری ۱۹۸۵ء)

ماہنامہ ، صحت ، کراچی راشد الخیری نمبر اگست ۱۹۶۳ء

علی گڑھ میگزین ، طنز و مزاح نمبر ۱۹۵۳ء

ماہنامہ نگارش ، کراچی جولائی ۱۹۴۹ء ، ستمبر ۴۹ ، نومبر ۴۹ء ، دسمبر ۴۹ء ، ستمبر ۵۰ء ،

اپریل ۵۱ ء ، مئی ۵۱ ء ، جولائی ۵۱ء ، اگست ۵۱ء ، نومبر ۵۱ء ، فروری ۵۲ء

مارچ ۵۲ ء ، نومبر ۵۲ء ، مارچ ۵۳ء ، اپریل ۵۳ء ، ستمبر ۵۳ء ، اکتوبر ۵۳ء
فروری ۵۴ء ، مئی ۵۵ء ، جولائی ۵۵ء ، ستمبر ۵۵ء ، دسمبر ۵۵ء ، جنوری ۵۶ء
جولائی ۵۶ء ، اگست ۵۶ء ، جنوری ۵۷ء ، فروری ۵۷ء ، جون ۵۷ء ، جولائی ۵۷ء
نومبر ۵۷ء ، جنوری ۵۸ء ، اپریل ۵۸ء ، مئی ۵۸ء ، ستمبر ۵۸ء ، جنوری ۵۹ء
اپریل ۵۹ء ، مئی ۵۹ء ، اکتوبر ۵۹ء ، فروری ۶۰ء ، اپریل ۶۰ء ، مئی ۶۰ء ،
نومبر ۶۰ء ، دسمبر ۶۰ء ، فروری ۶۱ء ، مارچ ۶۱ء ، مئی ۶۱ء ، ستمبر ۶۱ء ،
اکتوبر ۶۱ء ، دسمبر ۶۱ء ، فروری ۶۲ء ، اپریل ۶۲ء ، مئی ۶۲ء ، ستمبر ۶۲ء ،
اکتوبر ۶۲ء ، نومبر ۶۲ء ، اگست ۶۳ء ، ستمبر ۶۳ء ، نومبر ۶۳ء ، دسمبر ۶۳ء
مارچ ۶۴ء ، اپریل ۶۴ء ، جنوری ۶۵ء ، فروری ۶۵ء ، اپریل ۶۵ء ، جون ۶۵ء ،
جولائی ۶۵ء ، ستمبر ۶۵ء ، اکتوبر ۶۵ء ، فروری ۶۶ء ، جولائی ۶۶ء ، اکتوبر ۶۶ء
نومبر ۶۶ء ، جنوری ۶۷ء ، فروری ۶۷ء ، مارچ ۶۷ء ، اپریل ۶۷ء ، مئی ۶۷ء،
اکتوبر ۶۷ء ، نومبر ۶۷ء ، دسمبر ۶۷ء ، جنوری ۶۸ء، مئی ۶۸ء ، اگست ۶۸ء
نومبر ۶۸ء ، جنوری ۶۹ء ، فروری ۶۹ء ، جون ۶۹ء ، جولائی ۶۹ء ، اگست ۶۹ء
ستمبر ۶۹ء ، ستمبر ۷۰ء ، اپریل ۷۱ء ، مئی ۷۱ء ، ستمبر ۷۱ء ، نومبر ۷۱ء ،
دسمبر ۷۱ء ، فروری ۷۲ء ، مارچ ۷۲ء ، مئی ۷۲ء ، جون ۷۲ء ، اگست ۷۲ء ،
دسمبر ۷۲ء، مارچ ۷۳ء ، اپریل ۷۳ء ، جولائی ۷۳ء ، اگست ۷۳ء ، اکتوبر ۷۳ء ،
نومبر ۷۳ء ، دسمبر ۷۳ء ، فروری ۷۴ء ، مارچ ۷۴ء ، مئی ۷۴ء ، جون ۷۴ء ،
نومبر ۷۴ء ، دسمبر ۷۴ء ، جنوری ۷۵ء ، فروری ۷۵ء ، مئی ۷۵ء ، جون ۷۵ء ،
اگست ۷۵ء ، نومبر ۷۵ء ، جنوری ۷۶ء ، جون ۷۶ء ، جولائی ۷۶ء ، اگست ۷۶ء،
ستمبر ۷۶ء ، اکتوبر ۷۶ء ، نومبر ۷۶ء ، جنوری ۷۷ء ، فروری ۷۷ء ، مارچ ۷۷ء
مئی ۷۷ء ، ستمبر ۷۷ء ، اکتوبر ۷۷ء ، دسمبر ۷۷ء ، جنوری ۷۸ء ، مئی ۷۸ء ،

دسمبر ۷۸ء ، مئی ۸۰ء ، مئی ۸۱ء ، جولائی ۸۱ء ، ستمبر ۸۱ء ، مئی ۸۲ء ،

مئی ۸۳ء ، مئی ۸۳ء ، اگست ۸۶ء ، اکتوبر ۸۶ء ،

ماہنامہ " نگار " حیدر آباد دکن مئی ، جون ۱۹۸۷ء ، (گوشۂ ماہر)

ہفت روزہ " لیل و نہار " لاہور ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء

ماہنامہ " معارف " اعظم گڑھ (بھارت) جون ۱۹۷۸ء

" نقوش " لاہور مئی ، جون ۱۹۵۳ء ، دسمبر ۱۹۵۵ء (افسانہ نمبر جلد دوم) ، دسمبر ۷۰ء

اکتوبر ۱۹۸۵ء (غزل نمبر)

ماہنامہ نگارِ پاکستان کراچی ، اصنافِ سخن نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۷ء) ، اصنافِ ادب نمبر (سالنامہ ۶۶ء)

نیرنگِ خیال لاہور " اقبال نمبر " ادارہ نقوش لاہور طبع جدید نومبر ۷۷ء

ماہنامہ ہمدردِ صحت ، " ڈائجسٹ " کراچی ، اکتوبر ۱۹۶۹ء

ENGLISH BOOKS

1- Encyclopedia Britanica, Vol.16.

2- Henry Hudson, Introduction to the Stydy of Literature 2nd ed. George G. Harrap & Co, London, 1930.

3- Scott James R.A. The making of literature London, Scher & Warbury, 1962.